رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

پطرس نمبر

۷۵، ۷۶
ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء

مرتب
محمد طفیل

سالانہ چندہ
بیس روپے

فی پرچہ
سات روپے

ادارہ فروغ اردو ــــ لاہور

کوئی مضمون بلا اجازت شائع نہ کیا جائے

فہرس

افسانے، ڈرامے، ناولٹ

مزاحیہ مضامین

فنی مضامین

تنقیدی مضامین

نیاز مندانِ لاہور کا سلسلہ

ادبِ لطیف

دیباچے

سفرنامے

بچوں اور عورتوں کے لیے

خطوط

پطرس کے مضامین

(مکمل کتاب)

تقاریر

پیغامات

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا



اس کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

[illegible] بخاری

لاہور ۲۰ جنوری ۵۶ء

AHMED BOKHARI

DAG HAMMARSKJOLD

I first met Ahmed Bokhari soon after taking over my functions as Secretary-General. He was then Head of the Pakistan Delegation to the United Nations, famous for his wit and eloquence, but also respected as an extremely effective spokesman for his country. Our first discussion added something essential but not quite unexpected to his profile as it was known to the outside world. I remember how on that occasion he demonstrated his interest in the English metaphysical poets rather than in the more worldly affairs of the United Nations.

A year or so later, when I was looking for a senior representative in the Secretariat for the Islamic world, my thoughts naturally turned to Bokhari. I was happy to see him willing to join our staff. His first strictly personal assignment was a somewhat unexpected one. In January 1955 he accompanied me to Peking, where I had to negotiate about the release of a group of United States fliers. He was, of course, a wise and subtle counsellor but, outside the professional duties, he derived great satisfaction from this first contact with East-Asian civilization with its parallels to the West-Asian culture in which he was steeped.

On later trips to the Middle East I had, a couple of times, the privilege of his guidance. It was especially on those trips that I got to appreciate how deeply the experiences of his youth, and in particular the traditions of his family, had influenced his personality. As all his friends know, he combined great natural warmth and simplicity with considerable shyness. Back of this blend of qualities was a profoundly aristocratic attitude. There was much natural pride reflected also in such an ironical statement of his, as this one which he made to me a couple of times: "I was brought up camelback".

I have stressed here his attachment to his own background. Others will undoubtedly write about his learning and his deep insight in Western traditions. He was, indeed, a master of the English language as of the languages of his own region, and he was a critic of Western literature of an unusual *esprit de finesse*.

It may be natural for me to sum up what I have said about the qualities of Ahmed Bokhari in a word about how those qualities were reflected in his work as a diplomat. I can do that by a quotation from Jacques Barzun, who says in his recent book "The House of Intellect":

"Diplomacy . . . requires an awareness of others' minds which is one of the chief attributes of the prose writer, second only to his capacity for meeting argument with finesse and clear reason. A self-centered diplomat, an incoherent diplomat, are contradictions in terms".

Ahmed Bokhari was, indeed, a diplomat meeting the requirements which this quotation sets out.

25 June, 1959

احمد بخاری

ہیمر شولڈ (سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ)

احمد بخاری سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب مجھے سیکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھالے کوئی زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ اس وقت وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس تھے اور اپنی حاضر جوابی اور شگفتہ بیانی کی بدولت عظیم شہرت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ملک کے بدرجہ غایت موثر اور باوقار ترجمان ہونے کے اعتبار سے بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہماری پہلی گفتگو نے ان جذبات و احساسات میں کسی قدر اضافہ ضرور کیا۔ لیکن یہ اضافہ ان کی اس خیالی تصویر سے چنداں مختلف نہ تھا جس کے لئے وہ باہر کی دنیا میں معروف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس موقعہ پر انہوں نے اقوام متحدہ کے عالمی مسائل سے زیادہ انگریزی زبان کے ماورائی شعرا کے بارے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

کم و بیش ایک سال کے بعد جب مجھے اس ادارے کے لئے عالم اسلام کے ایک اعلیٰ نمائندے کی جستجو ہوئی تو قدرتی طور پر میرا ذہن بخاری کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے یہ معلوم کر کے مزید مسرت ہوئی کہ وہ ہمارے عملے میں شرکت کے لئے رضامند ہیں۔ یوں پہلے پہل ان کی خود سپردگی کسی قدر اچنبے کی بات تھی۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں وہ میرے ہمراہ پیکنگ گئے جہاں مجھے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہوا بازوں کی ایک جماعت کو رہا کرانے کے لئے بات چیت کرنی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ وہ بڑے ہوشمند اور زیرک مشیر تھے۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے ساتھ جس بات پر انہیں زیادہ تسکین حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ انہیں مشرق ایشیا کی تہذیب سے رابطہ پیدا کرنے کا اولین موقع ہاتھ آیا تھا۔ یہ تہذیب مغربی ایشیا کی ثقافت کے متوازی اوصاف رکھتی تھی کہ جس رنگ میں وہ خود رنگے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مشرق وسطیٰ کے دوروں میں مجھے چند موقعوں پر ان کی رہنمائی سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ انہی سفروں کے دوران، میں نے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا کر یہ محسوس کیا کہ انکی شخصیت پر انکے عہد شباب کے تجربوں اور خاص کر انکی خاندانی روایات کی کتنی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تمام رفقاء اور احباب جانتے ہیں کہ انکی قدرتی گرم جوشی اور سادگی میں حیاداری کس قدر رچی بسی ہوئی تھی۔ ان مرکب اوصاف کے پیچھے ان کے عمیق شریفانہ اطوار کار فرما تھے۔ دراصل وہ ایک احساس فخر بھی رکھتے تھے - جس کا اظہار انہوں نے میرے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے دو موقعوں پر کیا۔ ان میں سے ایک ان طنزیہ الفاظ سے بھی مترشح ہے کہ "میری پرورش و تربیت اونٹ کے کوہان پر ہوئی"

میں نے اس جگہ روایات کے اس پس منظر پر خاص زور دیا ہے جس سے انہیں واقعی دل بستگی تھی۔ دوسرے اصحاب بلا شبہ انکی علمی فضیلت اور مغربی اقدار پر انکی بصیرت کا ذکر کریں گے۔ فی‌الواقعہ انہیں انگریزی زبان اور اپنے علاقے کی زبانوں پر زبردست قدرت حاصل تھی اور وہ غیر معمولی طور پر مغربی ادب کے بھی بلند پایہ نقاد تھے۔

قدرتی طور پر میرے لئے لازم ہے کہ احمد بخاری کے اوصاف و کمال کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے اسے چند لفظوں میں سمیٹ کر یہ بیان کروں کہ ان کی یہ خصوصیات ایک سیاسی سفیر کی حیثیت میں کس طرح ظاہر ہوتیں اور اپنا اثر ڈالتی تھیں - یہ کام میں جیقس برزون (Jacques Barzun) کی تازہ تصنیف دی ہاؤس آف انٹی لیکٹ کا ایک اقتباس پیش کر کے بخوبی انجام دے سکتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔ "حکمت عملی (سفارت) کا تقاضہ ہے کہ دوسروں کے افکار و اذہان سے آگاہی حاصل ہو یہ انشا پرداز کا بھی ایک امتیازی وصف ہے مگر اس سے دوسرے درجے پر کہ وہ دوسروں کے دلائل کا جواب کس ہوشمندی اور واضح استدلال کے ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک 'حاضر دماغ' سفیر اور ایک 'پریشان خیال' سفیر اصطلاح میں ایک دوسرے کی ضد ہیں"

احمد بخاری حقیقت میں ان اوصاف پر پورے اترنے والے سفیر تھے جو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں۔

۲۵ جون، ۱۹۵۹ء

طلوع

محمد طفیل

خبر آئی۔ بخاری صاحب کا انتقال ہوگیا۔ جی ڈوب سا گیا۔ ذہن ماضی کی طرف پلٹا۔ کوئی مجھ سے مخاطب تھا:۔

مشفقی و مکرمی، سلام مسنون!

ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے لاہور ضرور آؤں گا۔ اور منجملہ اور احباب کے آپ سے بھی تجدیدِ نیاز کروں گا۔ لیکن افسوس کہ بوجوہ یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ آج شام واپس یورپ جارہا ہوں۔ اور وہاں سے امریکہ، انشا اللہ!

آپ کے کرم اور بخشش سے آپ کا رسالہ اکثر مل جایا کرتا تھا۔ اور امید ہے کہ آپ کا یہ فیض اب بھی جاری رہے گا۔ البتہ میرا پتہ اب پاکستان مشن نیویارک نہیں بلکہ یونائیٹڈ نیشنز نیویارک ہے۔ سب سے بہتر تو یہ ہو کہ آپ مجھے معرفت مرکزِ اطلاعات اقوامِ متحدہ کراچی کے پتے سے بھجوا دیا کریں۔ محصول میں بھی بچت رہے گی۔ کراچی کا مرکزِ اطلاعات آگے بھیجنے کا خود ہی انتظام کردے گا۔

آپ کی مہربانیوں کا بے حد شکریہ اور کیا عرض کروں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

خاکسار

احمد شاہ بخاری

میرے نام بخاری صاحب کا یہ پہلا خط تھا۔ جو اچانک چلا آیا تھا۔

معاً ذہن پھرکی کی طرح گھومنے لگا ــــ بڑے آدمی کا انتقال ــــ بڑے ادیب کا انتقال ــــ بڑے عالم کا انتقال۔ بڑے مفکر کا انتقال ــــ بڑے مخلص کا انتقال ــــ بڑے حیالے کا انتقال۔

شیطان نے بہکایا ــــ اٹھو اور خراجِ عقیدت پیش کرو۔ پطرس نمبر نکالو۔

فوراً ذہن نے تردید کردی۔ یہ کام نہ کرنا۔ لوگ سو سو باتیں بنائیں گے۔ جتنے ذہن اتنے نتیجے۔ کوئی کہے گا اچھا کام کیا۔ کوئی

لکھے گا۔ یہ تو اسی دن کے انتظار میں تھا۔

بالآخر دل و دماغ نے یہ فیصلہ کیا ـــ اگر تجھے پطرس سے عقیدت ہی ہے تو چپکے سے رو لے اور بس۔

یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ بخاری صاحب کا دوسرا خط میرے سامنے آیا۔ خط کیا خود پطرس نے مجھ سے باتیں کیں :۔

مشفقی و مکرمی۔ سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ۔ پڑھتا گیا خوش ہوتا گیا۔ مگر خط کی آخری تین چار سطریں میرے لیے بہت بڑا سوالیہ نشان بن گئیں۔ ہاں کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ میری تحریر کی کسی جنبش سے اگر آپ کی دل آزاری ہوئی تو مجھے کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔ انکار کرتا ہوں تو نہ یہ خوش مذاقی کی ذیل میں آتا ہے اور نہ شرافت کی ذیل میں۔ اگر آپ دل کو کڑا کر لیں اور میں جو کچھ آپ کی کتاب پر لکھ دوں اُسے قبول کر لیں تو بیشک پروف بھیجدیں۔ میں بخوشی مقدمہ لکھ دوں گا۔

ویسے مقدمہ نویسی میرے لیے ہمیشہ آزمائش کا وقت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس سے اس طرح بھاگتا ہوں جس طرح عورت بچّہ جننے سے۔ مگر کبھی احباب کے کام سے متأثر ہو کر مقدمہ لکھا۔ کبھی احباب کی دوستی کے ڈر سے۔ آپ کس خانے میں جا پڑیں گے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا ویسے میں نے آپ کے دو تین مضمون اس سے پہلے پڑھے ہیں۔ اس لیے جرأت کر کے لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ بدمزہ نہ ہوں۔

میرا یہاں قیام دس پندرہ روز کا ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو۔ پروف بھیج دیجئے۔ ورنہ پھر فرصت کے دن نصیب نہ ہوں گے۔

لاہور کے احباب کو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

خاکسار
بخاری

جس دن بخاری صاحب کا یہ خط ملا تھا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اترا اترا کے میں نے یہ خط اپنے کئی دوستوں کو سنایا تھا۔ مسرتوں کی رات کے ساتھ جلدی جلدی "صاحب" کے پروف تیار کر ڈالے۔ رجسٹری کر کے بھجوائے۔ مگر پروف بھیجنے کے دوسرے دن بخاری صاحب کا ایک اور خط ملا۔ جو بڑا مختصر تھا۔ لکھا تھا :۔

مشفقی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کے پروف اب تک نہ ملے۔ مگر میرے جانے کا وقت آ گیا۔ میں آج ہی ایک لمبے دورے پر جا رہا ہوں۔ نہ جانے امریکہ کب پہنچوں۔

مجھے اس کا افسوس رہے گا کہ میں آپ کی کتاب پر کچھ نہ لکھ سکا۔

خاکسار
بخاری

یہ تینوں خط میرے ذہن پر سوار ہو گئے۔ سوار ہوتے چلے گئے۔

پطرس سے میرا کوئی یارانہ تھا۔ نہ ہی خط و کتابت تھی۔ رتبہ ایک نہ تھا۔ ایک عالم فاضل دوسرا مولوی مطلق۔ ایک بین الاقوامی شہرت کا مالک۔ ایک کنویں کا مینڈک۔ کوئی خوبی، کوئی خرابی میرے اندر ایسی نہ تھی جو پطرس کے دل میں جگہ بناتی۔

خیالات اُمڈتے رہے۔ کئی بیٹھے بٹھائے ___ پطرس نے یوں خط لکھنے میں پہل کی تھی کیوں میری باتیں مانی تھیں۔ یہ جتنا سوچتا، اتنی ہی پطرس کی عظمت میرے دل میں بڑھتی۔

پطرس کی عظمت کے چکر ہی میں لگا تھا کہ ایک بار ذہن پھر پٹڑی سے اُترا۔

سنو میاں! لوگوں کی پروا نہ کرو۔ پطرس نمبر ضرور چھاپو۔ یوں ڈرتے رہے تو زندگی بھر سیتے تا کام نہ کر سکو گے۔

خیالات میں تصادم رہا۔ کبھی یوں۔ کبھی ووں۔

بالآخر جی کڑا کرکے، کچھ نیم دلی کے ساتھ، میں نے پطرس کے دوستوں کی فہرست بنائی۔ خط و کتابت کی۔ اس سلسلے میں میری جتنی مراسلت ہوئی۔ وہ سب یہاں درج کرتا ہوں۔ سوائے ان باتوں کے جو ذاتی ہیں، در اخفائی ہیں۔ میرے خطوں کا مضمون یہ تھا۔ پطرس پہ لکھیے اور ہمیں بتلائیے کہ وہ بہ حیثیت انسان کیسے تھے اور بہ حیثیت ادیب کیا مقام رکھتے تھے۔

بڑے بڑے ادیبوں نے میرے نام ہزاروں خط لکھے ہوں گے۔ جن میں سے کچھ ضائع ہو گئے۔ کچھ کو دیمک چاٹ گئی۔ کچھ ہیں۔ مگر مجھے ان کی اشاعت کا کبھی خیال نہ آیا۔ ان خطوں کو اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے پطرس کی شخصیت کچھ اور نکھرے گی ___ اور پھر معلومات!

یہ خط تبصرے کے بغیر ہی ملاحظہ فرمائیں۔ میرے لیے ابھی اس نمبر کی ترتیب و تدوین کا بہت سا کام باقی ہے۔ ذرا سے کمینٹ بعد اگر کہیں لکھنے کی ضرورت پڑی تو کچھ عرض کر دوں گا۔ ورنہ ضرورت ہی کیا۔

مکرمی طفیل صاحب۔ تسلیم

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں بخاری مرحوم کے چند خطوط ارسالِ خدمت ہیں۔ میرے نام اُن کے بیشتر خطوط ایسے ہیں جنھیں بہت زیادہ ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے مقابلتہً زیادہ دلچسپ اور مجھے زیادہ عزیز وہ خطوط ہیں جو مجھ میں اُن میں کوئی کشیدگی پیدا ہو جانے کے بعد اُنھوں نے مجھے لکھے۔ لیکن اُن میں بعض دوسرے دوستوں کا تذکرہ اور اُن کے طرزِ عمل پر بے تکلفانہ اس قسم کی رائے زنی ہے جسے کسی رسالے میں چھپا ہوا دیکھنا شاید انھیں مرغوب نہ ہو۔ اس لیے انھیں شائع کرنے کے لیے دینا مجھے قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ پھر کئی خطوط میں جابجا اس قسم کے حوالے اور اشارے ہیں۔ کہ جب تک اُن کی مکمل تشریح نہ کی جائے کسی کے پلّے کچھ نہیں پڑ سکتا۔ اور اُن حوالوں اور اشاروں کی تشریح لکھنا آسان کام نہیں۔ اس لیے تعمیل ارشاد میں چند ایسے خط بھیجنے کے سوا چارہ نہیں۔ جو مکمل کے مکمل یا بہت تھوڑی سی قطع و برید کے بعد عام دلچسپی کے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے خطوط بھی۔ زیادہ احتیاط سے نہ رکھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جو اس وقت مل گئے، ارسالِ خدمت ہیں۔

ان خطوط کے ساتھ چند ایسے مضامین بھی بھیج رہا ہوں۔ جو ادبی رسائل پڑھنے والوں کی نظر سے شاید نہ گزرے ہوں۔ اس قسم کے کئی مضامین یوں لکھے گئے تھے کہ بخاری صاحب حسبِ معمول مجھے اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانے کے لیے آئے۔ دیکھا کہ اخبار کا کاتب انتظار میں بیٹھا ہے۔ اور میں اُس کے لیے مضمون لکھنے کے تردد میں دفتر سے نہیں اُٹھا۔ میری امداد کے لیے سمجھیے یا جلد از جلد اپنے ساتھ لے چلنے کے خیال سے انھوں نے مجھے تیار ہونے کے لیے گھر میں بھیج دیا۔ اور میری بجائے خود مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ میں شیو غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اور کپڑے بدل کر واپس آیا تو تیار مضمون میرے حوالے کر دیا۔ ایسے مضامین جو قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور ایک ایسے مضامین ہی کیا۔ جو مضمون بھی لکھنے بیٹھ جاتے۔ اُسے عموماً ایک ہی نشست میں ختم کر کے اُٹھتے تھے۔ عبارت کاٹتے چھانٹتے بھی نہ تھے۔ البتہ لکھنے کے بعد مضمون پڑھوا کر سنتے ضرور رہتے۔ اگر اس میں کہیں کوئی لفظ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو کبھی نہ بھولتے۔ مضمون سننے کے بعد وہ لفظ بدل دیتے۔ مگر ایسی تبدیلیاں اتنی کم ہوتی تھیں کہ مسودہ نقل کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوتی تھی۔

تہذیبِ نسواں اور پھول میں نہ جانے اُن کے کتنے مضامین اسی طور چھپ گئے۔ بعض تو پطرس کے نام سے مضمون زیادہ خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ تو کسی اور فرضی نام سے۔ "رونا رلانا" اسی قسم کے مضامین میں سے ایک ہے۔ نظم "دلی کی سیر" انھوں نے پھول کے کسی سالگرہ نمبر کے لیے لکھی تھی۔ اخبار میں نظموں کی کمی تھی انھیں اسی قسم کی کوئی انگریزی نظم یاد آئی۔ اُسے ذہن میں رکھ کر ذرا سی دیر میں یہ نظم کہہ ڈالی تھی۔

"کاغذی روپے" کا مضمون بچوں کے لیے اقتصادیات کی ایک کتاب کا باب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مجھے بتائے بغیر دارالاشاعت پنجاب لاہور کو عنایت فرمانے کے لیے لکھنی شروع کی تھی۔ ایک روز اس کے دو تین باب لے کر میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے ارادہ تھا کہ کتاب ختم کر کے چھاپنے کے لیے تمھیں دوں گا۔ مگر بعض دوسری اہم مصروفیتیں نظر آتی ہیں۔ نہ معلوم ان سے کب فراغت ہو۔ اور جب فراغت ہو تو کتاب ختم کرنے کا جوش باقی رہے یا نہ رہے۔ یہ چند باب GETTING OUR LIVING کو سامنے رکھ کر از سرِ نو لکھے گئے ہیں کتاب اب خود مکمل کر لو۔ یہ کتاب میں اب تک مکمل نہیں کر سکا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ اسے مکمل کرنے کی ضرورت اب تک محسوس نہیں ہوئی۔ اب پہلی فرصت میں اسے مکمل کر ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے دارالاشاعت پنجاب کے اکثر مشاغل میں وہ مخلصانہ ہمدردی کے ساتھ میرے شریک رہتے تھے۔ ایک بار مجھے تہذیبِ نسواں۔ پھول اور دارالاشاعت پنجاب کی مطبوعات کے پوسٹر تیار کرتے دیکھا۔ تو اگلے روز خود تین پوسٹروں کا مضمون تیار کر کے لے آئے۔ اُن کی عبارت بھی ارسالِ خدمت ہے شاید آپ کے قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہو۔ مثلاً ——— "عورتوں اور بچوں کے لیے مردوں اور عورتوں کے لیے

بڈھوں اور بچوں کے لیے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

سب کے لیے

بہترین کتابوں کا ذخیرہ
دارالاشاعت پنجاب لاہور
۱۹۔ ریلوے روڈ لاہور
تصنیف یا ترجمہ مصنف ہو گزند بیاں
ظاہری نفاست کے ہم ذمہ دار ہیں
اور باقی چیزیں خود تجویز

باقی بخاری پر مضمون لکھنے کے لیے صحت فی الحال کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ اُن کے میرے تعلقات ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئے تھے: جس وقت وہ نئے نئے پشاور سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تھے۔ اس زمانے میں اُن کی شخصیت کی رعنائی بقول بیدل مرحوم کے اُن کی بدرستے تعلق رکھتی تھی۔ ۱۹۳۵ء تک سے کم دن ایسے گزرے ہونگے کہ وہ اور میں بورڈ میں جس اور جانے سے بہت رات تک کا وقت اکٹھے نہ گزارا ہو۔ البتہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے تو ملاقاتوں کی صورت کچھ اور ہو گئی۔ لیکن تقریباً سترہ اٹھارہ سال کا زمانہ جو لاہور میں اکٹھا گزرا۔ اُس کی مکمل داستان بیان کرنا کچھ آسان نہیں گھومنا پھرنا۔ کھانا پینا۔ دلچسپیاں۔ تفریحیں۔ ملاقاتیں سب کچھ تھا۔ مختلف مشاغل کے دور آئے اور گزر گئے۔ کئی جنون سر پر سوار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ وقت اور واقعات نے عجیب عجیب تماشے دکھائے۔ اتنے لمبے ساتھ میں سے چند باتیں چن کر لکھنا دوستی کی داستان سے بے انصافی معلوم ہوتی ہے۔ سوچتا بھی ہوں تو خیال ساتھ نہیں دیتا۔ کچھ سوجھتا ہے تو لکھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ دل البتہ یہ ضرور کہتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے گا کہ اپنے اور بخاری کے تعلقات پر کچھ لکھنے بیٹھوں گا تو بھولے بسرے واقعات آپ سے آپ زندہ ہو کر سامنے آجائیں گے۔ اُن محفلوں اور صحبتوں کی دھندلی سی تصویر کھینچ سکوں گا۔ جن کی جان بخاری تھے اور تناسب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرحوم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا دشوار کام اس حد تک سر انجام دے لوں گا کہ جو لوگ انھیں نہ جانتے تھے انھیں عہدِ حاضر کی اس عدیم المثال شخصیت کی دلکشی اور رعنائی اور رعنائی کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو جائے گا۔

خاکسار
(سید امتیاز علی تاج)

ہیگ - ۱۵ / جون ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

حقیقت یہ ہے کہ بخاری کی ذہنی پرواز مجھ جیسے "زمین پیماؤں" کی نظروں سے بہت بلند تھی۔ میں اس موضوع پر کچھ لکھنے کا اہل نہیں لیکن تعمیلِ ارشاد میں چند سطریں گزارش خدمت ہیں۔ ممکن ہے آپ انھیں قابلِ التفات پائیں۔

بخاری کے خط تو میرے نام بہت سے آئے خصوصاً اس زمانہ میں جب وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ تھے لیکن میں جواب دینے کے بعد خط تلف کر دیتا ہوں اس لیے افسوس ہے اب میرے پاس ان کا کوئی خط محفوظ نہیں۔ والسلام

خاکسار
(سر ظفر اللہ خاں)

UNITED NATIONS – NATIONS UNIES
NEW YORK

PU 113 (4,

26 June 1959

Dear Mr. Tufail,

Thank you for your letter and for your thoughtfulness in asking me to write a few words about Ahmed Bokhari.

It was a pleasure for me to accede to your request and I send you my contribution enclosed.

Yours sincerely

Dag Hammarskjold
Secretary-General

نقوش ——— ۱۱ ——— پطرس نمبر

PAKISTAN MISSION TO THE UNITED NATIONS

PAKISTAN HOUSE
12 EAST 65th STREET
NEW YORK 21, N. Y.

AD 64-59 16 June 1959

Dear Sir·

Your letter of 13th May, 1959 addressed to the Ambassador of Pakistan in Washington. D.C. has been forwarded to us for disposal.

We have sent you by separate post copies of Professor Bokhari's speeches listed below :-

1) The Tunisian Question
2) Speech on South Africa, delivered before the Ad Hoc Political Committee of the U. N. General Assembly on November 13, 1952.
3) Keynote address delivered to the model General Assembly held at Barnard College on April 7, 1952.

Very truly yours,

Riaz Piracha
First Secretary

برادرم طفیل صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا ۲۴ اپریل کا خط عمان ہوتا ہوا نیویارک میں ملا۔ میرا کام عمان میں ۱۵ اپریل کو ختم ہو گیا تھا۔ وہاں سے براہ لندن اپریل کے آخر میں نیویارک اپنے مستقر پر واپس آ گیا۔ لندن انڈیا آفس لائبریری میں اس مرتبہ متعدد کوششوں کے بعد مولانا آزاد کے سنٹرل ایشیا اور روس کے سفر کے حالات مفصل مل گئے۔ اب ان کا یہ سیاسی مشن ایک مستقل مقالہ بن سکتا ہے۔ میں نے اس پر کام شروع کر دیا ہے۔ اور انشاء اللہ اگست تک اسے مکمل کر لوں گا۔

پروفیسر بخاری کی تقریریں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے ۱۹۵۴ء میں ختم ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ اقوام متحدہ کے انڈر سکرٹری ہو گئے تھے۔ اور جو انھوں نے کہا وہ محکمے کے لیے کہا۔ البتہ ان کی ایک تقریر جو سان فرانسسکو میں ہوئی تھی لاجواب تھی۔ میں اس کی نقل آپ کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر صرف یہی شائع ہو جائے تو سب سے عمدہ رہے گی۔ جو تقریریں انھوں نے پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے کی انھیں بھی جمع کر رہا ہوں۔ مگر اس میں ذرا دیر لگے گی۔ بہرحال پطرس نمبر کے لیے یہ مواد اچھا ہے۔ نیویارک ٹائمز نے ان کی وفات پر جو افتتاحیہ لکھا تھا اسے ضرور شائع کیجیے۔ اس کی نقل USIS کے لاہور کے دفتر سے مل سکتی ہے۔ مرحوم کا سامان سنا ہے کہ واپس پاکستان چلا گیا۔ آپ ان کے صاحبزادے یا ان کی بیوی سے مل کر دریافت کیجیے کہ سامان میں تقریروں کے مسودے آئے ہیں یا نہیں۔ یہ مسودے بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ ان کی اپنی تصاویر کا البم نہایت مکمل تھا۔ اس سے بھی آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سنا ہے کہ یہ اپنی سوانح عمری بھی لکھ رہے تھے۔ خدا جانے اس کا مسودہ سامان کے ساتھ گیا ہے یا نہیں اس کے متعلق ضرور دریافت کیجیے۔ اور پھر مرحوم کے ذاتی خطوط بے شمار ہیں۔ ان کا آخری خط جو مرنے سے ایک ہفتہ قبل انھوں نے مجھے لکھا تھا۔ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ آپ نے غالباً ماہِ نو کے جنوری ۱۹۵۹ء نمبر میں پطرس پر میرا مضمون پڑھا ہو گا اس میں بھی میں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔

خاکسار

(آغا محمد اشرف)

VICE-CHANCELLOR
B. A. HASHMI, M.A., M.ED., Ed.D.

UNIVERSITY OF KARACHI
KARACHI

حضرت سلامت

آپ کا والا نامہ اور بعد ازاں نقوش وصول ہوئے۔ شاید کوئی پندرہ بیس سال ہوئے قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پھر توفیق ہی نہ ہوئی کہ اسے سنبھالوں۔ بہرحال اب تو کوشش کروں گا کہ ایک آدھ صفحہ خدمت عالی میں ارسال کروں۔

پچھلے چند ماہ سے مصروفیات بہم اور مسلسل ہیں اور یہ سلسلہ ابھی باقی ہے۔ گزارش رسمی نہیں واقعہ ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے کچھ نہ کچھ ارسال کرنے کی کوشش کروں گا۔ آخری تاریخ سے مطلع فرمائیے کہ وہ پیش نظر رکھوں۔

میرے پاس خط ہوتے تو کبھی کے پیش خدمت کر دیتا۔ میں خط پڑھنے کے بعد چاک کر دینے کی عادت کا شکار ہوں۔ ڈاکٹر اقبال اور قائد اعظم کے خطوط بھی اسی بے پروائی کے باعث ضائع کر دیئے میری بے ڈھنگی۔

(محمد بشیر ہاشمی)

UNITED NATIONS — NATIONS UNIES

کراچی - ۲۶ - مئی ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ سلام نیاز۔ گرامی نامہ اور "نقوش" کے دو شمارے بھی۔ "نقوش" کے لیے لکھنے میں آپ کے ساتھ "مراسم کی کمی" حائل نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صحافی قسم کی انشاپردازی سے تائب ہو چکا ہوں — بخاری مرحوم کے بارے میں آپ کی یا کسی اور کی فرمائش پر جو کچھ لکھوں گا۔ اس کی قیمت صحافت نگاری سے زیادہ کیا ہوگی؟ "عالمانہ" مضمون لکھنے کے لیے وقت درکار ہے۔ اور عالمانہ مضمون لکھنے کے قابل بھی خود کو نہیں پاتا ہوں۔ اس لیے معذرت قبول فرمائیے۔ آپ کی عالی ہمتی کا ہمیشہ قائل رہا ہوں کیونکہ "نقوش" جیسا رسالہ اس باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہنا، اپنے آپ پر ہزار جبر کے مترادف ہے!

والسلام

آپ کا مخلص

(ن۔م۔ راشد)

طفیل صاحب۔ تسلیم

یہ قطعی زیادتی ہے کہ آپ مجھ سے زبردستی مضمون لکھوا ہی لیتے ہیں۔ میں پطرس کو بہت ہی کم جانتی تھی۔ مگر اس پر بھی آپ نے پطرس پر لکھنے کے لیے جواز نکالا۔ میرے پاس جو کچھ تھا بلا سوچے سمجھے لکھ دیا ہے۔ آپ جانیں۔

شاہد عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ آج تک نقوش کے جتنے نمبر نکلے ہیں۔ یہ طفیل صاحب سے منگواؤ۔ مجھے یہ فرمائش کرتے، تکلف سا ہوتا ہے۔ جس پر شاہد کو اور بھی جلن ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا شاہد کی اس ہٹ دھرمی کے بارے میں؟

اچھا ایک مہربانی کیجئے کہ نقوش کا ایک پرچہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیج دیں۔ میری جانب سے،

(عصمت چغتائی) خاک رعصمت۔

کراچی

۸۔ جون ۵۹ء

عزیزم طفیل صاحب

پطرس پر ابھی میں نے مضمون مکمل نہیں کیا۔ اور آپ ہیں کہ حسب معمول ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، اور اپنے تاکیدی خطوں سے حواس مختل کیے دیتے ہیں۔ بقیا مضمون آپ کو ۲۵-۳۰ جون سے پہلے نہیں مل سکتا۔ پچھلے ایک مہینے سے میری صحت اچھی نہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ مگر مرحوم سے جو عقیدت مجھے عمر بھر رہی ہے، وہ مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ ان دنوں میں کہاں اور لکھنا کہاں، لہذا صبر کیجئے، یا پھر جی کڑا کر کے اپنی سکیم سے نکال دیجئے۔

آپ کا

(غلام عباس) عباس

کراچی

۱۸ر جولائی ۵۹ء

محترمی۔ تسلیم

۱۔ مجھے افسوس ہے کہ مرزا محمد سعید صاحب سے پطرس کے متعلق مضمون حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بہت ضعیف ہیں اور ان سے اصرار کرنا اچھا بھی نہیں لگتا۔ ان کے پاس پطرس کے خط بھی محفوظ نہیں ہیں۔ آمنہ مجید ملک کے نام یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اگر پطرس نمبر کی ترتیب

مکمل نہ ہو گئی ہو تو شامل کر لیجئے۔

۲- پطرس نے [illegible] کے انتقال کے موقعے پر انگریزی میں ایک مضمون ان کے متعلق دہلی کے انگریزی اخبار Statesman میں لکھا تھا۔ وہ مضمون انگریزی میں ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے کہیں سے وہ حاصل کریں تو اس کا ترجمہ چھپ سکتے ہیں۔ اس کے لیے دلّی خط لکھنا پڑے گا کہ statesman والے ۴۸ء کے فائل نکال کر اس میں سے وہ مضمون تلاش کریں۔ مجھے اس کی تاریخ اشاعت یاد نہیں۔ سٹیٹسمین کے نمائندے جو کراچی میں رہتے ہیں آجکل یہاں موجود نہیں ورنہ میں ان سے کہتی۔

پطرس نمبر کب تک نکل رہا ہے؟ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص
قرۃ العین
(قرۃ العین حیدر)

کراچی
۲۹ مئی ۱۹۵۹ء

محترمی، سلام مسنون۔ حسب فرمائش بخاری مرحوم کا خط ملفوف ہے جس ملاقات کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ جب میں نے دیار غیر میں ان کی موت کی خبر سنی تو سناٹے میں آ گیا۔ ایسے دانائے راز اور زندہ دل صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مستدعی ہوں کہ یہ خط مجھے واپس بھیج دیا جائے۔ خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

مخلص
ہاشم رضا
(سید ہاشم رضا)

باسمہ سبحانہٗ

برادر مکرم، تکلیف فرمائی کے لیے شکریہ۔ میں نے گزشتہ دس روز میں دو دفعہ آپ کے ادارہ فروغ اردو کی زیارت کی۔ آپ نہ ملے اور مایوس پھر آیا۔

پطرس کے متعلق میری معلومات زیادہ نہیں۔ اگرچہ ابتدا ہی سے خاص تعلق رہا۔ فی الحال وعدہ نہیں کرتا۔ ذرا فوری کاموں سے فارغ ہو جاؤں تو سوچوں گا۔

ہاں بھائی! غالباً مولوی عبداللہ قریشی نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ آپ کے بچے کو کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ میرے جانے کا مقصد یہی تھا کہ اس کے متعلق پوچھوں۔

ملاقات کو بہت دن ہو گئے۔ یہ دعوتِ تکلف نہیں محض اظہارِ آرزو ہے۔

آپ کا
(غلام رسول مہر)

ذکاء اللہ روڈ - یونیورسٹی علی گڑھ

۲ جولائی ۱۹۵۹ء

مکرمی تسلیم

نقوش کے پطرس نمبر کے لیے مضمون کا تقاضا موصول ہوا تھا۔ جو کچھ بن پڑا لکھ ڈالا ہے۔ دو چار دن میں مکمل کر کے ٹائپسٹ کو دے دوں گا۔ اس میں شاید آٹھ دس دن اور لگ جائیں۔ اندازہ ہے کہ یہ مضمون کم و بیش ۸ — ۱۰ صفحے آپ کے رسالے کے لے گا۔

امید ہے آئندہ آپ مضمون کے لیے اس طرح اصرار نہ فرمایا کریں گے۔ مضمون وغیرہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی صورت حال کیا کم تکلیف دہ ہے کہ دوستوں اور عزیزوں کی فرمائش نہ پوری کرنے پر اپنے اوپر نفرین کرنے کا فرض بھی ادا کرنا پڑے۔

یہ نمبر بھی (طنز و مزاح نمبر) اپنے پیشروؤں کی طرح حسب توقع خاطر خواہ ہوا۔ خاص نمبر شائع کرنے میں آج شاید آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ آپ یقیناً اپنے [illegible] کارناموں پر فخر کر سکتے ہیں اور ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب

(رشید احمد صدیقی)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

۴ جون ۱۹۵۹ء

پیارے طفیل۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں پطرس کے مضامین پر ایک مختصر سا تبصرہ حاضر ہے۔ ایک اور مضمون میر پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے جواب میں بھی تیار ہے۔ اگر تم چھاپنا گوارا کرو تو وہ بھی بھیج دوں۔ مگر طویل ہے اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے متعلق میری تردید میں ہے۔

میں بہت بیمار رہتا ہوں اور موت کا منتظر۔ خدا تم کو سلامت اور شاد کام رکھے۔ والسلام

تمہارا اثر (اثر لکھنوی)

برادرم، تسلیم وغیرہ

آپ کے خط کا جواب دینا ضروری تھا۔ آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ میں سید ذوالفقار بخاری کے پاس گیا۔ ان سے وعدہ لیا۔ اور وعدے کے علاوہ ایک تصویر بھی حاصل کر لی۔

آپ غالباً مایوس ہو چکے ہوں گے اور میری اس خاموشی کو طرح طرح کے معنی پہنا رہے ہوں گے، مگر میں بڑے بخاری پر ان کے شایان شان چیز لکھ رہا ہوں۔ جو آپ کو امروز فردا میں مل جائے گی۔

طفیل! خدا کی قسم اب اس سرد جنگ سے جی گھبرا گیا ہے۔ جو میرے اور تمہارے درمیان جاری ہے

اس مئی و نمبر جلد برقرار رکھتے ہوئے کوشش کر رہی ہے۔ [illegible] نسبت کو ہو سکے تو
کو ختم کر دو۔ [illegible] سے [illegible]

[illegible] صاحب کا مضمون اور [illegible] مضمون طبع ہوں گا اور [illegible]

باہمہ
شوکت تھانوی
شوکت

اے طفیل صاحب!

یہ نقوش۔ پطرس پہ مضمون حاضر ہے۔ مضمون ہے۔ پیرومرشد [illegible] کی یاد میں۔ اس لیے نہ
رہا کہ یہ مرحوم کے [illegible] یہ مضمون کا عنوان ہے۔ نقوش پہ سینکڑوں مضامین لکھے جائیں گے لیکن بس
مضمون میں آپ کو چند نئی باتیں اور واقعات ملیں گے تفصیل ارسال حسب معمول دیر سے کر رہا ہوں امید ہے
حسب سابق آپ فراخدلی سے معاف کر دیں گے۔

نقوش کا طرز و انداز مجھے بہت پسند آیا کارٹون اس نمبر میں چھاپے جا سکتے ہیں۔ مجھے یہ
کارٹون اتنا پسند آیا۔ کہ ہر واقف نا واقف کو دکھاتا پھرتا ہوں۔ میری طرف سے کارٹونسٹ کو مبارکباد
دیجئے۔ اور اس کا نام اور پتہ بھی تحریر فرمائیے۔ بخدا یہ شخص لائق قدر فن کار ہے۔

مضمون کی رسید سے مطلع فرمائیے گا۔ خطوط کا جواب نہ دینا یا بہت دیر سے دینا میری پرانی
عادت یا خباثت ہے۔ مجھے آپ کے خط مل گئے تھے۔ طویل اور مجرمانہ خاموشی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

"آج کل" دہلی میں میرا ایک مضمون "پطرس" پر چھپا تھا۔ افسوس کہ وہ میرے پاس نہیں۔ لاہور کی
رہ گیا تھا۔ اگر کسی لائبریری سے (جہاں کہ آجکل کی پرانی فائلیں ہوں) پتہ کریں تو شاید مل جائے
ویسے عرش ملسیانی حال چیف ایڈیٹر "آجکل" آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔ اگر انھیں لکھیں۔ تو
پرانی فائل میں سے یہ مضمون نقل کروا کر آپ کو بھیج سکتے ہیں مضمون برا نہیں تھا۔ پطرس نے اسے
خود سراہا تھا۔

(کنھیا لال کپور) کنھیا لال کپور

۴/۳ بلاک II سی۔ ناظم آباد۔ کراچی
۲۴۔ مئی ۵۹ء

بھائی طفیل صاحب۔ السلام علیکم

مئی کا نقوش ملنے کے بعد۔ آپ کو کئی خط لکھے۔ مگر یقیناً ان میں سے کوئی بھی آپ کو نہ ملا ہوگا
کیونکہ ان میں سے کوئی بھی یہاں سے روانہ نہ ہو سکا۔

خیر وہ سب خط آپ کو ایک ساتھ بھیجے دے رہا ہوں :-

نمبر ایک مؤرخہ بارہ مئی نقوش ملا۔ برابر لکھتے رہنے کا وعدہ۔ لاہور آنے کا ارادہ
نمبر دو " سترہ مئی پطرس نمبر۔ اس کے لیے لکھنے کا ارادہ
نمبر تین " ۲۲ مئی مضمون حسب ذیل

میں اردو کے مزاحیہ نگاروں پر لکھ رہا ہوں۔ ایک مضمون مزاح اور مزاحیہ نگاری لکھا۔ وہ "ماہ نو" والے خدا ان کو نیک ہدایت دے دبائے بیٹھے ہیں۔ دوسرا [illegible] غالب کا مزاح شروع تو ہو گیا مگر ختم ہونے کو نہیں آتا۔ تیسرا مضمون "پطرس کا ہیومر" غالب والے مضمون کو چھوڑ کر اسے پہلے لکھ ڈالا تاکہ پطرس نمبر میں آ سکے۔ اب آگے آپ جانیں آپ کا کام جانے!

مضمون منسلکِ دستاویز ہذا ہے۔ فقط
محمد احسن فاروقی
(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)
از وزیر کوٹ سرگودھا

۸ جون

محترمی طفیل صاحب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ تاخیر سے جواب دے رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔
دراصل اس دوران میں آپ ہی کے لیے مضمون حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ لاہور میں بڑی کوشش کے باوجود ایڈیٹر راوی سے مطلوبہ مضمون حاصل نہ کر سکا کیونکہ وہ خود پطرس نمبر نکالنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

اب صورت یہی باقی ہے کہ کوئی تازہ مضمون لکھ دوں۔ اگر آپ مجھے دس بارہ روز کی مہلت دے سکیں تو توقع ہے کہ سبکدوش ہو سکوں گا۔ دوسری طرف اگر آپ کو ضروری مضامین مل گئے ہوں اور آپ کا پرچہ اس سے قبل ہی آ رہا ہو تو پھر آپ میرے مضمون کی شمولیت کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں۔ آخر اس سے فرق ہی کیا پڑے گا؟

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

مخلص
وزیر آغا
(ڈاکٹر وزیر آغا)

مکرمی!

پطرس پر مضمون آپ کو پسند آیا، غنیمت ہے میں نے بڑی تکلیف میں اس مضمون کو لکھا ہے۔ سانس کی تکلیف الگ تھی اور خون کا دباؤ جدا، جواب بھی ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ عبد المنعم سعیدی میرے ایک دوست تھے جو حال میں کراچی پہنچ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انھوں نے آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا جب تھوڑا سا چلا تو مجھے بھی شریک کر لیا اور ہم دونوں نے لشتم پشتم اسے ختم کر کے چھپوا ڈالا، غلطیاں خاصی تھیں۔ اس پر

محمد دین تاثیر نے ایک سخت تنقید کی جو مخزن (جسے حفیظ نکالتے تھے) میں چھپی۔ میں نے اس کا جواب
لکھا تو پنجاب کے پرچوں نے تاثیر کے خلاف ہونے کی وجہ سے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ انھیں
دنوں یو پی سے ایک نیا پرچہ نکلا تھا اس میں یہ جواب میں نے چھپوا دیا جو جواب کم اور سب و شتم
زیادہ تھا۔ اس پر محمد دین بھڑ گئے۔ انھیں دنوں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ غنچۂ تبسم شائع ہونے لگا
تو میں نے اس مضمون کو بھی اس مجموعہ میں شریک کر دیا اور عبدالمنعم سعیدی نے اس کتاب کے مقدمے میں
بعض چوٹیں بعض لوگوں پر کیں۔ اتفاق سے انھیں دنوں میری خط و کتابت پطرس سے ہوئی تو انھوں
نے اس قصّے کو چھیڑا میں نے اعتراف کر لیا کہ غلطیاں واقعی خاصی ہیں اور اگر ان غلطیوں کی فہرست وہ
بنا دیں تو میں آئندہ اس میں ترمیم کروں گا، چنانچہ پطرس نے بڑی مہربانی سے اصل ڈرامے سے
اس کا مقابلہ کر کے ایک ضخیم فہرست ان غلطیوں کی بنا دی اور مشورہ دیا کہ اب اس کا دوسرا
اڈیشن نکالنے کے بجائے اس کے نام اور ذرا سے کردار بدل کر "اُڑا دو" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تھا
غنچۂ تبسم پر مقدمۂ تعارف' وغیرہ کئی ایسی چیزیں تھیں انھیں دیکھ کر ڈاکٹر تاثیر نے تبسم وغیرہ
چند احباب کو ساتھ لے کر غنچۂ تبسم پر ایک مضمون لکھا جو اس کی مخالفت میں تھا۔ یہ مضمون نیرنگ خیال
میں "نیازمندان لاہور" کے نام سے طبع ہوا۔ میرا خیال یہی تھا کہ پطرس اور سالک بھی اس میں شریک
ہیں مگر پطرس نے مجھے لکھا کہ میں اس مضمون سے واقف ضرور ہوں اور اس کی تحریر کی اطلاع مجھے ضرور
تھی مگر اُس کے لکھنے میں شریک نہیں ہوں'

یہ ایک ہی مضمون میرے اور غنچۂ تبسم کے خلاف "نیازمندان لاہور" کے نام سے چھپا ہے۔ اب
نہ تو یہ مضمون ہی میرے پاس ہے اور نہ اس کا سنہ ہی یاد ہے چونکہ اس کا جواب لکھ کر میں نے نیرنگ خیال
میں چھپوانا چاہا اور نیرنگ خیال نے اس کے چھاپنے سے انکار کر دیا اس لیے میں نے نیرنگ خیال میں
لکھنا انتقاماً چھوڑ دیا۔

احمد جمال پاشا نے حال ہی میں پطرس پر ایک مضمون قومی زبان کراچی میں لکھا ہے جس میں
انھوں نے غنچۂ تبسم کے خلاف نیازمندان لاہور والے مضمون کو پطرس کا بتایا ہے' چونکہ خود پطرس
نے مجھے لکھا تھا کہ اس سازش میں وہ شریک نہیں ہیں اس لیے میں نے اس مضمون کو پطرس کے
مضامین میں شمار نہیں کیا۔

آپ کا

تمکین کاظمی

(تمکین کاظمی)

مکرمی طفیل صاحب، سلام مسنون

میں سرکار کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نقوش برسوں سے خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور خاص نمبر نکالنے میں بڑے بڑے رسالوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ایک نمبر میری تجویز پر ترتیب دیا جائے اور وہ نظم نمبر ہو اور اس میں ساری دنیا کی بہترین نظمیں ہوں۔

میں پطرس نمبر کا ٹائیٹل ضرور بنا دوں گا۔ آپ سے بھی تعلق خاطر ہے اور پطرس سے بھی زندگی بھر کا ساتھ تھا۔ ہو سکا تو مضمون[1] بھی لکھ دوں گا۔ مگر ادھر میری کچھ دنوں سے طبیعت بڑی خراب ہے۔

آپ کی نوازش کا شکریہ ——— کہ آپ ہر موقع پر مجھے بھی یاد رکھتے ہیں اور ہمارے لیے آپ کے رسالے ادبی سرمایہ ہیں جو ہم حاصل کرتے ہیں۔

آپ کا
[دستخط]
(عبدالرحمٰن چغتائی)

خطوط پڑھ لیے آپ نے، اچھا ہوا۔ نہ چھپنے سے ان کا چھپنا بہتر ہی ہوا ہو گا۔ وہ باتیں جو ان کی عدم اشاعت کے باعث معلوم نہ ہوتیں اب آپ کو معلوم ہو گئیں۔ اگر آپ نے ان خطوط کی اشاعت سے کچھ پایا ہے تو میں سرخرو، ورنہ مجرم تو ہوں ہی۔ یہ اعزاز مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔

مرحوم کے کئی قریبی دوست لاہور میں تھے۔ ان سے خط و کتابت نہیں ہوئی۔ باتیں ہوئی ہیں۔ ایک دو تحریریں خط کی صورت میں ملی تھیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ان حضرات سے جو جو باتیں ہوئیں۔ وہ اس نمبر کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔ مشوروں کی صورت میں، تحریر کی صورت میں تکمیل کی صورت ہیں۔

اس پرچے کی ابتدا پطرس پر شخصی نوعیت کے مضامین سے ہوتی ہے۔ ان مضامین پر الگ الگ لکھنا طوالت کا باعث ہو گا۔ ویسے اس حصہ میں کوئی بھی مضمون ایسا نہیں۔ جو محض مضمون ہو اور کچھ نہ ہو۔ ان میں سے ہر مضمون میں پطرس سے ملاقات ہوتی ہے ——— مرحوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ——— اور یہ بھی کہ مرحوم احباب سے ہمکلام ہیں اور احباب مرحوم سے ——— اس سے زیادہ مضمون اپنا کرشمہ کیا دکھا سکتے تھے۔

اس کے بعد پطرس کے فن پر چار ہلکے پھلکے مضمون ہیں۔ اس حصہ کو ہم نے جان بوجھ کر بھاری بھر کم نہیں بنایا۔ اس لیے کہ مرحوم کے فن پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اصل میں ہم چاہتے ہی نہ تھے کہ جو کام آئندہ ہو سکتا ہو۔ اُسے بھی آج کر کے اپنے کام کو اور بڑھالیں۔ ہم نے اپنے ذمہ وہ کام لیا۔ جو آئندہ چل کر مشکل ہو جاتا۔ پھر بھی مرحوم کے فنی محاسن پر یہ مضامین کارآمد ہیں اور اس نمبر میں ان کی اسی حد تک ضرورت تھی۔

یہاں تک تو جو کچھ پیش کیا گیا۔ وہ یا تو مرحوم کی شخصیت پر تھا یا فن پر۔ اب مرحوم کے فن پاروں کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدا

---

[1] (چغتائی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکے۔ مگر انھوں نے پطرس کی شخصیت اور فن کو اپنے لازوال خطوط کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے۔ نقوش کا سرورق چغتائی صاحب ہی کی اعجاز کاریوں کا شاہکار ہے۔)

مرحوم کی منظوم تخلیقات سے ہوئی۔ مرحوم نے اردو میں بھی شعر کہے، فارسی میں بھی، کہا بہت کچھ، مگر شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ کہا اور ضائع کر دیا۔ بعض شعری کارنامے صرف تفریحِ طبع کا سامان تھے اور بس۔ چند ایک چیزیں جو محفوظ ہو گئیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم اردو سے زیادہ اچھے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بیدل شاہجہانپوری مدیر مخزن نے ۱۹۲۲ء میں لکھا تھا:

> ایک عزیز زبانِ خوش نوا کا ہم صفیرانِ عجم ہونا اور اجنبی۔ سمجھا جاتا اگر آئینہ حیرت ہے تو یہ نظر قطعاً مستحق ہے کہ معجزۂ ادب کہی جائے۔ سید احمد شاہ بخاری میرے جذباتِ دوستی کی آرزو اور اعترافِ قابلیت کا ایمان ہیں۔ اس لیے بجائے حقیقت نمائی کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اربابِ کیف کے ذوقِ سلیم کو دوبارہ اس شعر کے تارِ لطیف سے متوجہ کروں ؎

نشانِ سجدہ کام اہلِ نظر را آستاں باشد

کہ زیرِ سجدہ ہائے شوق می آں آستاں گم شد

منظومات کے بعد وہ تمام مضامین پیشِ خدمت ہیں۔ جو مرحوم کا زندگی بھر کا سرمایہ ہیں۔ انھیں یکجا اور اکٹھا کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ اس لیے کہ آج کسی بھی لائبریری میں اچھے اچھے رسالوں کی بھی جلدیں محفوظ نہیں۔ ہم نے پہلے تو لائبریریوں سے مواد حاصل کیا۔ مگر وہ بسلسلۂ پطرس ایسا وقیع نہ تھا جو آپ حضرات کے سامنے پیش کر سکتے۔ چنانچہ ذاتی لائبریریوں کی خاک چھانی بھی، چھانی بھی۔ لاہور میں بھی، لاہور سے باہر بھی۔ اس کام کے سلسلے میں سیلاب سے بھی واسطہ پڑا۔ کہیں اٹکے، کہیں بھٹکے، کہیں پھسلے، کہیں تیرے۔ غرض جیسے بھی بن پڑا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہم مرحوم کی اس سے بڑی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے ان کے تقریباً سارے کام کو یکجا کر دیا ہے۔ ورنہ قارئین کے ذہن میں تو مرحوم کی بس ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ساری چیزیں مرحوم کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف مزاح نگار نہ تھے۔ بلکہ ادب کے ہر موضوع پر نہ صرف لکھ سکتے تھے بلکہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

بعض کتابیں ایسی بھی ہیں، جن کا ترجمہ تو مرحوم ہی نے کیا تھا۔ مگر وہ ان کے نام سے نہیں چھپی تھیں۔ جن میں "تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں" اور "نوعِ انسان کی کہانی" اور "دیہات میں برائے اسکاؤٹ کا کام" ہیں۔ ایسے کاموں کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ مگر ہم نے یہ کام بھی کیا۔ یہ کتابیں بچوں کے لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے ترجمہ کرائی تھیں۔ ان کا ریکارڈ موجود ہے۔ اس نمبر میں ان کتابوں میں سے بھی چند ٹکڑے دے دیے گئے ہیں۔

مرحوم کے تنقیدی اور فنی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواہ وہ دیباچوں کی صورت میں ہوں۔ خواہ مضامین کی صورت میں نتیجہ خیز بات کرنے میں، فن کی باریکیوں اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں، جیسی نظر ان کی تھی کم کسی کو نصیب ہوئی۔ زیرِ نظر شمارہ میں دیکھیے، تو کیا کچھ ہے اور کتنے پائے کا ہے۔

ڈرامے سے بھی مرحوم کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اچھے ڈراموں کے ترجمے کیے۔ ڈرامے ڈائریکٹ کیے۔ ڈراموں میں کام کیا۔ اور خوب خوب داد حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامیٹک کلب کے نکھار میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ چند ڈرامے اس نمبر کی بھی زینت ہیں۔ یہ ڈرامے کاغذ پر بھی خوب ہیں۔ جب یہ سٹیج ہوئے ہوں گے اور خود بخاری صاحب اسٹیج پر موجود ہوں گے۔ نہ جانے اس وقت

کیا قیامت برپا ہوئی ہوگی۔

اس پرچے میں ایک جھگڑے کی بات بھی ہے۔ وہ ہے نیازمندانِ لاہور کا سلسلہ۔ پہلی بات تو اس میں جھگڑے کی یہ ہے کہ بعض حضرات ان تحریروں کو صرف بخاری صاحب کی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں ایک اور جگہ بھی عرض کرچکا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ صلاح مشورے کی حد تک، سالک صاحب، تاثیر صاحب اور امتیاز صاحب شریک رہے مگر انھیں لکھا پطرس ہی نے۔ چند ایک اسی نوع کی چیزیں ڈاکٹر تاثیر نے بھی لکھی تھیں۔ مگر ہم نے انھیں پیش نہیں کیا۔ ہم جو تین مضمون پیش کر رہے ہیں۔ یہ یقیناً پطرس ہی کے ہیں۔ تفصیل میں کیا جائیں۔ ایک آدھ کا تو اصل مسودہ موجود ہے۔ دوسرے حکیم یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" اس کی شہادت دیتے ہیں (بھلا ایڈیٹر کو مضمون نگار کا پتہ نہ ہو) پھر مرحوم کے قریبی دوست بھی میری ہی بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً سالک صاحب، تاج صاحب

"چیز تبسم" کے مصنف نے ایک بات پطرس کے حوالے سے کہی ہے کہ وہ "مضمون میرا لکھا ہوا نہیں"۔ میرے نزدیک یہ حوالہ تفنن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اُس مضمون پر ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی تھا:۔

"جس ذریعہ سے ہمیں یہ مضمون ملا ہے۔ اس سے اور مضمون کی گرانقدری سے ہمیں چار احباب پر شک ہوسکتا ہے۔ پروفیسر بخاری، سید امتیاز علی تاج، پروفیسر تاثیر اور قبلہ سالک صاحب۔ ان چار پر اس لیے کہ ایسا وقیع مضمون لکھنے والے "نیازمند" یہی اربعہ عناصر ہوسکتے ہیں۔ الگ الگ شک کے وجوہ یہ ہیں: (۱) تاثیر صاحب اس سے قبل تلکین کائی صاحب کے واکڈے ڈرامہ کے ترجمہ پر لکھ چکے ہیں جس کا آج تک جواب نہیں دیا جاسکا (۲) سلاست اور روانی تاج کی سی ہے (۳) ادبی تنقید اور نباذانی حضرت سالک کی آمیزکار ہیں (۴) شوخی کلام اور اندازِ بیان سید احمد شاہ بخاری کی چغلی کھا رہے ہیں۔ بلکہ کئی فقرے تو مضامینِ پطرس ہی سے لیے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کی ہم آہنگی اور نگارش کی یگانگت سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں کا کام نہیں۔ ایک ہی قلم کی تراوش ہے۔ حقیقت کچھ ہو جملے شکوک ان چاروں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو زیادہ، امتیاز، سالک اور تاثیر کو کم"۔

ایڈیٹر لفظی پینتروں کے ساتھ واضح اشارے تو کرتے ہیں کہ یہ مضمون پطرس ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک ہو تو کیا کیا جائے۔

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ مضمون لکھ کر بخاری صاحب نے اچھا کیا تھا یا بُرا۔ مجھے تو ان کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ کم از کم یہ تین مضمون پطرس ہی کے ہیں۔ بس! — زیادہ وضاحت میں گیا یا اپنی رائے کو دخل دیا تو گتھم گتھا ہونے کے بڑے امکانات ہیں۔

مرحوم اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے۔ بلاشبہ ان کی تقریروں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہاں بخاری صاحب کی دو ایک تقریریں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ان کی لسانی خوبیوں کا بھی اندازہ ہوسکے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یو۔ این۔ او میں تقریر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ساری دنیا گوش برآواز ہوتی ہے۔ جن کے سامنے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ مانے ہوئے مدبر ہوتے ہیں۔ ایسے گھاگ قسم کے لوگوں کے سامنے اپنی بات کہنا اور پھر منوانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ اپنی ایک تقریر کے بارے (جو ہم بھی پیش کر رہے ہیں) مرحوم ہی نے ایک خط میں لکھا تھا:۔

بہر حال آیا، مسئلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس بارے میں مجھے ایسا بہرہ ور کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی توجیہ باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یہاں اور کسی کو نصیب ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہیں۔"

اس نمبر میں مرحوم کی اکلوتی مگر معرکۃ الآرا کتاب "پطرس کے مضامین" بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بظاہر اس کا شامل کرنا عجیب سا لگتا ہے مگر ہم نے اس نمبر کو مرحوم کے تمام تر کارناموں سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے اس کی بھی اشاعت ناگزیر تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ کہ منتشر مضامین کو یکجا کرنے کے بعد ہمیں یہ خیال گزرا کہ ان مضامین سے مرحوم کی اتنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا۔ جتنا کہ پہلے سے موجود ہے (اس لیے کہ اس میں تو نرم گرم سبھی کچھ موجود ہے) اسی خوف سے کہ کوئی مرحوم کے انہی منتشر مضامین کو سامنے رکھ کر غلط رائے قائم نہ کر بیٹھے۔ اس کتاب کو شامل کیا گیا۔ تیسری بات یہ تھی کہ مرحوم کا سکہ مزاح نگاری کے سلسلے میں رائج ہے۔ منتشر مضامین میں مزاحیہ انداز کی چیزیں کم تھیں۔[1]

پطرس کے خطوط، اتنی تعداد میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ یہ خطوط کیسے ہیں؟ ادب میں کیا مقام رکھیں گے؟ میری ناقص رائے میں اس کا فیصلہ بھی اس سے مختلف نہ ہو گا۔ جو مزاح نگاروں کے دربار میں "پطرس کے مضامین" کو حاصل ہے۔ یہ خوش گفتاری کے تمام آداب کے ساتھ بولتے ہیں۔ اپنا بنا لیتے ہیں۔ پڑھئے گا تو ڈوب جائیے گا۔ سرشاری کی کیفیت پائیے گا۔ پھر نئی ترکیبیں سامنے آتی ہیں۔ نئے استعارے سامنے تیرتے جو موہ لیتے ہیں۔ اُتر جاتے ہیں ——— ابوالکلام اور نیاز فتحپوری کی طرح پطرس فرضی خطوط کے انداز میں مضمون نہیں لکھتے۔ بلکہ ان کا واقعی کوئی مخاطب ہوتا ہے اور یہ واقعی خط ہوتے ہیں جب کوئی ابوالکلام اور نیاز فتحپوری کے مضمونوں کو (بلاشبہ بلند پایہ ہی) خطوط سمجھ کے پڑھتا ہے تو بڑا غلط کرتا ہے۔ غالب بھی بعض خطوط یہ سمجھ کے لکھتے تھے کہ یہ چھپیں گے جیسا کہ نواب امین الدین احمد خاں نے غالب سے کہا، آپ کے خط چھپتے ہیں۔ ایک خط میرے نام بھی لکھ دیجئے تاکہ وہ بھی چھپ جائے۔ چنانچہ غالب نے خط لکھا اور وہ چھپا ——— اس کے برعکس یہ خط، خط ہی ہیں ——— غالب کے بعد اتنے دلکش خط اور کتنے ادیبوں نے لکھے؟ آپ سوچیں۔ میں ایک دو سطریں اور لکھ لوں۔

ہیمرشولڈ نے کہا ——— "سیاست دان میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ احمد شاہ بخاری میں موجود تھیں۔"

بشیر احمد ہاشمی نے کہا ——— بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔

رشید احمد صدیقی نے کہا ——— پطرس نے اُردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا۔ مگر کتنا اونچا مقام پایا۔

عبدالمجید سالک نے کہا ——— احمد شاہ بخاری کی موت علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے۔

امتیاز علی تاج نے کہا ——— پطرس کی ڈرامہ پر بڑی نظر تھی۔ کسی ڈرامے میں خود کام کیا تو اپنی ایکٹنگ کا بھی لوہا منوایا۔

صوفی تبسم نے کہا ——— بخاری کی حیثیت صرف استاد کی نہ تھی بلکہ وہ طالب علموں کے مشفق رہنما اور دوست تھے۔

عصمت چغتائی نے کہا ——— نہ جانے کیوں پطرس بھا گئے اور ایک جان چھوڑ، ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے۔

فیض احمد فیض نے کہا ——— بخاری صاحب عالم بھی تھے، ادیب بھی، استاد بھی، ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش گفتار بھی، سخت گیر منتظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحب سیاست بھی۔

---

[1] یوں بھرپور قسم کا نمبر پیش کرنے کے سلسلے میں ادارہ "نقوش" مولانا عبدالمجید سالک کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے بعض شرائط کے ساتھ ہمیں بیگم پطرس سے مضامین کی اشاعت کی اجازت دلوا دی۔ اگر ہمیں مولانا سالک اور بیگم پطرس کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ تو یہ نمبر چھپ ہی نہیں سکتا تھا ——— ادارہ محترمہ بیگم صاحبہ کا بے حد ممنون ہے۔

عالمی شہری

جب سے کپلنگ نے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" کا گیت گایا ہے اسی دن سے ہم مختلف اور متصادم معاشروں کے تعلقات کے بارے میں زیادہ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ ہمیشہ ہم اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا مرکب مل جائے جو ہر ایک کی بہترین خوبیوں کو محفوظ کر سکے۔

کبھی کبھی ہمیں کسی ایسی ہستی کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے جو ہمارے تخیلات کو عمل کی دنیا میں لے آتی ہے۔ ابھی ابھی ہمیں پاکستان کے سفیر پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بے وقت موت کی شکل میں ایسی ہی ایک شخصیت کے ضیاع کا سامنا ہوا ہے جنہوں نے اقوام متحدہ میں رئیس شعبۂ اطلاعات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ صحیح معنوں میں عالمی شہری تھے۔

پروفیسر بخاری کا تعلیمی پس منظر مشرق اور مغرب — پنجاب یونیورسٹی اور کیمبرج — دونوں کو آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ وہ دنیا کے دونوں حصوں کی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور محاوروں کا راگ الاپا۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے نزدیک عالم تھے۔

لیکن مشرق اور مغرب کا یہ ملاپ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ — حاضر جواب، شائستہ، دانش مند، زندہ دل، اور گرم جوش۔ وہ خود پسندی کی نمائش سے پاک تھے، انہیں زندگی سے اُنس تھا۔ وہ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں سے ان کی قومیت، رنگ، نسل، مذہب، یا پیشے کا خیال کئے بغیر محبت کرتے تھے۔ ان کی روح ان کے ذہن کی طرح تنگ سرحدوں کی قائل نہ تھی۔

ہزاروں امریکی جنہیں ان سے ذاتی شناسائی کا شرف حاصل ہے ان کی موت کو اپنا ذاتی رنج محسوس کر رہے ہیں سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ دوست تھے۔ لیکن یہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا ایک ایسے شخص کے اٹھ جانے سے مفلس تر ہو گئی ہے جو ہمیں بہتر طریق سے یہ دکھاتا تھا کہ آسودہ مستقبل کے لئے کون کون سی اچھی باتیں ممکن ہیں۔

(ترجمہ) (نیویارک ٹائمز مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کا اداریہ)

پروفیسر بخاری — آخری لمحات

مارلی ہیمن

"وہ آخری لمحے تک زندہ رہے" ان کے ڈاکٹر کا قول ہے" وہ کام کرتے ہوئے مرے" اقوام متحدہ میں ان کے ایک رفیق کار کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات پروفیسر احمد شاہ بخاری سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے ان کے ڈاکٹر ان کے دوست بن گئے تھے۔ اور انہوں نے بخاری کے سفر زندگی کی رفتار کو حتی المقدور کم کرنا چاہا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب (جیسا کہ لوگ انہیں محبت سے کہتے تھے) یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے معذور ہونے کا اعلان کر دیں۔ گو وہ چند سال سے اچھے خاصے بیمار رہتے تھے۔ ان پر دل کا پہلا دورہ ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء کو پڑا۔ پروفیسر بخاری کو اس کا شدید احساس تھا کہ وہ جب ہسپتال میں طبی مشورے کے لئے گئے تو انہوں نے اپنا نام "مسٹر پاٹن" لکھوایا۔ اس دورے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری کا کام شروع کرنے سے احتراز نہ کیا۔ بلکہ چارج لینے سے قبل ہی مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کے ساتھ چین کے تاریخی دورے میں کام شروع کر دیا۔

وہ بڑی مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں کسی چیز کا خوف نہ تھا لیکن وقتاً فوقتاً ان پر دل کا دورہ پڑتا تھا۔ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے تو انہیں آکسیجن میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ دن آرام کر کے پھر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور پھر اس طرح مستعد نظر آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گذشتہ چند سال سے ان کی صحت بری طرح گرنے لگی تھی۔ دل کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ ان کی صحت جلد گرنے کے کئی وجوہ تھے۔ ان کو زندگی سے ان کی والہانہ محبت تھی۔ پھر وہ پیشہ ورانہ ریشہ دوانیاں جو ان کے خلاف ہوتی رہیں۔ جب کوئی تیز اور ذہین آدمی کسی بین الاقوامی ادارے میں اعلیٰ جگہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جب مسٹر ہیمرشولڈ کی مدت عہدے کے پانچ سال ختم ہو گئے۔ اور ان کے نائبین کے استعفے دینے کی بات ہوئی تو رسم کے مطابق سب کو ایک سال کی توسیع دے دی گئی۔ یہ مدت توسیع اپریل ۱۹۵۹ء میں ختم ہو رہی تھی۔ اور اس کے بعد پروفیسر بخاری کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالنے والے تھے پچھلے مہینے وہ بہت پریشان ہوئے۔ جب کہ اسمبلی کی ایک کمیٹی نے شعبہ اطلاعات کے بارے میں تحقیقات شروع کی۔ وہ چونکہ صدر شعبے کے حساس تھے اس لئے اس تحقیقات کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسمبلی کئی سال سے شعبہ اطلاعات کے مصارف کم کرنے کی فکر میں تھی۔ اور اس کمیٹی کی تحقیقات اس مہم کی کئی سال کی جدوجہد کا آخری مرحلہ تھی۔ نومبر میں جب اس پانچویں کمیٹی کی بحث ہوئی تو ان لوگوں کو کامیابی ہوئی جو نام نہاد ماہرین کی سفارشات کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور یہ طے پایا کہ یہ کام صدر دفتر کے ذمہ کر دیا جائے۔ اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کو محض پروپیگنڈا بیورو بنا دینے کی نامہ نگاروں نے سخت مخالفت کی اور خود مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کو بھی اس پر شدید اعتراض تھا۔

عالمی شہری

جب سے کپلنگ نے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" کا گیت گایا ہے اسی دن سے ہم مختلف اور متصادم معاشروں کے تعلقات کے بارے میں زیادہ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ ہمیشہ ہم اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا مرکب مل جائے جو ہر ایک کی بہترین خوبیوں کو محفوظ کر دے۔

کبھی کبھی ہمیں کسی ایسی ہستی کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے جو ہمارے تخیلات کو عمل کی دنیا میں لے آتی ہے۔ ابھی ابھی ہمیں پاکستان کے سفیر پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بے وقت موت کی شکل میں ایسی ہی ایک شخصیت کے ضیاع کا سامنا ہوا ہے جنہوں نے اقوام متحدہ میں رئیس شعبۂ اطلاعات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں وہ صحیح معنوں میں عالمی شہری تھے۔

پروفیسر بخاری کا تعلیمی پس منظر مشرق اور مغرب ——— پنجاب یونیورسٹی اور کیمبرج ——— دونوں کو آغوش میں لئے ہوئے ہے وہ دنیا کے دونوں حصوں کی زبانوں کے نقاد اور ساتھ ہی شاعر تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور محاوروں کا راگ الاپا۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے نزدیک عالم تھے۔

لیکن مشرق اور مغرب کا یہ ملاپ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے ——— حاضر جواب، شائستہ، دانش مند، زندہ دل اور گرم جوش۔ وہ خود پسندی کی نمائش سے پاک تھے، انہیں زندگی سے اُنس تھا۔ وہ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں سے ان کی قومیت، رنگ، نسل، مذہب یا پیشے کا خیال کئے بغیر محبت کرتے تھے۔ ان کی روح ان کے ذہن کی طرح تنگ سرحدوں کی قائل نہ تھی۔

ہزاروں امریکی جنہیں ان سے ذاتی شناسائی کا شرف حاصل ہے ان کی موت کو اپنا ذاتی رنج محسوس کر رہے ہیں سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ دوست تھے۔ لیکن یہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا ایک ایسے شخص کے اٹھ جانے سے مفلس تر ہو گئی ہے جو ہمیں بہتر طریق سے یہ دکھاتا تھا کہ آسودہ مستقبل کے لئے کون کون سی اچھی باتیں ممکن ہیں۔

(ترجمہ) (نیویارک ٹائمز مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کا اداریہ)

پروفیسر بخاری — آخری لمحات

مارلی ہیمین

"وہ آخری لمحے تک زندہ رہے" ان کے ایک ساتھی کا قول ہے "وہ کام کرتے ہوئے مرے" اقوام متحدہ میں ان کے ایک رفیق کار کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات پروفیسر احمد شاہ بخاری سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے ان کے ڈاکٹر ان کے دوست بن گئے تھے۔ اور انہوں نے بخاری کے سفر زندگی کی رفتار کو حتی المقدور کم کرنا چاہا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب (جیسا کہ لوگ انہیں محبت سے کہتے تھے) یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے معذور ہونے کا اعلان کر دیں۔ گو وہ چند سال سے اچھے خاصے بیمار رہتے تھے۔ ان پر دل کا پہلا دورہ ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کو پڑا۔ پروفیسر بخاری کو اس کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ جب ہسپتال میں طبی مشورے کے لیے گئے تو انہوں نے اپنا نام "مسٹر براؤن" لکھوایا۔ اس دورے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری کا کام شروع کرنے سے احتراز نہ کیا۔ بلکہ چارج لینے سے قبل ہی مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کے ساتھ چین کے تاریخی دورے میں کام شروع کر دیا۔

وہ بڑی معروف زندگی بسر کرتے تھے اور انہیں کسی چیز کا خوف نہ تھا لیکن وقتاً فوقتاً ان پر دل کا دورہ پڑتا تھا۔ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے تو انہیں آکسیجن میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ دن آرام کرکے پھر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور پھر اس طرح مصروف نظر آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گذشتہ چند سال سے ان کی صحت بری طرح گرنے لگی تھی۔ دل کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ ان کی صحت جلد گر جانے کی کئی وجوہ تھے۔ زندگی سے ان کی والہانہ محبت تھی۔ پھر وہ ریشہ دوانیاں جو ان کے خلاف ہوتی رہیں۔ جب کوئی تیز اور ذہین آدمی کسی بین الاقوامی ادارے میں ممتاز جگہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جب مسٹر ہیمرشولڈ کی مدت عہدہ کے پانچ سال ختم ہو گئے۔ اور ان کے نائبین کے استعفے دینے کی بات ہوئی تو رسم کے مطابق سب کو ایک سال کی توسیع دے دی گئی۔ یہ مدت توسیع اپریل ۱۹۵۹ء میں ختم ہو رہی تھی۔ اور اس کے بعد پروفیسر بخاری کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالنے والے تھے پچھلے مہینے وہ بہت پریشان ہوئے۔ جب کہ اسمبلی کی ایک کمیٹی نے شعبہ اطلاعات کے بارے میں تحقیقات شروع کی۔ وہ چونکہ صدر شعبے کے صاحب رہے تھے اس لئے اس تحقیقات کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسمبلی کئی سال سے شعبہ اطلاعات کے مصارف کم کرنے کی فکر میں تھی۔ اور اس کمیٹی کی تحقیقات اس نے کئی سال کی جدوجہد کا آخری مرحلہ تھی۔ دسمبر میں جب اس پانچویں کمیٹی کی بحث ہوئی تو ان لوگوں کو کامیابی ہوئی جو نام نہاد ماہرین کی سفارشات کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور یہ طے پایا کہ یہ کام صدر دفتر کے ذمہ کر دیا جائے۔ اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کو محض پروپیگنڈہ بیورو بنا دینے کی نامہ نگاروں نے سخت مخالفت کی اور خود مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کو بھی اس پر شدید اعتراض تھا۔

موت کی باتیں

بحث کا جو نتیجہ نکلا اس سے گو پروفیسر بخاری مطمئن ہو گئے مگر اس بحث و مباحثہ کے دوران ان پر جو بار پڑا اس سے ان کی وفات کا وقت قریب تر آ گیا۔ اگر یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی تو شاید وہ مزید چھ ماہ سے دو سال تک زندہ رہ سکتے تھے لیکن جو کچھ ہوا یہ ذہن تاب بھی قائم باز یا وہ دن دنیا میں نہ رہتے وہ اپنے ڈاکٹر سے اس تلخ ترین حقیقت (موت) کے بارے میں اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے: "بتائیے خدا کے لئے موت کب تک آئے گی؟"

گزشتہ اپریل میں نامہ نگاروں نے سر ہیمر شولڈ کے اعزاز میں جو لنچ دیا تھا اس میں پروفیسر بخاری بیمار ہو گئے ڈاکٹر نے انہیں کچھ ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ انہیں انجکشن لگایا گیا جس سے ان کا بلڈ پریشر کم ہو گیا۔ اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔ انتقال سے ایک دن قبل پھر ان کو انجکشن لگایا گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ چلنے پھرنے اور اٹھنے سے انہیں نقصان ہوگا مگر وہ اٹھ بیٹھے اور آخر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور انہیں آکسیجن میں رکھ کر گھر پہنچایا گیا ڈاکٹروں نے جو کر سکتے تھے کیا، شام کو انہیں کچھ افاقہ معلوم ہو۔

ڈاکٹر کو بھی بخاری کی طرح شیکسپیئر سے بڑی محبت تھی۔ اس شام کو ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔ کہ کیا میں رات آپ کے ساتھ بسر کر سکتا ہوں۔ پروفیسر بخاری نے کہا "نہیں۔ نرس موجود ہے آپ زحمت نہ کریں"۔ اور پھر ڈاکٹر نے جاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا "خدا حافظ، شہزادہ شب!"

صبح ہوتے ۴½ بجے نرس نے ڈاکٹر کو اطلاع دی کہ مریض کی حالت تشویش ناک ہے۔ ساڑھے چھ بجے وہ اس دنیا سے سدھار چکے تھے۔ انہوں نے موت کا کرب تک محسوس نہ کیا۔ جمعہ کو اقوام متحدہ کی جتنی کمیٹیوں کے جلسے ہوئے سب میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اور اسمبلی کے اجلاس میں بھی ان کا سوگ منایا گیا۔ سپلی کمیٹی میں جب انہیں خراج عقیدت پیش کیا جا چکا اور آغا شاہی اس کا جواب دینے کے لئے اٹھے تو ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

پرنس علی خان نے اسمبلی کے بھرے اجلاس میں کہا "ان کے اٹھ جانے سے اقوام متحدہ کے برآمدے سنسان نظر آئیں گے۔"

اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات میں جو لوگ ان کے ساتھ کام کرتے تھے وہ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اب یہ لوگ بہت افسردہ نظر آتے تھے نامہ نگاروں کو جو انہیں ایک مندوب کی حیثیت سے جانتے تھے (اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاکستان کے بہترین مندوب تھے اور پاکستان کو عرصے تک ایسا مندوب مشکل سے ملے گا) اب یہ احساس ہوگا کہ ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ جملوں میں کس قیامت کی ذہانت پوشیدہ ہوتی تھی۔

نامہ نگاروں نے انہیں شمالی افریقہ کی آزادی کے لئے نسلی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے سیاست دانوں سے سوال و جواب کرتے دیکھا ہے اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کبھی ان مباحثوں میں زیر نہ ہوئے تھے۔

ہر دم مسکراتی اور پُر مذاق شخصیت کے پس پردہ ایک سنجیدہ بخاری بھی تھے۔ وہ مزاح کی نقاب اتار کر ضرورت کے وقت انتہائی سنجیدہ بات کر سکتے تھے اور کرتے تھے لیکن مزاح کی نقاب وہ تحفظ کے طور پر اکثر و بیشتر ڈالے رہتے تھے۔

———

بھلے مانس بنو

نیویارکر

ہم لے مین گن پائی کہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے پروفیسر احمد شاہ بخاری ہیں جو عام طور پر عرب ایشیائی بلاک کے قابل ترین ترجمان سمجھے جاتے ہیں اور وہ پاک و ہند کے سرکردہ مزاح نویس بھی ہیں۔ مستقل نمائندوں اور مزاح نویسوں میں مجموعی طور پر یا الگ الگ دلچسپی رکھنے کے باعث ہم نے پروفیسر بخاری کی تصانیف حاصل کرنی چاہیں لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہوا۔ ہم نے یہ ٹھان کر کہ ان کا کچھ اندازہ کریں گے خود پروفیسر صاحب کو ٹیلی فون کیا اور ہمیں اقوام متحدہ کی عمارت میں پہنچ کر حاضر ہونے کی دعوت مل گئی۔

بہرکیف پروفیسر صاحب ان چند خوش دل، با مروت اور ذی علم مستقل نمائندوں یا مزاحیہ نویسوں میں سے ایک ہیں جن سے ہم مدت کے بعد ملے ہیں۔ انہوں نے دریائے ایسٹ سے توجہ ہٹا کر ہنسنے کی میز کی طرف ہماری راہنمائی کی۔ ہمیں گوشت، روٹی اور ٹماٹر منگوایا اور کہا کہ "پاکستان کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء تک وہ ایک استاد، مترجم اور مصنف تھے، سیاسی سفیر نہ تھے۔ ۱۹۴۷ء سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر (پرنسپل) تھے۔ تیس برس وہ اس کالج میں ادبیات کے پروفیسر رہے۔ انہوں نے اس درسگاہ کے تجرباتی تھیٹر کے لیے دوسری چیزوں کے علاوہ شیکسپیئر اور شا کے بہت سے ڈرامے اردو میں ترجمہ کر کے دیے جن میں ابسن¹ کا ڈرامہ "گڑیا کا گھر" اور المر رائس² کا ڈرامہ "جمع کرنے والی مشین" بھی ہیں۔" پروفیسر نے ہمیں بتایا کہ "ہارون الرشید کے زریں دور کے بعد گذشتہ چالیس سال کا زمانہ اسلامی دنیا میں تراجم کے لیے بڑا سازگار رہا ہے۔ پچھلے زمانے میں مسلمان ہر اس چیز کا ترجمہ کر دیتے تھے جو فلسفہ اور سائنس میں ان کے ہاتھ لگتی تھی۔ اب ادب کے تراجم پر زور صرف ہو رہا ہے تمہیں شیکسپیئر کو اردو میں سننا چاہیے۔ لاہور کی مقامی بولی میں "پینڈا" نہایت ظریفانہ لفظ ہے۔ شیکسپیئر کی حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو ڈرامے سے کچھ نہ کچھ لطف حاصل ہو ہی جاتا ہے۔"

تیز نیلی آنکھوں والے پروفیسر بخاری نے جو ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے اور نیلے رنگ کی ٹائی لگائے ہوئے تھے برطانیہ اور امریکہ کی غیر افسانوی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ اردو کا ایک مزاحیہ رسالہ بھی مرتب کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے انگریزی اور اردو میں ادبی تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت تین یا چار سو مختصر افسانوں پر پھیلی ہوئی ہے جو انہوں نے پطرس کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "ان افسانوں کی مقبولیت کی بعض وجوہ یہ ہیں کہ وہ غلط ہیں۔ نقادوں نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ افسانے اگرچہ مزاحیہ ہیں لیکن انہیں بے دھڑک گھروں میں لے جایا سکتا ہے۔"

ELMER RICE'S "THE ADDING MACHINE" ۲؎ ______ ABSON'S "A DOLL'S HOUSE ۱؎

• پطرس کو پاکستان میں شگفتہ ترین شخص مانا جاتا ہے۔ ان کے چند افسانوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے جنہوں نے اہل برطانیہ کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ برطانیہ والے لکھتے ہیں کہ انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک مشرقی مزاحیہ نگار ایسا بھی ہے جو "غزالی" آنکھوں اور ناموافق حالات کو اپنی تحریروں کا مرکز نہیں بناتا۔ ہم نے پوچھا "آخر پطرس اپنی تحریر کا مرکز کس چیز کو بناتا ہے؟" پروفیسر بخاری نے جواب دیا "میری کہانیوں کا شمالی کردار ہمیشہ ایک معمولی آدمی ہوتا ہے جس میں بہت سی کمزوریاں، درکوتاہیاں ہوں۔ حادثات اسے ایسے ناموافق ماحول میں پھینک دیں جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔ وہ ہمیشہ بڑا سیاستدان اور عظیم ادیب بننے کے خواب دیکھتا ہو۔ ایک کہانی میں وہ خطرناک سرغنہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر ناکام رہنے کے نتیجے میں بہتر آدمی بن جاتا ہے میں نے اپنی تحریروں میں واحد متکلم اور جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے تاکہ طنز کا نشانہ خود بیان کرنے والا بنے۔ پاکستانی اس بات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ

"پہلے ہنسو ہنسو"

پروفیسر بخاری ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے ابتدائی بیس اور تیس برسوں کے درمیان چھ سال انہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان کی سفارتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۷ء میں اس وقت ہوا جب وہ بین الاقوامی "ہائی فریکوئنسی براڈ کاسٹنگ کانفرنس" منعقدہ میکسیکو میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت میں شریک ہوئے۔ ۱۹۵۰ء سے وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس چلے آ رہے ہیں۔ وہ لسانیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے کوکنی (COCKNEY) کے اختلافی لب و لہجہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے چھ مہینے صرف کئے تھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں بتایا "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کوکنی زبان اپنی گرامر اور حروف علت کا مخصوص نظام رکھتی ہے۔" ہم امیدوار بن کر انتظار کرنے لگے۔ لیکن انہوں نے کہا "اب میں کوکنی لب و لہجہ کی نقل اتارنے کی جرات نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ میں پھر شاہی انگریزی کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ اور برلن کی جون سے نکل چکا ہوں۔"

ہم نے دریافت کیا کہ آپ سفارتی ذمہ داریوں اور مزاح نویسی کو کس طرح یکجا کرتے ہیں؟ پروفیسر نے جواب دیا کہ "مزاحیہ نویسی میں میری پیداوار بہت کم ہو گئی ہے ایک مشکل یہ ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ سفارتی کاروبار میں آپ بعض چیزوں پر ہنس تو سکتے ہیں لیکن معقول اڑانے کی مقدار روایات نے مقرر کر دی ہے۔"

"مجھے نیویارک سے پیار ہے۔ میں بڑے شہر کا باشندہ ہوں تاہم ابھی مجھے ملامت کی جاتی ہے کہ میں چلنے میں بہت سست ہوں۔ دوا دن کے ذخیرے مجھے بہت دلچسپ نظر آتے ہیں۔ جب میں پہلے پہل یہاں آیا تو میں نے ایک سینڈوچ (سموسے) کی فرمائش کی۔ سٹال والے نے پوچھا "سفید یا رائی (ڈبل روٹی) میں؟" اس کی بات سمجھنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ اوہ یہ ہے تمہاری زبان، چیک کا مطلب ہے بل۔ باقی کیا رہا؟ میں اپنے شاگردوں کو لاہور میں امریکہ کے متعلق طویل خط لکھا کرتا تھا تاکہ وہ مجلسوں کے سامنے پڑھ کر سنائے جائیں۔ ایک خط میں میں نے لکھا کہ یہاں کے کونے کونے پر ایک ڈرگ سٹور موجود ہے۔ انہوں نے جواب میں بڑے خطرے اور تعجب کا اظہار کیا۔ مجھے اگلے خط میں اس کی تشریح کرنی پڑی کہ یہ ڈرگ سٹورز زہریلی اور نشہ آور چیزیں نہیں بیچتے۔ جب معلومات اور واقفیت بڑھ جائے گی تو ممکن ہے کہ پطرس امریکہ کے بارے میں کچھ لکھ سکے۔"

۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء

(ترجمہ)

ہر نغمہ جس کا حسن تمنائے گوش تھا

محمد عبداللہ قریشی

پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پاکستان کے نہایت ذہین، نہایت روشن دماغ، بڑے ہنس مکھ، خوش پوشاک، خوش گفتار، مشہور ماہرِ تعلیم، انگریزی اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب، منفرد مزاح نگار اور کامیاب سفیر تھے۔ ان کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ مشہور مبلغ اسلام خواجہ کمال الدین مرحوم نے جب پشاور میں وکالت شروع کی تو بخاری کے والد سید اسد اللہ شاہ ان کے منشی تھے۔ وہیں یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو سید احمد شاہ پیدا ہوئے۔ سید محمد شاہ رفعت مرحوم ان کے بڑے بھائی تھے اور سید ذوالفقار شاہ بخاری چھوٹے بھائی ہیں جو حال ہی میں ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کرنے کے بعد سید احمد شاہ بخاری نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے نہایت ہونہار طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کا ایم اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں انھیں شعر و ادب سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میگزین "راوی" کے ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے اپنے استاد واٹکنس سے عقیدت کی بنا پر اپنا قلمی نام پیٹرو واٹکنس اختیار کیا اور اسی نام سے انگریزی کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں ایسے مضامین لکھے جنھیں معاوضے کے قابل سمجھا گیا۔ مختلف اردو رسائل میں بھی بہت سے مضامین لکھے جو ادب، فلسفہ، طنز و مزاح اور فنونِ لطیفہ کے موضوعات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو میں وہ صرف پطرس کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ "مضامینِ پطرس" اسی عہد کی یادگار ہیں۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے انگلستان کا رخ کیا جہاں امانوئیل کالج کیمبرج میں داخلہ لے کر انگریزی ادب کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہاں کے اساتذہ کی رائے تھی کہ "بخاری کا علم اس قدر فراخ اور وسیع و بسیط ہے کہ ایک انگریز کے لیے بھی اتنا علم اک عمر میں رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔"

وطن واپس آنے کے بعد وہ پہلے سنٹرل ٹریننگ کالج، پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر ہو گئے۔ ان کی توجہ سے گورنمنٹ کالج کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی رفتار میں بہت ترقی ہوئی۔ انھوں نے مباحثوں میں حصہ لیا، مذاکروں میں جان ڈالی، ڈراموں میں اداکاری اور ہدایت کاری کے جوہر دکھائے۔ اپنے دوست سید امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر کئی انگریزی ڈراموں کے اردو ترجمے کیے جن میں برنارڈ شا کا کھیل "آرمس اینڈ دی مین"، ووٹرز کا کھیل "دی مین ہو ہابیٹ دی پوپ"، چیکوسلاویکی مصنف کیرل چاپیک کا ڈراما "آر یو آر" اور ایک ایکٹ کی نقل "باکس اینڈ کاکس" وغیرہ شامل ہیں۔

خالص تعلیمی کاموں میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مبلغ دس ہزار روپے کی رقم مخصوص کر کے یہ اسکیم منظور کی کہ انگریزی کی بعض معلوماتی کتابیں جن سے لڑکوں اور لڑکیوں کو خاص دلچسپی ہو، مروجہ دیسی زبانوں میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ اُردو ادب کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس کے بعد کمیٹی ہر سال اس مقصد کے لیے روپیہ منظور کرتی رہی۔ ابتدا میں ڈاکٹر آر۔ ایچ وائٹ ہاؤس اور پروفیسر بخاری اس کے ایڈیٹر اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر وائٹ ہاؤس طویل رخصت پر چلے گئے اور مسٹر ای پارکنسن صاحب ان کی جگہ ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ ایک دفعہ پروفیسر بخاری نے بھی رخصت لی مگر ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی نامزد نہ کیا گیا۔ فروری ۱۹۳۱ء میں جب پارکنسن صاحب بھی ولایت تشریف لے گئے تو کمیٹی نے ایک ایڈیٹوریل بورڈ بنا دیا جو مسٹر جی۔ سی چیٹرجی، اے۔ ایس بخاری اور رالا رونگ بہاری لال پر مشتمل تھا۔ یہ "پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس" کہلاتا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ ترجمے کے لیے کتابیں منتخب کر کے قابل اساتذہ سے انھیں اُردو، ہندی اور پنجابی میں منتقل کرائے اور خود نظرثانی کر کے انھیں شائع کرنے کا اہتمام کرے۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر بیسیوں مفید اور دلچسپ کتابیں شائع ہوئیں اور محکمے کی طرف سے سکولوں میں بطور پیش کش بھیجی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو کی تمام کتابیں نظرثانی کے لیے بخاری کے حصے میں آئی ہوں گی۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں بخاری کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری کا عہدہ پیش کیا گیا چنانچہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ چار پانچ سال تک اس خدمت کو بھی باحسن الوجوہ انجام دیتے رہے۔ سیکرٹری کی حیثیت سے آپ نے مندرجہ ذیل سالانہ رپورٹیں مرتب کیں جن سے کمیٹی کی کارگزاریوں کا پتہ چلتا ہے:-

سال ۳۲-۱۹۳۱ء	حجم ۱۵۲ صفحات	تاریخ اشاعت ۱۳ر جون ۱۹۳۲ء
سال ۳۳-۱۹۳۲ء	حجم ۱۱۶ صفحات	تاریخ اشاعت ۱۵ر جون ۱۹۳۳ء
سال ۳۴-۱۹۳۳ء	۱۵۴ "	" " ۱۵ر جون ۱۹۳۴ء
۳۵-۱۹۳۴ء	۸۵ "	" " ۲۶ر مئی ۱۹۳۵ء

پطرس بخاری نے اس عرصہ میں دو بین ضخیم انگریزی کتابیں خود بھی ترجمہ کیں۔ ان میں ایک تو برٹرنڈ رسل کی تصنیف تھی جس کا ترجمہ "تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ۲۰۷ صفحات کی کتاب ہے جس میں تعلیمی نصب العین، تربیت سیرت اور عام اصولِ تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

دوسری کتاب ہنڈرک فان لون کی سٹوری آف مین کائنڈ تھی جس کا ترجمہ "نوع انسان کی کہانی" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں طبع ہوا۔ یہ ۷۰۵ صفحات کی کتاب ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ ترجمہ منہ سے بولتا ہے کہ پطرس کا کیا ہوا ہے۔

تیسری کتاب تالیف۔ ایل برین صاحب کی تھی۔ انڈین سول سروس کے اس انگریز حاکم نے "دیہات سدھار"، "سنوار ہندوستان کے گاؤں میں"، "ہندوستان کے گاؤں کی اصلاح" وغیرہ کئی مفید کتابیں انگریزی میں لکھی تھیں جو بے حد مقبول ہوئی تھیں ان کی ایک کتاب کا ترجمہ بخاری نے غلام عباس کی مدد سے کیا جو "دیہات میں لوائے سکاؤٹ کا کام" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ دو سو صفحات کی اس کتاب میں دیہاتی سکاؤٹوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں اور اپنے گاؤں کی بہتری کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

بخاری انگریزی کی روح میں ڈوب کر اردو کی بلند سطح پر پہنچتے اور اس بے تکلفی سے ترجمہ کرتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہونے لگتا تھا اور ترجمہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا تو مسٹر لیونل فیلڈن کنٹرولر نے بخاری کی خدمات مستعار لے کر انھیں اپنا نائب منتخب کیا۔ وہ سات برس تک ریڈیو سے منسلک رہے اور ۱۹۴۳ء میں کنٹرولر جنرل مقرر ہو گئے۔ اس عہدے کی بدولت ان کو بہتیری کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ ساتھ ہی دوسری جنگِ عظیم کے دوران دولتِ برطانیہ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے جو سپریم کمانڈ بنی تھی اس میں بھی ان کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ حکومت وقتاً فوقتاً ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھاتی رہی۔ اس سلسلے میں ان کو حکومتِ ہند کی طرف سے افغانستان بھی بھیجا گیا جہاں انھوں نے نمایاں خدمت انجام دیں۔

قیامِ پاکستان سے کچھ قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس حیثیت میں انھوں نے نہ صرف کالج کو فسادات کی زد سے محفوظ رکھنے میں اپنے غیر معمولی تدبر کا ثبوت دیا بلکہ گورنر مغربی پنجاب کے ایما سے حکومت کے مہیا کردہ مستند مواد کی بنا پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام، کشمیر میں ڈوگروں کے مظالم، راشٹریہ سیوک سنگھ کی تخریبی سرگرمیوں اور سکھوں کی سازشوں اور سفاکیوں کے بارے میں چند رپورٹیں بھی مرتب کیں جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہوئیں۔ یہ ایسی قیمتی دستاویزات ہیں کہ اس عہد کی تاریخ لکھنے والا کوئی مورخ ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

گورنمنٹ کالج ہی سے وہ لندن بھیجے گئے جہاں پاکستانی نمائندے کی حیثیت میں انھوں نے ان مذاکرات میں حصہ لیا جن کا تعلق انڈیا آفس کی املاک کی تقسیم سے تھا۔

۱۹۴۸ء میں میکسیکو کے مقام پر ریڈیو کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ بخاری نے اس میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی اور ایک نہایت مفید رپورٹ لکھی۔ ۱۹۴۹ء میں اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی میں آپ نے دولتِ پاکستان کی طرف سے شرکت کی۔ ۱۹۵۰ء میں جب خان لیاقت علی خاں مرحوم نے وزیرِ اعظم پاکستان کی حیثیت سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دورہ کیا تو ہر شخص نے بخاری کی لیاقت کا لوہا مانا۔ بخاری اس تاریخی دورے میں ہر جگہ ان کے ہمراہ رہے۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے روزانہ اکیس گھنٹے نہایت جانفشانی سے کام کر کے پاکستان کی عزت میں اضافہ کیا۔ اس سے اعصاب پر اتنا بوجھ پڑا کہ صحت خراب رہنے لگی مگر آپ کی خدمات کو اتنا سراہا گیا کہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا مستقل مندوب نامزد کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۵۴ء تک فائز رہے۔ اس جگہ ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آیا کہ وہ ایک باوقار مقرر اور سلجھے ہوئے سیاست دان بھی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی مجلسِ شوریٰ کی صدارت بھی کی اور خوب نام پیدا کیا۔

حفاظتی کونسل کی مجالس میں بخاری کی شگفتہ اور متوازن تقریریں اتنی پسند کی جاتی تھیں کہ دنیا گوش بر آواز ہو کر سنتی تھی۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی، ہر نغمہ حسنِ تسلسل گوش تھا۔ تقریروں کے بعض حصے تو شیکسپیئر اور دوسرے بلند پایہ انگریزی ادیبوں کے حوالوں اور لطیف طنز و مزاح سے مزین ہونے کی وجہ سے ادب پارے ہوتے تھے۔ پاکستان کے مسائل کو جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے آپ نے پیش کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ تیونس کے بارے میں انھوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار جس انداز میں پیش کیا اس سے تمام دنیا کے مسلمان انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں بخاری کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر ڈاگ ہیمرشولڈ کی خواہش پر آپ کو اقوامِ متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کا ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ آپ پہلے ایشیائی ہیں جو اس عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ اس عہدے سے اپریل ۱۹۵۹ء کے آخر میں سبکدوش ہونے والے تھے۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں ادبیاتِ انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش قبول بھی کر لی تھی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو نیو یارک میں آپ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ نغمۂ حیات سمٹ گیا اور یہ قیمتی جوہر اجنبی دیار میں پیوندِ خاک ہو گیا۔

وہیں آرام گاہِ آخری ہے اس سپاہی کی ۔۔۔ ہمیشہ جو رہا سرگرمِ جنگِ زندگانی میں

پروفیسر بخاری کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی اور ان کی موت شہادت کی موت۔ انھوں نے ملک و ملت کی خاطر ہر محاذ پر جنگ کی اور اس عزیز وطن کی خدمت میں جان دی جہاں انھوں نے اپنا شباب رنگین کیا اور جوانی چھوڑی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سیاحت کے لیے تو دنیا

کا ہر ملک خوب ہے لیکن کوئی بیمار ہو تو اپنے وطن میں اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں کیونکہ "انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے کہ اس کے جانے پر کچھ غلغلہ ہوگا، کوئی تھامے گا، کوئی اٹھائے گا، کوئی روئے گا، کوئی چلائے گا" مگر ان کی یہ توقعات پوری نہ ہوئیں ؎

دامن کو منہ پہ ڈال کے رویا نہیں کوئی   دنیا سے وہ اٹھے بھی تو کس بے کسی کے ساتھ

پروفیسر بخاری کی وفات سے نہ صرف پاکستان کو زبردست ملی نقصان پہنچا بلکہ اقوام متحدہ کی سیاسی اور علمی حلقوں میں بھی سُونی ہو گئیں چنانچہ جنرل اسمبلی نے قرار داد تعزیت میں ان کے سانحہ ارتحال پر افسوس کا اظہار کیا اور ہر ملک کے نمائندے نے شاندار الفاظ میں ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا اعتراف کیا۔ ایرانی نمائندے نے کہا کہ بخاری کی ذات نہ صرف اپنے ملک کے لیے باعث ناز تھی بلکہ عالم اسلام کے لیے بھی سرمایہ افتخار تھی۔ وہ فارسی خوب جانتے اور بولتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے اور فارسی کے قدیم و جدید ادب سے بخوبی واقف تھے۔

ایک ممتاز عرب خلیل عیلی نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے گہرے جذبات رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ؎

اقول وقد فاضت لعینی عبرۃ   الارض بنی و الافلاء تذھب

یعنی میری آنکھیں اشکوں سے تر ہیں اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ زمین تو وہیں کی وہیں ہے لیکن احباب رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی ذات میں مشرق و مغرب کی خوبیاں جمع تھیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال تھا۔ مسٹر ہیمرشولڈ سیکرٹری جنرل مجلس اقوام متحدہ نے ان کی رحلت پر جو اعلامیہ شائع کیا اس میں آپ کی خدمات اور صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پروفیسر بخاری مشرق و مغرب کی میراث کے مالک تھے۔ یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے جس کی بدولت ہم بین الاقوامی مسائل حل کر سکتے ہیں کیونکہ وسعت نظر و فکر کے بغیر یہ مشکل کام حل نہیں ہو سکتا۔ نئی دنیا میں وحدت پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ بزرگ میراث اور روایات پر کامل نظر ہو۔ جدید نسل کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر وہی فضائل و مکارم پیدا کرے جو بخاری کی شخصیت میں آشکار تھے۔"

پروفیسر بخاری کی دنیا محدود نہ تھی۔ ان کا مزاج مشرقی، ذہن مغربی اور طرز فکر عالمگیر تھا۔ انھوں نے علمی اور ادبی یادگاریں زیادہ نہ چھوڑیں جو کچھ لکھا خوب سوچ سمجھ کر لکھا۔ ان کی ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے۔ آخری زمانے میں فرینکلن پبلیکیشنز والوں نے تالیف و ترجمے کے کام میں ان کا تعاون حاصل کرنا چاہا۔ بخاری نے سنکلیئر لیوئس کے ناول "ایرو سمتھ" کے ترجمہ کا ذمہ لے بھی لیا مگر اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے باعث اسے مکمل نہ کر سکے۔

اس کے بعد ان کی طرف سے بخاری کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ امریکی مصنف مرو کے سلسلہ کتب "دس آئی بلیو" کی طرز پر اردو میں ایک کتاب مرتب کر دیں۔ بخاری نے اس سلسلے کی کتابوں سے مجوزہ کتاب کے لیے چند ایسے مضامین انتخاب کیے جو پاکستان کے پڑھنے والوں کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ ان منتخبہ انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ کرایا گیا اور کچھ نئے مضامین پاکستانیوں سے لکھوائے گئے کہ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر زندگی سے کیا سبق حاصل کیے۔ بخاری نے ترجموں نیز دیگر مضامین پر بڑے غور سے نظر ثانی کی اور کتاب کا مختصر دیباچہ بھی لکھا۔ یہ مسودہ عین اس روز لاہور پہنچا جس کی شام کو ریڈیو پاکستان نے بخاری کی وفات کی خبر نشر کی ؎

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ



چار یار

(۱) تاج (۲) پطرس (۳) تاثیر (۴) فیض



بڑے بخاری　　　　چھوٹے بخاری

بھائی بھائی

سید ذوالفقار علی بخاری

سید ذوالفقار علی بخاری اپنے برادرِ محترم سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کی موت کے بعد ان ایام یادوں کو جو ان سے وابستہ ہیں "بھائی بھائی" کے نام سے ایک کتابی صورت میں لکھا کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے اُس سراپا زندگی بھائی کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھین کر ہمیشہ کے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہیں جس کی موت کا یقین کر لینے کے بعد زندگی کا اعتبار اور بھی اٹھ جاتا ہے۔

سید ذوالفقار علی بخاری کی اس کتاب کا ابھی بچپن ہے کہ اسی دور کے چند اقتباس ہم نے اس لئے حاصل کر لئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ سب کا پطرس خود اپنے بھائی کے لئے کیا تھا۔

میں جناب غلام عباس کا ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھ کو یہ اقتباس نقوش کے لئے حاصل ہو سکے اور طفیل صاحب سے سرخروئی ہوئی۔

(شوکت تھانوی)

بھائی جان سکول میں پڑھتے تھے اور میں ابھی سکول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ والد گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ میری والدہ سے کہا "لو مبارک ہو۔ کل پیر احمد شاہ کو سکول میں انعام ملے گا۔"

"بھائی گھر آئے تو میں نے کہا "کیا سکول میں مار پیٹتی ہے یا انعام ملتا ہے؟"

پھر رات بھر ہم دونوں بھائی جاگتے رہے۔ وہ مجھے سکول کے قصے سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔ مجھ سے کہنے لگے "تم بڑے ہوتے تو میں تم کو کل ساتھ لے جاتا۔"

میں رو پڑا۔ انھوں نے مجھے اٹھا کر پیار کیا اور کہا "اچھا دیکھو کل میں تمہاری شلوار پہن کر انعام لینے جاؤں گا۔"

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہنسی خوشی سو گیا۔ اگلے دن وہ میری شلوار پہن کر انعام لینے کے لئے گئے۔ ان کو کچھ کتابیں انعام میں ملی تھیں۔ جن پر سرخ رنگ کا دفتری فیتہ بندھا ہوا تھا۔ کئی دن تک وہ فیتہ میرے پاس رہا اور میں محلے کے لڑکوں کو دکھاتا رہا۔

میں سکول میں داخل ہو گیا۔ بھائی جان کے ساتھ سکول جانے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں کچھ ڈھیلے ڈھیلے تھے۔ کبھی بغل میں سے بستہ سرک جائے کبھی تختی پھسل جائے۔ کبھی میں گر پڑوں۔ چنانچہ بھائی میرا بستہ خود اٹھا لیتے اور انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ چلاتے۔

جب میں نے سڑک پر جم جم کر پاؤں رکھنا سیکھ لیا تو بھائی جان نے اپنا بوجھ مجھ پر لادنا شروع کر دیا۔ اب ان کا بستہ میں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ کبھی ان کو سکول جاتے ہوئے کچھ اور لڑکے مل جاتے تو یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے۔ میں بعد میں ہانپتا اور روتے روتے سکول پہنچتا۔

سکول میں سالانہ جلسہ ہوا۔ اس وقت ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل تھے اور وہی جلسے کے صدر تھے۔ شہر کے تمام رؤسا اور حکام جلسے میں شریک تھے۔ ہمارے والد بھی تشریف رکھتے تھے۔ سکول کے کئی لڑکوں نے نظمیں پڑھیں۔ بھائی جان نے بھی انگریزی میں ایک نظم پڑھی۔ ان کی خواندگی کی بہت داد دی گئی۔ سر جارج روس کیپل بھی بہت خوش ہوئے۔

جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ ٹولیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے یا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ بھائی جان اور میں والد کے پاس کھڑے تھے۔ لوگ والد کو مبارکباد دے رہے تھے اور بھائی جان کو پیار کر رہے تھے کہ اتنے میں بھائی جان کی ڈھونڈیا پڑی۔ ہمارے ایک ماسٹر صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور کہا "چلو پیر احمد لاٹ صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں بھائی جان کو لیے ہوئے جلدی جلدی وہیں گیا جہاں ہم پہنچے کہ بیچ میں سر جارج روس کیپل کھڑے تھے۔ والد آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے آنے لگے۔ جب سر جارج روس کیپل نے بھائی جان کو دیکھا تو آگے بڑھے اور بھائی جان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انگریزی میں کہا۔ "تم نے نظم بہت اچھی طرح پڑھی۔ تمہارا لہجہ بھی اچھا ہے اور تلفظ بھی۔ شاباش۔"

اتنے میں والد بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ سر جارج روس کیپل نے میرے والد سے مصافحہ کیا اور بھائی جان کے متعلق تعریفی جملے پشتو میں کہے۔ والد نے کہا "صاحب جو لفظ کہہ رہے ہو یہیں لکھ دو تا کہ یہ لڑکا تمام عمر زمانے کے کی لاج رکھے۔"

سر جارج نے بھائی کی بغل سے انعام کی کتابوں کے بنڈل میں سے ایک کتاب کی جلد کے اندر کی طرف پنسل سے یہ الفاظ لکھے۔

"اے کاش میں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر۔ پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے۔"

یہ سند بہت مدت تک والد نے سنبھال کر رکھی تھی۔ اگلے دن صوبہ سرحد کے واحد اخبار "افغان" میں اس سند کی کہانی شائع ہوئی۔ عنوان تھا۔

"چھوٹا پیر ——— پیر احمد شاہ"

بھائی بڑے ہوتے گئے اور ہر سال سکول میں انعام پاتے رہے ——— میں بھی پانچویں سوار کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ہمارے ایک بڑے بھائی تھے۔ پیر محمد شاہ اللہ انہیں غریق رحمت کرے بہت تیز مزاج بزرگ تھے۔ ہم دونوں کو ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ لیکن کئی باتوں میں ہم ان کی پیروی بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان کو انگریزی ڈھب کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ ہم کو بھی یہ شوق لاحق ہوا۔ وہ شعر کہتے تھے اس لئے والد کے منظور نظر تھے۔ ہم دونوں نے بھی شعر کی طرف توجہ کی۔ جب ہماری شعر گوئی کی خبر بڑے بھائی تک پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور والد نے بھی اس بات کو نہ سراہا کہ ہم سکول کا کام

چھوڑ کر شعر و شاعری میں پڑ جاتیں۔ جو والد شعر کہتے تھے۔ لیکن بچوں میں سے کسی اور کا شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہونا ممنوع تھا۔ شروع ہی سے انھیں پسند نہ آتا تھا۔ بھائی شعر کہتے مگر انھیں فضول سمجھ کر پھاڑ دیتے۔ میں شعر کہتا اور فضول بھی کہتا تو لوگوں کو سناتا۔ میں نے بہت سے تخلص رکھے۔ ناثر۔ ذوالفقار۔ واجد۔ ان گمراں میں سے کوئی مجھے پسند نہ آیا نہ میرے بھائی کو۔ ایک دن جب اس تخلص کا جھگڑا درپیش تھا تو کہنے لگے تخلص کیوں ضروری ہے۔ میں نے کہا مقطع کے لئے۔ پھر کہا مقطع کیوں ضروری ہے، میں نے کہا تاکہ معلوم ہو کہ غزل کس کی ہے اور کہا باقی شعر میں چپ ہو گیا۔ اور تخلص رکھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

— —

الف۔ اے پاس کرنے کے بعد بھائی جان گورنمنٹ کالج [illegible] میں داخل ہو گئے اور ان کے خط آنے لگے۔ ایک خط میں بھائی نے مجھے لکھا کہ میں نے یہاں راجا غضنفر علی خان اور پنڈت اوتار لال بقایا کو دوست بنایا ہے۔ راجا غضنفر علیخاں تو بہت برے ہیں لیکن پنڈت اوتار لال بہت خوب گاتے ہیں اور باجا بھی بجاتے ہیں۔ میں نے بانسری بجانی سیکھ لی ہے اور ان کے باجے کے ساتھ بانسری بجاتا ہوں۔ بھائی نے مجھے تاکید کی کہ اس بات کو صرف اپنے تک رکھوں۔

———

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

سر ظفر اللہ خاں

احمد شاہ بخاری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء کے آخری ایام میں ہوئی جب وہ (لاہور میں) کالج کے طالب علم تھے۔ میری ان کی رفاقت چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ ابتدائی دور ہی میں ان کے چٹکلے اور حسن ہر اس شخص کا دل موہ لیتے تھے جسے ان کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا۔ انگریزی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی یہ امتیازی خصوصیت کیمبرج اور بالآخر امریکہ میں بھی برابر قائم رہی۔

بخاری ہر اس صحبت یا اجتماع کی روح رواں ہوتے تھے جس میں انہیں شامل ہونے کا موقع ملتا تھا۔ وہ بڑے تیز فہم اور حاضر جواب تھے ان کی شخصیت گوناگوں صفات حسنہ کی حامل تھی۔ انگریزی زبان پر قدرت، ہر دور کے انگریزی ادب سے قریبی واقفیت، ملٹن اور شیکسپیئر کی تصانیف سے گہری شیفتگی یہ ایسی خصوصیات ہیں جو بخاری کی شخصیت میں متوازن طور پر جمع ہو گئی تھیں۔ اور ان کی گفتگو، حاضر جوابی، مکالمے اور مباحثے کے دوران پھلجھڑیاں بن کر اپنے اظہار کی راہیں تلاش کر لیتی تھیں۔ اسی طرح اردو میں بے تکلف اظہار اور اس کی آمد برابر کا درست سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم نہیں، لیکن بخاری بانسری بجانے میں بھی قابلِ تعریف مہارت رکھتے تھے۔

وہ مغربی پاکستان کی قدیم ترین تعلیمی درسگاہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے انگریزی کے پروفیسر اور بعد میں پرنسپل مقرر کئے گئے۔ یہ بات انگریزی زبان اور ادب میں ان کے بلند مقام کی آئینہ دار ہے۔ مگر یہ ان کے ایک جوہر کی قدردانی تھی۔ انہوں نے سفارت کے میدان میں اس کے برابر امتیازی مراتب کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر بین الاقوامی تنظیم میں داخل ہو کر اپنی زندگی کے سفر کا اعلیٰ ترین مقام پا لیا۔ زندگی کی دوڑ میں جو یکساں طور پر درخشاں تھی وہ جہاں رکے اور جس رتبے پر فائز ہوئے وہاں ہر شخص نے انہیں صفِ اول کے لوگوں میں شمار کیا۔

بخاری زندگی کے ابتدائی دور ہی میں صحت کی تشویشناک خرابی کا شکار ہو گئے تھے۔ اور عمر بھر یہ روگ پالتے رہے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں مسٹر فیلڈن کے ساتھ کام کر رہے تھے تو حیاتی لحاظ سے بہت آزردہ اور دل شکستہ رہتے تھے۔ انہیں خرابیٔ صحت کی شدید کیفیت کا مقابلہ بھی درپیش تھا جس نے بعد ازاں کم و بیش دائمی مرض کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان ایام میں انہوں نے اس مرض کے پے در پے تکلیف دہ حملوں کا مقابلہ بڑی ہمت اور پامردی سے کیا۔ اور اپنی جسمانی تکالیف کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں حائل نہ ہونے دیا۔ بعد میں جب وہ مسٹر فیلڈن کی جگہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل بنائے گئے۔ تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اس بات نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی تکلیف دہ بیماری کا مقابلہ کسی قدر کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ۱۹۵۳ء میں ان پر بیماری کا جو ناگہانی حملہ ہوا اسے ان کی مستقل رنجوری سے کوئی علاقہ تھا یا نہیں تاہم یہ حملہ شدید تھا

جس کی وجہ سے انہیں کئی ہفتے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اس صدمے سے وہ بچ گئے تو ہم سب نے اپنے آپ کو مبارک باد کا مستحق گردانا کہ وہ اپنی دلچسپی کے مختلف میدانوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں گے۔ ہم پُر امید ہو گئے کہ مناسب احتیاط سے وہ اپنی فیض رساں اور لطف اندوز زندگی کے کئی مزید سال ہمارے درمیان بسر کر سکیں گے۔

جتنا عرصہ انہوں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے کام کیا ہے مجھے ان سے بہت قریب رہنے کا موقع ملتا رہا۔ انہی دنوں مجھے بخاری کی ذہانت و تدبر کے بعض ایسے اوصاف کو بہ نظر غائر دیکھنے کا موقع ملا جو پہلے چنداں واضح اور روشن نہ تھے۔

اس اطلاع نے کہ بخاری خون کے دباؤ سے صاحبِ فراش ہو گئے مجھے اچانک صدمہ پہنچایا لیکن جب میں نے سنا کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اگرچہ انہیں تندرست ہونے کے لئے کئی ہفتے انتظار کرنا پڑا۔

تھوڑے ماہ بعد وہ اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مقرر ہو گئے۔ اس بات نے ان کے لئے موقع مہیا کیا کہ وہ اپنی قابلیت اور استعداد احسن طریقے پر پوری وسعت کے ساتھ بروئے کار لائیں۔ اقوام متحدہ میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ابھی انہوں نے اقوام متحدہ میں اپنے فرائض انجام دینے شروع نہیں کئے تھے کہ مجھے اپنے موجودہ منصب کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد مجھے بخاری سے ملنے کے مواقع بہت کم میسر آئے۔ البتہ جب کبھی میں نیویارک جاتا تھا تو ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتا تھا۔ میرے دل میں یہ خطرہ پیدا ہونے لگا تھا کہ بخاری کے قوائے جسمانی پر جو بوجھ پڑ رہا ہے وہ بہت بھاری ہے اور آخرکار ان کے دل پر اثر ڈال کر رہے گا۔ ایک اور بات جس نے میرے اس حساس خطرے کو تیز تر کیا یہ تھی کہ بخاری تنہائی محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اس حال میں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے وہ درجہ متاثر فکرمند اور غمگین ہو جاتے تھے جنہیں عام حالات میں نظرانداز کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت کا یہ رخ سنبھالا ثابت ہونے کی بجائے ان کی گرتی ہوئی صحت کی ایک علامت بن گیا۔

اچانک ان کے انتقال کی اطلاع، جو مجھے لندن کے اخبار "ٹائمز" کی وساطت سے ملی، میرے لئے صدمہ عظیم تھی۔ اس صدمے کے اثر سے میں کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی سنبھل سکا۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز عدالت کے پرائیویٹ اجلاس میں، میں اپنے پیڈ پر کچھ لکھتا رہا یہ میری عادت کے سراسر خلاف بات تھی۔ جب ختم کیا تو جو کچھ میں نے لکھا تھا اسے دیکھا وہاں یہ شعر نظر آیا ؎

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہ بخاری کے نمایاں ذہنی و فکری اوصاف کے لئے میرا لاشعوری خراجِ تحسین تھا۔ اور اس نقصان پر احساسِ رنج و الم کا اظہار، جسے ہم اس لئے زیادہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں ترقی پر سول سے لے کر بلندیوں پر پہنچنے کے وقت سے جانتے چلے آئے ہیں۔

خدا ان کی روح کو آسودگی نصیب کرے۔

(ترجمہ)

میرا نام بخاری ہے

بی۔ اے۔ ہاشمی

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"آجائیے"

"السلام علیکم . . . . اقبال ہیں؟"

"کہ وہ آپ کے سامنے ہے دیکھ لیجئے۔"

نمایاں طور پر مسکراتے ہوئے "میرا نام بخاری ہے امتیاز نے کہا تھا وہ آپ کے پاس آئیں گے تو ابھی نہیں پہنچے۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کروں۔"

"بسم اللہ۔"

یوں میری اور بخاری صاحب کی ۱۹۲۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی۔

بخاری صاحب بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی رسمی باتیں کرتے رہے پھر دلی شہر گفتگو کا موضوع بن گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک دلی کے آثار قدیمہ سے لے کر کارخانہ داروں کے طور طریق اور رہن سہن کی باتیں ہوتی رہیں۔ سورج ڈھل گیا۔ مغرب کی اذانیں ہونے لگیں۔ بخاری صاحب بولے۔ دیکھئے امتیاز نہیں آئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ زبان پر یہ لفظ تھے لیکن چہرے پر شادابی کہ اچھا کیا تیرا وقت ضائع کیا۔ پھر بولے آپ شام کو ٹہلنے نہیں جاتے۔ میں نے کہا۔ التزاماً اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ جی چاہے تو چلئے۔ یوں بخاری صاحب اور میں ٹہلنے نکلے جو پھر مہینوں لیکن بے قاعدگی سے جاری رہا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ واپس آئے تو پھر میرے کمرے میں۔ ملازم نے کہا میاں کھانا لے آؤں۔ میں نے کہا ہاں۔ اپنی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے فضا کو مخاطب بنا کر بخاری صاحب بولے اب چلنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا دال روٹی یہیں کھا لیجئے۔ انڈوں اور دہی کے اضافے کے بعد کھانا آیا۔ ہم دونوں نے معمولی اور مختصر کھانے کو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں ختم کیا۔ ساڑھے نو کے قریب بخاری صاحب بولے۔ اچھا بھائی میں چلا۔ میں گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کوارڈرینگل میں رہتا ہوں۔ میں بھی ہمراہی کے لئے ان کے ساتھ ہو لیا۔ اور نیلے گنبد کے چوک سے واپس آگیا۔

اس دن کے بعد کم و بیش بلاناغہ شام کی ملاقاتوں کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔

ہمارے ایک مشترکہ دوست کو بخاری صاحب کا اس باقاعدگی سے میرے پاس تشریف لانا کچھ گراں گذرا۔ ایک دن وہ بولے کہ دیکھو بخاری! باوجود دیرینہ رسم کے تم میرے پاس نہیں آتے اور ہاشمی کے پاس روز آتے ہو۔ بخاری صاحب نے جواب دیا ملک صاحب یہ دل لگے کے سودے

ہیں۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوں تو میرے لئے کوئی نوٹس لکھ [illegible] روزی منگنی مقرر کر دیجئے۔ سو روپیہ مہینہ پر روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے مقررہ وقت پر حاضر ہوا کروں گا۔ البتہ اتوار چھٹی کے دن نہیں۔

بخاری صاحب بڑی ہموار طبیعت کے آدمی تھے کم ہی کسی سے الجھتے تھے۔ تاہم دو چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کو [illegible] کا مذاق اڑانے کا خمیازہ سمجھ کر ایسا کرتے تھے لیکن جب گرم ہوتے تو بہت گرم ہو جاتے [illegible]

بیدل صاحب اس زمانہ میں نارمل سے [illegible] مسلم ہوٹل میں رہتے تھے۔ ان سے پاس کبھی کبھی امتیاز بخاری [illegible] دوست ملنے جایا کرتے تھے ایک دن بیدل صاحب نے [illegible] شفقت [illegible] کے کھانے پر مدعو کیا کھانا شروع ہوا تو بیدل صاحب کو خیال آیا کہ بخاری صاحب کو دہی سے بہت رغبت ہے بولے آپ لوگ دہی کھاتے ہیں [illegible] سب نے عرض کیا جی ہاں بیدل صاحب نے آواز دی [illegible] ایک آنے کا دہی لے آ [illegible] لیکن ایک آنے کا دہی تو [illegible] ایک [illegible] آنے کا ہوتا تھا بخاری صاحب بولے۔ بیدل صاحب یہ دہی کیا منے کے لئے منگایا ہے۔ بیدل صاحب ذرا تنک مزاج تھے برہم ہو گئے بخاری صاحب نے بھی خلاف معمول برہمی کا جواب برہمی سے دیا۔ بہرحال بات آئی گئی ہوئی لیکن لوگ [illegible] ہوا کرتے۔

بخاری صاحب غیر ارادی طور پر ہمیشہ محفل کی توجہ کا مرکز خود ہی رہنا چاہتے تھے۔ کبھی علمی مشغلوں کی چاشنی اور کبھی مشغلوں میں عمر کی تاک [illegible] کے الٹ پھیر بات کی برجستگی سے ذہانت [illegible] معصوم روشنی سے وہ ہر بات اور ہر حرکت میں [illegible] جو بیٹھتے تھے محفل کی نگاہیں اور کان ان کے لئے وقف ہو جاتے تھے۔

ایکٹر اور تمثیل کار ایک معنوں میں خوش نصیب ہوتے ہیں وہ اپنی پسند کے مطابق اپنے پارٹ تجویز کرتے ہیں کبھی تخت شاہی اور کبھی کاسۂ گدائی کبھی ہر وقت خوش باشی اور خوش کامی اور کبھی ہجوم مصائب و آلام۔ لیکن زندگی کا رنگ نرالا ہے اس میں اپنی پسند اور انتخاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ اس میں رنج اور خوشی توام ہیں۔ تاہم ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی زندگی کو تمثیل کاری بنا لے مقصود صرف یہ ہو جائے کہ زندگی کا صرف ایک رخ پیش کرے جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہو بخاری صاحب کی زندگی کا فلسفہ اور شیوہ یہی تھا۔ تاہم ان کے نیازمندوں میں دو تین ایسے شخص بھی تھے جن کے سامنے وہ دکھ سے رو دئے ہوں یا خوشی سے ہنس پڑے ہوں۔ شاذ و نادر ہی سہی لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ چہکنے والا بخاری اور ہر بات میں امرت گھولنے والا بخاری اپنے کسی نیازمند کے پاس آدھ آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھا رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس کا دل اس کی زبان سے زیادہ طاقت اور ندرت سے اپنی کہتا تھا۔ اور دوسروں کی سنتا تھا۔ یہ لمحے اس کے نیازمندوں کو نہیں بھول سکتے اور خواہ کوئی خود کو کتنا ہی زبان آور اور قلم کا دھنی کہے، بیان نہیں کئے جا سکتے۔

محبت کے فسانے دیدہ و دل کی امانت ہیں
خیانت ہے زباں کو محرم اسرار کر لینا

بخاری صاحب احسان فراموش نہیں تھے لیکن احسان مندی کے اعلان کے بھی قائل نہ تھے ان کی رائے میں اظہار احسان مندی محسن کو خفیف اور خود کو بھکاری بنا دینے کے مترادف تھا۔ محکمہ تعلیم اور پھر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں وہ ہمیشہ جو کھم اٹھاتے رہے لیکن یہ کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ عمر یا زید سے برسر پیکار ہیں۔ ایک بار ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں دشمن نے نرغہ کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ایک مسلمان ممبر نے بے طلب درخواست پانسہ بخاری صاحب کے حق میں پلٹ دیا اور یوں بخاری صاحب نے تشویش سے نجات پائی لیکن اس کے بعد بخاری صاحب ان

صاحب کے سامنے بیٹھنے سے بچتے رہتے ہیں۔ اس قصے سے آگاہ ہو کر ایک دن میں نے بخاری صاحب سے کہا: دیکھو لوگ تمہاری بے مروتی اور تم پر دعویٰ کرتے ہیں۔ تم تو سامنے سے گزر جاتے ہو اور سلام دعا بھی نہیں کرتے۔ وہ تمہارے شکریہ کے محتاج نہیں لیکن تمہاری شرافت کا تو یہی تقاضا ہونا چاہئے کہ تم شکر گزار ہو۔ بولے بہت اچھا۔ پرانے زمانے کے بزرگ ہیں۔ بے شک انہوں نے کرم فرمایا تھا ان کے احساس خوش گواری اور دل بستگی مندی کو میں شکریہ کے چند جملے کہہ کر کیوں ضائع کروں۔

دوران ملازمت میں ہر ملازم کی طرح بخاری صاحب کو بھی اکثر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے مستعد رہنا پڑتا تھا۔ ان کے اختیار کی پڑتال تھی۔ گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کے چیئرمین کی جگہ خالی ہوئی۔ بخاری صاحب کو نظر انداز کر کے ایک فرنگی کو چیئرمین بنا دیا گیا۔ بخاری صاحب نے پرنسپل سے تحریری احتجاج کیا۔ اس نے اپنے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے بخاری صاحب کی درخواست ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس بھیج دی۔ ڈائریکٹر نے بھی پرنسپل کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ بخاری صاحب نچلے نہ بیٹھے اور درخواست صوبے کے گورنر کو مکانہ دینے سے ارسال کر دی۔ گورنر نے روبکاری کو بلایا اور کہا کہ گورنمنٹ کالج میں تو انگریزی کا چیئرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیے۔ بخاری صاحب نے جواب دیا، حضور کا ارشاد بجا لیکن اگر گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کا چیئرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیے تو اس انگریز کے پاس انگریزی کی فرسٹ کلاس ڈگری بھی ہونا چاہیے۔ بخاری صاحب کی ڈگری فرسٹ کلاس تھی اور دوسرے شخص کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ فرنگی گورنر نے تالی بجا کر کہا کہ ملاقات نعرہ تحسین کے بعد ختم کی جاتی ہے اور بخاری صاحب شعبہ انگریزی کے چیئرمین ہو گئے۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے ایک دو سال اچھے خاصے بدمزہ سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی اپنی پریشانی کا حال بیان نہیں کیا۔ اپنے تمام حربے استعمال کرتے رہے اور آخر کار تمام دشواریوں پر فتح پائی۔ ان کے ایک مہمانے کا قصہ سنیے۔ —

میں لاہور سے دلی گیا ہوا تھا۔ صرف ایک آدھ روز کے لئے۔ بغیر اطلاع بخاری صاحب سے ملنے ان کے دفتر پہنچا۔ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ محکمے کے فرنگی افسر اعلیٰ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان کی اور میری بے تکلف ملاقات تھی وہ سمجھے کہ میں ان سے ملنے کو آیا ہوں۔ نہایت گرمجوشی سے ملے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد جب انہوں نے اپنے کمرے میں چلنے کو کہا تو میں نے بتایا کہ میرا مقصود اس وقت بخاری صاحب ہیں۔ یہ بات ان کے لئے بھی لیکن عنش زوده کرنے کے لئے اس نے سلسلہ گفتگو دراز کر دیا۔ اچھے خاصے پندرہ منٹ کھڑے کھڑے اور باتیں کرتے گزر گئے تو بولا چلو میں تمہیں بخاری کے کمرے میں پہنچا دوں۔ بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میرے اچانک پہنچنے پر متعجب اور خوش ہوئے۔ فوراً غالب کا مصرع پڑھا۔

آئے خدا کرے یہاں پر نہ کرے خدا کریوں

مجھے بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچا کر فرنگی رخصت ہو گیا۔ ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ لیکن چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ صاحب پھر آ گئے۔ کاروباری بات کی وجہ سے معافی مانگتے ہوئے بخاری صاحب سے مخاطب ہوئے کہ ایک ضروری دورے پر وہ اگلے ہفتہ خود مدراس جائیں گے اور اس لئے بخاری صاحب کے پیش نظر جو بھی پروگرام ہو وہ منسوخ کر دیا جائے۔ چونکہ بخاری صاحب کو دفتر میں موجود رہنا ہوگا۔ نہایت خوش ہو کر بخاری صاحب بولے۔ آپ ضرور مدراس جائیے شکر کا مقام ہے کہ میں گرمی کے زمانے میں ریل میں بیٹھ کر ریگستان کی خاک پھانکنے سے بچ گیا۔ دلی کا خوش گوار موسم، دفتر کا دل پسند کمرہ، میں نہایت خوشی سے دفتر میں رہوں گا۔

وہ فرنگی افسر اعلیٰ بخاری صاحب کو میرے آگے ہلکا بنانے آیا تھا لیکن خود سبک ہو کر واپس ہو گیا۔ اگر خواشیدہ ماہت قصد خراش۔

دس منٹ کے بعد پھر آیا اور بولا بخاری صاحب سے مجھ کو ملاقات دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ گلے بعد بیچ و معاملات کے لیے میری رائے میں موجودگی ضروری ہو گی، اس لیے اب تم ہی دو سے پڑھا ساں چلے جاؤ۔ بخاری صاحب اچھل پڑے۔ تالیاں بجانے لگے "اللہ، وہ لڑکے جیسے جھومتے ہوئے درخت۔ وہ نیلا سمندر، وہ خاموش فضائیں وہ فلاں، وہ فلاں سے ملاقات یقین کا زمرہ ... یاد ہے؟" اس شخص نے بھونچکا ہو کر بخاری صاحب کا منہ دیکھا اور کچھ کہے بغیر کلٹی گرتے کرتے چلا گیا۔

میں اس ڈرامے کا تماشائی تھا۔ بخاری صاحب بولے بھائی اگر یہ سال بھر اور رہ گیا تو یہاں سے پاگل ہو کے جائے گا۔

تقریباً سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں لیکن ان اثنا میں دنیا کا نقشہ بدل چکا ... کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ اور بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے فرسٹ اے ... مقرر ہوئے۔

بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل ہو گئے لیکن وجود یہ زمانہ بخاری صاحب کے دوستوں اور بخاری صاحب کے لیے خود ایک آزمائش کا دور تھا۔ آل انڈیا ریڈیو ایک نیا ادارہ تھا سب سے پہلے اور بڑھنے والا محکمہ تھا۔ روز نئی نئی نوکریاں نکلتی تھیں اور ہر نوجوان اس محکمہ میں نوکری کا خواہش مند تھا۔

بخاری صاحب کے دوستوں نے بے شمار تعلقات میں سفارشی خطوط لکھنے شروع کیے اور اپنے اپنے امیدواروں کی ناکامی پر ابتدا میں خفیف سی خفگی اور بعد ازاں رنجش کا اظہار شروع کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے کبھی کسی کی سفارش بخاری صاحب سے نہ کی لیکن ایک روز گفتگو کرتے ہوئے میں نے ان سے عرض کیا کہ مرحوم فلاں دوست نے جو ہمارا محترم اور محسن ہے اپنے بیٹے کے لیے تمہیں لکھا اور تم آئیں بائیں شائیں کر گئے۔ یہ کیا طور ہے صاف لکھ دیتے کہ اس کو ملازمت دینا ممکن نہیں لیکن بیت دعل میں ڈال دینا قطعی غلط ہے۔ بخاری صاحب نے جواب کی تمہید میں سرکاری قسم کی توجیہات پیش کیں جن سے ہر سرکاری ملازم واقف ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ بھائی ہر ایک خواہش مند کو نوکری کہاں سے ... البتہ میں اس کی ... کوتاہی کو اور ذرائع سے پورا کر دیتا ہوں۔ مثلاً کوئی فلاں صاحب کا خط لائے تو میں کہہ دوں گا۔ دفتر میں خط لائیے۔ اور فلاں صاحب کا خط ہو تو کھول کر پڑھتا ہوں برآمدے میں آ کر عرض گزار ہوں سے ملاقات کروں گا۔ غرضیکہ اسی طرح کسی سے دفتر کے کمرے میں اور کسی سے ڈرائنگ روم میں ملتا ہوں بہت محترم اور عزیز دوستوں کے سفارشیوں کو گھر پر ٹھہرا بھی لیتا ہوں۔ موٹر میں صفدر جنگ اور ہمایوں کے مقبرے کی سیر بھی کرا دیتا ہوں۔ نہایت لذیذ گفتگو کے بعد بولے کہ بھائی سفارشی خطوط کی پذیرائی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔

بخاری صاحب نے شعر و نثر میں بہت ہی کم لکھا ہے شعر میں ایک نظم جس کا عنوان میں بھول رہا ہوں اور جو شاید کبھی چھپی بھی نہیں دو تین غزلیں اور چند متفرق شعر۔ نثر میں پطرس کے مضامین کے علاوہ ایک کہانی عشق کی خودکشی، چند متفرق مضامین جو مختلف رسالوں میں چھپے اور گالزوردی کا ایک ترجمہ سیب کا درخت۔ مجھے یاد نہیں کہ انگریزی میں ایک دو مضمون کے علاوہ جو پاکستان ٹائمز میں چھپے اور کوئی چیز بخاری صاحب نے لکھی ہو۔ اس سرمایۂ ادب کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت اس کا انوکھا پن ہے .... وہ بیس تیس بلکہ چالیس پچاس شعر کہتے۔ دو ایک دوستوں کو ایک ایک کر کے کبھی ایک کبھی دوسرا شعر سناتے۔ تنقید سے مستفیض ہوتے جو شعر معیار پر پورا اترتا اسے رکھتے اور باقی اس طرح بھول جاتے، جیسے کبھی کہے ہی نہ تھے۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ بخاری صاحب پر بحیثیت ادیب یا نقاد کچھ عرض کروں۔ مجھ سے بہتر بہت سے حضرات ہیں جو مبسوط مضامین تحریر فرمائیں گے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ بخاری صاحب کو قدرت نے یہ دولت فراوانی سے عطا فرمائی تھی کہ وہ چھپے ہوئے کرنوں میں اپنی ذہانت کی لہ

روشنی ڈال دیں۔ ان کے سارے گوشوں کو منور کر دیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔

بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔ اعلانِ آزادی کے بعد گورنمنٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے تو پھر طالب علمی کے زمانے سے ملتی جلتی محفلیں گرم کرنے کی سوجھی۔ میں اس زمانے میں ٹریننگ کالج میں تھا اور اس سے بہرطور ان کے بہت قریب۔ سال ڈیڑھ سال ایسا گذرا کہ میں دائم و دل دادہ تھا۔ ان دنوں میں ہم دونوں کو بہت سی آسانیاں میسر تھیں، اس لیے بلا لحاظ وقت یا قید لباس جب جی میں آیا ایک دوسرے کے پاس پہنچ گئے۔ شام کے بعد از رات گئے تک کی صحبتوں میں میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اس معاملے میں کچا ہوں۔ اس لیے اس وقت بخاری صاحب ہوا میں میرا ... ہم اُدھر دوستوں پر پرورش کیا کرتے تھے بلکہ ملاقاتوں کو یقینی بنانے کے لیے انہوں نے ہر دس پندرہ دن کے بعد اپنے گھر پر ان سے کھانے کی دعوتوں کا سلسلہ شروع کیا جو کئی مہینے چلا۔ ان دعوتوں میں ان کے پانچ چھ نیاز مند شریک ہوتے تھے۔ ان موقعوں پر وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے: میرے دوستوں کا خون سفید ہے۔ کھانے کو بلاؤ تو بلا تامل آ بیٹھتے ہیں، ویسے ادھر کا کبھی رخ بھی نہیں کرتے۔ دس بارہ برس گذر گئے لیکن سے

کسے کہ محرم باد صبا است میداند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی است

یہ قصے کہاں تک لکھے جاؤں۔ اگر اس زمانے میں تنہائی عدیم الفرصتی نہ ہوتی تو بھی یہ داستان اتنی طویل ہے کہ اس کا لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔

ایک بار میں نے بخاری صاحب سے کہا کہ میرے نزدیک "کلچرڈ" آدمی کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ تنہائی سے نہ گھبرائے اور آپ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی سے خوف زدہ رہتے ہیں یعنی میرے نزدیک آپ کلچرڈ آدمی نہیں ہیں یا میری "کلچرڈ" ہونے کی تعریف غلط ہے۔ باوجود میرے کچھ کہنے کے کوئی جواب نہ دیا۔ چہرے پر افسردگی نمایاں ہو گئی۔ میرا گمان ہے کہ بخاری صاحب کے تحت الشعور میں ان کی زندگی کے کم از کم آخری دس پندرہ سالوں میں جان لیوا مرض کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ضبط نے کبھی انہیں اجازت نہ دی کہ وہ اس کو ظاہر کریں۔ لیکن وہ ہمیشہ انجام مرض سے خائف رہے۔

اس دن کے بعد میں نے اس قسم کی کوئی بات بخاری صاحب سے نہ کی۔

گورستانِ ادب کا فقیر

عبدالمجید سالک

مسلم ٹاؤن لاہور

عزیزمی۔ السلام علیکم

آپ نے دو تین خط لکھے لیکن میں کسی ایک کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ حالانکہ یہ کوتاہی میری وضع کے خلاف ہے۔ بخاری کا مرنا، میری محفلِ احباب کا قطعی طور پر اجڑ جانا ہے۔ زندگی بالکل بے مزہ و بے رنگ ہو کر رہ گئی۔

آپ کو غالباً معلوم نہیں، میں کوئی سال بھر سے عوارضِ قلب میں مبتلا ہوں۔ لکھنا پڑھنا چھوٹ چکا ہے۔ مگر کبھی کبھار ایک آدھ شذرہ تو ہفتہ میں لکھ لیتا ہوں اور بس۔ آج کل بلڈ پریشر میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر محمد یوسف مہینوں سے علاج کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے مضمون کی فرمائش کرتے ہیں تو بے حد شرمندہ ہوتا ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ تعمیلِ حکم کر سکوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو شاید کچھ لکھ دوں۔ نہ ہوا تو معذور جان کر معاف فرما دیجئے گا۔

عبدالمجید سالک

مولانا عبدالمجید سالک کا یہ خط مجھے ۱۳ر دسمبر ۵۸ء کو ملا تھا۔ مگر اس عرصے میں مولانا موصوف کی صحت اور بگڑ گئی، اتنی بگڑی کہ ہم لوگ دم سادھ کے رہ گئے۔ مضمون لکھوانا تو درکنار، ہمیں اپنی زندگی ان کے حساب میں جمع کرانا پڑی۔ تب کہیں انہیں دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

ابھی دو چار روز کی بات ہے کہ میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ان کی صحت اچھی ہوئی تو پھر بخاری پر لکھنے کے لئے کچھ عرض کروں گا۔ انہیں دیکھا تو کچھ کہا نہ گیا۔ دل کی دل ہی میں لے کے واپس آ گیا۔

بخاری صاحب کے جتنے گہرے تعلقات مولانا عبدالمجید سالک سے تھے۔ اتنے اور کسی سے نہ تھے۔ دین کے تھے تو یہ، دنیا کے تھے تو یہ، دوست تھے تو یہ، بھائی تھے تو یہ، مشیر تھے تو یہ، استاد تھے تو یہ، گویا سب کچھ بخاری صاحب کے لئے سالک صاحب ہی تھے۔

بیماری نے انہیں اس حد تک نڈھال کر دیا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ پطرس کے لئے کچھ نہیں لکھ سکے حالانکہ اتنا کچھ لکھنا چاہتے ہیں کہ آپ پڑھ پڑھ کر خوش ہوں اور یہ لکھ لکھ کر۔

مجبوری کے عالم میں مولانا موصوف کی دو چھوٹی چھوٹی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک تو بخاری کی وفات پر ریڈیو پاکستان کا پیغام ہے، دوسری ایک ادھ مطبوعہ تحریر جس میں پطرس بھی ہے اور مجید بھی۔

(محمد طفیل)

(۱)

احمد شاہ بخاری کی موت پاکستان میں علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے۔ اس کے دوست اشکبار ہیں اور پورا ملک ناقابلِ تلافی نقصان پر ششدر و مبہوت ہو رہا ہے۔ اس بے نظیر قابلیت کے افراد ہمارے ملک میں نایاب ہیں جو زندگی کی ہر مصروفیت میں اپنے اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئیں۔ بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر کی حیثیت سے، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے، پھر اپنے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے، اس کے بعد اقوامِ متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت سے۔ جہاں کہیں بھی رہے سربلند و ممتاز اور نمایاں رہے۔ وہ ادب و انشا، طنز و مزاح اور تنقید عالیہ میں دور دور تک اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ صرف پاکستان ہی میں نہیں، بلکہ پورے برصغیر میں بخاری کے بیسیوں شاگرد اپنی اپنی حکومتوں کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اور بہترین خدمات بجا لا کر اپنے عالی قدر استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بخاری نے ادب و انشا میں بہت قلیل سرمایہ چھوڑا ہے۔ لیکن اس کے قلم سے جو چند تنقیدی مضامین اور جو ایک دو کتابیں نکلیں وہ ہمیشہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں کو صحیح الخیالی اور بالغ نظری کا سبق دیتی رہیں گی۔ اور پاکستان ہمیشہ اپنے اس عدیم المثال اور عالی دماغ فرزند پر ناز کرتا رہے گا۔

(۲)

جن دنوں میں کراچی میں مقیم تھا۔ بخاری مرحوم پاکستان آئے تو چند روز کراچی میں فروکش رہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہیئے کوئی نیا دوست بھی بنایا۔ میں نے کہا کیسی باتیں کرتے ہو۔ کبھی دوست بھی بنائے جاتے ہیں اور خصوصاً اس عمر میں؟ دوست تو نوجوانی میں میسر آتے ہیں۔ اور خود بخود بن جاتے ہیں۔ البتہ بعض مخلص نوجوان زندگی کے ہر حصے میں ملتے ہیں جن کے خلوص پر جان قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً تم نے مجید لاہوری کا نام سنا ہوگا۔ کراچی میں یہ شخص میرا انتہا رفیق اور دوست ہے۔ اسے عالم اور ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں۔ لیکن طبیعت کی جودت کی وجہ سے اچھے اچھے عالم اور ادیب اس کی قدر کرتے ہیں۔ کہنے لگے تو پھر ہم سے اس کی ملاقات ضرور کرا دیجئے۔

ایک دن میں مجید کو لے کر برسٹل ہوٹل کے پاس بخاری کے ہاں گیا۔ "جنگ" کا "حرف و حکایت" تو پڑھتے ہی تھے۔ اب اس کے مصنف کو دیکھا تو بے حد نہال ہوئے اور جب باتیں سنیں تو اور بھی زیادہ فریفتہ ہوئے۔ مجید کی بھولی بھالی صورت، اس کے بے ضرر تفنن اور مخلصانہ سادگی کی وجہ سے پہلی ہی ملاقات میں اس سے یوں پیار کرنے لگے۔ جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ مجید کی نظمیں سنیں تو اور بھی لٹو ہوئے۔ اس کے بعد قرار پایا کہ ہر روز رات کے وقت کھانے کے بعد سالک کے مکان پر "خلوتِ اُنس" برپا ہوا کرے۔ جس میں بخاری اور مجید کے سوا کوئی نہ ہو۔ چنانچہ عقب ریڈیو سٹیشن والے مکان میں یہ نشست باقاعدہ منعقد ہونے لگی۔ خشک پھل کی پلیٹیں تپائیوں پر پڑی ہوتیں۔ چلغوزوں کا انبار موجود ہوتا اور نمکین اور گرما گرم کشمیری چائے کے بھرے ہوئے تھرمس تیار رہتے۔ بخاری، مجید اور میں چائے کی چسکیاں لیتے، چلغوزے کھاتے اور غزلیں پڑھتے۔ یہ صحبت بعض اوقات دو دو بجے رات کو ختم ہوتی۔

ان صحبتوں میں مجید کراچی کی سیاسیات، پاکستان کے بعض اکابر کی خصوصیات اور بعض ادبی، مجلسی اور اقتصادی (یعنی تجارتی) شخصیتوں

کے لطیفے اپنے مخصوص انداز میں سناتا۔ بخاری بے حد شگفتہ ہوتے۔ دونوں ہم مذاق اور ایک سے مطالعات کی چنگاریاں گرتے اور دن یادوں سے اپنے خیال پر وہ زندگی کی ویرانیوں کو لالہ زار بناتے اور پھر جب رات بوڑھی ہونے لگتی تو بخاری مجید کو اپنی موٹر کار میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچاتے اور پھر اپنے گھر جاتے۔

جب تک مجید زندہ رہے بخاری پروانہ وار شیفتہ رہے اور بخاری بھی نیویارک سے جب کوئی خط لکھتے تھے مجید کا حال ضرور پوچھتے اور سلمان، مجیب کا تقاضا کرتے چنانچہ ہم تک بیان جائے پہنچے جمع لے کے دوست فاروقی نے ریڈنگ بک میں بخاری کو ارسال کر دیتے۔

مجید کے انتقال پر بخاری اس قدر غمزدہ ہوئے کہ ان کا خط جو میرے نام آیا خون رُلاتا ہوا معلوم ہوتا تھا

ابھی حسرت و مجید کا ماتم ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ہم لوگوں کو بخاری جیسے عظیم الشان دوست اور عظیم الشان انسان کے فقدان پر سینہ کوبی کرنی پڑی۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ گویا گورستانِ ادب کا فقیر ہوں جنازے دھڑا دھڑ آرہے ہیں یہاں تک کہ میں دفن کرتے کرتے تھک گیا ہوں چاروں طرف نظر میں ڈالتا ہوں تو تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

زندگی کی شاہراہ تو اودن کے آفتاب کی تمازت سے تپ رہی ہے۔ آہ! اے موت کی سایہ دار سرزمین تو کہاں ہے؟ کہ راہِ حیات کے مسافر تیری ٹھنڈی چھاؤں میں آرام پا سکیں۔ وہ ان گئے گزروں سے جا ملیں جو اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے اس تیرہ خاکدان سے نجات پا کر جا چکے ہیں ؎

یارانِ موافق ہمہ از دست شدند — از دستِ اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر — یک دو ز ما پیشترک مست شدند

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

رشید احمد صدیقی

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) دفعتہً ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالے نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لئے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آراکس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگتا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے "ساقی" میں پطرس کا مضمون "کتے" پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا۔ ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پُرپیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن و تشنیع کسے نہیں آتی۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہئے کس پر ہنسنا چاہئے کتنا ہنسنا چاہئے اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہئے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح ہنستے ہیں ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو۔ بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمہ داریوں کا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں۔ صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح و تفنن۔ ان کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِ عمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو ابھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فن کار کا جیسا ردِ عمل ہوا ہے اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے یعنی فن کار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے۔ نادانستہ طور پر یہ بحث اس منزل پر آگئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا

ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن اور شخصیت سے توانائی۔ وہ توانائی ملتی ہے۔ وہ فن کی غلامی شخصیت کی نااہلی کی دلیل ہے۔ فن ٹیکنیکل اور میکینکل ہوتا ہے اور شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے کہ سامنے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں۔ جن پر طنز و ظرافت کامل کوشش کئے بغیر بھی کار آمد ہو سکتا ہے مثلاً بیوی، نرس، مولوی، والدین، فرمس، مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری، اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے جیسے کسی گھٹیا درجے کے شاعر کو اس سے زیادہ گھٹیا شعر پر اسی طرح کے حاضرین داد دیتے ہیں۔ مضحک کو مضحک دکھلانے یا بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ سستا اور نقلی کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں۔ وہ اچھے رہتے اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، روایتی کرداروں اور نقلی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں انہوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے جیسے "صحرا کو مسکرا کے گلستاں بنا دیا" ہو۔ بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے مرکب نہیں۔ بعض اطبا بڑے سے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ بعض دوسرے معمولی امراض کے لئے بھی مرکب دوائیں مثلاً معجون، گولیاں، کشتہ جات تجویز کرتے ہیں۔ علاج دونوں مستند ہیں لیکن اول الذکر زیادہ مشکل اس لئے زیادہ قابل تعریف ہے۔ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں۔ اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر، بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری کی ظرافت نگاری کی مثال داغ کی غزل اور مرزا شوق کی مثنوی سے دے سکتے ہیں جس طرح ان بے نظیر فن کاروں نے ماجرائے حسن و عشق کو قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی رکھا ہے مزرع آخرت بنانے کی کوشش نہیں کی اسی طرح بخاری نے ظرافت کو زمینی و زمانی ہی رکھا ماورائی و لامکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں۔ اور جلد کہہ دیتے ہیں۔ انتظار کرنے اور سوچ میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور لسانیاتی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسخر رکھنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

بعض مشاہیر کو کبھی کبھی اس شوق میں بھی مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ بدیہہ گو، بذلہ سنج اور داستان طراز بھی سمجھے جائیں اس کی آسان ترکیب یہ نکالی ہے کہ بے شمار لطیفے از بر کر لئے جائیں جن کو موقع بے موقع کبھی ایسے بھونڈے طریقے سے جیسے بعض شعراء اپنا کلام سنانے کے لئے کسی شریف آدمی کو وقتاً گھیر لیتے ہیں، سناتے رہیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے ظرافت کا مدار ذوق پر ہے حافظے پر نہیں۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ خود ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے تجارت کے لئے نہیں تواضع کے لئے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر میں لطیفوں اور چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے بلکہ طباعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی۔ اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ خواں نہ تھے۔ لطیفہ طراز تھے ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف بھی پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے

ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی کلفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو

غالباً ۱۹۴۳ء میں پی۔ ای۔ این کا سالانہ اجلاس جے پور میں منعقد ہوا تھا۔ ای۔ ایم۔ فاسٹر، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، مادام [illegible] صوفیا واڈیا، مرزا اسمٰعیل، ملک راج آنند، بخاری اور کتنے اور مشاہیر علم و ادب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے شریک جلسہ تھے۔ موسم خوش گوار، جے پور کا تاریخی خوب صورت اور ستھرا شہر، ریاست کی روایتی مہمان نوازی، مرزا اسمٰعیل کا انتظام، جو اس زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ پی۔ ای۔ این کا ایسا شاندار اجلاس ہندوستان میں شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد منعقد ہوا ہو۔ تین دن تک کیسی کیسی عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ بلند پایہ مقالے پڑھے گئے۔ علمی مذاکرے رہے۔ بے تکلف ملاقاتیں اور پرتکلف دعوتیں ہوئیں۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجہ کرنے والی شخصیت، حسین و ذہین خدوخال، اجلا اور ستھرا لباس، بے تصنع خرام و تبسم، ہر شخص سے اس کے مناسب حال گفتگو ہونے کی بھی پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یونہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آ جاتے جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں ورنہ بیشتر عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقے میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے پوسٹ سنتے جو کبھی بے کارواں نہیں رہتے۔ مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئی۔ اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلہ کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ بحث تفصیل سے یاد نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ ذولسانی کشمکش ان کے فکر و نظر کو فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اس کے حسن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں دوسری طرف انگریزی ادب کے اصلی خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لیے جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پوری طرح آشنا۔ نتیجہ ظاہر ہے وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے اس لیے جدید ادب کے افکار کو پرکھنے کی صلاحیت سے بیگانہ ہیں۔ ان کا پورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بخاری کے ان خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیت دی گئی۔ اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ کتنے اہم موضوع پر کتنی فکر انگیز بات، کس وضاحت سے، کتنے بڑے مبصر نے کہی۔

آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا تو اس کے عملے کا تقرر ایک بورڈ نے کیا جس میں مسٹر فیلڈن ڈائریکٹر جنرل، بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر، لودی اور کچھ اور لوگ تھے۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ مسٹر فیلڈن تھے اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجاز مرحوم اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف آسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔ فیلڈن بڑے ذی استعداد، جری اور آزاد خیال تھے۔ ریڈیو کا کاروبار سنبھالنے ولایت سے نئے نئے آئے تھے۔ حکومت ہند کے اعلیٰ انگریز عہدہ داروں تک کی پروا نہ کرتے تھے لیکن بخاری کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اور ان کے اشاروں تک کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے امیدواروں سے ہر ممبر اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کر کے رائے قائم کرتا۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی۔ اس پر ان کا بھاری بھرکم جثہ، ایسی ہی آواز، کڑے تیور، امیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔ تھوڑی بہت ان امیدواروں پر بھی جو بعض امیدواروں کی موافقت پر مائل ہوتے۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد میری نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھا ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلہ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے آ چکے تھے۔ گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا ڈاکٹر حیدر دیکھو اگر تم نے آئندہ امیدواروں کو ڈرانے دھمکانے کا ارادہ کیا تو میں بے تامل تم کو گولی مار دوں گا۔

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پر پیچھے کی طرف لیٹ سے گئے پھر مصافحہ کے لیے

غیلڈن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید کے بیٹے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی۔ صدیقی صاحب! ذرا بیٹھو، غیلڈن کے تتانے پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ اب غیلڈن کا یہی حال تھا جو پروفیسر حمید کا تھا۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے کھیلنے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے ماہرین کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی ستاروں کی۔ بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری مشتعل ہوتے تھے نہ مایوس نہ متفکر۔ وہ ہر طرح اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ کبھی برجستہ فقروں سے، کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے۔ لیکن اس دوران میں مقصد ذہن سے کبھی غائب نہ ہوتے اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے رہتے کہ حریف کو قائل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک کار آزمودہ جنرل کی مانند۔ حریفوں کو چپ ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہوا، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے ہی۔

پر سال ایک بار آل انڈیا ریڈیو دہلی میں دیکھا جب بخاری، اس کے ڈائریکٹر جنرل اور . . . . . فنشا انچارج تھے۔ جن کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ بخاری اردو کے عاشق زار نہ تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا آئے دن وزارت سے عتاب نامے اور ملک کے گوشے گوشے سے طرح طرح کے دفعنا نازل ہوتے رہتے۔ بخاری کو ان دونوں سے نپٹنا پڑتا مگر وہ مطلق فکر مند نہیں ہوتے تھے۔ وزارت کے عتاب ناموں کو تو "نامۂ الفت" کہا کرتے تھے۔ اور دفعوں کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ان کی نفسیات وہی تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے اس مصرعے میں کیا ہے۔

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایسے وفود کا خیر مقدم وہ اس طرح کرتے جیسے اپنے بے تکلف دوستوں یا عزیز طالب علموں کو چائے پر مدعو کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک وفد باریاب ہوا۔ بخاری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ، وقت کی اہمیت کا احساس کرتے اور دلاتے ہوئے ایک مختصر لیکن لاجواب انگریزی تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور تقریر کو ختم کیا چند خوشنما توصیفی فقروں پر جس کے مخاطب وہ بھڑکے دل لیکن غبی اراکین تھے۔ جن کو متعارف ہوتے وقت انہوں نے اپنی بیخطا ذہانت سے بھانپ لیا تھا۔ بخاری کی شیریں بیانی سے وفد ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اور ممبروں کے وہ کلے اور کڑوے تیور مضمحل ہو گئے۔ جن کے ساتھ وہ مخاطب کے پرنسپے' اٹھ نے آئے تھے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، اس کو چائے، سموسوں نے پورا کر دیا جن پر بخاری کا جادو پہلے سے چل چکا تھا اور مباحثے کے دوران میں بخاری کی ناقابل بیان و ناقابل گرفت شہ پا کر جس کے وہ امام وقت تھے اپنے ساتھیوں ہی سے بہکنے اور رد و قدح کرنے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر بخاری نے پینترا بدل دیا اور ہمہ تن ان ممبروں کی تکریم و تواضع پر مائل ہو گئے۔ جو یقیناً قابل لحاظ تھے لیکن اب تک ان کو نظر انداز کر رکھا تھا ان سے ملنے اور بات کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ بڑے عالمانہ اور ماہرانہ سطح سے گفتگو شروع کی۔ اردو ہندی کے مسئلے پر جتنی کتابی، اخباری، دفتری معلومات اور طرح طرح کے شمار و اعداد اور ان سے اخذ ہوئے نتائج بخاری کے حافظے میں اور زبان پر تھے۔ ان کے نصف معنی تک بھی وفد کے ممبروں کی رسائی نہ تھی۔ پھر ان کا سریع الانتقال، اکثر شرکا اور ناقابل تسخیر ذہن اور بات منوانے کے طرح طرح کے انداز۔ بخاری کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ ٹینک میں ہر طرح کے "کیل کانٹے سے لیس" ہو کر آنے میں بخاری کے ہمسر کچھ ہی لوگ دیکھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اراکین بھی مزید عام "آگئے" اور بخاری نے "علیٰ قدر مراتب" کسی سے ہاتھ ملا کر کسی کو گلے لگا کر، کسی کی شان میں دو چار نہایت مبالغہ آمیز فقرے کہہ کر جو اتنے ہی مغالطہ انگیز بھی ہوتے، وفد کو ہنسی خوشی رخصت کر دیا۔ علیٰ قدر مراتب کا ان کا اصول اور وہ دوسروں کا المیہ یہ تھا کہ جن کو جتنا ہی مغز سمجھتے اتنا ہی زیادہ اس سے "سوگن اشفاق" ہوتے اس سے حساب لگایا جا سکتا ہے کہ جن سے انہوں نے معانقہ کیا ہوگا

اس کا ان کے ہاں کیا مرچہ رہا ہو گا۔

اس صحبت سے بخاری ہی کام لے سکتے تھے۔ ان سے ذرا بھی کم درجے کا آدمی اس صحبت کا خوشہ چیں ہوجاتا ۔ یہ اس لئے کہتا ہوں کہ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس جس طرح کے تیر تھے موقع آجانے پر انتخاب جس تیزی اور تعین سے کرتے اور جس خاموشی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ویسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ڈائریکٹر جنرل شپ کے زمانے میں ایک ہندوستانی ڈکشنری کی تالیف میں مصروف ہو گئے تھے جس میں ملک کے بعض مخلص اور مستند اہل قلم ان کے شریک کار تھے۔ یہ کام ان ہی کی نگرانی میں ہوتا تھا اس میں ان انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ہندوستانی مترادفات دیئے گئے تھے۔ جو ریڈیو اور اخبارات وغیرہ میں رائج تھے یہ کام اس زمانے میں جتنا ضروری تھا اتنا ہی نازک اور مشکل تھا اس لئے "ہندوستانی" کا لفظ یا تصور (جسے ہندی اردو کا سنگم کہتے تھے) اردو اور ہندی دونوں کے علمبرداروں کے یہاں نامقبول تھا۔ ڈکشنری کی کئی ضخیم جلدیں تھیں جو ٹائپ میں چھاپ لی گئی تھیں۔ اور نظرثانی کے لئے مختلف اصحاب کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ تمام مترادفات اس ترتیب اور وضاحت سے علیحدہ علیحدہ خانوں میں دی گئی تھیں کہ متلاشی کو انتخاب میں دقت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد معلوم نہیں اس لغت کا کیا حشر ہوا۔ مکمل ہو جاتی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے محکمہ نشر و اشاعت کے لئے بہت کار آمد اور بچھڑے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت مفید ہوتی۔

انگریزی شعر و ادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا۔ ہم سب جانتے ہیں لیکن ان کے ذوق و ذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے اردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار، گوارا، ٹھہری ہوئی اور خوش آئند فضا محسوس کرتے ہیں۔ جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسل سے انگریزی کی جھلک اردو میں دیکھ کر ان کی اردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں کہ غیر زبان کا اردو میں ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ غیر زبان کی جنس کا پتہ نہ لگے۔

انگریزی موضوعات، مفاہیم اور اسالیب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام اوروں نے بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے ایسا کرنے میں اکثر ترجمے، تفسیر یا مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں کبھی کبھی اور کچھ طور سے یا انگریزی کے مطالب کو اردو کے روائتی شاعرانہ الفاظ یا انداز میں اس درجہ شرابور کر کے پیش کریں گے کہ نہ انگریزی ذہن کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا نہ انگریزی زبان کا نہ انگریزی اسالیب کا اور نہ انگریزی فضا کا۔ بخاری کی اردو کو میں ٹکسالی نہیں کہتا لیکن انگریزی کے پرتو سے ان کی اردو اس طرح جگمگاتی ہے جیسے

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

علمی اور فلسفی کتابوں کا ترجمہ سب سے مشکل ہوتا ہے اس کے بعد میرے نزدیک یورپین زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ مشکل ہے جہاں فن، بیان و زبان اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی نازک اور ناقابل گرفت واردات کا سامنا ہوتا ہے جس طرح سیسمو گراف (زلزلہ پیما) زمین کے چھوٹے بڑے ارتعاش مرتسم کر لیتا ہے اسی طرح اچھا ڈرامہ سوسائٹی اور زندگی کے ارتعاشات کی نشان دہی کرتا ہے۔ بخاری نے انگریزی کے بعض مشہور ڈراموں کا جس خوبی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی سوسائٹی کے مزاج اور ڈرامے کی فنی نزاکتوں سے پورے طور پر واقف ہونے کے علاوہ اردو کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرنے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اردو کا کوئی معمولی واقف کار اس غیر معمولی فریضے سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی ظرافت نگاری اور انگریزی ڈراموں کے تراجم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بخاری نے اردو کی ایک نئی جنس اور ایک نئی توانائی کا انکشاف کیا ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے بخاری نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن اردو کے ادبی تنقید نگاروں میں ان کا پایہ مسلّم ہے اور یہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ بخاری نے بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے لیکن بہتوں سے اونچا مقام پایا ہے۔ گزشتہ ۲۰۔۲۵ سال میں اردو تنقید پر کافی توجہ کی گئی اور اب تو ادبی مذاکروں یا مجادلوں میں اس کا نام سرفہرست آتا ہے۔ غزل کے بعد تنقید کے فن شریف پر ہمارے قبیلۂ شعر و ادب نے سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے تنقید نگار تنقید کے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوں اور تنقید نہیں تبلیغ کرتے ہوں۔

اردو میں جدید تنقید کا بیشتر سرمایہ مغربی ہے لیکن اسے جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اس میں مغربی تنقید کی اتنی توضیح نہیں ملتی جتنا اس کا ترجمہ۔ ہمارے بعض تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی کہ مغربی تنقید کے کس اصول سے اردو کے کس صنف ادب کو پرکھیں۔ نیز مغرب میں جن اصناف ادب پر تنقید ملتی ہے ادب کی وہ صنفیں اردو میں ہیں بھی یا نہیں یا اردو میں جو صنف ادب ملتی ہے اس کے لیے مغرب نے کوئی اصول تنقید وضع بھی کیا ہے یا نہیں، ادب کہیں کا ہو کسی طرح کا ہو، تنقید مغربی ہوگی۔ کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ تکتے تکتے تھکیں گے آنسو۔

یہ بحث فرسودہ بھی ہے، تلخ بھی، شاید بے نتیجہ بھی۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بخاری اس حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تنقید وسیع ترین مفہوم میں خالص ادبی ہوتی تھیں۔ انہوں نے جس مسئلہ پر یا شخص پر لکھا ہے اس کو اپنے نقطۂ نظر کا تابع نہیں کیا ہے بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ نقطۂ نظر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مسئلے یا شخص میں خوابیدہ یا بیدار موجود ہے۔ ادبی پارکھ کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی ادبی تخلیق یا شخصیت پر قلم اٹھائے تو اس کا احاطہ اس طور پر کرے کہ جزو اور کل دونوں گرفت میں آ جائیں نہ یہ کہ جزو سے کل کی نشان دہی کرے اور کبھی کل سے جزو کو روشناس کرائے تصوف میں یہ روا ہے تنقید میں نہیں۔ ایسی تنقید یا پرکھ کے لیے ادب کی وسیع معلومات اور تنقید کے فنی اصول سے گہری واقفیت کے علاوہ ایک بڑی شرط یہ ہے کہ تنقید نگار کی نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی ہو۔

بخاری کی تنقید کا بڑا اچھا نمونہ ان کا مضمون "کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں" ہے۔ عصمت چغتائی کی تحریریں منظر عام پر آئیں تو ادبی اور غیر ادبی دونوں حلقوں میں "ایک شور طوفان خیز" اٹھا اور ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں سخت اختلاف آ گیا۔ یہ اختلاف شدت پر تھا کہ بخاری کا یہ مضمون شائع ہوا۔ بخاری نے ایسے بے لاگ تجزیہ، اتنی گہری بصیرت کے ساتھ، اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ موافق اور مخالف دونوں دم بخود ہو گئے البتہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود عصمت چغتائی کے نقطۂ نظر پر اس کا کیا اثر پڑا۔

بخاری کا مزاج مغربی نہ تھا۔ ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اردو شعر و ادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ان کا اور ان کے رفقا کا اردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے میں "نیاز مندان لاہور" کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظر انداز کرنا آسان ہوتا۔ نیاز مندوں کے جلسے میں بخاری کا انداز قدرے بے تکلف پہچانا جا سکتا تھا۔ نئی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ اس پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسید اور ان کے رفقا علی گڑھ میں، تو اردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

یہ خیال اس لیے ذہن میں آیا کہ تقسیم ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آ گئے تو اردو کو نئے حالات اور تقاضوں

سے ہم آہنگ کرنے۔ ضروری ہو تو اس کے مطابق اس کی تعلیم و ترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقا یونیورسٹی میں اردو کی سطح تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے کتنی حوصلہ انگیز، دلکش اور گراں قدر یہ سکیم تھی۔ جو بروئے کار آجاتی تو کیا عجب ہے کہ پنجاب یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے پیروں تک کھینچ اور سرگرمیوں میں شامل کر لیا۔ ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ دکھاتا اور ساتھی نوجوانوں کی قیادت کرسکتا۔

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے آثار موجود ہوں، علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایت کی فراوانی ہو اور قوم ملک کی از سر نو تشکیل و تنظیم کے لئے دعوت کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو۔ وہاں یہ بے عملی و بے حوصلگی کیسی۔ اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے طور پر جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلہ فکریہ ضرور ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر اس فضل و کمال کا جیسا نادر روزگار اجتماع دہلی میں ہو گیا تھا، اس کی مثال مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان میں کہیں اور کم نظر آتی ہے جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا۔

کتے ہنرمند اٹھ گئے میں جتنے گردوں پر نجوم

غدر میں یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ان میں سے سر سید نے اپنے رفقائے کرام کے ساتھ علی گڑھ میں ایک جدید شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مسلمانوں کی حیات نو کی طرح ڈالی۔

اس کے بعد اور پہلی جنگ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں علوم و فنون کے کیسے اور کیسے کیسے جامع کمالات، ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں جن میں "جوانان سعادت مند" کے "پیر دانا" سر شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان اور ڈاکٹر سر اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر بعض وجوہ کی بنا پر موخر الذکر دو کو علیحدہ کر دیں تو سر شیخ عبدالقادر یقیناً ان لوگوں میں سے تھے جو پنجاب کے سرسید ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی بزرگی، شفقت اور سرپرستی کا تعلق ہے انہوں نے لاہور کے ہونہار نوجوانوں کے لئے کم سے کم اتنا ضرور کیا جو وہاں کے کسی اور سے نہ ہو سکا۔

شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ اس کی توقع بخاری سے تھی وہ ان مرکز گریز اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے ایک حد تک انہوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا کسی عظیم مقصد یا منظم اسکیم کے ماتحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کچھے احباب ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے "صحت مند" علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا فیمتی، بڑا خطرناک لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہوتا ہے۔ پاکستان کے نوجوان کو مناسب اور بروقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا۔ کسی اور سے ناتہ جوڑے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نوجوان کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ در اصل وہ اپنے شباب کی واردات (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے دیتے ہیں۔

اسی سلسلے ("نیاز مندان لاہور" یا "ناموران لاہور") سے اس زمانے میں ایک بحث یہ اٹھائی گئی کہ پنجاب میں "جویہ" میں نے جانا ہے" یا اس طرح کے اور فقرے بولے جاتے ہیں ان کو غلط کیوں قرار دیا جائے۔ پنجاب کے لوگ اردو سے کچھ کم واقف نہیں ہیں۔ اردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ نثر اور نظم کی محفل میں ان کا درجہ کسی سے کم تر نہیں رہا۔ اردو کا مستقبل بھی پنجاب ہی میں زیادہ روشن نظر آتا ہے فارسی عربی کے علاوہ معتز

کی بولیوں اور محاوروں سے بھی انہوں نے دوسروں کی طرح استفادہ کیا ہے وغیرہ۔ اس سے ان کی زبان پر یہ فقرہ جس شکل میں آتا ہے اس کو صحیح کیوں نہ مانا جائے۔

کچھ دنوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا لیکن جلد ہی ختم ہو گیا اور بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ اس موضوع پر ان سے اکثر گفتگو آئی۔ اتنی علمی دلچسپی نہیں جتنی تفریحی۔ یو پی کی زبان، اشخاص یا شاعروں پر بخاری کو طبع آزمائی کا شوق ہوتا تو بے تکلف روئے سخن میری طرف کر دیتے۔ ایک بار بڑے مزے سے اور بہت زور دے کر کہنے لگے "پنجاب اس طرح کے فقرے اسی طرح بولے گا آپ نے ..... (نام حذف کرتا ہوں) جو چاہیں کہیں۔ یہ جو غلط کیوں ہو؟" میں نے کہا "ہاں کیوں ہو۔" کچھ مسکرائے۔ کچھ نرم پڑے لیکن اندازِ برہمی قائم رکھتے ہوئے بولے: "بتائیے نا، آپ تو صرف دکھ میں مبتلا رہتے ہوں گے۔ اس میں قباحت کیا ہے؟" میں نے کہا: "میں صرف دکھ سے قطعاً معصوم ہوں۔ آپ بھی ہوں تو ایسا کوئی سانحہ نہ ہوگا۔ لیکن مجھ جیسے ان باتوں کو، میں تو چاہوں گا کہ یہ فقرے اسی طرح بولے جائیں۔ اس میں بڑا عیب ہوں ایک خوبی بے مثل ہے" بولے: "یعنی چہ؟" عرض کیا "اس سے آدمی پہچان لیا جاتا ہے۔" بے اختیار قہقہہ لگا کر کھڑے ہو گئے بولے "صدیقی صاحب میرے ساتھ چلیے۔ میں اس فقرے پر آپ کے اعزاز میں کھڑے کھڑے، پنجاب میں فرسٹ کلاس ملیا کرا سکتا ہوں۔"

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر فاش کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لیے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں ہے جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ SAFETY FIRST. یا SELF FIRST کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ میرا تو کہنا ہے کہ "گوہر پاک او کجا" کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار، اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی بعض تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

بخاری کو اچھے سوٹ پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک زمانے میں جب آل انڈیا ریڈیو کا پہلا دفتر علی پور روڈ پر تھا اور وہ اسٹیشن ڈائریکٹر یا اس سے اونچے کسی منصب پر تھے ان کا درزی کشمیری دروازے کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ دکان اور مرجع دیکھتے ہوئے کچھ ایسا ماہر فن نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن بخاری اس کے فریفتہ تھے۔ اس کے پاس کبھی تقاضے کے لیے، کبھی سوٹ میں ترمیم و اصلاح کی غرض سے، اس پابندی اور شغف سے آتے تھے جیسے بعض مصنفین اپنی کتاب کا مسودہ دیکھنے بھالنے، کاتب کے گھر یا پریس کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس مہم پر ایک بار میں بھی ساتھ تھا۔ دکان پر پہنچے تو وہاں فلانی پر درزی سے کچھ دیر معروف و مصروف گفتگو رہے۔ کپڑے کی قطع برید، استر، سلائی، کاج، بٹن کے بارے میں ایسے ایسے نکتے درزی کے ذہن نشین کرانے لگے معنا میرے بھی کہ میں حیران رہ گیا کہ اچھا خاصا آدمی کس چکر میں مبتلا ہے۔ شاید اس بات کو سمجھ گئے۔ دفعتاً بولے: "کیوں صدیقی صاحب آپ کو سوٹ سے بھی دلچسپی ہے؟" عرض کیا "کیوں نہیں، لیکن مردوں کے نہیں، عورتوں کے سوٹ سے!"

بخاری ہنس پڑے لیکن فقرے کی داد درزی سے دلائی یہ کہہ کر کہ "صاحب کو سلام کرو، صاحب عورتوں کا سوٹ پسند کرتے ہیں۔" سلام تو اس نے کیا لیکن مجھے اس سے اس کا یقین نہ ہو کہ اس پسند کا اظہار میں نے سوٹ میں ملبوس کسی خاتون سے کرنے کی کبھی جرات کی ہوگی۔ مدتوں بعد، تقسیم ملک

سے کچھ پہلے مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بنی تو ایک دفعہ دفتر میں ملاقات ہوئی۔ سر سے پاؤں تک کسی اعلیٰ نسل کے کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھے دیکھ کر ہم دونوں بیک وقت مسکرائے لیکن ستم یہ تھا کہ بخاری کا مسکرانا میرے مسکرانے پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک بار میں نے خط لکھا کچھ روپے بھیج دیجئے کارِ خیر کے لئے درکار ہیں۔ خط ملتے ہی روپے بھیج دیئے توقع سے زائد۔ میں نے شکریہ کے خط میں لکھا بخاری صاحب میری طرح بچپن میں آپ نے بھی جغرافی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تھے کہ وہی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کارِ خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک کے گناہوں کے لئے ایسی ہی ثابت ہوگی۔ بخاری نے لکھا مژدے کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو "شرح مبادلہ زر" آپنا خاطر خواہ نہ رہے ــــــ تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے بخاری ان کے نہ تھے وہ یقیناً ان کو بہت عزیز رکھتے تھے لیکن مقررہ فاصلوں میں۔ ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہو جاتی ہو گی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔ روپے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے، تحریر و تقریر سے لیکن شاید وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت علمیت، اقتدار اور شہرت کے میدان میں جہاں وہ لاشریک رہتے ان کا کوئی ساتھی یا کوئی اور شرک کا مرتکب ہو، بخاری بڑے بت شکن تھے جنیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے ــــــ اقوامِ متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جانفشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے وہاں کے چھوٹے بڑے اہلِ کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے تھے اور یاران باصفا سے ملنا ہو جاتا تھا تو جس محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں۔ کچھ عرصے ان کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی "بادِ شمال" کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا ــــــ پی ای این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں۔ چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ہندوستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہئے یا ادب کی خدمت کرنا چاہئے کتنی غلط جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھی تو بولے تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقید کر لیتے۔ موقع ملتا تو میں ان کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا پھر دبی زبان اور غمگین مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ وہ وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔

آج یہ گفتگو یوں یاد آ رہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوامِ متحدہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے لیکن اسے کیا کہئے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ زندانِ حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

"پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔"

۔۔۔۔ کہ گوہرِ مقصودِ گفتگوست

فیض احمد فیض

دوستی تو وہی اور سعدی کا کام ہے یارو، محنت تو یہ بھی کہنے کی بات ہے، دیکھو تو ہر روز ہی تم میں سے ہر ایک کو ٹیلیفون کرتا ہوں، ہر ایک کے گھر پہنچتا ہوں، اپنے گھر رکھتا ہوں، کھلاتا ہوں، پلاتا ہوں، سیر کراتا ہوں، ہنساتا ہوں، شعر سناتا ہوں، پھر رات گئے باری باری سے سب کو گھر پہنچاتا ہوں، سب بیویوں کی بددعائیں میرے حساب میں لکھی جاتی ہیں، آدھی تنخواہ پیٹرول میں اڑ جاتی ہے یعنی اول نقصانِ مایہ، مایہ نہیں مانع یعنی پیٹرول دوم شماتتِ ہمسائی، ارے یار یہ شماتت کیا لفظ ہے، شٹ۔ ما۔ نت کچھ پنجابی گالی معلوم ہوتا ہے نہیں؟ .... تھو۔

”کچھ تو خدا کا خوف کرو دوستو، کسی کم بخت کو توفیق نہیں کہ کبھی خود ہی اٹھ کر چلا آئے، میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہوں؟ شوفر ہوں؟ میراثی ہوں؟ مجھے تنخواہ دیتے ہیں آپ؟ یا آپ میری معشوقائیں ہیں، برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے آپ کا؟ یا آپ کے ذہنِ مبارک سے حکمت و موعظت کے وہ لعل و گہر برستے ہیں کہ اس ہیچمداں کا دامن گنج ہائے گراں مایہ، اوئے مایہ، پیٹرول والا مانع نہیں۔ دوسرا، عثمان نوٹ کرو، بلکہ تیسرا پنجابی والا، نون غنہ کے ساتھ، اوئے سمجھ آئی ہے؟ (عثمان نوٹ کرو کی تلمیح کسی معمر بزرگ کی جانب تھی جسے بخاری صاحب نہ جانے کب ملے تھے؛ روایت یہ تھی کہ ان بزرگ کے فرزند اکبر عثمان بھی سفید ریش اور کبر سنی کی منزل میں تھے لیکن بڑے میاں انھیں وہی طفل مکتب گردانتے اور انھیں اسی ڈھب سے خطاب کرتے، چنانچہ اگر محفل میں کسی نے کہا کہ میر صاحب وہ ڈپٹی کلکٹر آپ کا پوچھ رہے تھے تو میر صاحب کڑک کر بولے ”ڈپٹی کا تلفظ ڈیپوٹی ہے، عثمان نوٹ کرو!“ سمجھ آئی ہے؟ کا قصہ میں نے انھیں سنایا تھا اور مجھے خورشید انور نے، بھاٹی اسلامیہ ہائی اسکول میں کوئی ماسٹر صاحب تھے جو تختہ سیاہ پر ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے بعد قریب قریب ہمیشہ اپنے طلبا سے پوچھتے ”اوئے سمجھ آئی ہے“ اور لڑکے ہمیشہ جواب میں کہتے ”نہیں جی“ اس پر ماسٹر صاحب لڑکوں کو ایک موٹی سی گالی دیتے اور کہتے ”نہیں سمجھ آئی تو جاؤ فلاں کی فلاں میں“۔ بخاری صاحب سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے، کہنے لگے ”یار اگر اسے یہی کہنا تھا تو پوچھتا ہی کیوں تھا؟“ اس کے بعد عثمان نوٹ کرو کے ساتھ ”سمجھ آئی ہے“ بھی ان کی محفل کے روزمرہ میں شامل ہو گیا)

ان کی فریاد ابھی جاری تھی۔

”دیکھو یارو اگر کل ہی تم میں سے کسی کو ٹیلیفون کروں کہ بھائی جان مجھے ہیضہ ہو گیا ہے، پلیگ کی گلٹی نکل آئی ہے، ڈاکٹر جواب دے

گئے ہیں، لبوں پہ دم ہے، البتہ آکر منہ دیکھ جاؤ تو سو فیصدی یہی جواب ملے گا کہ موٹر میں آکر لے جاؤ.....؟

"ہمارے پاس موٹر جو نہیں ہے" تاثیر صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں اور آپ ہر روز کالج تو میری ہی موٹر پر تشریف لے جاتے ہیں، اور دن بھر جہاں جہاں بھی آپ حضرات چھاپہ مارا کرتے ہیں۔ اسی بخاری کے ساتھ تو جاتے ہیں، بات یہ ہے کہ تم سب نہایت بڑے دوست ہو، کاہل ہو، بے قاعدہ، بے سلیقہ، اگر میں اس شہر میں نہ ہوں تو تم مہینوں ایک دوسرے کی صورت بھی نہ دیکھو۔"

اور یہی ہوا بھی۔ ع "ان کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگِ محفل ہو گیا" ادھر بخاری صاحب لندن اور نیویارک روانہ ہوئے ادھر یہ بساط الٹ گئی، ان کی محفلِ شبینہ کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر کبھی یکجا نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ مختصر سے عرصے کے لئے لاہور لوٹے تو یاروں کی صحبت احوال سے بہت رنجیدہ ہوئے، کہنے لگے "یار تم لوگوں نے سب چوپٹ کر دیا ہے، اب ہم جاتے ہیں" اور اس بار کے بعد ایسے گئے کہ اپنی مٹی بھی پردیس ہی کو سونپ دی۔

بخاری صاحب کی شخصیت کا ہلکا سا نقش بھی قلم کی گرفت میں کب آتا ہے۔ یہ کام تو انھیں کے کرنے کا تھا۔ ہاں انھیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو یہی تن دہی، مستعدی، قاعدہ اور سلیقہ طرح طرح سے یاد آتے ہیں، خوش وقتی کے لئے احباب کی محفل کا اہتمام تو شاید ایسی بڑی بات نہیں۔ اگرچہ ہم میں سے بیشتر اتنا بھی نہیں کرتے اور بخاری صاحب ایسی تن دہی سے تو کوئی بھی نہیں کرتا لیکن وہ تو جو کچھ کرتے تھے ایسے ہی ڈھب سے کرتے تھے، دفتر ہو یا گھر، تحریر ہو یا گفتگو، دقیق علمی بحث ہو یا فقرہ بازی،

مغنی نے غزل شروع کی۔

بجوائی دو چشمت چشم بلا نشستہ
چون قبیلہ گرد لیلیٰ ہمہ جا بجا نشستہ

تو اسی مطلع پر سحر ہو گئی، قوال اس شعر پر پہنچے،

"صد چاک شدہ سینہ و صد پارہ شدہ دل
دیں بے خبراں جامہ دریدن نگزارند"

تو گھنٹوں وارفتگی کا عالم رہا۔ کوئی شعر، کوئی مصرع، کوئی ترکیب، کسی محراب کا خم، کسی کتبے کا خط، کسی خوانچے والے کی آواز، کوئی محاورہ، کوئی گالی جہاں بھی دل کو وجد و اہتزاز کا ذرا سا اشارہ ملا۔ اپنی واردات میں سبھی کو شریک کر لیا۔

دلی کی جلتی ہوئی دوپہر میں کبھی جھک کر گھٹا آ گئی تو جنگ عظیم، ہٹلر اور مسولینی، آل انڈیا ریڈیو، دولت مشترکہ انگلشیہ اور ایسے سبھی دفاتر یک لخت بے معنی ہو گئے۔ دوستوں کے افسروں کو ٹیلیفون ہو گئے کہ ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو فلاں فلاں صاحب سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ہم لوگ بھاگم بھاگ پہنچے، بخاری صاحب دفتر میں دربار لگائے بیٹھے ہیں، آغا حمید، سید رشید احمد، غلام عباس، یا ایک آدھ اور، تاثیر پہنچے، مجید ملک آئے، میں گیا، بخاری صاحب کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تشریف رکھیے۔ آپ کانفرنس کرنے آئے ہیں؟ تو کیجئے۔" اور سب پر اسکول سے بھاگے ہوئے بچوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی، دن بھر قطب میں گزارا، شام کو جامع مسجد کی دیوار تلے کباب کھائے، ایک قطعی غیر معروف محلے میں پان کھائے، آدھی رات تک انڈیا گیٹ کے سامنے بیٹھ کر بیت بازی کی، پھر کناٹ پلیس کے جس قہوہ خانہ کا در کھلا پایا وہاں سے ملک شیک پیا، اور دن میں کناٹ پلیس ہی کے میدان میں غالب اور نظیر

حافظ اور سعدی، اقبال اور گوئٹے، [illegible] ورڈزورتھ [illegible] سے خاص [illegible] تھے۔ [illegible] باہر نکلے تو شہر نے کہا ہمائسے دل چلئے چائے پئیں گے! بخاری صاحب بولے [illegible] اور [illegible] چائے [illegible] سے [illegible] صاحب [illegible] چاہیے، عثمان نوٹ کرو!

خبر پہنچی [illegible] ریڈیو [illegible] بیٹھے [illegible] میرے دل محفل میں [illegible] صوفی تبسم [illegible] صاحب [illegible] دونوں اپنا عجب [illegible] تھا اور [illegible] چلی جاتی تھی [illegible] گھنٹی بجی۔ ہمائسے [illegible] میاں شفیع ٹیلیفون پر تھے [illegible] ٹیلیفون [illegible] قائداعظم فوت ہو گئے ہیں [illegible] آپ تحقیق کر لیجئے [illegible] بخاری صاحب نے کہا ہم بھی چلتے ہیں [illegible] ہزار جگہ سے خبر کی تصدیق چاہی لیکن کسی نے کچھ [illegible] پاکستان ٹائمز [illegible] کے بہرحال تیار کر لئے جائیں۔ ممکن ہے رات میں کسی وقت کوئی اطلاع پہنچ جائے۔ [illegible] بخاری صاحب مرحوم کے سوانح حیات مرتب کرنے لگے، صوفی صاحب قطعۂ تاریخ کی فکر کرنے لگے، تاثیر مرحوم اور حسرت مرحوم [illegible] کی ترتیب میں مصروف ہو گئے [illegible] کام کیا، تین بجے کے قریب خبر کی تصدیق ہو گئی۔ [illegible] جب ہم دفتر سے نکلے تو پو پھٹ چکی تھی [illegible] بارہ [illegible] گئے ہوں گے سے روانہ ہو چکے تھے، بخاری صاحب کو صحافت یا خاص [illegible] لیکن انھوں نے اسی ذوق سے [illegible] پاکستان ٹائمز کے دفتر اور چھاپہ خانے میں بسر کیں، گاندھی جی کے قتل کی رات، [illegible] ہونے کی رات [illegible] اگست کی [illegible]

اب شاید یہ بتا دینے میں بھی مضائقہ نہیں کہ اس زمانے کے پاکستان ٹائمز کے [illegible] اداریے اور مختلف ناموں سے بہت سے مراسلے بخاری صاحب ہی کے قلم سے ہیں۔ مراسلوں کے کام میں ایک پُرلطف بحث مجھے خاص طور سے یاد ہے جو [illegible] اور اصل ان حقیقی یا ذہنی بزرگ کے سر ہے جو مولوی [illegible] کے نام سے مشہور تھے اور بقول [illegible] بے نقاب خاتون کی چوٹی پر دست درازی کی فکر میں رہتے تھے۔ ایسے دو چار واقعات سننے میں آئے تو بخاری صاحب نے مولوی صاحب کی خدمت اور بے نقاب خواتین کی حمایت میں ایک بہت [illegible] MERE WOMAN کے نام سے لکھا، اس پر آزادیٔ نسواں کے حامیوں اور مخالفین میں بہت زور دار کی بحث چلی اور جب تک چلتی رہی بخاری صاحب ان میں سے بیشتر خطوط کی تصحیح و ترتیب پاکستان ٹائمز کے دفتر میں بیٹھ کر خود کرتے رہے۔

انھیں بچوں سے خاص رغبت نہ تھی (" چھوڑو یار، عورتوں کا محکمہ ہے") لیکن وہ قریب قریب ہر چھٹی کے دن ہمارے اور تاثیر صاحب کے بچوں سے " مالاج " میں آنکھ مچولی کھیلتے، ان کے لئے نئے نئے کھیل ایجاد کرتے، گیت گاتے اور کہانیاں سناتے۔

وہ بوڑھوں سے اور بھی زیادہ متنفر تھے۔ لیکن انہی دنوں لندن سے میری بیوی کے والدین ہمارے ہاں وارد ہوئے تو بخاری صاحب نے ایک ہی ملاقات میں انہیں بھی رام کر لیا، یہ بچارے اگلے وقتوں کے سیدھے سادے سفید پوش انگریز لوگ جنھیں بخاری صاحب کے ذہنی مشاغل سے دور دور علاقہ نہ تھا۔ اس شام بخاری صاحب پہنچے تو میں اور میری بیوی دونوں یہ سمجھے کہ آج ان کا رنگ نہ جمے گا اور بات رسمی تکلفات سے آگے نہ بڑھ سکے گی خیر تعارف اور دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، پھر بخاری صاحب اچانک بولے " مسٹر جارج آپ کو پہلی جنگ عظیم کے بعد کا کوئی گانا یاد ہے، مثلاً فلاں اور کوئی پرانا انگریزی گیت گنگنانے لگے، ہمارے خوشدامن کو گانے سے شغف تھا، فوراً کھل گئیں اور پھر دو گانوں کا ایسا تانتا بندھا کہ کسی

کو زمان و مکان کی سدھ بدھ نہ رہی یہ ایکٹ ختم ہوا تو بخاری صاحب نے سعید صاحب سے مخاطب ہو کے کہا "مسٹر جارج ہم ٹیبل چھوڑ کر چلئے ہم دونوں چلیں؟"

"کہاں سے مقصد ہو میرے مدعے کو، مسٹر جارج بخاری۔"

"ہم عیش کرنے جا رہے ہیں مسٹر جارج GOING TO PAINT THE TOWN RED" اور اس کے بعد انہیں لاہور کے ریسٹورانوں میں گھماتے اور اینگلو انڈین لڑکیوں کا رقص دکھاتے رہے۔

لیکن ان سب اداؤں کے باوجود ناآشنا لوگ بخاری صاحب کو بہت ہی کم آمیز اور بڑا صاحب سمجھتے تھے اور یہ تاثر چنداں غلط بھی نہ تھا مگر پھر بے تکلفی کے باوجود ہم میں سے بھی کسی کا یہ حوصلہ نہ تھا کہ اُن کے اوقات میں مداخلت کرے یا اُن کی فرمائش کے بغیر اُن کی کسی مصروفیت میں شامل ہو۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ بخاری صاحب لباس بدلتے ہیں تو ساتھ ہی شخصیت بھی بدل لیتے ہیں۔ دفتر میں اور، گھر میں اور، محفل میں اور۔ اصل میں یوں نہ تھا بلکہ اُن کے سب ہی پیچے تُلے قاعدے اور سلیقے کا اظہار تھا۔ ایک بار ایک بہت ہی بے تکلف لیکن کچھ عجیب و غریب سے حضرت میرے گھر پر تشریف لائے۔ میں بخاری صاحب کے ہاں جانے کی فکر میں تھا۔ کہنے لگے "مجھے اُن سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے مجھے بھی لے چلو؟" میں نے کہا چلئے۔ بخاری صاحب کی پیشانی پر ان کو دیکھتے ہی ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔ یہ صاحب پہلے تو گم سم بیٹھے رہے، پھر ایک آدھ یونہی سی بات کی۔ بخاری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہنے لگے "صاحب اس وقت بدقسمتی سے میں مصروف ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" ہم چلنے لگے تو چپکے سے پوچھا "اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟"
میں نے کہا دفتر جاؤں گا۔ میں اپنے ساتھی سے رخصت ہو کر دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر میں بخاری صاحب بھی آ گئے۔ پوچھا یہ کون تھے؟ میں نے بتایا کہ فلاں فلاں ہیں بہت بھلے آدمی ہیں۔ کہنے لگے، تکلف میں تضیعِ اوقات تک تو خیر جائز ہے لیکن تکلف میں بور ہونا کسی صورت بھی جائز نہیں، وہ امرتا شیرگل کیسی یاد ہے! کیا غضب کی عورت تھی! ایک دفعہ اس کے اعزاز میں ہیں فلیٹیز میں ایک بہت بڑی دعوت تھی، بڑا بڑا خان بہادر اور رائے بہادر بیٹھا تھا، امرتا کے بیٹھیں آس پاس کے لوگوں سے کچھ دیر گفتگو کی اور کھانا شروع بھی نہ ہوا تھا کہ اٹھ کھڑی ہوئیں "میں بور ہو گئی، میں جاتی ہوں؟" میزبان اور مہمان دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ کھٹ کھٹ یہ جا وہ جا! اخلاقی جرأت اسے کہتے ہیں، مجھے آج تک اس واقعے سے رشک آتا ہے۔"

یہ تو ایک قاعدہ تھا، دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ کام کے وقت ڈٹ کر قاعدے سے کام کرو تاکہ کام کے بعد ڈٹ کر بے قاعدگی کر سکو۔

اور قاعدے کی صورت یہ تھی کہ آل انڈیا ریڈیو کی پہاڑ سی عمارت اور ہندوستان بھر میں بکھرا ہوا چیونٹیوں کا سا عملہ لیکن اور دفتری کام کے علاوہ اس عمارت کی ہر کھڑکی کے ہر شیشے، ہر دروازے کے ہر قبضے، ہر کمرے کے ہر کونے کی صفائی اور اس عملے کے ہر فرد کی ہر سرکاری و غیر سرکاری حرکت پر اُن کی نظر رہتی تھی۔ اور یہ تو خیر ممکن ہی نہ تھا کہ مستقل ہنگامہ آرائی کو چھوڑ کر دی اور رتجگوں کے باوجود اُن کی گاڑی ہر صبح نو بجنے سے پانچ منٹ قبل دفتر کی عمارت میں داخل نہ ہو۔

لیکن اس ساری قاعدے بازی میں ساتھ ہی ساتھ اُن کی خوش طبعی اور اپج بھی کسمساتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ کمرے میں آتشدان کے سامنے بہت سی فائلیں لئے بیٹھے ہیں اور فائلوں میں سے کاغذات نکال کر آگ میں جھونکے جا رہے ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو اس کو انگریزی زبان میں کہتے ہیں QUICK DISPOSAL بات یہ ہے کہ ان سب فائلوں میں محض خرافات بھری ہے اور اس خرافات سے چھٹکارا پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ اس کا نام و نشان صفحۂ دفتر سرکارِ عالی مدار سے محو کر دیا؟" یہ دوسری بات ہے کہ اس نوع کی خرافات وہ خود ہی ایجاد بھی کرتے رہتے تھے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد بھی تھے اور

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری بھی ۔ ایک دن ہم دونوں دوست کسی کام سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے دفتر گئے ۔ بخاری صاحب نے دیکھا کہ اپنے کمرے میں بلائے جا سکنے کے متعلق معلوم ہے اس دفتر [illegible] ہوتا ہے یہ دلچسپ [illegible] ایک [illegible] نازل ہوگی جس نے سرورق [illegible] لکھا تھا "OFFICE CAT" یعنی دفتر کی بلی [illegible] ہم نے پوچھا "یہ تصویریں کیسی ہیں" [illegible] میرے کمرے میں ایک بلی آ نکلی تھی ابھی گئی ہی نے کسی سے کہا اسے [illegible] دودھ [illegible] دودھ بھی ملنے لگا ۔ مہینے کے آخر میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دفتر کے اخراجات کا بل مجھے بھیجا [illegible] ساتھ ایک تحریری سوال [illegible] بلی کے دودھ پر [illegible] روپے جو آنے کی رقم صرف ہوتی ہے [illegible] مد میں [illegible] میں نے لکھ بھیجا Contingency یعنی متفرق خرچ میں ڈال دو ۔ تھوڑے دنوں کے بعد اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر نے بل لوٹا دیا اور یہ تحریری فرمائش کی کہ Contingency کی مد [illegible] کے سامان [illegible] وغیرہ [illegible] شے سے مخصوص ہے بلی جاندار شے ہے اور اس کے اخراجات Contingency میں شامل نہیں کئے جا سکتے ۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ سے مزید تحریری ہدایت طلب کی ۔ میں نے لکھا کہ جاندار اور غیر جاندار کا فقرہ ہے تو یہ خرچ establistment یعنی عملے کی مد میں ڈال دو ۔ [illegible] بل خزانے کو [illegible] اور حکم دفتر میں لوٹ آیا ۔ اب کے ایک طویل مراسلے میں یہ استفسارات تھے کہ اگر یہ خرچ عملے کی مد میں جانے کا تو واضح کیا جائے کہ اس رقم کو تنخواہ تصور کیا جائے یا کہ الاؤنس ؟ اگر تنخواہ ہے تو بموجب ضابطہ فلاں فلاں فلاں دفتر کی پیشگی منظوری درکار ہے اور اگر یہ الاؤنس ہے تو بموجب قاعدہ فلاں فلاں ، فلاں افسر سے اس کی تصدیق لازمی ہے .... چنانچہ یہ فائل مجھے [illegible] سے چل رہی ہے اور اس میں ایسے ایسے مارکے ہیں کہ [illegible] بیان ہو سکے نہ کر اندازہ نہیں ... پھر ایک اور فائل نکالا ، سرورق پر یہ عبارت درج تھی ، خط و کتابت مابین پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی و پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور ۔ کہنے لگے سنو ۔ یہ پہلا خط ہے از جناب پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور ۔

جناب والا !

آپ کی یاد دہانی کے لئے معروض ہے کہ گزشتہ ماہ آپ کو پانچ کتابیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے ۔ ریویو کی غرض سے ارسال کی گئی تھیں لیکن ریویو ابھی تک موصول نہیں ہوئے ، مہربانی سے جلد توجہ فرمائیے ۔

آپ کا نیاز مند ۔ اے ۔ ایس بخاری

اس کے بعد یاد دہانی کے دو خط اور ہیں ۔ اور تیسرا خط یہ ہے ۔

از جناب پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج ۔ لاہور

جناب والا !

بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں ، آپکو ٹیکسٹ کمیٹی کی طرف سے جو پانچ کتابیں ارسال کی گئی تھیں (تفصیل درج ذیل ہے) ان میں سے تین کے ریویو وصول ہو گئے ہیں جس کیلئے کمیٹی آپ کی ممنون ہے ، لیکن کمیٹی توجہ دلانا چاہتی ہے کہ انتہائی اصرار کے باوجود آپنے دو کتابوں (یعنی فلاں اور فلاں کتاب) کے بارے میں ابھی تک اپنی رائے تحریر نہیں فرمائی ، کمیٹی اس تاخیر کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے ، آپکو تنبیہ کی جاتی ہے اگر فلاں تاریخ تک آپکی رائے موصول نہ ہوئی تو آپکا نام ریویو کرنے والوں کی فہرست میں سے خارج کر دیا جائیگا ۔

آپکا نیاز مند : اے ایس بخاری

اور اس کا جواب یہ ہے ، منجانب اے ۔ ایس بخاری وغیرہ بنام اے ایس بخاری وغیرہ

جناب والا : بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں ، بقیہ ریویو ملفوف ہیں ۔ میں یہ گوش گزار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے خط کا آخری پیرا گراف انتہائی

قابلِ اعتراض ہے۔ سینیئر (SENIOR) افسروں سے خطاب کا یہ انداز قطعی غیر موزوں ہے۔

آپ کا نیازمند: اے ایس بخاری

پھر بخاری صاحب نے فائلیں اور کاغذات سمیٹے اور بولے "اچھا اب تم فوراً رفو چکر ہو جاؤ، مجھے بہت کام ہے۔"

لیکن یہ سب کچھ تو صرف بخاری صاحب کی باتیں ہیں بخاری تو نہیں ہیں، وہ عالم بھی تھے ادیب بھی، استاد بھی، ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش تحریر بھی، سخت گیر منتظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحبِ سیاست بھی، لیکن یہ سب صفات گنوا دینے سے بھی کیا ہوتا ہے، ان کی زندگی کا بنیادی پہلو تو یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی لمحہ بے مقصد اور بے مصرف نہیں گزرا اور ان میں سے بیشتر لمحات موجودات کے ہر مظہر سے خوبی اور حسن اور انبساط کے اخذ و استفادہ میں گزرے اور وہ قلب و نظر کی اس دولت کو عمر بھر مخلوق، دانشمندوں، دیوانوں اور گنہگاروں میں یوں بکھیرتے رہے کہ اپنے نام کی یادگار کے لئے اس کا عشرِ عشیر بھی نہ بچا۔ مجھے اس دور کی کوئی ایسی شخصیت معلوم نہیں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کے لئے اس قدر لطف و مسرت دریافت اور تخلیق کی ہو۔ وہ سب لوگ جن کے لئے دوسرے اہلِ کمال گفتار و تحریر کی کیسی بھی نعمتیں مہیا کریں۔ یہی فریاد کریں گے کہ

"خوشتر زاں لبِ شیریں شکر باز بیارد"

ہنستے ہنستے

عصمت چغتائی

ہنستے ہنستے سب دن ہوا پر تخت سے نیچے ڈھلک گئی۔

[illegible] آنسو پونچھ [illegible] سانس پھول

گئی تھی ہنسی جھٹکوں میں بند کی تھی۔ [illegible] تو مجھ میں [illegible] سے ہو جائے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بات بات پر ہنسی آتی تھی کہاں ہنسی پڑا ہنسی چھوٹ نکلی [illegible] دوہرے ہو گئے اور

قہقہوں کا طوفان ٹوٹ پڑا اور جو کہیں کسی نے پوچھ لیا کہ بھئی کیوں ہنس رہی ہو [illegible] سے بجائے [illegible]

کے اور بھی تیز ہو جاتا۔ ہنسی آسیب کی طرح سوار ہو جاتی [illegible] ہنس ہنس کر شل ہو جاتے [illegible] پسینے آ جاتے

کسی صورت [illegible] ہوتے دیکھو [illegible] [illegible] رستے نکال دیتے [illegible] تب

ہم نا ہیں پکڑے پیٹ پکڑے [illegible] پڑے ہونے اپنے مخصوص میٹھے میں [illegible] سے ہنسنے لگتے۔

عظیم بھائی کی کتابوں میں سے مضامین پڑھ پڑھ کر ہنستے [illegible] اسی قسم کی ہوا ہنسی کے جھونکے [illegible] ہنسی کے مارے

پھول کھل کھل [illegible] اور بردبار اور غمگین آپا کی سمجھ [illegible] ہونے لگی [illegible] کئی بار

پڑھ رہے تھے۔ ہمیں جملے کے جملے یاد ہو گئے تھے جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دہرائے جاتے تھے اور [illegible] پر کیوں ہنسی آ

ہنسی آتی ہے اب وہی مضامین پڑھتی ہوں تو اتنی ہنسی نہیں آتی۔

اس وقت تک عظیم بھائی نے مزاح نگاری شروع نہیں کی تھی یا شاید ہم نے ان کے مضامین نہیں پڑھے تھے۔ [illegible] کے مضامین پر

اتنی ہنسی نہیں آتی تھی جیسی کبھی آیا کرتی تھی۔ پھیکے پھیکے سے لگنے لگتے۔ نہ جانے کیوں ہم پطرس کھا گئے اور ایک جان چھوڑ ہزار جان سے ان پر عاشق ہو

گئے نہ جانے کیوں تخیل میں وہ اپنے ہم عمر سے نظر آتے تھے اور یقین تھا کہ اگر ان سے ملاقات ہو جائے تو ہم ضرور انہیں پیڑ پر بدھی [illegible] کی گشتی پر چڑھا

لے جائیں جو کنوئیں کے پاس نیم کی اونچی شاخوں پر شمیم اور چنو نے باندھ رکھی تھی۔

پطرس کی باتیں ـــــ جی ہاں میں انہیں باتیں ہی کہوں گی کیونکہ ان کی تحریریں بے ساختہ بولتی تھیں۔ ان میں بڑی یگانگت اور قربت

محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے زندہ ماحول میں بڑی بے تکلفی سے کھپتی تھیں چھوٹے بڑے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے۔

عظیم بھائی نے "تفریح صحرا" لکھی تو ہم نے جی جان سے پڑھی مگر "قرآن و پردہ" "حدیث و پردہ" بڑی بور معلوم ہوئیں۔ خشک مردہ کتابیں

ان کے کچھ مضامین اقتصادیات پر "ریاست" میں نکلتے تھے وہ بھی ہمیں قطعی کھردرے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے جب ہمیں پطرس کے مضامین اس غرض سے پڑھتے دیکھا تو کچھ کبیدہ سے ہو گئے۔

تالی مشورہ کرنے کا دور گذر چکا تھا۔ سخت، روکھے اور خشک انسانوں سے کبھی شدید دلچسپی نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں پطرس سب سے [illegible] پسند آگئے۔ "میں ایک میاں ہوں" ہمارے گھر میں بالکل کیری کی پھٹی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا اماں تک نے پڑھ ڈالا۔ اور جب اپنی پلٹی پر بیٹھ کر وہ نہیں تو پان ان کی کلیاں چٹک چٹک کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ میں تنقید نگار نہیں نہ میں کوئی بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ "میں ایک میاں ہوں" کے بعد سے پطرس کا رنگ دوسرے مزاح نگاروں پر جھلکنے لگا عظیم بھائی نے تو اپنی ایک کہانی میں اعتراف بھی کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ میں مزاح نگاری کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان میں سے پہلے اس انداز میں کس نے لکھنا شروع کیا مجھے آج تک نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کس سے متاثر ہوا اور کس نے کس کی پیروی کی۔ مگر میرے مطالعے کی تاریخ میں پہلا نام پطرس کا آتا ہے۔ میں پطرس کو اپنی جانب سے کوئی مقام نہیں دینا چاہ رہی ہوں۔ مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ ایک عمر میں پطرس کی تحریریں دل کو ایسی بھلی لگتیں کہ ہم نے ایک دن جوش میں آکر پطرس کو خط لکھ مارا۔ ابّا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرایا اور معرفت "تہذیب نسواں" خط بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔

یا اللہ تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسی پر تو میں خدا کے وجود کی قائل ہوں۔ وہ خط قبلہ ممتاز علی صاحب نے کھول لیا اور مع لفافہ کے ابا کو جنہیں انہوں نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا بھیج دیا بلی مظلوم سی ایک چوہیا پکڑ لیتی ہے اور کم بخت اس سے مذاق کرتی ہے کبھی دانت مار دیا، کبھی گدگدا دیا کبھی پنجہ سے لڑھکا دیا۔ اس خط کے آنے کے بعد کئی روز ہماری گت اسی طرح بنتی رہی ہمارا خط اونچی آواز سے ابا کے سامنے پڑھا گیا ہر فل سٹاپ پر سر پر چپتیں پڑتی جاتیں۔ خط میں ہم نے انہیں مسخرا لونڈا سمجھ کر نہایت بے تکلفی فرمانے کی کوشش کی تھی۔ اب تک اس خط کا ایک ایک حرف دماغ پر داغا ہوا ہے برسوں خیال ہی سے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ خط ہمیں تنبیہ دینے کے لئے بار بار پڑھا جاتا تھا۔ ہم نے نہایت بے تکلفی سے اپنی دانست میں بالکل پطرس کے رنگ میں لکھا تھا۔ سب سے بھیانک جملہ تھا۔

"ابے پطرس! کیا تو گھاس کھا گیا ہے؟"

"عوام" اس جملے سے ہماری دھجیاں بکھیرتے تھے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ بے تکلف ہمارے سر پر چپت جڑ دے۔ ظاہر ہے کہ اس صلائے عام پر برجستہ دل نے لبیک کہا۔ ہم حضرت ممتاز علی صاحب اور پطرس کی جان کو کوستے تھے۔ ہم مجرم جو تھے صرف اس لئے نہیں کہ پطرس سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم نے اس لفافے پر جو ٹکٹ لگایا تھا اس پر "سروس" لکھا تھا جو صرف سرکاری ڈاک کے استعمال کے لئے ہوتا تھا۔ آٹھ آٹھ آنے جرمانہ الگ ٹھکا۔ سچ پوچھئے تو اس سانحہ کے بعد پطرس ہماری چڑ بن گئے۔ ہماری عہد شیطانیوں کی فہرست بناتے وقت ہمیشہ اس واقعہ کو تکلیف دہ حد تک اہمیت دی جاتی۔

بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات کا دل پر نقش دیرپا رہتا ہے۔ برسوں گذر گئے۔ لوگ بھول بھال گئے۔ مگر شاید دماغ نے ایک ننھی سی گانٹھ باندھ لی۔ بمبئی میں کسے سال بھر گذرا ہوگا کہ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے کسی صاحب نے فون کیا کہ بخاری صاحب آج کل بمبئی آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پہلا خیال یہ آیا کہ کوئی بہانہ کردوں۔ کہہ دوں کہ بیمار ہوں، پھر سوچا یہ کیا حماقت ہے۔ پطرس آئے ہیں یعنی سچ مچ پطرس آئے ہیں اور میں ان سے ملتے جان چرا رہی ہوں یعنی ان کو کیا پتہ کہ ایک دن ان کی بدولت میرے چپتیں پڑ چکی ہیں۔ وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو

بیچارہ۔ خیر بیچ کا وعدہ رہا۔

مگر میں نے شاہد سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے جایا تو شاہد کو بھی تائیں میں نے بہانہ کر دیا کہ انہیں قطعی فرصت نہیں۔ یہی میری نیم کے نیچے پڑے ہوئے جلنے والی ذہنیت! یہ ذرا کم بخت کا ہے کا تھا۔ خیر یہ تو آگے چل کر بتاؤں گی۔

مجھے ضرورت سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی شخصیت مجھے کسی جانب کھینچتی بھی ہے اور دور بھی دھکیلتی ہے۔ اور پھر پطرس کا مجھ پر ویسے ہی رعب بیٹھا ہوا تھا خواہ مخواہ ان سے مل کر احساس کمتری دوچند ہو جاتا ہے۔ ڈر کی بات ہوئی، نہیں جانتی ہوں تو نہ جانے پھر کتنا پچھتانا پڑے۔ جاتی ہوں تو اللہ! نہ جانے کیسی چوٹیں کریں گے۔ ضرور میں بدتمیزی برتاؤں گی۔ تبھی جو میل جاؤں، میں نہیں جانتی تھی کہ شاہد کے سامنے میرا پول کھل جائے۔ وہ ذرا فنوں سے کہہ دیں گے کہ پطرس نے محترمہ کو وہ پٹخنیاں دیں کہ گفتگو بند ہو گئی۔

رات بھر میں نے ان تمام جملوں کے جواب سوچے جو وہ کہیں گے اور میں منہ توڑ جواب دوں گی۔ بدقسمتی سے میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ پطرس نے وہ سوال ہی نہ کئے۔ اف میری حماقت! میں نے اپنے پر فیلیئر سے کبھی ہار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چوکنے رہتے تھے۔ میری کئی استانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں۔ یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر ناز تھا۔ مگر اس دن احساس کمتری بے طرح بھوت بن کر گلا دبوچنے لگا۔ میں نے پطرس کی زندگی میں کبھی کسی سے ان احساسات کا ذکر نہ کیا۔ کوئی گلے پر چھری رکھ دیتا، تب بھی نہ کرتی۔ کسی نے بچپن میں مجھے ہوا بن کے ڈرانے کی کوشش کی۔ تو میں نے اس ہوتے کی پنڈلی کی بوٹی اتار لی تھی اور بجائے ڈرنے کے ڈرانے والے کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ مگر پطرس کے ہوتے نے مجھے ہولا تو کر شل کر دیا۔ میں نے اپنے لباس کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ مگر اس دن میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایسی ساڑھی نکالی جس کا ذرہ بھر کوئی دھندلا سا نقش بھی نہ رہ جائے تاکہ کوئی حوالہ نہ دیا جا سکے۔ ہر شے مبہم ہو جائے۔ پطرس کے سامنے دل لگتی نہیں۔ صرف غائب ہو جانے والی نوٹ پینچ ہی میں عافیت ہے۔

جب ریڈیو اسٹیشن جانے لگی تو دل سے دعا نکلی کاش پطرس بیمار پڑ گئے ہوں یا میرے ہی پیٹ میں درد اٹھ آئے۔ ہسپتال سے فون کروا دوں کہ آخری وقت ہے۔ لعنت ہے بصیرت کی کچھ تجرپہ تو وہ ضرور ہسپتال عیادت کو آئیں گے۔ شاید اب تو ہلکے میں بھی رہی نہیں کہ دعا دینے تو وہ آ ہی پہنچیں گے۔ پھر میرے حیدرآبادی خون نے للکارا میرے سکر ماداں کے گھوڑوں کا بیٹا رچھوا کر بس پر بیٹھ کر خاصہ تن دل فرمایا تھا۔ اور میں ایک حقیر بطخ کی دہشت میں فنا ہوئی جا رہی ہوں۔ ایسا کبھی کیا ہے۔ ٹانگ کھینچیں گے تو اپنی اُبلی بدزبان پر اُترا آنا مزاج ٹھکانے لگا جائیں گے شاہ صاحب سے پیچھے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہونچی تو کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"آداب عرض!"

"گڈ مارننگ" یہ جواب ملا

"اف بدو" میں نے سوچا۔ اب فرانسے کی انگلش کا رعب ڈالیں گے۔ وہ کاغذوں پر جھکے تھے۔ میں نے غور سے معائنہ شروع کر دیا۔ صورت تو کچھ زیادہ توپ نہیں" میں نے سوچا۔ سیدھی سادی سانولی سلونی سی شکل ہے مگر تصویر سے نہیں ملتی۔ تعلیمی مختلف!

"کتنے دن قیام رہے گا" میں نے انہیں کاغذوں میں لوٹ پوٹ دیکھ کر پوچھا۔ سوچا میں پہلے بولنا شروع کر دوں تو پہلا وار میرا رہے گا۔ مگر دل ڈوبنے لگا کہ پہلا وار نہایت پھسپھسا رہا۔ ضرور اس جملہ کی دھجیاں اڑیں گی۔

"جی" وہ کاغذوں میں سے ابھرے "میرا تبادلہ بمبئی کا ہو گیا ہے"

یہ لیجئے سنا تھا کسی میٹنگ کے سلسلہ میں کہیں گئے ہیں۔ بہت جلد جانے والے ہیں یہ آخر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کرتی اس میں بھی چال ہوگی۔ وہیں سے قبول کرتی اور سوال بھانپ تا۔ فرمانے لگے

"چلیے!"

"خاصہ بڑے" میں نے فوراً خاطر پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ یہ دانت کیوں بار بار نکوستا ہے؟ سامان ڈیوڑھی اسٹیشن گھما کر ایک کمرے میں مجھ سے چلنے کو کہا۔ سامنے میز پر ایک دو بچے کاغذوں کے ڈھیر کے سامنے ایک عجب سی صورت کا گورا چٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے جیسی لمبی ناک، بھاری بھاری آنکھیں

"آئیے آئیے ...... معاف کیجئے گا میری میٹنگ ذرا لمبی کھنچ گئی۔"

"اوہ" میں نے سانولے سلونے پٹھان کے بولنے کے بعد کہا "میں سمجھی تھی آپ وہ ہیں۔"

"کیا؟ ..... میں وہ ہوں .... آپ میری ہتک کر رہی ہیں؟" وہ بالکل گئے۔ "وہ پشتون ہیں اور میں قطعی وہ نہیں ہوں۔" ایک جھٹکے سے سارا اعصابی بوجھ سنبھلتے اڑ گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ایک دم مجھے نیند سی آنے لگی۔ یا خدا! ناحق میں نے اس شخص کی اپنے حواس پر اتنی ہیبت سوار کر لی۔ ایسا معلوم ہوا میں انہیں برسوں سے جانتی ہوں۔ یہ غضب تو قطعی نا فرشتہ نکلی۔ پھر جو باتوں کا سلسلہ چلا ہے تو میرا سارا پیچ سب کا سب بیکار ہوگیا۔ سارے تماشے بھونے جلے اڑن چھو ہو گئے۔ تاج محل ہوٹل پہنچتے پہنچتے دو چار مسائل پر اختلافات بھی ہو گیا۔ میرے خیال میں پطرس کی خاصیت یہی تھی کہ ان سے ملتے ہی برسوں کی ملاقات کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ انہوں نے اس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ اور یاد رکھا تھا۔ انہیں جملے کے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اس طرح سنی۔

"میرے کمرے میں چلنے پر کوئی اعتراض؟" بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ٹھیک۔ آئیے۔"

یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی کہ پطرس نہایت لوفر انسان ہیں۔ اس وقت مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری ڈھیٹ کہانیوں کی وجہ سے لوگ مجھے بھی بڑی نٹ کھٹ سمجھتے ہیں

میں نہایت بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ پیتی رہی۔ وہ پلنگ پر بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر کی چسکیاں لیتے رہے اور دو قینچیاں اپنی پوری رفتار سے چلتی رہیں۔ باتوں کے طوفان میں بار بار یہ محسوس کر کے سخت کوفت ہوتی رہی کہ پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھری گھونٹ پر تل کر بحث نہ ہو سکے گی اس لئے کیوں نہ قنوطیت پر اتر آؤں اور اپنی خاندانی کج بحثی کام میں لاؤں کہ بڑے بڑے سورماؤں پر آزمایا ہوا نسخہ ہے جہالت اور کم مائیگی کے لئے بہترین ڈھال۔

مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ غنیم نہایت چوکس ہے مجھ سے کئی سال پرانا اور اکھاڑے کا کج بحث ہے تیر کی ڈک بڑی چابک دستی سے واپس لوٹا دیتا ہے اس میدان میں بھی کھلی مات سے بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دوں۔ شاگردی کی مسکین صورت سے سوالات کروں اور یہ بکھر جائے کہ حلق خشک کرے۔ موقع پاؤں تو ڈنک مار دوں۔ مگر توبہ کیجئے پطرس گھسنے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال میں نہایت بھونڈے پن سے "ہٹائیے بھی یہ بدرنگ باتیں" کہہ کر میرا خوب جی جلایا۔

میں نے بھی چڑ کر ان کی ہر بات کو الٹ کر بحث شروع کر دی انہوں نے میرے ہر پسندیدہ شاعر کو اور ادیب کو جاہل اور الو کہہ دیا۔ میں

نے بھی بالکل برخلاف نہایت تہذیب اور سلیقے سے انہیں احمق کہہ دیا جس پر وہ بے تحاشہ ہنسے۔ میں نے پھر جھجک کر ان کا ساتھ دیا گو جی یہ چاہ رہا تھا کہ سرہانے رکھا ہوا لیمپ اسٹینڈ ان کے سر پر گر پڑے اور میں ہنستی رہوں۔

" اسے اٹھوا دیا گیا" گھڑی دیکھ کر وہ جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگے پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بالکل ویسے بدذات کالے بھالو کی طرح۔ ایک دفعہ اس نے چڑانے پر میرے گال پر ایسا پنجہ مارا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔

" جلدی چلنا چاہیے ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔" مطلع صاف ہو گیا اور ہم نہایت اطمینان سے ڈائننگ ہال میں جا کر مینو پڑھنے لگے۔ " اف یہ فرنچ کھانوں کے نام مجھے بڑے گندے لگتے ہیں" میں نے پھر جلانے کی کوشش کی۔ "سب کھانے سارڈین کی طرح بدبودار اور لس لسے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد مچھلیوں، گھونگھوں اور سیپیوں پر بحث ہونے لگی اب انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکالا ہر بات پر اتفاق کرنے لگے جس پر کوفت ہونی ہی ہو گئی اور میں اس نتیجہ پر پہونچی کہ پطرس اتر جائیں تو دلہن جانے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے چاہا ان کی تحریروں کے بارے میں بات کروں مگر اس عرصے میں ہمارے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ بھڑک گئے اور یہ بجا بھی تھا اس وقت میں ان کی کہانیوں کی تعریف کر کے ان کے چہرے پر آنے والی جھپکیوں پر مسکرا کر جی ٹھنڈا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ فوراً ادب کی محفل سے چھلانگ مار کر کھانے پر آ گئے۔ کافی بدمزہ کھانا تھا۔ شوربا تھا جیسے پھر وہ چبا رہے ہوں اشارے سے بیرے کو بلا کر بڑی لجاجت سے بولے۔

" دوست یہ بڑا اکڑ سینگ لگ رہا ہے کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکا دیا ہے ناں۔" بیرے بے چارہ کھسیانا ہو کر ہنس دیا۔ اور جب وہ پلیٹ اٹھا کر چلا گیا تو ایک دم سے بولے۔

" تم نے کشمن کو پطرس کیوں سمجھا اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا ہوتا تو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی۔" مجھے ستاتا دیکھ کر بولنے سے پہلے جلدی سے بولے " شاید گدھے کو شکایت ہوتی۔" میں نے اتنی زور سے ٹھٹھا مارا کہ ہال میں مہذب لوگ ہڑبڑ کرتے کرتے ایک دم چونک کر دیکھنے لگے۔ پطرس نے تادیبی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں

" درمیانہ درجہ کی چار دیواریوں میں پلی ہوئی لڑکی تاج محل ہوٹل کے آداب سے کیسے واقف ہو سکتی ہے۔" ان کا خیال ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک دفعہ تاج میں چائے پی تھی۔ اس وقت تک یہ پہلا اتنا شاندار ہوٹل جسے صرف دیکھنے کے لیے گئی تھی۔ تکلفات، سجاوٹ اور صفائی کو ہمارے گھر میں نہایت تحقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانے کی میز تو تھی اور جب نہایت غیر دل چسپ قسم کے مہمان آتے تھے تب اس پر سے سلائی کی مشین، اچار کی برنیاں اور بچہ کا گڈولنا اتار کر تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیا جاتا تھا۔ خاص مہمانوں کی چادر بچھا کر چینی کی پلیٹیں سجا دی جاتی تھیں۔ آپا بڑے چاؤ میں آ کر نیپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں سنوار دیتیں۔ ہم لوگ اسے احمقانہ بناوٹ اور بے کار کی زحمت سمجھ کر نہایت تحقیر سے ہنستے اور انہیں چڑانے کو گلاس میں سے نیپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے۔ آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے جنگلی پن کی وجہ سے شرمندہ ہوتیں تو بڑا لطف آتا۔ ہم لوگ تو تانبے یا تام چینی کی رکابیوں میں کھانا لے کر بان کی چارپائی پر سینی رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ذرا پلنگ کی ادوائن ڈھیلی ہوتی تو بڑا مزہ آتا کوئی موٹا آدمی بیٹھ جاتا تو سارا شوربہ گود میں بہہ آتا۔ بان کی ڈھیلی چارپائی پر بیٹھ کر پتلے شوربہ کا سالن کھانا بھی ایک فن ہے۔ جس میں ہمارا گھرانا ماہر تھا۔

تاج محل ہوٹل میں کانٹے چھری سے کھانا کھاتے وقت میرے کندھے اچکانے کے بوجھ سے تھک گئے۔ اور انانیت کو سخت ٹھیس لگی اور

مجھے فوراً احساس برتری ہونے لگا کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روز روز کی طرح طرح کی مہمان نوازیوں کا پڑتا ہوگا۔ انہوں نے شاید کبھی کھاٹ پر بیٹھ کر آلو گوشت نہیں کھایا ہوگا۔ خاص کر جب کہ اس میں پڑوسی کے باغ سے چرا کر نیبو نچوڑا گیا ہو۔ پتہ نہیں میرے سے پیٹوں میں نے جلسہ کیا تھا کر رکھ دیا۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ بے سمجھے سوال اور طریقے پر کرشن چندر، بیدی اور منٹو پر بحث ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا میں تکلف میں ان کی تعریف کرتی ہوں تاکہ لوگ مجھے بڑا اور یار لوگ سمجھیں اور میں کہتی تھی میں خدا کی کبھی جھوٹی تعریف نہیں کروں گی۔ ان کی کہانیاں میں نے تنقید لکھنا ایک کہانی نگار کی حیثیت سے نہیں ایک انسان کی حیثیت سے دل بہلانے کو پڑھی ہیں کچھ بری بھی لگی ہیں اور کچھ نشتر بن کر دل میں تر از ہو گئی ہیں۔

"یہ جذباتیت ہے" انہوں نے رکھائی سے کہا۔

"جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا وہ سمجھے میں بن رہی ہوں۔ حالانکہ یہ سولہ سال پہلے کی بات ہے اور واقعی میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتی تھیں۔ میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیے تھے۔ ان کی علمی بزرگی کی قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا جو کہا وہ نہایت بے دلی سے سنی ان سنی کر گئے۔ ان کی اپنی تخلیقات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔ کم سے کم مجھے آج یہی اندازہ ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔

وہ ٹھنڈے پن سے کھیلتے گذر گئے

"آپ ڈرامہ کیوں لکھتی ہیں؟" انہیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"یونہی" میں نے لنگڑا سا جواب دیا۔

"میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے اسٹ پلاٹ ہوتے ہیں کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا۔ سلیقہ سے کتر بیونت کرنے کے بجائے آپ انہیں دانتوں سے گھسوٹتی ہیں۔" ان کی بوجھل عقابی آنکھوں میں ایذا رسانی کی لذت کا نشہ بھر آیا۔

چائے کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر لوٹ دوں اور پلیٹ کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر سرکا دوں۔ مگر میں نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے رہوار کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی اتار کر نہایت نرمی سے کہا۔ "اچھا...... اب نہیں لکھوں گی۔" انہیں ناامیدی سی ہوئی کہ میں نے بحث کیوں کاٹ دی۔

"مکالموں میں آپ کے کافی جان ہوتی ہے۔" اور نو میں نے سوچا۔ یہ میرے مکالمے کتو ڈی ہوتے ہیں گھر میں سب ایسے ہی بولتے ہیں میں دوسری زبان کہاں سے لاؤں۔

"برنارڈ شا سے متاثر ہیں؟"

"بے حد" میں نے ایک ڈرامہ میں برنارڈ شا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اٹھا لیا ہے کیونکہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ مجھے اپنی آنے والی ذمہ داریوں کا اس وقت تک اندازہ نہیں تھا یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن "جواب داری" کرنا ہو گی۔ اصل میں میں نے وہ سین ایک فلمی کہانی کے لئے اڑایا تھا۔"

میں نے سوچا اس سے پہلے میری ٹانگ کھینچیں خود ہی کیوں نہ سرکھولوں۔ "آپ کبھی کے جرم جرم اور سے بھی اس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہہ تو دیا لیکن اب سوچتی ہوں کہ صرف ایک بات مشترک تھی یعنی دونوں مزاح نگار تھے۔ شاید چڑ کر کہہ دیا ہو گا وہ نہایت ہوشیاری سے ٹال گئے اور اشارے سے بیرے کو بلایا۔ بڑی پریشان صورت بنا کر چاروں طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا۔" بڑے ادب سے مجھ سے معذرت چاہی پھر سرگوشی میں بیرے سے کچھ کہا۔ وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"صاحب! آپ اطمینان رکھو، کوئی بات نہیں۔" بیرے نے ہمت بڑھائی۔

"نہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو ...." پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا

"آپ بڑا صاحب"

"منیجر تو کچھ ...."

"نہیں صاحب منیجر تو کون بولے گا...... ہم کو بولو...."

پطرس نے بڑی شکرگزار نظروں سے مجھے دیکھا پھر بالکل کان کے پاس ہونٹ لے جا کر بولے

"ہاں"

"کافی؟" بیرا چکرایا۔

"ہاں! اور نمکین بسکٹ بھی۔" بیرا مجسم سوال بنا کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھنے لگا۔

"کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے..... شاباش!"

"نہیں صاحب اطمینان رکھو۔" بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو "دماغ تو سلامت ہے حضور کا" پطرس نے نہایت معنی خیز انداز میں آنکھ ماری بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا۔

اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگاری نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلا پن ہے۔ ان کی زبان میں چٹخنے ہیں اور برتاؤ میں چلبلا پن ان کے طنز میں تیکھا پن ہے۔ انہوں نے زندگی کا تنگ و تاریک رخ نہیں دیکھا۔ وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے آزاد زندگی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے کبیدہ سے ہو جاتے تھے۔

جسم فروشی اور حرامی بچوں کے سوال کو وہ کچھ زیادہ مہذب نہیں سمجھتے تھے۔ ان دنوں جس کسی سے بھی ملتی تھی "لحاف" کا ذکر چھڑ جاتا تھا میری چڑھ سی ہو گئی۔ پطرس نے لحاف ہی نہیں اور بھی جنسی الجھنوں پر کوئی بحث نہ کی۔

"میں اپنی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتی ہوں۔" میں نے انہیں زمار سانیت کے موڈ میں پا کر کہا۔

"کیوں؟" وہ بڑے کھرے پن سے بولے "آپ کی کہانیاں ترجمہ نہ ہوں گی تو کیا انگریزی ادب غریب رہ جائے گا یا شاید آپ کا خیال ہے۔ انگریزی کا جامہ پہن کے تحریر زیادہ بلند ہو جائے گی۔"

پھر جی جلا۔ ایک دم سے یہ انسان اتنا خشک کیوں ہو جاتا ہے۔ "نہیں، یہ بات تو نہیں اصل میں انگریزی میں چھپنے سے پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ احمد علی نے ایک کہانی کے مجھے چار پونڈ دلائے تھے۔"

کچھ لاجواب سے ہو گئے اور مسکرانے لگے۔ "فکر نہ کیجئے ایک دن ملک کے لوگ خود ہی اس طرف توجہ دیں گے۔" پھر میں نے فکر نہ کی۔

ایک ایک لمحہ پر لطف گزرا۔ گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ابھی ذہن میں بہت کچھ تھا وہ مجھے چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے۔ میں ان دنوں ملاڈ رہتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ جو میں نے نہیں پڑھا لوگوں سے ذکر سنے تھے۔ ایک بار دلی جانا ہوا تو دعوت میں بلایا، وہاں فیض بھی تھے۔ مگر بڑی چپ چاپ سی محفل تھی جس کا میرے دماغ پر دھندلا سا بھی عکس نہیں۔ کچھ سیاست کی باتیں زیادہ ہوئیں جو میرے پلے

نہیں پڑیں۔

سال بھر بعد میں نے نوکری سے استعفا دے دیا۔ شاہد کی نوکری بھی کچھ ڈھل مل سی نظر آنے لگی۔ میں نے پھر نوکری کا ارادہ کیا۔ نہ جانے کیا دل میں سمائی پطرس کو لکھ مارا کہ نوکری چاہیے کہیں بھی ملے۔ چار پانچ سو سے کم میں گذر نہیں ہوگی۔ ہفتہ بھر کے اندر چھ سو روپے کی نوکری مع تقرر کے خط کے مل گئی۔ اس عرصہ میں مجھے ایک فلم کا کام مل گیا تھا اور شاہد کو بھی ڈائرکشن مل گیا۔ میں نے پطرس کو بڑی شرمندگی کا خط لکھا۔ معافی مانگی۔

پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ جاگیریں بٹیں، زبان بٹی، ادب بٹا اور ادیبوں کا بھی بٹوارا ہوگیا۔ آدھا کنبہ یہاں آدھا وہاں چلا گیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہونچ گئے۔

مگر نقوش میں ان کا ایک خط پڑھ کر نجانے کیوں محسوس ہوا...... پطرس دور جا کر بھی پاس ہی کھڑے ہیں۔ آج ہی میں نے سٹائیٹ پیپرس خریدی ہے پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ کر پلنگ سے نیچے گرنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر میرے دل و دماغ کی تکان سی اتر رہی ہے۔ وہ قلم جو تھکے ہوئے انسانوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی مہلت بخش دے خاموش ہو چکا مگر وہ میرے تخیل میں وہ بھاری بھاری غلافی آنکھیں آج بھی بے ساختہ مسکرا رہی ہیں۔

اے۔ ایس۔ بی

شوکت تھانوی

"زیڈ۔ اے۔ بی کے بڑے بھائی کو ہم لوگ اے۔ ایس۔ بی کہا کرتے تھے۔ پطرس بخاری صاحب کہنے میں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کون سے بخاری صاحب بڑے یا چھوٹے؟ اور پورا نام لینے میں یعنی احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری۔ کہنے میں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اتنی سی تو ہے، اتنے بڑے بڑے نام ہیں کہ اس کی خواہ مخواہ فضول خرچی کیوں کی جائے لہٰذا ریڈیو والے عموماً ان دونوں بھائیوں کو اے۔ ایس۔ بی اور زیڈ۔ اے۔ بی کہنے میں کفایت شعاری کے زرّیں اصول پر عمل کیا کرتے تھے ـــــ لیکن یہ میں نے بیچ ہی میں ریڈیو کی بات کہاں شروع کر دی۔ ریڈیو سے تو میرا تعلق اس وقت پیدا ہوا ہے جب آل انڈیا ریڈیو کا لکھنؤ اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اور میں اے۔ ایس۔ بی سے بحیثیت پطرس کے اس سے پہلے ہی مل چکا تھا یعنی اس وقت جب میں لکھنؤ سے بحیثیت "ناگر" تقریباً ہر ہفتہ آل انڈیا ریڈیو دہلی جایا کرتا تھا۔ اور تاکے بیٹھا تھا کہ پطرس بخاری سے ملاقات ہوتے ہی ان کو بھی اسی طرح پھانس لوں گا جس طرح مولانا نیاز فتحپوری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، اور رشید احمد صدیقی کو پھانس چکا ہوں۔ اپنے ایک مجموعہ مضامین پر مولانا نیاز فتحپوری سے مقدمہ لکھوا چکا تھا۔ اس مجموعے کا نام بحرِ تبسم تھا۔ دوسرے مجموعہ سیلابِ تبسم پر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ تیسرے مجموعہ طوفانِ تبسم پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے مقدمہ لکھا تھا۔ چوتھے مجموعہ دنیائے تبسم پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ تھا۔ اور اب ایک اور مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کو پطرس بخاری پر کمند باندھ چکا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو اپنی تقریر نشر کرنے دہلی گیا تو اس نئے مجموعے سے مسلح ہو کر گیا اور بخاری صاحب کو ان کے دفتر میں جا لیا۔ بڑے خلوص سے ملے بلکہ مجھ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ نہیں مل رہا ہوں یعنی میں ان سے مرعوب ہونا چاہتا تھا اور وہ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت ڈپٹی کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی کرسی پر بیٹھے تھے، مگر مجھ کو اس سے کیا، میں تو ایک عظیم مزاح نگار کے سامنے ان کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے حاضر تھا۔ اور ان کی عظمت کا احساس مجھ پر طاری تھا جس کو وہ اپنے انتہائی یگانگت اور مساوات کے برتاؤ سے غیر محسوس بنائے دیتے تھے۔ آخر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں حرفِ مطلب زبان پر لایا اور بخاری صاحب سے اپنے نئے مجموعہ مضامین پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تو بڑی خندہ پیشانی سے بولے

"یہ کیا مقدمہ بازی لے بیٹھے آپ؟"

میں نے عرض کیا "جی ہاں یہ چھوٹا منہ بڑی بات تو ضرور ہے مگر میں آپ سے وعدہ لیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔"

کچھ ہنستی ہوئی آنکھوں سے گھورا۔ کچھ سر پر ہاتھ پھیرا اور گویا عاجز آ کر مسکراتے ہوئے بولے: "اگر آپ اپنے مقدمہ نگاروں کی ٹیم ہی مکمل کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے لکھ دوں گا مقدمہ۔"

یہ وعدہ لے کر میں بڑے فاتحانہ انداز سے واپس آیا مگر اس ملاقات کے بعد ہی حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے لکھنؤ میں بھی

پٹنا اسٹیشن کھول دیا اور اس اسٹیشن کے ڈائریکٹر جگل کشور مہرا اور پروگرام ڈائریکٹر ملک حبیب احمد نے اپنے محکمہ کو منتقل کیا یعنی پٹھانی کو مجھ کو ابھی صحافت چھوڑ کر ریڈیو سے وابستہ ہو جانا پڑا اور اس کے چند ہی دن بعد میرا وہ مسودہ جو میں بخاری صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا مجھ کو ان کے اس خط کے ساتھ واپس مل گیا کہ "اب جبکہ آپ کو ریڈیو میں ایک منصب حاصل ہو چکا ہے عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مجھ سے مقدمہ نہ لکھوائیے اور میں مقدمہ نہ لکھوں" بات یہی ٹھیک تھی لہٰذا یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہ گیا اور بقول بخاری صاحب کے میرے مقدمہ نگاروں کی ٹیم مکمل نہ ہو سکی۔ اب بخاری صاحب محکمے کے افسر اعلیٰ تھے اور میں محکمہ کا ایک ادنیٰ کارپرداز۔ لہٰذا جب بھی وہ لکھنؤ کے اسٹیشن کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تو میں نے ان سے واقفیت کرانے کی کوشش کی مگر انہوں نے عمداً کچھ کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اس توجہ سے کام لیتے رہے کہ ان کے اپنے عہدہ کا تقاضا تھا اور میں ان حدود سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ کچھ دن کے تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ بخاری صاحب کے جس سلوک کو میں اپنے ساتھ خصوصیت سمجھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے عام تھا۔ ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ سرکاری اور محکمہ جاتی کام کے وقت وہ نہایت بھاری بھرکم قسم کے سڑے ہوئے افسر بنے بیٹھے رہتے تھے اور کام ختم ہوتے ہی کچھ صحبتوں میں ان ہی سب کے بے تکلف دوست بن جایا کرتے تھے جن پر ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا رعب قائم رہ چکا تھا لطیفے سنا رہے ہیں لطیفے سننے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ بات سے بات پیدا کر رہے ہیں ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔ ایک دن اسی قسم کی نجی صحبت میں ہنس بول رہے تھے کہ ایک بھولی بسری بات یاد کر کے ٹہلتے ہوئے میرے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"مجھ کو بری کرنے کے بعد آپ نے وہ مقدمہ کس پر دائر کیا؟"

میں نے کہا: "کسی پر نہیں۔ وہ مجموعہ بغیر مقدمہ کے چھپ گیا۔"

کہنے لگے: "اور میری یہ سزا بحال رہی کہ میں اسے نہ پڑھ سکوں۔"

میں کتاب پیش نہ کرنے پر ابھی پوری طرح نادم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا: "آخر لوگ مقدمے لکھواتے ہی کیوں ہیں مجھے تو یہ حرکت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہو بلکہ انگلی پکڑا کر سیدھ دیکھنے گیا ہو۔"

میں نے اقرار کیا کہ "جی ہاں میں اس حماقت کو سمجھ چکا ہوں اور اب اس مقدمہ بازی کے چکر میں نہ پھنسوں گا۔"

بڑی سنجیدگی سے بولے: "اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت دے۔"

کچھ ہی دن بعد مجھ کو لاہور سے پھول آرٹ پریس والوں نے طلب کر لیا اور میں نے ریڈیو سے علیحدگی کے وقت بخاری صاحب کو ایک الوداعی خط لکھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا کہ: —

"امتیاز (سید امتیاز علی تاج) کے بعد آپ کے بھی پھول آخر نکل ہی آئی۔ خدا اللہ کرے آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ آپ جا رہے ہیں خدا حافظ۔ ریڈیو کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ دروازہ صرف جانے کے لئے نہیں آنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔"

اور جب پھول آرٹ پریس سے گزیٹڈ افسر بننے کے شوق میں سرنگ پبلسٹی آفیسر ہو کر میں پھر لکھنؤ آ گیا تو بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر نہیں بلکہ کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی حیثیت سے لکھنؤ کے دورے پر آئے اور مجھے خاص طور پر ملنے کے لئے بلا بھیجا۔ میں نے اپنی تازہ کتاب شیش محل پیش کی اور جب دوسرے دن ریڈیو والوں نے ان کے ساتھ ہی مجھ کو بھی لنچ پر مدعو کیا تو میری صورت دیکھتے ہی بولے: —

"ساری رات شیش محل کی سیر کی ہے لیکن ابھی تک باقی ہے کیسے کیسے بھرپور معرکے ہیں

> ہیں جا بجا — ہزاروں سلام پہنچیں اس خاتون مشرق کو جو احسان کے بچپن کی ماں تک ہے۔
> احسان کی رفیقۂ حیات ہو تا قرۃ کفار — اور وہ افسر ہیر کلی کے لئے گیا عطا ہے کہ بچپن سے
> ان کو دیکھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے بارے میں نظر آتے ہیں معلوم نہیں یہ لوگ فریجیر پر
> ہی بیٹھ کر عمر بھر ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مٹی میں ڈالنے والا مسالا اپنے زندہ جسم پر لگا لیتے
> ہیں۔

اور مجھ کو اس تبصرے سے زیادہ خوشی اس کتاب کی رائلٹی وصول کرتے وقت بھی نہ ہوئی تھی اتنے بڑے مزاح نگار کی یہ سند میرے لکھنے کے لئے بہت کافی تھی۔

سونگ پبلسٹی کے محکمے میں چار پانچ سال تک گانے بجانے کی گزیٹڈ افسری کر کے میں پھر اپنی اوقات پا گیا۔ اور پنچولی آرٹ پکچرس سے پھر وابستہ ہو گیا مگر ۱۹۴۷ء ہی میں جب قیام پاکستان کے بعد پنچولی صاحب بمبئی سدھارے اور ریڈیو پاکستان کی داغ بیل پڑی تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل جناب بخاری یعنی سید ذوالفقار علی بخاری نے مجھ کو پروڈیوسر مقرر کرتے ہوئے کہا کہ: "یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ یہاں آپ کیا کریں گے اپنے لئے کام خود پیدا کیجئے۔" چنانچہ میں اپنے لئے کام پیدا کرنے میں اس طرح مصروف ہو گیا کہ اپنی حیثیت قاضی جی کی پیدا کرنی شروع کر دی۔ اے ایس بی ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے عہدے سے اپنے آپ کو سبکدوش کر کے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے دہلی سے لاہور آ چکے تھے۔ اور اب ان کے بنگلے پر شام کی نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، صوفی تبسم مع اپنے حقے کے، جگل کشور مہرا جو مشرف بہ پاکستان ہو چکنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہونے کے ارادے کر رہے تھے۔ سید رشید احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، اور سید امتیاز علی تاج کے اجتماع رہتے تھے جو نہیں آتا تھا اس کو بخاری صاحب خود جا کر پکڑ لاتے تھے جو آ جاتے تھے ان کو رات گئے بلکہ کبھی کبھی صبح ہونے سے قبل اپنی کار پر گھر چھوڑنے جاتے تھے اور یہ نصیحت کرتے جاتے تھے کہ رات کو خواہ کہیں رہو مگر صبح اپنے بستر ہی سے اٹھو۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کو تین بجے آئس کریم کھانے کا دورہ پڑا اور کوشش کی گئی کہ پچھلے پہر آئس کریم والوں کو جس طرح بھی ہو اسی وقت جگایا جائے اور حیرت ہے کہ اس وقت بھی ان کو کہیں نہ کہیں آئس کریم مل ہی گئی اور آئس کریم والے بھی جانے ڈھونڈ کر کہیں نہ کہیں سے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹر جگل کشور مہرا پاکستان کے زندہ باد ہونے کے بعد خود بخود مردہ باد ہو کر رہ گئے تھے کہ ہندی، اردو اور لاہور کی محبت میں رہ آ پڑے۔ پاکستان میں گھر بنانے کیوں ان کو یا جگل کشور مہرا ہوتا پاکستان میں کچھ چند سلطان احمد کا تھا بڑے سادہ مچھ نے ہر قسم کے بخاری لے ان کو سمجھایا دوسرے دوستوں نے بھی اس جلد بازی سے روکا مگر ہوا یہی کہ ایک دن چند مخصوص احباب کی موجودگی میں بخاری صاحب کے گورنمنٹ کالج والے بنگلے میں وہ مولانا غلام مرشد کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہو کر کلمۂ شہادت پڑھتے اور مولانا غلام مرشد سے اس کا تفسیل بلکہ تفصیل سے بھی کچھ زیادہ ترجمہ سمجھتے نظر آئے اور عین اس وقت جب وہ جگل کشور سے یکایک احمد سلمان بن چکے تھے اسی جگہ ان کی ترقی کے احکام موصول ہوئے کہ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان مقرر کر دیے گئے۔ اس کے بعد ہی دوسرا شرعی اجتماع خود احمد سلمان صاحب کی کوٹھی پر اس وقت ہوا جب ان کے نکاح کا مرحلہ درپیش تھا۔ اور محمود نظامی صاحب کے ذمہ تھا قاضی کو لانا چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹا سا ٹرانزسٹر مولانا کو نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے۔ بخاری صاحب نے ان مولانا کو بڑے غور سے دیکھا اور میرے کان میں کہا کہ "نکاح کے لئے قاضی اور چھوہارے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں نظامی ان دونوں چیزوں کو ملا کر لے آیا ہے۔" اس تقریب میں سید ذوالفقار علی بخاری دولہا کے ولی بنے اور میں دلہن کا ولی۔ ہم دونوں مہر کے تعین پر کافی دیر بحث کرتے رہے آخر تصفیہ ہوا۔

پہنچ ہی گئے۔ بخاری صاحب صرف تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ چھوٹے بخاری وکیل بنے گواہ میں بنا اور دوسرے گواہ محمود نظامی صاحب اور جب دلہن سے پوچھ کر سہاگ قاضی صاحب کے پاس گئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ ان کو ہنسی یہ کہلانے میں کتنے لمبے بیٹے ہیں کہ دلہن کا نام سلطان ہے بلکہ خود ہے اور دولہا کا نام احمد نہیں بلکہ سلمان ہے اس کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ قاضی صاحب نے ان دونوں میں سے کس کو دولہا اور کس کو دلہن سمجھ کر نکاح پڑھا ہے بہرحال یہ طے ہے کہ نکاح ان ہی دونوں کا ہوا تھا دراصل یہ بات ان ہی دونوں پر چھوڑ دی گئی تھی کہ اپنا دولہا دلہن ہونا خود آپس میں طے کرتے رہیں البتہ جو خطبہ بعد میں پڑھا ہے اس کے متعلق بخاری صاحب کا بیان یہ تھا کہ یہ خطبہ نکاح کا نہیں بلکہ جمعہ کا تھا۔ اس خطبے کے بعد بخاری صاحب نے دودھ سے ایک چھوارا ان مولوی صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا: "مولانا چھوارا" اور مولانا نے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا "جی بسم اللہ" بخاری صاحب نے "جزاک اللہ" کہہ کر چھوارا کھا گئے۔

اس کے بعد ہی یہ شیرازہ منتشر ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کا ہیڈ کوارٹر کراچی چلا گیا۔ چھوٹے بخاری صاحب معہ رشید احمد صاحب اور احمد سلمان صاحب کے کراچی چلے گئے، بڑے بخاری صاحب لیاقت اور میں چلے پہنچے میں لاہور ہی میں رہ گیا اس زمانے میں اپنے کو الجھانے کے لئے۔ کئی سال بعد کراچی میں اپوا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا بخاری صاحب ان دنوں امریکہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے اس مشاعرے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا کہ کراچی میں بخاری صاحب سے ملاقاتیں رہیں گی سلمان صاحب بھی وہیں ہیں رشید صاحب اور چھوٹے بخاری صاحب بھی وہیں ہیں ایک مرتبہ پھر محفلیں گرم ہو جائیں گی اور کراچی پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی بخاری صاحب ہی کر رہے ہیں تو اور بھی خوشی ہوئی۔ مشاعرے میں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی چنانچہ جب میں پہنچا ہوں تو بخاری صاحب فی البدیہہ صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور ذکر کچھ میرا ہی تھا کہ "اس مشاعرے میں شرکت کے لئے شوکت تھانوی بھی آئے ہوئے ہیں جن سے میں یہ پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں کہ آخر وہ کس تھانے یا کس تھان سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ ان کا کوئی ایسا گھر کا ماجرا ہے کہ وہ کسی طرح اسے کھولنا گوارا نہیں کرتے تھے ——— اس مشاعرے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن بخاری صاحب نے اپنے گھر پر چند نیازمندوں کو بلا لیا۔ اس میں شرکت کے لئے جب میں پہنچا تو بخاری صاحب محض ایک نکر پہنے باقی بالکل ننگے دھوپ میں بیٹھے تھے ان کو دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا پہنچا ہڈیوں کا ایک نحیف و نزار ڈھانچہ تھا ان کے قلب کے دورے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی آج ان کا یہ لاغر جسم دیکھ کر بیساختہ دل سے ان کی صحت اور درازی عمر کی دعائیں نکلنے لگیں مگر بخاری صاحب نے اپنے لطائف و ظرافت سے بہت جلد اس اضمحلال کو ختم کر دیا البتہ کھانے کی میز پر جب کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے ایک ڈش سے جیلی اپنی پلیٹ میں نکالی ہے تو بخاری صاحب دوڑ پڑے: "یہ نہ لینا کھو کا مر جاؤں گا میں" معلوم ہوا کہ وہ صرف "تماشائی" کے طور پر بیٹھے ہوئے چند ٹکڑے اور یہ جیلی ہی کھا سکتے ہیں یہی ان کی غذا ہے اور یہی غذائیت سے بے نیاز غذا کھا کر وہ جی رہے ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کتنا ترس آیا ہے ان پر کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ ان سے کہوں کہ اب آپ امریکہ نہ جائیں مگر میں ان پر وہ خطرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جو خود محسوس کر رہا تھا۔ آخر پچھلے سال جب میں ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہو کر پھر صحافت میں آگیا اور روزنامہ جنگ کی ادارت کے سلسلہ میں مستقلاً کراچی کا ہو گیا اور آخری مرتبہ بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اب آپ کراچی سے نہ جائیں اور اس کا جواب بھی سن لیا کہ "اگر آپ بچے کا عذر پیش کر دیں کہ میں کراچی میں رہ کر نہ مروں گا تو میں امریکہ جانے کا ارادہ ملتوی کرنے کو تیار ہوں۔" چنانچہ وہ پھر امریکہ گئے اور اب کبھی امریکہ سے واپس نہ آئیں گے اب کراچی میں کوئی ان کا انتظار نہ کرے گا اب کوئی ان سے اصرار نہ کرے گا کہ امریکہ نہ جائیے ———

———

پیر و مرشد

کنہیا لال کپور

پطرس میرے استاد تھے۔ ان سے پہلی ملاقات تب ہوئی۔ جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگلش میں داخلہ لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انٹرویو بورڈ تین اراکین پر مشتمل تھا۔ پروفیسر ڈکنسن (صدر شعبہ انگریزی)، پروفیسر مدن گوپال سنگھ اور پروفیسر اے ایس بخاری۔ گھر سے خوب تیار ہو کر گئے تھے کہ سوالات کا کرارا جواب دے کر بورڈ کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں گے۔ بخاری صاحب سے جسے سن رکھا تھا کہ ریچھ چونکنے لگے جونہی کمرے میں داخل ہو کر آداب بجا لائے انہوں نے ناک پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا "آپ ہمیشہ سے ہی ایسے نظر آتے ہیں یا آج خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟" لاجواب ہو کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگے

"آپ شاعر ہیں؟"

"جی نہیں"

"دیکھنے میں تو آپ مجنوں لاہوری نظر آتے ہیں"

پروفیسر مدن گوپال سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "بخدا ان کی شکل خطرناک حد تک مجنوں گورکھپوری سے ملتی ہے۔" پھر میری جانب متوجہ ہوئے "آپ کبھی مجنوں گورکھپوری سے ملے ہیں؟"

"جی نہیں"

"ضرور ملئے۔ وہ آپ کے ہم قافیہ ہیں۔"

پھر پوچھا "یہ آپ کے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ آپ کتابی کیڑے ہیں۔ جانتے ہو کتابی کیڑا کسے کہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ جو شخص ہر وقت مطالعہ میں منہمک رہتا ہے۔"

"کتابی کیڑا وہ ہوتا ہے جو کتاب کی بجائے قاری کو کھا جاتا ہے۔"

پروفیسر ڈکنسن نے بخاری صاحب سے دریافت کیا "ان کے بی اے میں کتنے نمبر آئے تھے؟"

انہوں نے میرا ایک سرٹیفکیٹ پڑھتے ہوئے جواب دیا "۳۲۹۔ فرسٹ ڈویژن۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" پروفیسر مدن گوپال سنگھ نے پوچھا۔

بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "داخل کرنا ہی پڑے گا۔ جو کام ہم سے عمر بھر نہ ہو سکا، وہ انہوں نے کر دیا۔"

پروفیسر ڈکنسن نے چونک کر پوچھا "کونسا ہم بخاری صاحب؟"

سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے فرمایا "یہی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لینے کا!"

دوسرے دن کلاس روم میں گئے۔ بخاری صاحب کا ان دنوں عالم شباب تھا پینتیس سال کے قریب عمر ہوگی۔ دراز قد گھنی بھنویں، سرخ و سفید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبوترا چہرہ، شکل و شباہت کے اعتبار سے وہ افغان یا ایرانی دکھائی دیتے تھے۔ ریشمی گاؤن (GOWN) پہن کر کلاس روم میں آتے تھے۔ حاضری لئے بغیر لیکچر شروع کیا کرتے۔ عموماً لیکچر سے پہلے اپنے عزیز شاگردوں سے دو ایک چٹکیاں مزید لیا کرتے تھے۔ طراح ساحلی (مشہور ہندوستانی اداکار) ان کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ اکثر ایک آدھ فقرہ اس پر کستے تھے "کیا باعث ہے ساحلی آج کچھ کھوئے کھوئے نظر آتے ہو۔ جانتے ہو جب کوئی نوجوان اداس رہتا ہے تو اس کی اداسی کی صرف دو وجہیں ہوتی ہیں۔ یا وہ عشق فرمانے کی حماقت کر رہا ہے یا اس کا بٹوہ خالی ہے۔"

لیکچر کسی کتاب یا نوٹس (NOTES) کی مدد کے بغیر دیتے تھے۔ انگریزی کا تلفظ ایسا تھا کہ انگریزوں کو رشک آتا تھا۔ فرسودہ یا رواتی انداز بیان سے چڑ تھی۔ غلطی سے بھی کوئی عامیانہ فقرہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ ڈرامہ پڑھانے میں خاص کمال حاصل تھا۔ ہیملٹ "HAMLET" پڑھا رہے ہیں تو چہرے پر وہی تاثرات پیدا کریں گے جو موقع محل کی عکاسی کرتے ہوں۔ کنگ لیر (KING LEAR) پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ طوفان میں گھرا ہوا بوڑھا شیر غرا رہا ہے۔ شیکسپیر کے مشہور کرداروں کی تقریریں زبانی یاد تھیں انہیں اس خوبی سے ادا کرتے کہ سامعین کو جھرجھری سی آجاتی حافظہ غضب کا پایا تھا۔ اگر جب کوئی نئی کتاب پڑھتے تو دوسرے دن کلاس روم میں اس کا خلاصہ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ لیکچر سننے کے بعد محسوس ہوتا کتاب انہوں نے نہیں ہم نے پڑھی ہے

ایک بار فرانسیسی فلسفی برگساں کی کتاب "LAUGHTER" (مزاح) کی وضاحت فرماتے وقت انہوں نے فلسفۂ مزاح سے متعلق بہت دلچسپ باتیں بتائیں فرمایا "انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے۔"

میں نے کہا "جناب بندر بھی ہنستا ہے۔"

ہنس کر فرمایا "کیونکہ وہ انسان کا جد امجد ہے۔"

بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "ہنسنے کے لئے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوقوف کو لطیفہ سنانا تضیع اوقات ہے۔ اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں لیکن اگر ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے تو باقی بھینسیں اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی۔ کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی تبھی تو یہ محاورہ ایجاد ہوا، عقل بڑی یا بھینس...... ہمدردی یا ترحم کا جذبہ ہنسی کے لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے اگر کوئی شخص سائیکل چلاتے وقت گر پڑے تو آپ اس پر ہنسیں گے لیکن اگر اسے سخت چوٹ آئی ہو تو آپ کبھی نہیں ہنس سکیں گے اگر ایک ریلوے گارڈ گاڑی چلنے سے پہلے ہر مسافر کو سخت سست کہے۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکنے والے ہر بچے کو سرزنش کرے ہر بوڑھے کو فہمائش کرے کہ اسے ڈبے میں فوراً داخل ہو جانا چاہیئے۔ اور خود چلتی گاڑی میں سوار ہوتے وقت گر پڑے تو تمام مسافر قہقہے لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گے کیونکہ ان میں سے کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوگی۔

ایک ہی چیز المیہ اور طربیہ ہو سکتی ہے سوال صرف ہمدردی کا ہے۔ فرض کیجئے بھرے میلے میں کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ میری بیوی کھو گئی ہے کچھ لوگ اس پر ضرور ہنسیں گے۔ یہ بات دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے طربیہ اور خود اس شخص کے نقطۂ نظر سے المیہ ہے..... مزاح بالکل اسی

طرح تیار کیا جاسکتا ہے۔ جیسے صابن یا خوشبودار تیل۔ قابل ملاحظہ ہے کہ دونوں چیزوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے شاں سکے جوہر یہ لکھنے کی بجائے کہ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔ یہ لکھنے سے کہ ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں۔ مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔

بخاری صاحب واعظ تقریر کرنے کے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ غالباً تقاریر کا وہ زمانہ تھا جب ادبی مجلس میں کرسی صدارت اور سر عبدالقادر لازم و ملزوم تھے۔ یونیورسٹی ہال میں ایک دن ساحر صاحب تھا۔ موضوع زیر بحث تھا THE PROPER STUDY OF MANKIND IS WOMAN. (صنف نازک ہی مطالعہ کا صحیح موضوع ہے) جب پروفیسر دیوان چند شرما، خلیفہ شجاع الدین تقاریر کر چکے تو سر عبدالقادر نے بخاری صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کو کہا۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انہیں پوری توقع تھی اب جنسی مذاق کے فوارے چھوٹیں گے۔ بخاری صاحب جھجکتے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ صاحب صدر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ سامعین پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور فرمایا۔ "صاحب صدر! میں بدقسمتی سے پروفیسر واقع ہوا ہوں۔ جس کالج میں پڑھاتا ہوں وہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ کلاس روم میں طلبا کی توجہ کا مرکز صنف نازک ہی ہوتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں طلبا کو اپنی بات متوجہ نہیں کر سکتا۔ بسا اوقات مجھے صنف نازک پر رشک سے تکلیف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے طلبا یہ نکتہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ صنف نازک ہی مطالعہ کا اصل موضوع ہے۔ . . . صاحب صدر! صنف نازک کے مطالعہ کے بغیر حسن کا مطالعہ ناممکن ہے۔ کیا آپ MAGNETISM (مقناطیسیت) کا مطالعہ صنف نازک کے بغیر مکمل سمجھیں گے۔ جب کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت سے زیادہ پُرکشش ہستی خداوند تعالیٰ نے پیدا نہیں کی۔ کیا آپ HEAT (حرارت) کا مطالعہ کرتے ہوئے عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب آپ جانتے ہیں کہ محفلوں کی گرمی عورت کی موجودگی کی مرہون منت ہے کیا آپ ELECTRICITY (برقیات) کا مطالعہ کرتے وقت عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب آپ کو معلوم ہے کہ حوا کی بیٹیاں بادل کے بغیر بجلیاں گرا سکتی ہیں۔ . . . صاحب صدر! صنف نازک آرٹ کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر لیونارڈو دا ونچی اور مائیکل اینجلو نے عورت کے خدوخال کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو کیا وہ ان لافانی تصاویر اور مجسموں کی تخلیق کر سکتے جن کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا ہے کیا کالی داس شکنتلا، شیکسپیئر، روزالنڈ (ROSALIND) اور دانتے بیٹریس (BEATRICE) کا تصور بھی ذہن میں لا سکتے۔ اگر انہوں نے صنف نازک کے مطالعے میں شب و روز نہ گزارے ہوتے۔ . . . . صاحب صدر! صنف نازک نے موسیقاروں سے نغمے اور شاعروں سے شعر، غزلیں اور نظمیں، اور رقاصوں سے کتھک اور کتھا کلی کی تخلیق کرائی۔ اگر آج فنون لطیفہ ختم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ کے اصلی موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جن سے بجلی کے پنکھے، بسکٹ اور دیسی گھی، اور کیمیکل تو معرض وجود میں آ سکتے ہیں لیکن "میگھ دوت"، "تائیس"، "اندمنی پورکھش" کی توقع کرنا بے کار ہے۔"

مرحوم تقریر نہیں سحر کیا کرتے تھے۔ ان کی ساحری کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد پروفیسر ایل مہتہ کے اصرار پر ڈی اے وی کالج لاہور میں گالزوردی کے ناول A MAN OF PROPERTY پر لیکچر دیا۔ پروفیسر مہتہ ان دنوں ڈی اے وی کالج میں ملازم تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا مطلع ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لاہور کے کالجوں کے سینکڑوں طلبا و طالبات لیکچر سننے کے لئے ڈی اے وی کالج کے سائنس تھیٹر میں اکٹھے ہوئے۔ بخاری صاحب نے لیکچر کی تمہید اس فقرے سے کی "خواتین و حضرات! ڈی اے وی کالج میں میرا پہلا اور آخری لیکچر ہے وجہ یہ کہ اس کالج کے طلبا کا انگریزی کا تلفظ اتنا عجیب واقع ہوا ہے کہ جب وہ مجھے انگریزی میں بولتے ہوئے سنیں گے۔ تو یہ سمجھیں گے میں انگریزی کی بجائے فرانسیسی یا جرمن میں تقریر کر رہا ہوں"۔ مرحوم کو انگریزی فکشن (ناول) پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ جب وہ گالزوردی کے ناول کی وضاحت کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا خود مصنف اپنی تخلیق کا تجزیہ کر رہا ہے۔ طلبا ان کے لیکچر کے NOTES لے رہے تھے۔ بخاری صاحب

کی فصاحت اور بلاغت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک خوب صورت فقرے کے بعد دوسرا وضع کر لیتے تھے، اور طلبا تذبذب میں پڑ جاتے کہ کون سا فقرہ نوٹ کریں اور کون سا نظر انداز کریں۔ [illegible] اور بارش تیز ہوگئی۔ بجلی ایک دم زور سے کڑکی اور کمرے کی تمام بتیاں گل ہوگئیں۔ بخاری صاحب نے سلسلۂ تقریر منقطع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گھپ اندھیرے میں اپنے اسی شگفتہ انداز میں تقریر کرتے رہے اور طلبا اندھیرے میں ان کے فقرے نوٹ کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ کہیں سے شور و غل یا چیخ و پکار کی آواز نہیں آئی۔ کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد بتیاں پھر روشن ہوئیں۔ بخاری صاحب نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر کے سننے کے بعد اکثر طلبا کا یہ رد عمل تھا کہ جو باتیں ان کے اپنے پروفیسر دو سال میں نہیں بتا سکے وہ بخاری صاحب نے ایک گھنٹے کے دوران میں بتا دیں۔ اسی تقریر سے متعلق مجھے ان کا ایک فقرہ یاد ہے۔ فرمایا۔ "مشہور انگریز نقاد ڈاکٹر بیکر (BAKER) نے انگریزی ناول پر آٹھ جلدیں لکھی ہیں جن کا مجموعی وزن کوئی چار سیر ہوگا۔ ایک اور انگریز نقاد جے بی پریسٹلے (J. B. PRIESTLY) نے ناول پر ایک کتابچہ لکھا جس کا وزن چار تولے ہوگا۔ میری رائے میں اگر بیکر کی تمام جلدیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور پریسٹلے کا کتابچہ دوسرے میں تو یقیناً پریسٹلے کا پلڑا بھاری رہے گا۔"

سنا تو یہ ہم کالج میں ایک ادبی مباحثہ ہوا۔ بخاری صاحب وہاں صاحبِ صدر کی حیثیت سے موجود تھے۔ موضوع زیر بحث تھا۔ FRAITLY , THY NAME IS WOMAN (عورت تمہارا دوسرا نام کمزوری ہے) لاہور کے بہترین مقرر اس مباحثے میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں سے اکثر یورپ کی سیر کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں یورپین عورتوں کو خاص طور پر نشانہ بنا لیا۔ کچھ نے ہندوستان کی تاریخ سے مثالیں دے کر ثابت کیا کہ عورت نے ہر گام پر مرد کو دھوکا دیا ہے۔ "سکھ مہارانی جنداں" کا ذکر کیا گیا۔ حوا کی کمزوری کی طرف بھی بار بار اشارے کیے گئے۔ بحث کے اختتام پر بخاری صاحب نے فرمایا "میں نے مخالفین کے دلائل بڑے غور سے سنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلائل صحیح اور نتائج غلط ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے کہ عورت مرد کو ہمیشہ گمراہ کرتی رہی ہے تو میرے خیال میں یہ مرد کی کمزوری اور عورت کی شہ زوری ہے ..... حالانکہ میں نے بھی یورپ کی سیر کی ہے لیکن عورتوں سے متعلق میرا تجربہ اتنا وسیع نہیں جتنا میرے چند دوستوں کا جنہوں نے یورپین عورتوں کی کمزوری کا بیان چٹخارے لے لے کر کیا..... کہا گیا کہ یورپ میں عورت شکاری اور مرد شکار ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں ہر شیر اور عقاب کو کمزور سمجھنا چاہیے۔ دراصل بات یہ ہے خدا پنج انگشت یکساں نہ کردہ۔ نہ ہر عورت کانچ کی چوڑی ہے اور نہ ہر مرد فولاد کا پنجہ۔"

بخاری صاحب اپنے طلبا میں تنقیدی شعور پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ رٹے رٹائے فقروں سے انہیں بہت نفرت تھی۔ اگر کسی طالب علم نے کسی مشہور نقاد کے قول کا حوالہ دیا اور جھٹ انہوں نے پھبتی کسی "منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ ابھی حضرت یہ فرمان تو اے سی بریڈلے (A. C. BRADLEY) کا ہے۔ خاکسار بریڈلے کی نہیں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہے۔" جب ہمارا پہلا سہ ماہی امتحان ہوا تو میں نے اپنے پرچے میں متعدد مشہور نقادوں کے فقرے نقل کر دئے۔ بخاری صاحب نے مجھے "صفر" نمبر عطا کرتے ہوئے پرچے کے ٹائیٹل پیج (TITLE PAGE) پر لکھا: "آپ کا سارا پرچہ واوین میں ہونا چاہیے۔ آپ نے جگہ جگہ ایف ایل لوکس (F.L. LUCAS) اور پروفیسر کلرکوچ کے اقوال نقل کر دئے ہیں۔ یہ دونوں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ یقیناً میں اس قابل نہیں کہ اپنے استادوں کا ممتحن بن سکوں۔ مجھے تو آپ کا امتحان لینا ہے۔"

کلاس روم میں کبھی کبھی جان بوجھ کر الٹی بات کہہ دیتے۔ ساری کلاس پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتی۔ وہ ہر ایک معترض کو ایسا دندان شکن جواب دیتے کہ بے چارہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ سارا پیریڈ بحث مباحثہ میں گزر گیا۔ سب کو قائل کرنے کے بعد فرماتے "یہ بات میں نے صرف اشتعال دلانے

کے لئے کھلی تھی۔ وہ اس میں کون کا ذہنی گدگدانے کی ٹیکنیک بہت بڑا فن کا ہے۔" SEMINAR کے پیریڈ میں جہاں طلبا کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی۔ وہ ہر ایک طالب علم پر جرح کیا کرتے تھے۔ ایسی کڑی جرح کہ طلبا کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ خون خشک ہو جاتا۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے اپنے جواب مضمون میں لکھا ہے کہ ٹینی سن (TENNYSON) کے کلام میں موسیقیت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ موسیقیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"موسیقیت سے میرا مطلب یہ ہے کہ ٹینی سن کا کلام پڑھتے وقت ایک دلکش لے یا تال کا احساس ہوتا ہے۔"

"لے یا تال کیا چیز ہے؟"

"آواز کا اتار چڑھاؤ"

"ٹینی سن کے کسی مصرعے کا حوالہ دے کر بتائیے"

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں یونہی ایک مصرع پڑھ دیا۔ فرمانے لگے "یہ تو اتنا کرخت ہے کہ اس کے مقابلے میں کوے کی آواز زیادہ سریلی معلوم ہوگی کہیں یہ بات تو نہیں کہ آپ موسیقی اور شور و غل کو ہم معنی سمجھتے ہیں؟"

سیمنار (SEMINAR) میں اکثر ہندوستانیوں کی عادات پر دل چسپ تبصرہ کیا کرتے تھے۔ "ہم ہندوستانی بھی عجیب لوگ واقع ہوئے ہیں۔ انگلینڈ میں اگر کسی کے گھر موت واقع ہو جائے تو ہمسایوں کو کان خبر نہیں ہوتی۔ یہاں کسی کا دور دراز کا رشتہ دار پیدا ہو جائے تو ساری رات دہاڑیں مار مار کر ہمسایوں کے علاوہ گلی محلے والوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔"

"شور و غل کا ہماری زندگی میں کتنا دخل ہے۔ انگلینڈ اور فرانس میں سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اتنی دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہیں گویا کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ہم ہندوستانی "مدھم" کی بجائے "پنجم" میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ بلکہ ہم بولتے نہیں چلاتے ہیں۔"

"ہم ہندوستانی جب تقریر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گھر والوں سے لڑ کر آئے ہیں اور سامعین پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ماتمی قرارداد بھی ہم اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے ہمسایہ ملک سے اعلان جنگ کر رہے ہوں۔"

"مبالغہ آمیزی ہماری طبیعت کا شعار بن چکی ہے۔ یہاں ہر کانفرنس 'آل انڈیا' یا 'بین الاقوامی' ہوتی ہے چاہے شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک درجن کیوں نہ ہو...... چند دن ہوئے میں نے موچی دروازے کے اندر ایک دکان دیکھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا ہارمونیم اور خستہ حال طبلہ پڑا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا "انٹرنیشنل اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈانسنگ"۔"

"ہندوستانی موسیقی میں سوز ہے جوش نہیں۔ کیمبرج میں ایک بار میں نے اپنے استاد کو پکے گانوں کے چھ سات ریکارڈ سنوائے اس کے بعد ان کی ہندوستانی موسیقی کے بارے میں رائے دریافت کی۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے "بور کرنے کے لیے ایک ہی ریکارڈ کافی تھا۔ آپ نے چھ سات سنوانے کا خواہ مخواہ تکلف کیا۔"

بخاری صاحب سے آخری ملاقات جون ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ تب وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہو چکے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے فرمانے لگے "آپ ڈی اے وی کالج میں یونہی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ غیر ادبی ماحول میں رہنا ذہنی خودکشی کے مترادف ہے۔ میں جلد ہی آپ کو گورنمنٹ کالج میں لانے کی کوشش کروں گا۔" ان دنوں تحریک پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ کسی پروفیسر نے کہا "اگر پاکستان بن گیا تو ہم پروفیسر کو ہندوستان میں نہیں جانے دیں گے۔ البتہ انہیں مشرف بہ اسلام ہونا پڑے گا۔" بخاری صاحب نے چونک کر

فرمایا "حضرت پہلے ہم اور آپ تو مشرف بہ اسلام ہو لیں۔ اس غریب کی باری تو بعد میں آئے گی۔ آخر ہم اور آپ ہی کون سے مسلمان رہ گئے ہیں۔"

آل انڈیا ریڈیو کا تذکرہ پھر چلا نکلا ہے۔ ایک بار میرے متعلق پارلیمنٹ میں کہا گیا کہ میں دوست پرور ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو میں میں نے اپنے دوست اور شاگرد اکٹھے کر رکھے ہیں۔ میں نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں کہا یہ الزام سو فی صد درست ہے مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ بدقسمتی سے میرے تمام شاگرد اور احباب قابل ترین اشخاص واقع ہوئے ہیں۔ اور قابل دوست یا شاگرد جاہل دشمن سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے؟

بخاری صاحب ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کا مقبرہ دیار غیر میں بنا۔ ہندوستان اور پاکستان سے اتنی دور کہ ان کے شاگرد اور عقیدت مند اس پر آنسو بہانے یا شمع جلانے کی سعادت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن علم و ذہانت کی شمعیں جو وہ خود جلا گئے۔ ان کی روشنی ابدی ہے ان کی دین صرف "مضامین پطرس" نہیں۔ ان کی اصلی دین ان کے وہ مایہ ناز شاگرد ہیں۔ جنہوں نے ادب اور فن میں نئی راہیں نکالیں۔ اور جنہیں اپنے "پیر و مرشد" پر جیتے جی کے آخری سانس تک فخر رہے گا۔

پطرس بخاری مرحوم

۱۳۷۸ھ

صوفی غلام مصطفٰی تبسم

بخاری صاحب کی زندگی کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اگر کہا جائے کہ ان کی بعض دلچسپیاں ایک دوسرے سے بھی ان سے ٹکراتے تھے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بقول ان کے ان کے دل میں تنہا ایک ملک یا شہر رہتی کی یاد نہیں بلکہ بیک وقت چھ ملکوں کی یادیں ساتھ ہی تھیں وہ ان سب کو سینے سے لگائے رکھتے اور کسی ایک وقت بھی دل سے الگ نہ ہونے دیتے۔ یہ ان کے ذہن کے وسیع ہونے کی دلیل تھی۔

اس وسعت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں ایک لچک بھی تھی وہ جہاں بھی ہوتے غیر ارادی اور فطری طور پر اپنے آپ کو اس ماحول میں سمو لیتے یا یوں کہیے کہ اس ماحول کو اپنا لیتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک یاد ان کے دل سے ہمیشہ چپکی رہی۔ اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہ پڑی وہ لاہور شہر کی یاد تھی اور اس شہر کا وہ طبقہ اور نمایاں مرکز جسے دنیا گورنمنٹ کالج کے نام سے پکارتی ہے

بخاری مرحوم اس کالج کے طالب علم بھی رہے تھے۔ ان کی اعلٰی تعلیم کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا ان کی علمی اور ادبی زندگی یہیں پروان چڑھی تھی وہ یہیں استاد بھی رہے اور رئیس درس گاہ بھی۔

ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اس ادارے کو چھوڑ کر باہر جانا پڑا۔ ان کے قدم دنیا بھر میں گھومے۔ ان کے فکر و ذہن نے بڑی بڑی پروازیں دکھائیں لیکن اس کالج کے خیال سے کبھی غافل نہ رہے۔

ریڈیو کے محکمہ میں تقریباً دس سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۷ء کے اوائل میں دوبارہ کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے وارد ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دن کے لئے بھی اس سے الگ نہیں ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کا سامان ٹرک سے اتارا جا رہا تھا تو وہ میرے ساتھ کالج کے وسیع صحنوں اور سرسبز میدانوں میں گشت لگا رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کا تبسم صاف صاف بتا رہا تھا کہ انہیں اس قدیمی ماحول میں اپنے آپ کو دیکھ کر کتنی مسرت ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن میں کالج کی عظیم الشان عمارت کا گوشہ گوشہ بدستور تازہ تھا وہ ان میں سے یوں گزر رہے تھے جیسے کوئی اپنے پرانے گھر میں پھر رہا ہو۔ وہ جہاں کوئی نئی چیز بھی دیکھتے تو انہیں اس میں اجنبی پن محسوس نہ ہوتا۔ جہاں کوئی چیز اپنی اصلی جگہ سے ہلی ہوئی آ جاتی کہتے ہیں! یہ کیا ہوا؟

بہرحال وہ اس کے چپے چپے کے ذرے ذرے سے آشنا تھے۔ کیونکہ ادھر مدتوں آتے گئے تھے۔

ان کے کالج میں آنے کے فوراً بعد حالات بگڑ گئے۔ لاہور میں مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہوئے لیکن بخاری صاحب مرحوم نے کالج کی فضا کو بڑی خوش اسلوبی سے ہموار رکھا۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد حالات ابھی مخدوش تھے۔ مقامی طلبا اور اساتذہ کی طبیعتیں اکھڑی اکھڑی تھیں۔ اور باہر سے

وابستہ ہونے والے اصحاب سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔ اس ابتری کی حالت میں انہوں نے کالج کو سنبھالا اور اس احتیاط اور محبت سے سنبھالا کہ اس کی روایات اور شان میں فرق نہ آیا۔

مجھے خوب یاد ہے کالج میں فسٹ ائیر کے داخلے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اخبارات میں داخلے کا اعلان ہو چکا تھا۔ داخلے کے فارم تقسیم ہو رہے تھے۔ داخل ہونے والے بچوں کی ہر طرف چہل پہل تھی۔ بخاری صاحب کے قدم غیر معمولی طور پر تیزی سے ہر طرف اٹھ رہے تھے۔ کبھی وہ نو وارد امیدواروں کو دیکھتے، کبھی دفتر کے کلرکوں پر نظر ڈالتے، کبھی دوسرے کالجوں میں پہنچ کر وہاں کی فضا کو بھانپتے۔ ان کے دماغ میں ایک خلجان تھا وہ یہ کہ کیا گورنمنٹ کالج میں آنے والے طلبا اسی قدیم معیار کے ہوں گے؟ کیا اس کی شان حسب معمول بلند رہے گی؟ کیا اس کی روایات میں فرق تو نہیں آ سکے گا؟

جب یہ خواستیں گزارنے کا آخری دن آیا تو وہ صبح سے بے چین رہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ہیڈ کلرک سے امیدواروں کی تعداد اور ان کی استعداد کے بارے میں پوچھتے۔ جب شام کو پانچ بجے انہیں معلوم ہوا کہ فسٹ ڈویژن میں پاس ہونے والے امیدواروں کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تک پہنچ چکی ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے اور بے ساختہ کہنے لگے ——— صوفی! ہمارے بچوں میں بڑی جان ہے! اس کالج کو زندہ رکھیں گے۔

داخلے میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا؟ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو ان کے شریک کار رہے۔ اللہ جانے انہوں نے کتنے بلکتے ہوئے بچوں کے آنسو پونچھے، کتنے نا چار اور مایوس انسانوں کی ڈھارس بندھائی۔ اس عالیشان عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیا۔ اور اس کام کے لئے انہیں محکمہ تعلیم، افسران بالا، وزرا کے آستانوں غرض جہاں جہاں بھی جانا پڑا گئے اور داماد ے کرائے۔ ایسے مخدوش حالات میں انہوں نے کالج کے لئے وہ کچھ کیا کہ شاید کوئی دوسرا نہ کر سکتا۔

ایک دن چند بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے۔ دوستو! تمہیں معلوم ہے گورنمنٹ کالج کا فارغ التحصیل طالب علم جہاں کہیں بھی ہو سب میں ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات، اس کا لب و لہجہ فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے ماحول اور ہمارے معیار کی بدولت ہے۔ اب اردو ایم اے کی کلاس شروع ہونے والی ہے میں سوچتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر ہم نے انگریزی ایم اے کلاس کی طرح اسے بھی نہ سنبھالا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد اس کی حیثیت ایف اے، فاضل اور منشی فاضل کی سی نہ رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اردو کی ایم اے کلاس کو یونیورسٹی سے الگ تھلگ چلایا اور اس میں بڑی سرگرمی اور تندہی سے کام کیا۔ اگر وہ امریکہ نہ چلے جاتے تو اس کے لئے کیا کچھ نہ کرتے۔

کالج کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی ان کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں اور اگر انہیں یہاں ٹھہرنے اور کام کرنے کا موقع ملتا تو یہ ادارے اللہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ لیکن حکومت ان سے اور خدمت لینا چاہتی تھی۔ انہیں بار بار باہر جانا پڑتا لیکن اس غیر حاضری میں بھی ان کا دل کالج کی یاد سے خالی نہ ہوتا۔ چند مہینوں کے بعد جب وہ لوٹ کر آتے تو گھر پہنچنے سے پہلے کالج کے سامنے موٹر کھڑا کر کے ادھر ادھر نظر ڈالتے اور ایک خوشی کی لہر ان کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے ایک ایک ذرے سے لپٹ رہے ہیں۔

گورنمنٹ کالج میں ان کی حیثیت محض ایک معلم، استاد یا پرنسپل کی نہیں تھی۔ وہ طالب علموں کو صرف پڑھاتے نہیں تھے، وہ زندگی میں ان کے مشفق رہنما اور دوست بھی تھے۔ طالب علموں کی ذہنی استعدادوں کو ٹٹولنا، انہیں ابھارنا، ان کی محنتوں کو صحیح راہ پر چلانا، ان کی زندگی کو سنوارنا، ان کا ایک اہم فریضہ حیات تھا۔ اور ایک دلچسپ مشغلہ۔ اس کے لئے وہ نئے نئے تعلیمی، ادبی، تفریحی حیلے سوچتے رہتے۔ مشاعرے، ڈرامے، مناظرے

ادبی مجلسیں قائم کرتے اور اس طرح طالب علموں کا ادبی ذوق برقرار رکھتے۔

کالج کے مشاعروں میں وہ نہ صرف صدارت کرتے بلکہ داد سخن بھی دیتے اور خود بھی شعر سناتے۔ ان ہی دنوں میں ان کی علمی شہرت نے اس سرزمین میں ایک خاص معیار عطا کیا تھا۔ وہ خود نئے شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ خورشید علی نے ادارہ اردو کے ساتھ ساتھ ہدایت کاری بھی کی۔ انہوں نے کالج میں ادبی سوسائٹیوں کے ہوتے ہوئے ایک الگ "بزم مجلس" قائم کی جس کے جلسے بخاری صاحب کے مکان پر ہوتے تھے۔ جس میں شریک ہونے والے کچھ احباب اور کچھ مخصوص طالب علم ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں علمی و ادبی مضامین پڑھے جاتے اور ایک نہایت ہی شائستہ انداز میں ان پر بے لاگ تنقید بھی کی جاتی۔ تنقید کا مقصد تخریب نہیں بلکہ تہذیب ہوتی تھی۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے اول اول صرف دو نوجوان تھے جو آج اپنی علمی و ادبی حیثیت سے اپنے دیس کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ میری مراد آغا حمید نسیم، سید فیض، حفیظ ہوشیارپوری ... جیسی شخصیتوں سے ہے۔ غرض بخاری صاحب مرحوم غیر معمولی طور پر گورنمنٹ کالج سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کی یاد کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا اور جہاں بھی رہے اسے فراموش نہ کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ خود کالج کی سرزمین بھی ان کی یاد سے خالی نہیں۔ آج جگہ جگہ ان کی محبت کے آثار نظر آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے شاگردوں کے دل اس محبت کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کالج کی فضا میں جن استادوں کی یادیں اور آوازیں گونجتی رہی ہیں ان میں بخاری کی آواز "نوائے زمزمہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ پروفیسر بخاری لان میں بیٹھے کالج کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کالج کی تدریسی و ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ہنس کر بولے: "صوفی! یہ تو شعر ہوئے۔ تم نے سنائے اور میں نے سن کر داد دی۔"

میں چپ ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد بولے: "سنو! تم استاد ہو اور میں کالج کا پرنسپل۔ ہمارا کام اس درسگاہ کے نظم و نسق کو صحیح طور پر آگے بڑھانا ہے۔ میرے نزدیک وہ تجویز جو عملی صورت میں نہیں آتی، خواہ وہ آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوئی ہو، محض ذہنی عیاشی ہے اور میں ذہنی عیاشیوں میں شعروں اور دوستانہ خوش گپیوں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔"

میں نے مرزا بیدل کی ایک غزل جو اسی روز پڑھی تھی سنانی شروع کر دی۔

رات کچھ بے چینی سی رہی۔ ایک مدت سے کالج میں اردو کی تدریس شبانہ جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے "ادیب فاضل کلاس" کی تدریس کا ایک مکمل "پیش نامہ" مرتب کر لیا۔ اور اس کی تین نقلیں بھی تیار کر لیں۔ شام کو یہ مسل بغل میں دبائے بخاری صاحب کے مکان پر پہنچا۔

انہوں نے پوچھا: "ضلع کچہری سے آئے ہو؟"

میں نے کہا: "نہیں، گھر سے آیا ہوں۔"

"تو یہ پلندہ کیسا ہے؟"

"میرے ذاتی کاغذات ہیں۔"

"ٹھیک، بیٹھو۔"

ان دنوں پرنسپل کے مکان میں سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا۔ ایک گھنٹہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی کلام سنانا شروع کیا۔

میں نے کہا: "عام شائقین کے لئے اردو کی شبینہ تدریس کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ ارادہ ہے کالج میں ادیب فاضل کی ایک کلاس شام کو جاری کی جائے۔ اس کلاس کے جملہ نظم و نسق، ترتیب و تدوین اور درس و تدریس کا کفیل کالج ہی ہو۔"

حسب معمول کہنے لگے: "یہ طرحی اشعار ہیں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں۔ مطلع سنا چکا ہوں۔ پوری غزل یہ ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کاغذات کا پلندا ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اسے پڑھتے جاتے تھے اور ان کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتماتا جاتا تھا۔ درمیان میں کہیں کہیں وہ کچھ سوال بھی پوچھتے جاتے میں جواب دیتا اور کہتا: "آپ سارا مسودہ پڑھ لیں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذات ختم ہوئے تو بولے:

"ہوں، گویا میں بھی پڑھاؤں گا۔"

میں نے کہا: "آپ فقط پرنسپل ہی نہیں۔ استاد بھی ہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

اس کے بعد انہوں نے ایک سگرٹ سلگایا۔ جس کا دھواں تھوڑے ہی وقفے میں برآمدے کے ہر گوشے میں لہرا رہا تھا۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ موٹر کار میں بیٹھ کر شہر میں گھومنے لگے جہاں جاتے اسی غزل کی تلاوت ہوتی اور پڑھنے کے ساتھ ہی اس طرح داد بھی دیتے کہ دوسروں کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی۔ اہل فکر حضرات اور مشفق احباب سب نے اسے سراہا۔ اس تبلیغی اعلان اور نشری پرچار میں آدھی رات گزر گئی۔

صبح کو یہ بات لاہور کی گلی گلی، کوچے کوچے میں گشت لگا رہی تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر تمام ضروری مراحل طے ہو گئے۔ محکمانہ اجازت، اشتہار و اطلاعات اور درخواستوں کی طلبی، امیدواروں کی پیشی، داخلہ اور پڑھائی۔

پروفیسر بخاری اپنے روزمرہ مشاغل میں خواہ وہ فرائض منصبی سے تعلق رکھتے ہوں یا نجی ہوں ایسے ہی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ زندگی میں ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی معاملہ فہمی اور جزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاتی تھی۔ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے اس کے حسن و قبح اور دور رس نتائج کو دیکھتے تھے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل بڑی تیزی سے کام کرتی تھی اور وہ کسی خیال کے آتے ہی اسے فی الفور عملی جامہ پہنا دینے کے عادی تھے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ معمولی اقدام کے لئے بھی کئی کئی دن تک غور کرتے رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوچتے تھے۔ دوسروں سے مشورہ بھی لیتے تھے اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسن تدبر سے کام لیتے تھے کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصل راز کا پتہ بھی نہ چلے۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انہیں پورا اطمینان ہو جاتا تھا تب وہ قدم اٹھاتے تھے اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہو جاتے تھے۔

کاموں کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا وہ اپنے عملی اقدام کا چرچا بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے دوستوں کی ہمدردی اور رفیقان کار کی اعانت ہمیشہ ان کا ہاتھ بٹاتی تھی پھر ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی اتنا خوش آئند ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک غیر معمولی ولولہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ خود ان کے شریک کار بن جاتے تھے اور اس شرکت میں ایک راحت محسوس کرتے تھے۔

بخاری کا معمول تھا کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لیے نشان پر محض تنقید نہیں، بلکہ جیسا ہونا چاہیے، چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو ہاتھ لگاتے تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے، کہ گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے۔ ان کا یہ ذوق و شوق ایک سہولت اور آسانی پیدا کرتا۔ ان میں ایک قدرتی روانی آ جاتی اور ان کی تکمیل ایک فطری تقاضے کی تکمیل معلوم ہوتی تھی۔

بخاری جس کام کو کرتے، اسی سرگرمی، ایسے انہماک اور شغف سے کرتے، کہ معلوم ہوتا یہی ان کا فطری شغل ہے۔ وہ قدرت نے انہیں اسی کام کے لیے بنایا ہے لیکن وہ تمام کاروبار بہت کر اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے۔ ان کے نزدیک ہر کام نے ایک پیشہ وارانہ صورت درکار تھی۔ جب تک کوئی مشغلہ نہیں بن جاتا اپنی صحیح حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ انسان کام کرے تو جس کو کام میں لانے، نہیں تو بے کار ہے۔

بخاری نے ایک بے چین طبیعت پائی تھی۔ ان کا دماغ ان کے جسم سے اور ان کا جسم ان کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا۔ خلقان سے ذہنی اطوار اور عملی رفتار ہمیشہ ہم آہنگ رہتے۔ اس لیے انتہائی مصروفیتوں میں بھی ان کی طبیعت پر کوئی ناگوار بوجھ نہیں پڑتا بلکہ تکمیل کار ان سے کوئی خاص لذت اندوزی کا سامان مہیا کرتی تھی۔ وہ کسی شے کو معمولی حالت میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے ان کی طبیعت ایک سی ہی ہر روز کوئی نئی تبدیلی چاہتی تھی اگر یہ تغیر واقع نہ ہو تو ہر مشغلہ اپنی دلچسپی کھو دیتا ہے اور اس کی یکسانیت اسے بے کیف بنا دیتی ہے۔ بخاری کو یہ یکسانیت کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ سمجھتے تھے کہ ایسی یکسانیت سے نہ صرف کام کی رفتار ڈھیلی پڑ جاتی ہے بلکہ کام کرنے والے کی طبیعت کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں مجلس کا قیام، محکمہ تعلیم میں منتخب کتابوں کے تراجم، ریڈیو کے نئے نئے نشری پروگرام سب کے سب اسی اپج کا نتیجہ تھے۔

بخاری کی تیز رفتاری کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ مجلس کے ہفتہ وار ادبی اجلاس پہلے پہل انہی کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ ایک شام جب مجلس کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ وہ ساتھ کے کمرے سے نکل کر آئے۔ آستینیں چڑھی ہوئی، ہاتھ گرد آلود تھے بولے آج میں سخت مصروف ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں میں شریکِ محفل نہ ہو سکوں گا۔ بات ختم ہوئی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ آپ نے رات بھر میں ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کی پچیس سالہ کارگزاریوں کی ایک رپورٹ مرتب کر لی۔ اس رپورٹ کی ترتیب میں انہیں سینکڑوں مسلوں کو کھنگالنا پڑا۔ متفرق اوراق سے ضروری مواد کا انتخاب اور اس کی تدوین و تہذیب کوئی آسان کام نہ تھا۔ دفتری کارروائی کی جاتی تو شاید مہینے لگ جاتے لیکن یہ کٹھن کام ان کے تنہا ہاتھوں نے ایک رات میں سرانجام دیا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ صبح سویرے بخاری صاحب یہ رپورٹ لے کر دفتر پہنچے۔ ان کا خیال تھا افسرانِ بالا ان کی اس فرض شناسی اور تیز کاری پر خوش ہوں گے۔ لیکن وہاں اس وقت کرسیٔ منصب پر ایک ایسے صاحب براجمان تھے جن کی قابلیت محض کہنہ سالی تھی۔ انہوں نے بڑی تمکنت اور رعونت سے رپورٹ کو ہاتھوں میں لیا۔ اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر نہایت بے پروایانہ انداز میں بولے۔ "یہ کیا لکھا ہے .... خیر کوئی بات نہیں میں درست کر لوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے رپورٹ کاغذات کی ٹوکری میں ڈال دی۔ بخاری نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا۔ کوئی صاحبِ ذوق یہ کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ ایک نااہل کا اس افسرانہ لہجے میں گفتگو کرنا نہایت ناگوار گزرا۔ انہوں نے لپک کر رپورٹ اٹھائی اور پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔

"ہیں ہیں یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟"

"اگر یہ رپورٹ اچھی نہیں تو اس کا رکھنا بے کار ہے۔"

بخاری یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ افسر کے کمرے میں دفتر کے چپڑاسیوں کا ایک بڑا دستہ بکھری ہوئی رپورٹ کے پھٹے ہوئے کاغذات کے ٹکڑے جوڑ رہا ہے۔

صلہ کار کی کے ننا نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی کام کسی تاریک کے بغیر یا حصولِ نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کیا جائے اور وہ بھی دوسروں کی خاطر کیا جائے اور پھر اس کام کو یوں ٹھکرایا جائے تو انسان کے دل کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ نا اہل ہاتھوں نے جو چرکے لگائے تھے معلوم نہیں کہاں تک ان پیچے ہوئے کاغذوں پر بیبیوں نے مرہم کا کام کیا۔ یہ بخاری صاحب کا دل ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی چابکدستی دونوں طرح اپنا جوہر دکھا کے رہی۔

ایک مرتبہ ان کے رفیقوں میں سے ایک صاحب یونیورسٹی کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری صاحب کہنے لگے بھائی صاحب! میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہئے۔ اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہئے۔ ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو! میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں۔"

بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار سی شے ہے۔ اور کاموں کی تکمیل میں ایک رکاوٹ سا نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس کی بنا کسی بڑے اصول پر ہو اور ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں۔ تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے تھے۔ رکاوٹوں سے ان کی طبعی صلاحیتیں اور استعدادیں اور بھی ابھرتی تھیں ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ان رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی محسوس نہیں کرتے تھے اور تو اور خود ان سے ٹکرانے والا جب ان سے شکست کھاتا تھا۔ تو اسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا جتنا ان کی عظمت اور برتری کا۔

ریڈیو کے محکمے میں ان کا بالتدریج آگے بڑھنا اور آگے بڑھ کر محکمے پر چھا جانا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ انہوں نے دس سال کے عرصے میں ریڈیو کو جو وسعت اور شہرت دی وہ ان کی ذہانت اور مستعدی کی بیّن دلیل ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں ریڈیو پروگرام اور بالخصوص خبروں کی نشر و اشاعت کا کام بہت کٹھن تھا۔ اس بارے میں انگریز حکام اور ان کی پالیسی بارہا ان کے آڑے آئی۔ لیکن انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک طرف ان کے تصرفات کی روک تھام کی۔ اور دوسری طرف اپنی پالیسی کے پیش نظر ریڈیو کے وقار کو برقرار رکھا۔ خبروں کا اہتمام ریڈیو کے پروگرام کا سب سے اہم کام ہے۔ اس کی اہمیت کو غالباً ریڈیو کے عملے کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسے موزوں بنانے بلکہ ایک نئی شکل و صورت دینے میں بخاری صاحب کا زبردست ہاتھ تھا اس میں ان کی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

انہیں نئی نئی تجویزیں سوجھتی تھیں ایک مرتبہ حسب معمول انہوں نے حکومت کو لکھا کہ ریڈیو پروگرام میں بہت سی چیزیں مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر انہیں شائع کر کے محفوظ کر لیا جائے تو ایک ادبی خدمت بھی ہو گی چونکہ جنگ کا زمانہ تھا انہوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ بعض پروگراموں میں جنگی پرچار کے عنصر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چھپ جانے کی صورت میں وہ بھی کار آمد ثابت ہوں گے۔ اس تجویز کا جواب کوئی آٹھ مہینے کے بعد موصول ہوا۔ تجویز رد کرنے میں جہاں بہت سے دلائل تھے۔ وہاں ایک دلیل یہ تھی کہ جنگ اب جلد ختم ہونے والی ہے لہٰذا ایسے مواد کا چھپنا بے موقع ہے بخاری نے اس دلیل کو پڑھ کر لکھا "ہاں درست، لیکن اگر ہماری حکومت اسی رفتار سے کام کرتی رہی تو "امن" کا دور بھی جلد ختم ہو جائے گا۔"

پطرس کے مضامین بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہلکی پھلکی شے ہے لیکن طنز نگاری کی طرح ایک لطیف شے کو پیدا کرنے کے لئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدے کی عادت اور

شگفتہ طرزِ بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہو سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر انسان کی آنکھ انہیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انہیں بروئے کار لاتا ہے اور ان کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں، اس طرح کرتا ہے کہ وہ حرکت خود سے ابھر کر آ جاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری تھی اور پیرایۂ بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکات کو دیکھ سکتے اور چٹکلے کہتے تھے۔

مذکورہ بالا ریڈیو مسل کا التوا میں پڑا رہنا روز مرہ کا معمول ہے کوئی اور ہوتا تو اسے دفتری سرخ فیتے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ کر ٹال دیتا، لیکن بخاری کی نظر التوا کے تمام پہلوؤں پر پڑی تھی۔

شاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں اور شہروں کی گندی حالت کو کون نہیں جانتا لیکن "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" بخاری ہی لکھ سکتے تھے۔

بخاری کا مزاحیہ انداز ان کی تحریروں تک ہی محدود نہیں ان کی تقریریں بھی مزاح سے مزین ہوتی تھیں وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے اس حربے کو کام میں لاتے تھے۔ احباب کی صحبتوں اور عام موقعوں پر بھی اسے بے ساختہ استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجمع میں ان کی گفتگو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی اور لوگ پہروں ان کے پاس بیٹھنے سے نہیں اکتاتے تھے۔

لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہئے کہ بخاری کی ذات میں جو کشش تھی وہ محض ان کی مزاح گوئی کی وجہ سے تھی۔ بے شک ان کا مزاح ملنے والوں کے دل میں ایک شگفتگی پیدا کرتا تھا لیکن انہیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں خلوص بھی تھا وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور عام لوگوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے تھے۔ اس رکھ رکھاؤ میں دوست داری بھی ہوتی تھی۔ اور سلیقہ بھی۔ عام ملاقاتوں میں جہاں انسانی منافقت کام کرتی ہے وہ اس آراستگی سے بات کرتے تھے کہ طبیعت کو خوش گوار معلوم ہوتی تھی وہ چھیڑ چھاڑ کے خوگر تھے لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے ان کی مراد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اس سے لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔

بخاری صاحب کو اپنے ان کرشموں کا پورا پورا احساس ہوتا تھا بلکہ وہ دوسروں پر اکثر ایک خاص تفوق محسوس بھی کرتے تھے اور اس تفوق سے دوسروں کو اپنے مطابق چلاتے بھی رہتے تھے جہاں کہیں ان کی طاقت لسانی کارگر نہیں ہوتی تھی اپنی مزاحیہ گفتگو کو چھوڑ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتے تھے جو دوسروں کو چپ کرا سکے یا انہیں شکست دے سکے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جب قومی زبان کا مسئلہ پیش ہوا تو بنگال کے ایک صاحب اقتدار بزرگ نے بنگالی زبان کی حمایت میں بڑی پرزور تقریر کی۔ بخاری نے اپنی بذلہ سنجیوں سے انہیں بہت کچھ مرعوب کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی دوسرے روز وہ بزرگ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنے والے تھے۔ بخاری صاحب کو ایسے مسودے کے مؤثر ہونے کا اندیشہ تھا آپ ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کی نظر ایک کاغذ پر پڑی، تاڑ گئے، ہو نہ ہو یہ اعداد و شمار کا پلندا ہے۔ انہوں نے چپکے سے وہ پلندہ نکال لیا جب وہ بزرگ پرجوش خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اعداد و شمار پر آئے۔ اور کاغذوں پر ہاتھ ڈالا تو غائب تھے۔ پریشانی میں جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور یہ معصوم صورت بنائے ان سے ہمدردانہ استفسار کرتے چلے گئے۔ ان کی بدحواسی پر محفل میں ایک کہرام سا مچا۔ جب محفل کا رنگ بگڑ گیا تو بخاری نے اچانک جھک کر میز کے نیچے سے وہی پلندا اٹھا کر انہیں دکھایا اور بھولے انداز میں کہا۔

"آپ یہ تو نہیں تلاش کر رہے؟"

اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور ساری بات ہنسی مذاق کی نذر ہو گئی۔

وضعداری، بخاری صاحب کا شیوہ ہی نہیں مسلک بھی تھا۔ اگرچہ اس دوست داری میں گرم جوشی اور فرط جذبات کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔ ذو آہوں اور آنسوؤں سے زیادہ جذبات محبت کے اعتدال اور اخفا کے قائل تھے۔ اس بارے میں ان کا گرم جوش دل مغرب کی خنک فضاؤں میں سانس لیتا رہتا تھا اور اپنی آگ کو دبائے رکھتا تھا۔

بظاہر دیکھو تو بخاری صاحب پورے "صاحب لوگ" تھے۔ ان کی وضع قطع، ان کا لباس، ان کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے کے یورپی انداز ٹپکتے تھے۔ وہ مشرقی طرز بود و باش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بازار میں گھومنے جائیے تو معلوم ہوتا تھا انہیں یہاں کی کوئی حرکت پسند نہیں۔

"وہ دیکھو، تہ بند کے ساتھ انگریزی قمیص۔"

"سبحان اللہ چپل کے ساتھ پتلون۔"

"ٹائی اور شلوار کیا کہنے۔"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے۔"

"یہ دیکھئے اس نے بائیسکل بازار میں بیچ شانے کے کھڑی کر دی۔"

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے جا رہے ہیں میں موٹر کہاں سے گزاروں۔"

یہ فقرے مسلسل آپ کے کان میں پڑیں گے اور آپ انہیں سنتے سنتے اپنے ملک بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے گا۔ جو خامی آپ میں نہیں وہ بھی نظر آنے لگے گی۔

لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بخاری صاحب مغربی طرز زندگی کے قالب سے نکلے ہوئے ایک مجسمہ تھے اور ان میں کوئی روح نہیں تھی۔ ان کی صورت شکل مغربی اور مزاج مشرقی تھا۔ ان کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی تھی۔

ان کی مشرق مزاجی کو دیکھنا ہو تو انہیں گھر کی چار دیواری میں دیکھئے جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے لیکن جہاں زندگی کی حرکات ٹھیٹھ مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لا ابالیانہ پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے لندن یا نیویارک کے کسی مکان میں دلّی کے بلّی ماروں کے محلے والے اچانک آ بسے ہوں۔ اور وہ ماحول کے لئے اجنبی اور ماحول ان کے لئے اجنبی ہو۔

کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا مات کو کیونکر جاگتا ہو گا لیکن بخاری صاحب کی شب بیداری کو ان کے ساتھ راتیں گزارنے والے ہی جانتے ہیں۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کے لئے نکلنا ان کا روز مرّہ کا شیوہ بلکہ معمول تھا، کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں محض گھومنا اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں ہانکنا، یہ تھی ان کی تفریح جس میں ان کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے تھے۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدل کے دقیق اشعار، شیکسپیر کے ڈرامے، ایلیٹ کی مجرد نگاری، منٹو کے افسانے انہی خوش گپیوں کے تحت میں آ جاتے تھے۔

راتوں کی یہ بیداری ان کے روزانہ کاموں میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح دوستوں کو ایک ایک کر کے جمع کیا تھا اسی طرح ایک ایک کو گھر پر چھوڑنے کے بعد وہ بستر پر جا کر لیٹتے تھے اور ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد حسب معمول اٹھ کر روز مرّہ مشاغل میں کھو جاتے تھے اور اسی معمول پر

وہ سختی سے کاربند تھے اور فرض [illegible] پیشہ ورانہ [illegible] وہ ان کے لئے قیمتی [illegible] کی ایک [illegible] اور منصبی فرائض ان کی ترجیح رکھتے تھے کسی طرح کی بے قاعدگی [illegible] نہیں کر سکتے تھے۔

بتایا جاتا ہوا کہ رات جو [illegible] کے بعد کہ پانچ بجے صبح [illegible] [illegible] [illegible] نوکر سے پوچھا [illegible] کہاں ہے؟"

[illegible] یونیورسٹی [illegible] کام؟

[illegible] یہ بھی پوچھا تھا۔

ان کا عقیدہ [illegible] اس تو نفس ہوا کرتا [illegible] سے پہلے فرائض منصبی سے [illegible] ایک دوستی [illegible] فرائض کی بجا آوری [illegible] سمجھتے تھے۔

ریڈیو کے زمانے [illegible] سے ان کو [illegible] انہوں نے بڑی سختی سے [illegible] غیر معمولی [illegible] اور مستعفی ہو کر ان کے حوالے کیا [illegible] آپ [illegible]

ڈنر کے بعد بخاری صاحب [illegible] کے مکان پر بیٹھے [illegible] احباب کے ساتھ [illegible] رہتے تھے

پروفیسر بخاری کی ذات ایسی جامع صفات تھی کہ ان کی وفات پر یوں [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] شخصیتیں [illegible] ان کے رخصت ہونے سے دنیا ایک معاملہ فہم، ہوش مند [illegible] سے محروم ہو گئی علم و دانش کی درسگاہوں سے [illegible] خوش فکر، خوش نگار انشاپرداز [illegible] کا ماتم کر رہے

یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی موت ان کے دوستوں کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہے [illegible] کی ذاتی [illegible] ہو گئی وہ ایک مخلص شفیق دوست کو کھو بیٹھے ہیں۔ ایسے مہربان دوست دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔

بخاری صاحب میرے محترم استاد بھی تھے، رفیق کار بھی اور پیارے دوست بھی۔ میرا ان کا تعارف ۱۹۲۴ء میں ہوا [illegible] تیس سال کے عرصے میں ان کا احترام، ان کی ہمدردانہ رہنمائی اور خلوص دوستی ایک عجیب امتزاج کے ساتھ دل کو [illegible] رہی۔ ان کی خوش [illegible] رونق، ان کی بذلہ گوئی، ان کے قہقہے جہاں دوستوں کی محفلوں کو جگمگاتے وہاں ان کی پرسکون خاموش گرم جوشی اور محبت اور شفقت کی تڑپ احباب کے دکھی دلوں کی آہوں اور آنسوؤں کا ساتھ بھی دیتی۔

آخری بار جب وہ امریکہ سے لاہور آئے اور چند روز یہاں ٹھہرے تو ایک بار پھر یہ محفلیں جاگ اٹھیں اور زندگی کی بہت سی یادیں پھر [illegible] ہو گئیں۔ یہ ایک بات کو تقریباً ایک سال گزر چکا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ کل ہمارے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کتنا تازہ تھا ان کا پیار اور کتنی تیز تھی ان کی یاد۔ ان کی ایک نظر زندگی کے بہت سے گوشوں کو [illegible] اور ایک بات کئی ایک سوئے ہوئے جذبات کو اکساتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل کی گم شدہ دنیائیں از سر نو آباد ہو جاتیں۔ اور زندگی پیچھے کو [illegible] کرتے ہوئے نقش ابھارتی چلی جاتی۔

ان کی کونسی بات ہے جو رہ رہ کر نہیں ستاتی لیکن وہ جب کبھی کچھ عرصہ ملک سے باہر رہ کر لاہور میں آتے تو یہی کہتے۔ دوستو! غربت میں تمہاری یاد بہت ستاتی ہے اور اس یاد کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت، اس کا احترام طوفانی جذبات بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے، انسان کا ہر قدم منزل دوست کی طرف اٹھ رہا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی طرف والہانہ انداز میں لپک لپک کر جا رہا ہو۔ تم لوگ

یہاں میں ڈاکٹر اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔

مجھ سے بخاری کی جدائی کا حال نہ پوچھئے۔ ان کی محبت، ان کا مسلسل خلوص، یہ احسان احساس احسان کا احساس ہمیشہ تیز اندازہ رہتا اور خیال ہوتا کہ زندگی تو کیا اپنی موت بھی اسی کے آنسوؤں کا سہارا لے گی لیکن کیا خبر تھی کہ ان آنکھوں کو اُن کے فراق میں آنسو بہانے پڑیں گے۔

کتنی جدائیوں کے کھائے ہیں زخم دل پر
کتنی محبتوں کے ماتم کئے ہیں ہم نے

ضابطہ بے ضابطہ

عشرت رحمانی

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں،
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بات ۱۹۴۳ء کی ہے۔ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ محکمے کے کنٹرولر زمین و طبقے انگریز مسٹر لائنیل فیلڈن تھے، اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر اسٹیپلٹن اور پروگرام ڈائریکٹر سید ذوالفقار علی بخاری (ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل) تھے۔ ان کے علاوہ آغا محمد اشرف (بیرزہ آزاد) اور سجاد سرور نیازی جیسے اہلِ فن حضرات بھی عملے کے رکن تھے۔ مسٹر فیلڈن خود ایک ماہر اہلِ قلم ہونے کے ساتھ نشریات کے رموز سے بھی کما حقہٗ واقف تھے جو اربابِ ہنر انہوں نے جمع کر رکھے تھے ان کے لئے ایسے سرگروہ کی تلاش تھی جو ان کی صحیح قیادت کی اہلیت رکھتا ہو اور ملک سے نشریات کا موزوں لائحہ عمل مرتب کر کے ان کو مناسب طریقہ پر چلا سکے۔ چنانچہ مسٹر فیلڈن نے برصغیر کی تمام یونیورسٹیوں کو مراسلے بھیجے کہ وہ اپنے اداروں سے ایسے لائق اہلِ علم و ہنر چن کر اس کام کے لئے بھیجیں جن کے تعاون سے وہ اپنے دست و بازو مضبوط کر کے باضابطہ کام چلا سکیں چنانچہ کئی اداروں کے اربابِ اقتدار نے چند اہم شخصیتوں کو منتخب کر کے مسٹر فیلڈن سے ملاقات کے لئے بھیج دیا۔ ان میں دو نام خاص تھے۔ ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پطرس۔ یہ حسنِ اتفاق تھا یا حسنِ انتخاب کہ یہ دونوں حضرات اردو کے مشہور مزاح نگار اور بلند پایہ ادیب بھی تھے اور ادب انگریزی کے پروفیسر بھی۔

فیلڈن صاحب نے تمام منتخب حضرات کا ملاقات کے دوران میں ضابطہ بے ضابطہ جائزہ لیا اور سید احمد شاہ بخاری کو اپنا دستِ راست منتخب کر لیا۔ مسٹر فیلڈن نے برصغیر کے قیام کے دوران میں آغا محمد اشرف سے اردو پڑھی تھی لیکن یہ استعداد معمولی تھی۔ وہ بخاری صاحب کی اردو ادیب کی حیثیت سے بے مثال خوبیوں کا اندازہ تو نہ کر سکتے تھے لیکن ابتدائی ملاقات میں ان کی شخصیت و کمال کا بخوبی جائزہ لے کر اس حقیقت کے معترف ہو چکے تھے کہ پطرس بخاری انگریزی زبان و ادب کی مہارت میں اس برصغیر میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اور اپنی طباعی، غیر معمولی ذہانت اور مختلف علوم و فنون میں واقفیت رکھنے کے سبب ان کی متنوع شخصیت گوناگوں کمالات کی حامل ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی باخبر حضرات اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا تھے اور ہیں کہ پطرس بخاری کی شگفتہ مزاجی، بزلہ سنجی اور ہمہ گیر لیاقت و ذہانت ہر علمی و ادبی محفل میں ان کی ذات کو ممتاز بنائے رکھتی اور بڑی سے بڑی مجلس میں ان کی صفات غالب و نمایاں نظر آتیں۔ بیک وقت ان کو متعدد زبانوں اردو، انگریزی، فارسی، پشتو اور

فرانسیسی وغیرہ پر قدرت حاصل تھی۔ چونکہ میرے پیشِ نظر بخاری صاحب کے ادبی و لسانی کمالات سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کی باضابطہ شخصیت کی چند یادوں
سے منضبط تازہ مقصود ہے اس لئے ان تفصیلات سے گریز مناسب ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی شاخ کے اسٹیشن پر پروفیسر سید احمد شاہ بخاری کو
ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور دن کی محفلوں، ادبی مجالس میں پطرس کے چرچے ہونے لگے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ پطرس بخاری نے محکمہ میں اپنی قابلیت کا سکہ جمالیا لیکن اس وقت ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری تھے۔ ان
دونوں نے اپنے اپنے انداز فکر کے لحاظ سے اس برصغیر میں نشریات کی تاریخ کی تدوین کا آغاز کیا اور متحدہ طور پر مستحکم تنظیم کی بنا ڈالی۔ اب نشری ر
شخصیتیں بڑے بخاری اور چھوٹے بخاری کے نام سے مشہور ہوگئیں۔ کچھ عرصہ بڑے بخاری اسٹیشن ڈائرکٹر اور چھوٹے بخاری اسسٹنٹ
ڈائرکٹر رہے۔ پھر بڑے بخاری ڈپٹی کنٹرولر مقرر ہوگئے اور چھوٹے بخاری اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فیلڈن صاحب کنٹرولر رہے
انہوں نے بڑے بخاری صاحب کو ان کی ذہانت و قابلیت کے بھروسے پر محکمے کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

ڈپٹی کنٹرولر بخاری نے برصغیر میں نشریات کا جال بچھانا شروع کیا۔ نئے نئے اسٹیشن کھولے۔ مزید قواعد منضبط کئے اور گوشے گوشے
سے نامور شخصیتوں کو کھینچ کر کسی نہ کسی حیثیت سے محکمہ نشریات میں لا شامل کیا۔ تعلیمی اور ادبی حلقوں سے متعدد نامور حضرات آکر مختلف اسٹیشنوں پر متعین
پروفیسر رشید احمد (حال ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) سوم ناتھ چیب (حال سیکرٹری ٹرانسپورٹ ڈیپارٹمنٹ ہند) ن۔م۔ راشد (حال ڈپٹی ڈائر
اقوام متحدہ امریکہ متعینہ کراچی) محمود نظامی (حال ڈائرکٹر محکمہ تعلقات عامہ مغربی پنجاب) سعادت گوہر (حال کنٹرولر محکمہ درآمد و برآمد حکومت پا
اعجاز بٹالوی (بیرسٹر) سید انصار ناصری (حال ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان) ملک حبیب احمد (حال پبلک ریلیشن آفیسر این ڈبلیو آر) رفیع پیرزادہ
(مشہور بھارتی ادیب و فلم نگار) سعادت حسن منٹو مرحوم۔ راجندر سنگھ بیدی۔ خورشید انور (حال فلم ڈائرکٹر) مسعود پرویز (فلم ڈائرکٹر) فیروز نظامی (
ڈائرکٹر) راقم الحروف اور متعدد اصحاب تھے جو بڑے بخاری صاحب کے عہد میں ان کے ایما سے یا تحریک پر نشریات میں داخل ہوئے ان میں
بعض حضرات نے بعد میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی نیا میدان تلاش کر لیا اور بعض اب تک ریڈیو پاکستان میں موجود ہیں لیکن بخاری صاحب کی نظر انتخاب نے
لوگوں کو قابل اعتماد تصور کیا تھا وہ اب خواہ کسی میدان میں بھی ہوں سر میدان ہی نظر آتے ہیں۔

ڈپٹی کنٹرولر ہونے کے زمانے میں بخاری صاحب نہ صرف فیلڈن صاحب ہی کی نظر میں نہیں بلکہ اعلیٰ انگریز حکام اور تمام اعلیٰ کی نگاہ
میں بھی معتمد الیہ تصور کئے جانے لگے ان کا ضابطہ تحریر و تقریر دونوں حیثیت سے ناقابل تسخیر تھا۔ جو تجویز یا تحریک ہوتی معقول اور مدلل۔ جوابات کرارے
اور مناسب۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ افسران بالا سے منوا کر نہ چھوڑتے۔

بخاری صاحب کی بے ضابطہ شخصیت کے رموز و نکات اور ادبی کمالات سے تو ہر عام و خاص بخوبی واقف ہے اور پطرس کی حیثیت
جاننے والے ان کے طنز و مزاح کی بے مثال خوبیوں کے دلی مداح ہیں۔ لیکن ایک باضابطہ سرکاری افسر اعلیٰ کی حیثیت سے صرف وہی لوگ ان
نکتہ رس شخصیت سے آگاہ ہیں جنہوں نے ان کے ماتحت براہ راست یا بالواسطہ محکمہ نشریات میں کام کیا ہے۔ بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر ہی تھے کہ میں ا
ایما سے اسی محکمہ میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوا۔ یہ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا اور میں اس وقت دہلی کے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے سے م
تھا۔ بہت سے ڈرامے اور تقریریں دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا کرتی تھیں۔ دہلی میں رہتے سات آٹھ سال گذر چکے تھے۔ میں اور چھوٹے بخاری دہلی
احباب کے قدیم رکن تھے۔ بڑے بخاری صاحب سے مجھے نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ ایک محفل میں نشریات پر بات ہو رہی تھی۔ بحث کے دوران
بڑے بخاری صاحب نے بڑی شفقت سے حاضرین میں سے چند اصحاب کو مخاطب کر کے مشورہ دیا بلکہ ڈانٹا کہ آپ لوگوں کو ریڈیو کے محکمے میں باضابطہ

ہو کر کام کرنا چاہیئے تاکہ آپ اپنے رجحان کے مطابق کچھ مفید اور رنگین [illegible] ادبی [illegible] کا [illegible] تحریر [illegible] سکتے ہیں ایک شعر بھی لاکر پیش کر دیا"۔ ـــ صاحب لکھنؤ سے کہتے سنتے تھے [illegible] پروگرام اسسٹنٹ کی جگہ [illegible] کرتے تھے۔ میرے خیال میں وہ اس جگہ کے لیے [illegible] ضابطہ کی پابندی [illegible] صاحب سے واقف تھا۔ بخاری صاحب نے میری درخواست دیکھ کر دی۔ [illegible] خیال ہے [illegible] بخاری صاحب [illegible] ارشاد ہے: بخاری صاحب نے مخصوص انداز سے زیر لب تبسم فرماتے [illegible] صاحب کے [illegible] کے بارے میں یونہی رائے قائم نہیں کی [illegible] کے لئے [illegible] حاصل کرنے کا [illegible] ہوں اگر آپ نے کا خیال ہے تو درخواست مسترد کر دیجئے۔ [illegible] جواب کیا [illegible] بخاری صاحب نے میرے مذہب [illegible] سوچ سمجھ کر [illegible] جلدی بھی [illegible] انتخاب [illegible] صاحب بعد میں [illegible] سفارشوں [illegible] دہری باتیں ہوتی رہیں۔ مجلس برخاست ہوئی۔ چلتے ہوئے بخاری صاحب نے مجھ سے فرمایا: "پھر [illegible]" ہوں۔" [illegible] صرف یہ سوچ کہ اگر انتخاب میں آ گئے اور داخل دفتر ہو گئے تو [illegible] کچھ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

میرے چند احباب و اعزا نے مشورہ کیا۔ درخواست بھی دی۔ منتخب بھی ہو گیا۔ پروگرام اسسٹنٹ کے عہدہ پر تقرر ہوا اور لکھنؤ اسٹیشن پر کی تعیناتی ہی میرے لئے دلی چھوڑنا سخت تکلیف دہ تھا ـــ یار دوستوں کی چوکھٹ ـــ [illegible] دوستوں کی جدائی بڑی شاق تھی۔ احباب کی رائے ہوئی کہ بخاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر لکھنؤ کی تعیناتی کی جگہ دلی اسٹیشن کی تقرری منظور کرا لوں۔ یہ معاملہ قطعی بخاری صاحب کے اختیار کا تھا۔ میں نے ٹیلی فون کے ذریعے بخاری صاحب سے دفتری ملاقات کی اجازت لی۔ اب میں ڈپٹی کنٹرولر نشریات کے دفتر میں ایک پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ لیکن بخاری صاحب نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب سابق تپاک سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ کر چند ضابطے کی ہدایات شروع کر دیں کیونکہ میں اس محکمہ میں نووارد تھا اور وہ ایک مخلص مہربان افسر اعلیٰ۔

بعد ازاں میں نے اصل معاملہ پیش کیا اور اپنی لکھنؤ کی تقرری کے احکام کی تبدیلی اور دلی میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ بخاری صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا: "عشرت صاحب! آپ کا تقرر لکھنؤ کے لئے محض اتفاقیہ نہیں بلکہ دانستہ ہے۔ آپ عرصہ دراز سے دلی میں مقیم ہیں۔ آپ کے تعلقات یہاں کے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں وسیع ہیں۔ آپ کا تقرر دلی ریڈیو کے کسی شعبہ میں ہو تو آپ کی جان ضیق میں ہو جائے گی۔ لوگ آپ کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ آپ پر کسی حلقے کی بے جا طرفداری اور کسی کی بے جا مخالفت کے الزام لگائے جائیں گے جس محکمہ کا پبلک سے قریبی واسطہ ہو وہ عوام و خواص ہر طبقہ کی نظروں میں رہتا ہے۔ ریڈیو کے محکمے کا بھی یہی حال ہے اس لئے ریڈیو اسٹیشن کے ذمہ دار اور کسی حد تک بھی با اختیار اہلکار کا اس کے اسٹیشن (مقام) پر تعینات ہونا خود اس کے اور محکمہ دونوں کے حق میں مفید نہیں۔ آپ خاص مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواہ وہ سب یہیں شاعر ہیں آپ کے دوست بھی ادیب اور شاعر ہیں اور دشمن بھی۔ ان میں سے بعض آپ کے ہم خیال ہوں گے۔ اور بعض مخالف۔ آپ کس کس کو خوش رکھ سکیں گے۔ اپنے متعلقہ شعبہ میں آپ سارے شہر کے ادیبوں اور شاعروں کو پروگرام نہیں دے سکیں گے اس لئے بہت جلد مطعون ہو جائیں گے اور ضابطہ بے ضابطہ ہر طرح سے آپ کی کڑی نگرانی ہونے لگے گی۔ اور نتیجہ آپ کے حق میں مضر ہوگا۔"

بخاری صاحب کی یہ مشفقانہ نصیحت اور مجرب گر دل کو لگے۔ لیکن دلی کی مفارقت کا خیال ستا رہا تھا۔ میں نے پھر بھی عرض کیا: "آپ

نے جو کچھ فرمایا بجا ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ دہلی میں اور رہتا اس کے بعد کہیں بھی بھیج دیا جاتا۔"

بخاری صاحب ذرا سر اونچا کر کے گردن ہلاتے ہوئے حسبِ عادت مسکرائے اور بولے: "آپ کہہ رہے ہیں میں ملنے کے لئے آپ کو بھلا سا رہوں۔ بات معمولی ہے آپ کو کچھ عرصہ کے لئے نہیں مستقلاً دہلی میں رکھا جا سکتا ہے مگر بات اب کی ہے ابھی آپ کا قیام دہلی میں آپ کے لئے مناسب نہیں۔ ابتدائی ایام میں دہلی کی ادبی مجالس راس نہ آئیں گی ان سے دور دلجمعی سے کام کرنے کا موقع ملے گا اور پھر یہ جدائی عارضی ہے 'یار زندہ صحبت باقی' اطمینان سے روانہ ہو جائیے اور لکھنؤ پہنچ کر کام میں دل لگائیے۔ اچھا! خدا حافظ!" اور کرسی سے اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے بخاری صاحب کے سنجیدہ و متبسم چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بعد سلام رخصت ہوا۔ میرے مخلص احباب میں سے ایک محترم بزرگ اکبر حیدری مرحوم تھے۔ میں نے ان سے بخاری کی گفتگو کا حال بتایا انہوں نے بخاری صاحب کی رائے کی حرف بحرف تائید کی اور کہا: "بخاری صاحب نے نہایت معقول فیصلہ کیا ہے۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں اس قسم کی چہ میگوئیاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ بعض ادیب احباب کو پروگراموں کی امید ہے بعض اس انتظار میں ہیں کہ اگر تم دہلی اسٹیشن پر تعینات ہو جاؤ تو تمہارے خلاف بے جا شکایتوں کا محاذ کھڑا کر دیں۔" بات ختم ہوئی۔ میں لکھنؤ چلا گیا اور بس!

جیسا کہ بخاری صاحب نے فرمایا تھا، یہ واقعی معمولی بات تھی اور ایک ادنیٰ ماتحت کے ساتھ (جو اس محکمہ میں ہنوز قدم رکھ پایا تھا) اس قدر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ حسبِ ضابطہ یہ کہہ کر بات ختم کر سکتے تھے کہ جس اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی ہے وہی مناسب ہے اس حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بخاری صاحب کا ضابطہ اس کا خوگر نہ تھا انہوں نے ابتدا ہی سے مجھے اپنی ناصحانہ گفتگو سے اس محکمہ میں کام کرنے کے ضوابط اور نشیب و فراز سمجھا دئے جن سے میں نے بہت سیکھا اور اپنی ملازمت کے دوران ان پر کاربند رہ کر اپنی ذات اور محکمہ کے لئے مفید ثابت ہوتا رہا۔ نیز انہوں نے حاکمانہ انداز اختیار کر کے سرسری طور پر میری درخواست رد کرنے کے بجائے بے ضابطہ طور پر ضابطہ کو اس خلوص اور محبت سے سمجھایا کہ میں قائل ہونے کے ساتھ ہی مطمئن واپس آیا۔

اس واقعہ کی عمومیت یہاں تفصیل طلب تھی تاکہ بخاری صاحب کے ضابطہ کی خصوصیت واضح ہو سکے۔ ایک اعلیٰ افسر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے محکمہ کے نظم و نسق کو اسی طرح منضبط کیا تھا ان کے ہر قول و فعل اور فیصلہ میں ہمیشہ خود اعتمادی، نکتہ رسی، دور اندیشی اور قطعیت ہوا کرتی اور لطف یہ کہ کسی کے خلاف فیصلہ کی صورت میں اس کی دل آزاری کا اظہار تک نہ ہوتا۔ وہ ضابطہ کے ہر معاملہ میں معمولی بات کو خاص اہمیت دئے بغیر نمٹاتے اور اہم بات کو عام انداز میں اس طرح طے کر ڈالتے جیسے نہایت معمولی ہو۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ایک پروگرام اسسٹنٹ کا دائرہ اختیار بھی خاصہ وسیع و کشادہ ہوتا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر اور پروگرام ڈائریکٹر کے فیصلوں کی بنیاد زیادہ تر پروگرام اسسٹنٹ کی تجویز و رائے پر ہوا کرتی تھی۔ کانگریس و مسلم لیگ اور ہندو مسلم مناقشات کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کے پیش نظر مسلمانوں کا مفاد اور ان کی آزادی کا حصول تھا۔ کانگریس ہندو گردی پر اتری ہوئی تھی۔ لکھنؤ یوپی کا مرکز ہی نہیں سارے صوبہ کی سیاسیات کا مرکز تھا۔ ایک بار ایک بڑے ہندو مہاشہ کی تقریر نشر ہونا تھی۔ میں نے تقریر کا مسودہ پڑھ کر مہاشے جی سے چند تبدیلیوں کے لئے کہا کیونکہ وہ باتیں پالیسی کے خلاف اور مناقشات کو بڑھانے والی تھیں۔ مہاشے جی نہ مانے۔ معاملہ اسٹیشن ڈائریکٹر تک پہنچا انہوں نے میری تجویز کے مطابق فیصلہ کیا۔ مہاشے جی بگڑ کے چلے گئے اور تقریر نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز مہاشے جی کی خفگی اور ریڈیو اسٹیشن کی کارروائی ضابطہ تمام اخباروں کی سرخیاں بن گئیں۔ ریڈیو کو موردِ الزام قرار دے کر خوب لے دے کی گئی۔ کانگریسی اخبارات نے ریڈیو کے محکمہ اور مرکزی حکومت کو ہلا ڈالنے کا اعلان کر دیا۔ میری معزولی کا مطالبہ کیا گیا۔

غیر معمولی ہنگامہ تھا۔ ڈائریکٹر جنرل (بخاری صاحب) کو دہلی سے بنفس نفیس تحقیقات کے لئے آنا پڑا۔ بخاری صاحب نے تقریر

مسودہ پڑھا، صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اور پھر خود مہاشے جی سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد بخاری صاحب ریڈیو اسٹیشن واپس آئے مہاشے جی ان کے ہمراہ تھے۔ بخاری صاحب مسکرا رہے تھے، اور مہاشے جی خاموش تھے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں میری طلبی ہوئی۔ سامنے پہنچتے ہی مہاشے جی نے بڑی خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا اور بولے: "میری غلط فہمی ہی تھی مگر آپ کا انداز ناخوشگوار تھا۔" بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے: "آپ بزرگ ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی مجبوریاں احتیاط کی متقاضی ہیں۔" معلوم نہیں بخاری صاحب کی حکمت عملی، شگفتہ بیانی نے مہاشے جی پر کیا جادو کیا کہ وہ اپنی ساری منطق بھول کر اسی رات مجوزہ تقریر نشر کرنے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے خود ہی اخبارات کے منہ بند کر دئیے اور ہماری دوستی کا دم بھرنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بخاری صاحب کے علم و فضل اور حسنِ گفتار و کردار کی خوبی تھی جس نے آل انڈیا ریڈیو کے محکمہ کو ایسے طوفانی زمانے میں فرقہ وارانہ تفرقوں سے محفوظ رکھا۔ عملے کے ادنیٰ و اعلیٰ اراکین میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب فرقوں کے خواتین و حضرات شامل تھے۔ لیکن باستثنائے چند ہر اسٹیشن پر اتحاد و یگانگت کے روابط قائم تھے۔ ہندو مہاسبھا نے بار بار اس قسم کی تفرقہ اندازی کی کوشش کی۔ خصوصاً اردو زبان کو مٹا کر ہندی رائج کرنے کی بڑی جدوجہد کی۔ مگر مہاسبھائی جوڑ توڑ بخاری صاحب کے تدبر و حکمت نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیے۔ نام بدل گیا ہندوستانی ہوا مگر زبان کی سلاست اور روانی بدلنے نہ پایا۔ اور جب ایک وقت آیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے "زبان" اور مسلمان دونوں کے گلے پر چھری چلائیں تو انہوں نے کھلم کھلا انکار کر کے اس عہدۂ جلیلہ سے سبکدوشی اختیار کر لی۔

جب کانگریس کی حکومت برصغیر پاک و ہند میں قائم ہوئی۔ اس وقت سردار پٹیل جو کٹر مہاسبھائی ذہنیت کے مالک تھے محکمہ اطلاعات و نشریات کے وزیر مقرر ہوئے۔ مسٹر پٹیل نے کرسی وزارت پر متمکن ہوتے ہی محکمہ نشریات میں ہندوگردی کا آغاز کر دیا۔ زبان ہندی، پروگراموں کی ترتیب ہندی اور موسیقی کے لیے احکام نافذ کئے گئے کہ تمام پیشہ ور موسیقار خواتین گانے کے پروگراموں سے یک قلم خارج کر دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ شوقیہ گانے والی خواتین سے مراد صرف غیر مسلم خواتین تھیں۔ بیک وقت مسلم دشمنی اور ہندو نوازی کی پالیسی مرتب ہو گئی، اردو زبان کی جگہ کھلم کھلا ہندی کا رواج ہو گیا۔ ڈائریکٹر جنرل (مسٹر بخاری) نے پہلے تو وزیر پٹیل کو سمجھایا بجھایا کہ اس انداز سے پروگرام بے جان ہو جائیں گے۔ ہمیں زبان اور آرٹسٹ دونوں کے مسئلہ کو مناسب اور موزوں طریقے سے حل کرنا چاہئے اور ایک متوازن و خوشگوار تناسب قائم رکھنا چاہئے۔ لیکن مسٹر پٹیل کا منشا کچھ اور تھا وہاں تناسب کی جگہ تناسخ کا مسئلہ زیر نظر تھا۔ چنانچہ ذی ہوش، صاحبِ خرد و حوصلہ مند بخاری نے اس بے بسی اور بے اختیاری کے تحت اس اعلیٰ عہدے کو قبول کرنا اپنی کسرِ شان اور موجودہ پالیسی کو اختیار کرنا اپنی دیانت و لیاقت کے منافی تصور کیا۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور واپس آئے اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ایک ہندو مہاشے (مجوزہ اسکیم کے مطابق) مقرر ہو گئے۔ بخاری صاحب نے اپنے اصول اور ایمان و ایقان کی قربانی گوارا کی، نہ جاہ و منصب کی طلب میں سرِ تسلیم خم کیا۔

بخاری صاحب ضابطہ و قاعدہ کے سختی سے پابند ہونے کے باوجود ہر معاملے کو چٹکی بجاتے باتوں باتوں میں طے کر دیتے تھے مشکل سے مشکل مسئلے کو نہایت خندہ پیشانی سے بآسانی حل کرنا ان کے ضابطہ کا خاصہ تھا۔ ان کی ضابطہ کی زندگی کے بے شمار واقعات و لطائف مشہور ہیں جن کا بیان اس مختصر مضمون میں دشوار ہے۔ وہ اپنے تمام ماتحت اہلکاروں سے ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک ناصح مشفق کا سلوک اختیار کرتے۔ ہر شخص کی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کو بخوبی پرکھ لیتے۔ اس کے ساتھ اسی انداز سے ہم کلام ہوتے اور اس کے عین مطابق برتاؤ کرتے۔ شگفتہ بیانی ان کا خاص کمال تھا۔ اور ہر شخص کے ساتھ گفتگو کے دوران میں اس کا دل موہ لینا اور بڑی سے بڑی شخصیت پر چھا جانا ان کا ادنیٰ کرشمہ تھا ان کے حلقۂ احباب

میں سیاسی لیڈر، سرکاری افسرانِ اعلیٰ، پروفیسر، عالم فاضل اور ادیب و شاعر سب ہی تھے لیکن سب ہی کو ان کی لیاقت اور حسنِ گفتار کا معترف پایا۔ ان احباب میں سے اکثر ان سے ضابطے کا پاس ملحوظ رکھتے تھے لیکن وہ تمام معاملات میں وہی فیصلہ کرتے جو حق و دیانت کے مطابق ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ خلافِ فیصلہ کی صورت میں بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ اور بڑے اطمینان و سکون سے اس طرح سمجھا کر ٹال دیتے کہ صاحبِ معاملہ مطمئن ہونے پر مجبور ہو جاتا۔

بخاری صاحب کا حاکمانہ برتاؤ اپنے ماتحت افسران ہی کے ساتھ مشفقانہ نہیں تھا بلکہ تمام درجوں کے ملازمین کے ساتھ بھی پسندیدہ تھا ہر اہلِ کار ان کے حسنِ سلوک اور اخلاقِ حمیدہ کا گرویدہ اور معترف تھا۔ ماتحت عملہ میں جو ادیب، شاعر اور ان کے دوست احباب شامل تھے ان کے ساتھ دفتر میں نہایت باضابطہ اور باقاعدہ ڈائریکٹر جنرل نظر آتے لیکن نجی صحبتوں میں اسی انداز کی بے تکلفی برتتے جس حیثیت کے تعلقات ہوتے۔ ضابطہ کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ایک بار اسٹوڈیو کے محافظ نے ان کو حسبِ ضابطہ بغیر پرمٹ دروازے کے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ نئی دہلی پارلیمنٹ اسٹریٹ کے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں بالائی منزل پر ڈائریکٹریٹ جنرل کے دفاتر تھے۔ اور زیریں منزل میں دہلی اسٹیشن کے دفاتر اور اسٹوڈیوز واقع تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن بخاری صاحب اپنے دفتر سے اٹھ کر بغرضِ معائنہ اسٹوڈیوز کی عمارت میں جانے لگے۔ اسٹوڈیوز کے دروازے پر محافظ موجود تھا جس کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ اندر جانے والے ہر شخص کو روکے اور داخلے کا پرمٹ دیکھ کر دروازہ کھولے ورنہ باہر ہی روک دے۔ بخاری صاحب کا حکم تھا کہ اس ضابطہ کی سختی سے پابندی کی جائے۔ اور وہ خود پرمٹ کارڈ اپنے لئے بھی ساتھ رکھتے تھے۔ اس وقت اتفاق سے پرمٹ ساتھ لے جانا بھول گئے۔ محافظ نے حسبِ ضابطہ ادب سے سلام کیا۔ اور عرض کیا: "حضور پرمٹ!" ڈائریکٹر جنرل بخاری نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرمٹ کارڈ نہ پایا، خاموشی سے مسکرائے اور واپس اپنے دفتر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد چپراسی آیا اور محافظ کی طلبی کا حکم سنایا۔ "ڈائریکٹر جنرل کو اس طرح بے باکی سے روک دیا۔ اب خیریت نہیں۔" محافظ بے چارہ تھر تھر کانپنے لگا۔ باضابطہ پیشی ہوئی۔ اور محافظ جو ڈرتا ہانپتا حاضر ہوا تھا خوش خوش اکڑتا ہوا اپنی ڈیوٹی پر واپس گیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے اس کی فرض شناسی اور مستعدی کی تعریف کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اور کئی روز تک اس محافظ کے چرچے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں ہوتے رہے۔

عام طور پر حکومتِ انگریزی کے زمانہ میں جب افسرانِ بالا اپنے ماتحت دفاتر میں معائنہ کی غرض سے جاتے تو عملہ کی جانب سے شاندار ضیافتیں ہوا کرتیں لیکن بخاری صاحب جب کسی شہر میں ریڈیو اسٹیشن کے معائنہ کو جاتے اور دستور کے مطابق ان کو اسٹاف کی جانب سے دعوت دی جاتی تو وہ منظور کرنے کے بعد یہ شرط کرتے کہ دعوت کے مصارف ان کے ذمے ہوں گے وہ صاف طور پر کہہ دیتے کہ آپ لوگوں کا مقصد مجھ سے ملاقات کرنا ہے مجھے آپ سب کے ساتھ مل بیٹھنے سے مسرت ہوگی لیکن آپ کو جو خوشی ہوگی اس کی قیمت آپ کی جیبوں سے ادا کرنے کا بار خاطر نہیں بننا چاہیے۔ وہ ان دعوتوں میں تمام اہل کاروں سے نہایت بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے اور بے ضابطہ طور پر ان کی مشکلات کا حال دریافت کر کے ان کے حل بتلاتے رہتے۔ آل انڈیا ریڈیو کی تعمیر و تنظیم بخاری صاحب کی دانش و تدبر کی رہینِ منت تھی۔ نئی دہلی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس کی تعمیر، پروگراموں کی ترتیب، برصغیر کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نشری مرکزوں کا قیام اور ان کا استحکام انہی کے ہاتھوں انجام پایا۔ ہندوستان میں نشریات کی توسیع کا جو کام ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد عمل میں آیا اس کا خاکہ بخاری صاحب نے کئی سال قبل مکمل کر لیا تھا یعنی چپے چپے پر نشریات کا ملک گیر جال پھیلانے کا دستور العمل انہوں نے تیار کر دیا تھا جس پر بعد میں عمل درآمد ہوا۔ اس عالی دماغ اہلِ علم و بصیرت نے نشری دنیا میں اپنے تدبر و حکمت اور فن کارانہ صلاحیتوں کے غیر معمولی جوہر دکھائے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندو پاکستان کے درمیان محکمہ نشریات کے سامان کی تقسیم کے سلسلے میں کمیٹی ...

بنائی گئی۔ اس کے صدر ورشید احمد بخاری صاحب ہوئے۔ اس طرح ریڈیو پاکستان کی بنیاد بھی انہی کے لائق ہاتھوں سے پڑی اور ان کے دست راست برادر عزیز سید ذوالفقار علی بخاری ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے (جو حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں)

پطرس بخاری نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت ــــــ سے اہم خدمات انجام دیں اور ملک و قوم کا پرچم بلند کیا۔ اقوام متحدہ کے محکمۂ نشریات اور اطلاعات کے شعبوں کی تنظیم کی مہم بھی بخاری صاحب نے انجام دی خصوصاً اقوام متحدہ سے اردو نشریات کے سلسلے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

بخاری صاحب کی نغز گوئی، بیدار مغزی، اور شگفتہ بیانی اقوام عالم کے سربرآوردہ نمائندگان میں ضرب المثل ہو چکی ہے اور انہوں نے اپنے حسن گفتار اور دانش و حکمت کا دنیا بھر سے لوہا منوالیا۔ لیکن اس بین الاقوامی شہرت اور عز و افتخار کے مالک ہونے کے باوجود ان کا دل وطن اور احباب وطن کے لئے ہمیشہ بے چین رہا۔ افسوس کہ ان کی آخری حسرت بر نہ آئی۔ اور وہ سرزمین وطن و یاران وطن سے دور دیار غیر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوگئے۔ یاران وطن ان کے دیدار سے محروم رہے اور انہوں نے بین الاقوامی شہرت کے دامن میں دائمی آرام گاہ بنائی۔ ہم ان کے نام کلام اور گفتار و کردار کی یادگار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے۔ ؏

بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

پطرس

حکیم یوسف حسن

جینئس بننے یا کہلانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کی پشت پر بہت سی تصنیفات لدی ہوں یا اس کے سینے پر بہت سی تعلیمی ڈگریوں کے طلائی تمغے جھلملا رہے ہوں۔ جینئس پیدائشی ہوتا ہے اکتسابی نہیں ہوتا اس کی غیر معمولی ذہانت ہی اسے اس رتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔

اس ربع صدی کے نامور اور ذہین اُدباء پر ایک نظر ڈالی جائے تو زیادہ سے زیادہ ایک درجن ناموں پر نگاہ رکتی ہے اور اس نظریہ کے ثبوت میں کہ غیر معمولی ذہانت کا ڈگریوں سے کوئی تعلق نہیں ہمیں تاثیر اور پطرس کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

تاثیر میرا دوست، میرا ساتھی اور نیرنگ خیال کا مدیر معاون تھا اس لحاظ سے تاثیر مرحوم کے مجھ پر بہت سے حق حقوق ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تاثیر کیمبرج میں داخلے کے لئے پہنچے تو انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا۔ اور پطرس نے بھی بی اے ہی میں داخلہ لیا۔ لیکن تاثیر نے انگریزی ادب کے متعلق اتنا کچھ پڑھا ہوا تھا کہ اگر میں کہہ دوں کہ وہ کئی لائبریریوں کو نگل چکا تھا تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ کیمبرج کے پروفیسروں سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ وہ تاثیر کی عظیم واقفیت سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے براہ راست ایم اے میں داخلے کی اجازت دے دی اور پھر ایم اے میں اس کی قابلیت کے جوہر جو کھلے تو کیمبرج کے مروجہ دستور کے علی الرغم انہیں پی ایچ ڈی میں بیٹھنے کی اجازت کیمبرج کونسل کے ایک اسپیشل اجلاس میں دے دی گئی۔ تاثیر کو پی ایچ ڈی کے لئے قرونِ وسطیٰ کی انگریزی نظم میں تصوف کے رجحانات پر تحقیقی مقالہ تیار کرنا تھا۔ عنوان ہی سے اس کی سنگلاخی ظاہر ہے مگر تاثیر نے کیمبرج سے پی ایچ ڈی نمایاں حیثیت سے حاصل کر لی۔ شاید تاثیر پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ فضیلت حاصل ہوئی تھی۔ تاثیر مرحوم نے اس واقعہ کی تفصیل اپنے ایک خط میں دی ہے۔ جو نیرنگ خیال میں شائع ہو چکا ہے۔

پطرس جب بی اے (کیمبرج) بن کر آئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ تاثیر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ حکیم صاحب! تاثیر وہاں پڑھنے تھوڑا گیا ہے وہ تو پروفیسری کر رہا ہے۔

تاثیر اور پطرس کی کیمبرج کی ڈگریوں میں عظیم تفاوت ہے۔ تاثیر کا انگریزی ادب پر عبور مسلم الثبوت ہے لیکن جہاں تک فطری ذہانت کا تعلق ہے پطرس کا مقام بہت آگے ہے تاثیر اور پطرس کی انگریزی اور اردو کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پطرس میں جو رنگینی، لطافت اور طنز پائی جاتی ہے وہ تاثیر میں موجود نہیں۔

تاثیر نے بھی مزاحیہ رنگ میں چند مضامین نیرنگ خیال میں لکھے تھے جو ادب میں اچھا مقام رکھتے ہیں لیکن ہم انہیں پطرس کے مزاحیہ مضامین کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔

پطرس کا ادبی کارنامہ صرف پطرس کے مضامین ہیں۔ اس ننھی سی کتاب کے متعلق کہیں شیخ سعدی نے فرمایا تھا کہ

ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

اس کے مصداق یہ چند مضامین ہی پطرس کی عالمگیر شہرت اور ناموری کا باعث بن گئے۔ اگر برصغیر ہند و پاکستان کی تمام مزاحیہ کتابوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دیا جائے اور پطرس کے مضامین دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں۔ تو پطرس کے مضامین بھاری رہیں گے۔

پطرس کے مضامین کے بعض حصے نیرنگِ خیال میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور پطرس کی یہ مزاحیہ تصنیف تو قریباً ہر پڑھے لکھے آدمی کی نظر سے گزری ہوگی۔ لیکن پطرس نے ان مزاحیہ مضامین کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس کا مجموعہ نقوش کے اس نمبر میں آپ کے ملاحظے سے گزرے گا۔ اور جس سے معلوم ہوگا کہ پطرس نے ادب اور زندگی کے ہر شعبے میں بہت سی کارآمد باتیں لکھی ہیں۔

پطرس کی شہرت ان مضامین سے بھی ہوئی تھی، جو نیاز مندانِ لاہور کی طرف سے نیرنگِ خیال اور کاروان میں شائع ہوتے تھے۔ ان مضامین میں طنز و مزاح کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نیاز مندانِ لاہور کون تھے؟ یہ سوال مدتوں لوگوں کو پریشان کرتا رہا۔ نیاز مندانِ لاہور سے مراد تین اصحاب تھے۔ پطرس، تاثیر، اور سالک۔ جو مضمون بھی شائع ہوتا تھا اس پر تینوں متفق ہوتے تھے۔ اصل میں ہوتا یوں تھا کہ نیرنگِ خیال میں تبادلے کے رسائل اور ریویو کے لئے کتابیں موصول ہوتی تھیں۔ جب ان میں کوئی چیز ایسی ہوتی جس پر کیفیت بحالی ہونے کے بعد بھی تو جہاں ضرورت ہوتی تو میں وہ مواد تاثیر کے سپرد کر دیتا کہ اس کتاب یا اس رسالے کے فلاں مضمون پر نشتر زنی کی ضرورت ہے۔ تاثیر صاحب وہ مواد اپنے خیالات اور تحقیق کے ساتھ پطرس صاحب تک پہنچا دیتے۔ اور پطرس صاحب اس پر ایک مضمون قلم بند فرماتے جس پر آخری ہاتھ جناب عبدالمجید صاحب سالک لگاتے تھے۔ اور پھر وہ مضمون نیرنگِ خیال میں شائع ہو جاتا۔ ان مضامین کی ان دنوں یوپی اور اہلِ زبان میں بڑی دھوم تھی۔ ان میں مزاح سے زیادہ طنز اور تنقید ہے۔

پطرس صاحب زندہ مزاج تھے۔ احباب کے ساتھ جس محفل میں بھی وہ بیٹھتے ان کے درخشاں اور شگفتہ چہرے سے مزاح کی نفاست ٹپکی پڑتی تھی۔ ان کے منہ سے مزاح بھرے فقرے اور الفاظ اس طرح سلیس ادا ہوتے تھے کہ تمام محفل لوٹن کبوتر بنی رہتی تھی۔ اس مزاح میں عامیانہ اور گھٹیا انداز میں کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں بیٹھے پطرس کی باتیں سنتے رہیں۔

جب پطرس صاحب آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر جنرل تھے۔ تو ریڈیو کی بعض پالیسیوں کے متعلق میں نے نیرنگِ خیال میں سختی سے نکتہ چینی کی۔ یہ سلسلہ کوئی دو مہینے چلا ہوگا کہ پطرس کا ایک خط مجھے ملا جس میں اس قسم کے الفاظ تھے "آپ میرے خلاف سب کچھ لکھیں تو میں برداشت کروں گا لیکن میرے خلاف نیرنگِ خیال میں کچھ لکھا جائے تو میں اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔" خط کے پہنچتے ہی میں نے یہ سلسلہ نیرنگِ خیال میں فوراً روک دیا۔

ایک دفعہ ہمارے دوستوں نے نیرنگِ خیال کو نیچا دکھانے کے لئے "مخزن" کا سہارا لیا۔ تاثیر مع اپنے "عملہ" کے مخزن کے دفتر میں جا پہنچے صبح سے شام تک یہ عملہ مخزن کو بڑھانے اور مقبول بنانے میں مصروف نظر آتا تھا۔ پطرس، سالک اور امتیاز کو بھی اپنے ڈھب پر لانے کی انہوں نے کوشش کی اور ان کے بعض مضامین جو نیرنگِ خیال کو ملنے تھے۔ انہوں نے راستے ہی میں اچک لئے۔ اس معرکہ میں پطرس صاحب نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "چوہے بلی کے گلے میں گھنٹی تو باندھیں گے لیکن اس کی میاؤں کا کیا علاج کریں گے۔ تمہارے طائفہ کے پاس سب کچھ ہے لیکن حکیم صاحب کی سوجھ بوجھ کہاں سے لاؤ گے؟" چنانچہ اس جماعت کی یہ تمام کوشش پوری طرح ناکام ہو گئی۔

پطرس نیرنگِ خیال کے دورِ اوّل کے لکھنے والوں میں سب سے نمایاں شخصیت تھے۔ بلکہ مجموعی طور پر انہوں نے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لکھا ہے۔ ان تحریروں میں ڈراما، فلم، افسانہ، ادب لطیف، تنقید، طنز و مزاح بھی کچھ شامل ہے،

جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

آغا بابر

جس قلم سے آج یہ چند منتشر خیالات خراجِ عقیدت کے طور پر پروفیسر بخاری مرحوم کی نذر کر رہا ہوں، یہ قلم چلانا انہوں نے ہی سکھایا تھا۔ وہ میرے استاد تھے، مشفق تھے۔ زندگی کی جنگ لڑنے کا اعتماد، ترسیدہ نہ ہارنے کا جذبہ، سب کچھ انہیں کی تہذیب و تربیت کا نتیجہ تھا۔ ان کی ناگہانی موت سے خیالات اس طرح پریشان ہیں کہ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں، رشتہ ترتیب قلم سے ٹوٹ گیا ہے۔ جیسے دماغ میں جو کچھ آ رہا ہے جس ترتیب سے آ رہا ہے اسی طرح پیش کر رہا ہوں۔

خاطر مسلسل است پریشاں چوں زلفِ یار

عیبم مکن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ام

گورنمنٹ کالج لاہور ہندوستان میں سب سے بڑی اور سب سے پرانی درسگاہ تھی۔ اس کی تعلیم کا ڈھنگ، علمی و ادبی صحبتیں اور پروفیسروں کی قابلیت کا شہرہ دور دور تھا۔ لڑکے اس درسگاہ سے سند لے کر نکلتے، انہیں بھی فخر ہوتا اور پروفیسروں کو بھی۔ جب میں فرسٹ ایئر میں یہاں داخل ہوا تو پروفیسر بخاری انٹرمیڈیٹ بورڈ میں تھے بلکہ بورڈ میں انہیں کی رائے چلتی تھی۔ گردن میں آپریشن ہونے کی وجہ سے ایک گڑھا سا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے نسیں کھنچی رہتیں۔ شکل و صورت ایرانیوں کی سی تھی۔ ان دنوں مسٹر ڈیرٹ پرنسپل تھے۔ پروفیسر بخاری کی وضع قطع، باتیں کرنے کا ڈھنگ، لباس اور اطوار سے یورپین انداز ٹپکتا۔ کسی پروفیسر کی کیا مجال کہ گرین کے کمرے میں سگریٹ پیتے ہوئے گھس جائے۔ مگر پروفیسر بخاری جب پرنسپل کے کمرے میں جاتے تو منہ کی طرف (KEY HOLE) میں سے دیکھتے۔ حیرت کے سامنے وہ کھڑے سگریٹ پیتے۔ دھواں نتھنوں سے نکلتا۔ کبھی کش لیتے تو دھواں منہ سے نکلتا، نتھنوں سے۔ باتیں رہتے ہی دھواں غائب۔ اتنی دیر میں دھواں نتھنوں سے نکلتا پھر منہ سے۔ یہ تماشا کئی بار میں دیکھ چکا تھا۔ گورنمنٹ کالج کے جرنل کے پروفیسر کا یہ انداز اپنے اندر عجیب وقار، حسن، اور کشش لیے ہوئے تھا۔ پروفیسر بخاری بی۔ اے کو ڈرامہ پڑھاتے تھے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ان کی باتیں سنوں۔ ان کی صحبت میں بیٹھوں۔

اردو مجلس کے وہ صدر تھے۔ اجلاس ان کے مکان پر ہوتے تھے۔ وہ ان دنوں میکلوڈ روڈ پر عطر چند کپور بلڈنگ میں رہتے تھے۔ پہلی دفعہ مجھے وہیں پروفیسر بخاری کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ فلیٹ کے برآمدے کی آرائش اور ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ہر شے میں مغربی انداز جلوہ گر تھا۔ اس مغربی ماحول میں اردو مجلس کی میٹنگ۔ پھر گفتگو کا انداز انتہائے تکلف، سب کے ساتھ خلوص آمیز میل ملاپ۔ اس مجلس میں سید امتیاز علی تاج اور سالک صاحب بھی تھے۔ ان سے بخاری گفتگو کرتے تو بات بات کے فوارے سے عجب پھلجھڑیاں اور شرارے پھوٹتے۔ تین گھنٹے کی مجلس رہی، مگر وقت گزرنے کا پتہ

ان کی ذات میں مشرق و مغرب کا ہ حسین امتزاج ہوا تھا۔ پہلی صحبت ہی میں آدمی ان سے متاثر ہوتا کمال تو یہ تھا کہ وہ بڑے بڑے اہم اور سنجیدہ مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کس طرح مزاح اور ظرافت سے ... دیتے تھے۔ ان کے مزاح کی شائستگی ساری محفل کو گرما دیتی۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی گرفت تھی کہ وہ مزاح میں بھی چلی آتی ... بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ... کی تصویر کھینچ رہے تھے۔ راشد اور فیض کو جدید شاعری کے گل بوٹے جانتے ... ایٹ دی پوپو میک (THE MAN WHO ATE THE POPOMACK) کا ریہرسل ہو رہے ہیں۔ انگریزی مباحثوں میں حصے رہے ہیں ادب اور فلسفہ پر لیکچر تیار کر رہے ہیں۔ پھر آستینیں چڑھی ہوئی ہیں ... ڈرامے کی سیٹنگ کی نگرانی ہو رہی ہے ... ایک ایک لمحے کا احساس کا اس طرح رس نچوڑ رہے ہیں کہ وقت کی بھی ناقدری پر نادم ہے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ اتنا خوش آئند ہوتا کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک ولولہ جاگ اٹھتا۔ جو لوگ ڈرامے کا ریہرسل دیکھنے آتے دم بخود رہ جاتے ... یونیورسٹی ڈی بیٹ کے لئے تیار کرتے تو لڑکوں کا جی چاہتا کہ وہ ڈی بیٹ ہی کو زندگی کا مسلک بنا لیں۔ یہ بخاری صاحب کے خلوص و ... کے کرشمے تھے۔

صوفی تبسم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:۔

" بخاری کا مقولہ ہے کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ جیسا ہونا چاہیئے چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے ہیں تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے۔"

ان کا اپنے شاگردوں سے بڑا مشفقانہ برتاؤ ہوتا تھا، کلاس میں بھی اور کلاس سے باہر بھی۔ اس کے باوجود ان سے جی ڈرتا۔ وہ اس لئے کہ جہاں کوئی اصول کی بات آجاتی، وہ معاف نہ کرتے، ڈانٹ پڑ جاتی۔ میں نے بی اے میں ان سے ڈراما پڑھا، شیکسپیئر کے وہ عاشق تھے۔ " ہملٹ " ہمارے نصاب میں تھا۔ جہاں پلونیس لی آرٹیز کو تقریر کرتے ہوئے عقل و دانش کی باتیں سمجھاتا ہے جو انسانی زندگی اور دنیوی تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ اس مقام پر شیکسپیئر نے جو باتیں سمجھائی ہیں ان کے متعلق پروفیسر بخاری ہمیں نوٹس لکھوانا چاہتے تھے۔ ہم نے اپنا اپنا قلم سنبھالا۔ اصغر (اب کمانڈر ... راولپنڈی) میرے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ اس نے موٹا سا پیلے رنگ کا قلم نکالا۔ نوٹ بک پر اس روز کی تاریخ لکھی اور میری نوٹ بک کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے قلم سے تاریخ لکھنی چاہی تو قلم نے لکھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصغر کی طرف دیکھا پھر قلم کو انگلی سے ذرا ٹھونک کر لکھنا چاہا۔ قلم نے نہ لکھا۔ میں نے اصغر کو زور سے کہنی ماری اور کہا۔

" ادھر مت دیکھو میرے قلم کو نظر لگ رہی ہے۔"

پروفیسر بخاری نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہم اگلی بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ دو سال ہوئے میں نے اپنے افسانوں کا تازہ مجموعہ " لب گویا " ن۔ م۔ راشد کے ہاتھ بخاری صاحب کو نیویارک بھیجا۔ میں نے اس پر لکھا ـــــ اپنے نالائق شاگرد کی طرف سے یہ کتاب۔ قبول فرمائیے جو اگلی بنچوں پر اس لئے بیٹھا کرتا تھا کہ آپ پچھلی بنچوں پر بیٹھنے والوں سے سوال پوچھا کرتے تھے "ـــ ۔ بخاری صاحب مسکرا کر کتاب دیکھنے لگے اور اگلے روز نئے سال کا کارڈ مجھے روانہ کیا جو اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ ہملٹ کا وہ نسخہ بھی جو پروفیسر بخاری ہمیں پڑھایا کرتے تھے میرے پاس موجود ہے حقیقت میں تو ہمارے پاس

ان کے وہ تحفے ہیں جن کو ہم نے زندگی بھر اپنائے رکھا ہے۔ یہ تحفے کا روگ جو ہم طالب علمی کے زمانے سے پال رہے ہیں انہیں کی بخشش ہے۔ قدما کا شوق بلکہ چسکا انہیں کا دیا ہوا ہے۔ جذبات کی یہ آنچ جس نے استخواں تک کو جلا دیا ہے اور ابھی "آرزوئے سوختن باقیست" انہیں کا کرشمہ ہے انہوں نے ن م راشد کی حوصلہ افزائی کی فیض کی کمر ٹھونکی۔ آغا عبد الحمید (سی ایس پی) بشیر قریشی (سی ایس پی) علی صفدر (سی ایس پی) رشید احمد (ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، ریڈیو پاکستان) اور منظور علی خاں (سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) پروفیسر بخاری کے وہ شاگرد ہیں جن کی علمی استعداد اور ادبی تہذیب و تربیت بخاری صاحب کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ وہ روشنی کا چراغ جس سے ہزاروں چراغ جلے، سینکڑوں نے اکتساب نور کیا آج اپنی زندگی ختم کر چکا ——

پرانے واقعات تازہ تر ذہن پر وارد ہو رہے ہیں جن سے اپنے استاد کی تعظیم و تکریم میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس عظیم انسان کا وقار و فضیلت بڑھ رہا ہے مرحوم کی شخصیت کا ایک پیارا پہلو یاد آیا ——

اصغر حسین قلعہ گوجر سنگھ رہتا تھا پروفیسر صوفی تبسم نے کہا "تم میکلوڈ روڈ سے گزرتے ہوئے بخاری صاحب کے ہاں چلے جانا اور ان سے کہنا کہ آج شام کو چھ بجے ادبی مجلس کی میٹنگ ان کے مکان پر ہوگی۔"

اصغر نے عزیز چند کپور بلڈنگ کے ساتھ بائیسکل رکھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند۔ بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے انگلی رکھ کر بٹن کو زیادہ زور سے دبایا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب وہ انگلی رکھ کر دباتا ہی چلا گیا۔

بخاری صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے آئے۔ دروازہ کھول کر بولے: "جو گھنٹی کے بٹن کے اوپر لکھا ہے تم نے پڑھا؟"

وہاں لکھا ہوا تھا "BE BRIEF AND PATIENT"

اصغر کچھ نہ بولا۔ انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "NO MISTAKE IN FUTURE" اور چلے گئے۔ اصغر حیران کہ اچھا پیغام دینے آئے کہ الٹی ڈانٹ کھا لی اور اس مرد خدا نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں آئے کیا بات ہے؟

اصغر نے گھنٹی کو زور سے بجایا، سیڑھیاں اترا۔ بائیسکل لیا اور بھاگ گیا۔ اگلے دن پروفیسر بخاری کے پیریڈ میں اصغر کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ حاضری لے رہے تھے جب نمبر ۵۶ بولا تو رک گئے۔ اصغر کا برا حال۔ بخاری نے رجسٹر سے نظر اٹھائی۔ اصغر کی طرف دیکھا۔ ذرا سا ڈرامائی وقفہ دے کر بولے —: "I LIKED IT"

اور حاضری لینے لگے

اسی زمانے کی بات ہے۔ یونیورسٹی سے کہہ سن کر پروفیسر بخاری نے کالجوں میں پراکٹوریل سسٹم رائج کرایا۔ طلبا کو شناختی کارڈ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نو بجے کے بعد بغیر اجازت نامہ کے طالب علم گھر سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں ایک دن پکڑا گیا

میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ساتھ ایک کھانے پر مدعو تھا۔ انہوں نے مجھے گنڈیریاں لینے بھیج دیا۔ میں گوالمنڈی کے چوک میں گنڈیریاں تلوا رہا تھا کہ ایک کار آ کر رکی۔ بخاری صاحب بولے۔ "اجازت نامہ؟"

میں نے کہا۔ "میں تو ——"

بولے۔ "کل صبح" اور چلے گئے۔

میں نے عاشق صاحب سے اجازت نامہ لیا کہ میری اجازت سے باہر گیا تھا، مگر بخاری صاحب نے دس روپے جرمانہ کر دیا۔ بولے "اس

وقت تمہارے پاس اجازت نامہ کیوں نہیں تھا؟ تم نے اصول توڑا ہے۔"

آج جب ہم اپنے بچوں سے اصول برتتے ہیں تو انہیں کیا معلوم کہ اس میں ہمارے پروفیسر کی تربیت بول رہی ہے ہم نے جو کچھ اپنے استاد سے سیکھا اُسی کی پاسداری کر رہے ہیں۔

گزشتہ جنوری میں وہ ڈھائی برس کے بعد رخصت لے کر امریکہ سے پاکستان آئے۔ راولپنڈی میں اپنے بڑے لڑکے ہارون کے پاس چند دن رہے۔ میں ملنے گیا۔ وہی پرانی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت۔ پوچھنے لگے "سنا ہے تم نے پنڈی میں ڈرامے سٹیج کئے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی لگائی ہوئی آگ ابھی تک نہیں بجھی۔" یہ سن کر مسکرائے۔

میں نے کہا "سول تھیٹر گروپ آپ کو چائے کی پیالی پلانے کا خواہشمند ہے۔"

بولے "میں ان تکلفات (FORMALITIES) سے بڑا تنگ آ گیا ہوں۔ تم بلاؤ تو آ جاؤں گا۔ کراچی اور لاہور میں میں نے کسی ادارے کی دعوت قبول نہیں کی۔"

میں نے کہا "سول تھیٹر کو کوئی پیغام ہی دے دیں۔"

بولے "پیغام تو بڑے آدمی دیا کرتے ہیں۔"

راولپنڈی میں انہوں نے اپنے شاگردوں اور مداحوں کے ساتھ ایک شام بسر کی۔ عابد علی کے ہاں تین گھنٹے محفل جمی۔ وہ گفتگو کے بادشاہ کو ہم نے پھر بلندیوں پر اڑتے دیکھا۔ دل خوش ہوا کہ دل کے دوروں نے ابھی تک اس عظیم شخصیت کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وقت سے زندگی کا پورا رس نچوڑ لینے والا یہ انسان ابھی زندہ رہے گا۔

وہ اپنے قیام کے دوران اپنے شاگردوں اور دوستوں سے پہلا سوال یہی کرتے رہے "کیا تم مطمئن ہو؟"

اس سوال کو اولیت دینے کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ پاکستان کا ہر شخص شاکی نظر آتا ہے۔ میں یہاں ایک عام فرسٹریشن دیکھ رہا ہوں بے دلی، بے اطمینانی اور محرومی کا احساس چاروں طرف دکھائی دے رہا ہے۔ لوگوں کی اپنی ذات میں دلچسپی انتہائی طور پر بڑھ گئی ہے سب قوموں میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ ان کی قوم کا کوئی فرد امریکہ میں آئے تو وہ اس کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ ہمارے ملک کا ممتاز اور قابل ترین فرد ہے۔ واحد پاکستانی ایسا شخص ہے جسے میں نے کبھی اپنے ملک کے فرد کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ وہ تو دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ سب سے ممتاز اور قابل ترین فرد تو میں ہوں: یہ تو بس ایسوں میں سے ہی ہے۔ اگر کسی کو کوئی اچھا عہدہ مل جائے۔ کسی منصب پر کوئی جا پہنچے اور کسی پاکستانی سے کہا جائے۔ "کیوں بھئی۔ وہ اچھے عہدے پر جا پہنچا؟" تو پتہ ہے وہ کیا جواب دیتا ہے ــ "او چھڈو جی ـــ یہاں پھرا کرتا تھا!" پھر میری طرف دیکھ کر بولے ـــ "کوئی اگر یہ کہے کہ بابر نے بڑا اچھا ڈرامہ سٹیج کیا تو کہیں گے 'او چھڈو جی ـــ کل ایتھے رلدا پھردا سی۔'"

اس 'چھڈو جی' میں ہماری کم ہمتی، محرومیوں اور نا اہلیتوں کی بہت بڑی جھلک موجود ہے۔ پاکستان چھوٹا سا ملک ہے آخر یہاں ہی کے لوگ اچھے عہدوں پر متمکن ہوں گے مگر اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ پاکستانی خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دوسرا اگر کچھ کر کے نیک نامی حاصل کر لے تو عام ردعمل یہی ہوتا ہے "او چھڈو جی۔"

کہنے لگے امریکہ میں ایک بین الاقوامی تقریب پر چوہدری سر ظفر اللہ خان کسی سے تنبورے کا ذکر کر رہے تھے۔ کسی غیر ملکی نے پوچھا تنبورے اور تان پورے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کہنے لگے "چلو بخاری سے پوچھیں وہ آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل رہ چکا ہے۔"

میں نے کہا "آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل رہنا تمہارے اور زمان پہ ہے پر کوئی اختیار نہیں ہو سکتا۔ آپ کی عمر کتنی ہوگی؟"
بولے "پینسٹھ سال"

میں نے کہا "جہاں آپ نے پینسٹھ سال تان پورے اور طنبورے کا فرق معلوم کئے بغیر گزار دیئے میں دو چار سال اور بھی گزار دیجئے۔"

پروفیسر صوفی تبسم کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ پروفیسر بخاری کے رفیقوں میں سے ایک یونیورسٹی کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری کہنے لگے "بھائی صاحب میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں کسی سے الجھنا ہو تو کسی بڑے سے پر الجھنا چاہئے اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہئے ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں۔"

جب علامہ اقبال کے کلام کے سلسلے میں یوپی کے بعض اہل قلم کی طرف سے اعتراضات اٹھنے لگے تو "زندہ دلان پنجاب" نے ان سے جو جنگ لڑی تھی بخاری اس میں پیش پیش تھے۔

ٹکراؤ سے ان کی استعداد کار کا حرکت میں آنا' یہ بات ان کے ڈرامے سے غایت درجہ شغف رکھنے کا ایک طبعی باعث قرار دی جا سکتی ہے اس طرح الجھنے اور ٹکرانے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوتیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ کبھی تھکن محسوس نہ کرتے۔ میں نے انہیں ۱۹۳۵ء میں ہیملٹ کا پارٹ ادا کرتے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروفیسر بخاری واقعی پرنس ہیملٹ ہے۔ ڈرامائی ٹکراؤ' واقعاتی الجھاؤ' کردار کی رکاوٹیں ہیملٹ کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ اور وہ کس کس طرح ان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ ہیملٹ کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آ گئی تھی۔

نیویارک کے جس ڈاکٹر کے وہ زیر علاج رہے وہ بھی شیکسپیئر کا بڑا دلدادہ تھا۔ مریض اور ڈاکٹر دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہتے۔ عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کے بعد پروفیسر بخاری جب بھی ڈاکٹر سے طبی مشورہ کرتے تو مسکرا کر پرمعنی انداز میں ضرور پوچھتے "کب ڈاکٹر؟ بتاؤ تو سہی کب؟"

نیویارک میں ملک ملک کے چوٹی کے اخباری نمائندے مقیم ہیں۔ وہ بخاری کی صحبت میں بیٹھنے کو بہت بڑا پر مسرت اعزاز سمجھتے۔ ہر شخص ان کا مداح تھا۔ پروفیسر بخاری نے ایک بے چین اور مضطرب طبیعت پائی تھی۔ اس سیماب صفت انسان کا دماغ اس کے جسم سے اور اس کا جسم اس کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

موت کا فرشتہ دہلیز پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "اگر تم چاہو تو میں حاضر ہوں۔ رات تمہارے پاس ٹھہرتا ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا۔"
پروفیسر بخاری نے کہا "نہیں، نرس جو میرے پاس موجود ہے۔"
ڈاکٹر نے مذاق سے کہا "اچھا سویٹ پرنس شب بخیر۔"
مگر یہ رات اس کی آخری رات تھی۔ موت کے فرشتے نے دہلیز الانگ لی۔
بچے پاپوں سے پوچھتے ہیں آج کون مر گیا آپ اداس ہیں؟ کون بتائے ننھی پود کو کہ آج وہ مر گیا جس نے کہا تھا بچوں کا بہلانا سہل ہے

بڑوں کا بہلانا نہیں تھی۔

پروفیسر بخاری کی شخصیت کی [illegible] بہت [illegible] چیز [illegible] بنے رہے۔ مگر اپنی لطافت [illegible] سے [illegible] تک [illegible] کی سوچ [illegible] ترتیب میں [illegible] کی ساتھ پھلجھڑیاں بھی بہا [illegible] ہوتی پڑتا۔ [illegible] زندگی کی چاندنی اور شگفتگی بلا کی چھپی [illegible] گئے۔

بہت سی باتیں [illegible] یہ حقیقت ہے [illegible] انسان [illegible] زندگی [illegible] ادیب، پاکستان کا شہری نہیں، دنیا کا شہری [illegible] چھپے ہوئے ہیں۔ شہزادہ علی خان نے [illegible] ہوتی ہیں — ہمارے ان آنکھوں میں کون [illegible] کا خالی [illegible] میں

[illegible]
ہمیں [illegible] کوں [illegible]

چند پرانی یادیں

غلام رسول مہر

میں نے بخاری صاحب کو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا۔ ترکِ موالات یا لاتعاون کی تحریک اوجِ شباب پر تھی اور اس کے اوجِ شباب کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لفظوں میں اس کا صحیح نقشہ پیش کرنا مشکل ہے۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ صاف نظر آرہا تھا حکومتِ برطانیہ کے قصرِ اقتدار میں ایک خوفناک زلزلہ آگیا ہے اور یہ قصر تھوڑی ہی دیر میں زمیں بوس ہو جائے گا۔

سالک صاحب "زمیندار" کے مدیر کی حیثیت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ مقدمہ چل رہا تھا اور اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ شجاعت اللہ خاں مرحوم "زمیندار" کے مینجر تھے اور انتظام کے علاوہ تحریر کا زیادہ تر کام بھی وہی انجام دیتے تھے۔ انہی کی تحریک پر سید عبدالقادر شاہ مرحوم نے مجھے ادارۂ تحریر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے بلایا تھا۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم بھی اس وقت "زمیندار" ہی سے وابستہ تھے۔ خبروں اور مختلف مضمونوں کا ترجمہ ان کے ذمے تھا۔

"زمیندار" کا دفتر دہلی دروازے کے باہر اس بڑی عمارت میں تھا جو حجازی بلڈنگ کے نام سے مشہور تھی۔ ایک روز شام کے وقت دو گورے چٹے جوان نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ بادی النظر میں صاحب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے کھڑے کھڑے شجاعت اللہ خاں سے باتیں کیں۔ غالباً اس روز سالک کے مقدمے کی پیشی ہوئی تھی۔ اسی کی کیفیت پوچھتے رہے اور چلے گئے۔ شجاعت اللہ خاں نے مجھے بعد میں بتایا کہ ان میں سے ایک احمد شاہ بخاری تھے اور دوسرے سید امتیاز علی تاج۔ میں ان دونوں سے ناواقف تھا اور محض نام سن کر میری معلومات میں کیا اضافہ ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کے متعلق کچھ پوچھنا بھی ضروری نہ سمجھا، البتہ اس بات پر تعجب ہوا کہ قومی تحریک کے نہایت اہم مرحلے پر بھی بعض مسلمان انگریزوں کی سی وضع قطع قائم رکھنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتے۔

چند روز بعد میں گھر واپس چلا گیا اور "زمیندار" کے ساتھ تعلق قائم نہ رکھ سکا اس لیے کہ میرے اقربا خصوصاً والدہ مرحومہ کو یہ تعلق منظور نہ تھا۔ دو تین مہینے کے بعد شجاعت اللہ خاں اور مرتضیٰ احمد خاں میکش خود میرے گاؤں پہنچے جو جالندھر شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور اقربا کو راضی کر کے مجھے دوبارہ "زمیندار" میں لے آئے۔ اس وقت سے مستقل طور پر میری اخبار نویسی کی ابتدا ہوئی۔ سالک صاحب کو ایک سال قید کی سزا ہو چکی تھی اور وہ لاہور سے میانوالی جیل میں منتقل ہو چکے تھے۔ بخاری

اور امتیاز وقتاً فوقتاً سالک صاحب کی صحت و عافیت دریافت کرنے کی غرض سے "زمیندار" کے دفتر میں آتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ان سے شناسائی ہوئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ سالک صاحب کے نہایت عزیز دوست ہیں۔

۱۹۳۱ء کے اواخر میں سالک صاحب رہا ہو کر آ گئے اور ان سے وہ برادرانہ تعلق استوار ہوا جسے زندگی کا ایک عزیز ترین سرمایہ سمجھتا ہوں۔ ان کی وجہ سے بخاری اور امتیاز کے ساتھ بھی ایک خصوصی علاقہ پیدا ہو گیا۔ بخاری صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس علاقہ میں آخری وقت تک کوئی خلل نہ آیا۔ امتیاز صاحب کو خدا تا دیر سلامت رکھے، ان کے ساتھ یہ علاقہ آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے تیس بتیس سال پیشتر قائم تھا۔

بخاری صاحب سے زیادہ مفصل ملاقاتیں اس زمانے میں ہوتی رہیں جب منشی نعمت اللہ صاحب مرحوم مسلم ہوٹل چلا رہے تھے اور بخاری صاحب نے اسی ہوٹل میں اپنے لیے ایک یا دو کمرے لے لیے تھے۔ یہ ہوٹل اسی جگہ تھا جہاں اب اس نام کا ہوٹل موجود ہے لیکن اس کی عمارت بالکل بدل گئی ہے۔

بخاری صاحب کی باتیں اس زمانے میں بھی سب سے نرالی ہوتی تھیں۔ ہم لوگوں کے دل و دماغ کا ریشہ ریشہ ترک تعاون اور آزادی کے جوش سے معمور تھا۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ ایک روز انھوں نے خاص احساس ذمہ داری کے ساتھ فرمایا کہ آزادی کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے ضرور کرنا چاہیے مگر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ جس قوم کا لباس ایک نہیں، جس کے کھانے کے اوقات مقرر نہیں، جس میں یکسانی اور یکجہتی کا کوئی بھی پہلو نظر نہیں آتا، وہ آزادی سے کیا فائدہ اٹھائے گی؟ کوشش کرو کہ اس سرزمین میں بسنے والے لوگ واقعی ایک ایسی قوم بن جائیں جو ایک نظام زندگی کی پابند ہو۔

اس وقت یہ سن کر احساس ہوا کہ بخاری صاحب کا دل آزادی کے جذبے سے بالکل خالی ہے لیکن جب بنیادی حقائق کے صحیح اندازے کا شعور پیدا ہوا تو پتہ چلا کہ یہ ارشاد ان کے مطمح نظر کی ایک روشن دستاویز تھا۔

اسی طرح مجھ سے انھوں نے بارہا کہا کہ آپ اخبار میں ایک چوکھٹا مستقل طور پر لگاتے رہیں جس کے اندر جلی حروف میں یہ عبارت مرقوم ہو کہ "بائیں ہاتھ چلو"۔ روزانہ یہ چوکھٹا چھپتا رہے گا تو یقین ہے کہ ہزاروں آدمیوں کو بائیں ہاتھ چلنے کی اہمیت کا احساس ہوتا جائے گا۔

میں خود ماضی پر نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ سیاسیات پر خدا جانے کتنے ہزار صفحے لکھ ڈالے۔ اپنے نقطۂ نگاہ کی توضیح کے لیے دلائل و شواہد کے سینکڑوں ہزاروں طومار مرتب کر دیے لیکن منظم قومی زندگی کے مبادی کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور آج بھی جبکہ آزادی پر بارہ سال گزر چکے ہیں، قوم ان مبادی سے اسی طرح ناآشنا ہے جس طرح تیس چھتیس سال پیشتر ناآشنا تھی۔

بخاری صاحب ابتدائی دور میں بھی بعض نہایت ممتاز خصوصیتوں کے مالک تھے مثلاً:۔

۱۔ جو کچھ لکھتے یا بولتے تھے اس میں تکلف بالکل نہ ہوتا تھا، تاہم ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی نادر خوبی ضرور ہوتی تھی۔ پھر وہ

فطری صلاحیت آج کی بنا پر اس میں خاص دل آویزی پیدا کر دیتے تھے۔

۲۔ میں نے کبھی ان کو کسی بھی مسئلے کے متعلق بحث و مناظرہ میں حصہ لیتے نہ دیکھا۔ جو موضوع زیرِ بحث آتا اس کے متعلق ایک دو سیدھی سی باتیں ایسے انداز میں کہہ دیتے جیسے کوئی بے تعلق سا آدمی کسی جواب کا اظہار کرتا ہے اور دوسرے معاملے پر گفتگو شروع کر دیتے۔

۳۔ کسی کی کم علمی یا ذہنیت کی فرومائیگی کا مذاق انھوں نے کبھی نہ اڑایا۔ ساتھ ہی وہ کبھی کسی بہت بڑے آدمی سے بھی مرعوب نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک مشہور لیڈر سے ملاقات ہوئی جس نے مسئلہ تعلیم کے متعلق وہی عامیانہ سی باتیں شروع کر دیں جو ہر جلسے میں کہی جاتی ہیں۔ بخاری صاحب دو چار منٹ سنتے رہے پھر کہنے لگے کہ صاحب اس موضوع کو چھوڑیے اور کوئی دوسری بات کیجیے۔

ایک تعجب انگیز معاملہ یہ ہے کہ کم از کم مجھے ان کی خداداد صلاحیتوں کا پورا اندازہ کبھی نہ ہو سکا۔ علم و فضل اور مشغولیت کے اعتبار سے وہ تعلیمی دائرے کے ایک بلند پایہ فرد تھے۔ اسی دائرے کے لیے انھوں نے یہاں اور ولایت میں تعلیم و تربیت پائی تھی لیکن جب انھیں آل انڈیا ریڈیو میں لیا گیا تو بہت ہی کم مدت میں ہر متعلقہ آدمی کو احساس ہو گیا کہ بخاری صاحب بے شک و شبہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں اور ان کے کمالات کا حصر مشکل ہے۔ چنانچہ ان کی نگرانی میں آل انڈیا ریڈیو نے جس سرعت سے ترقی کی اس کی نظیر ان سے پیشتر یا ان کے بعد کے دور میں شاید ہی مل سکے۔

پھر قومی یا بین الاقوامی سیاسیات سے انھیں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا تاہم جب پاکستان کی طرف سے انجمن اقوامِ متحدہ میں نمائندگی کا منصب انھیں سونپا گیا تو وہ تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف اسلامی اور مشرقی ممالک کے نمائندوں کی صف میں ممتاز ترین حیثیت اختیار کر گئے بلکہ بین الاقوامی دائرے کے لیے بھی ہر شخص کے دل میں ان کے لیے انتہائی احترام پیدا ہو گیا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن مختصر بخاری صاحب ہی تھے جنھوں نے ایک طرف بہترین قومی اور اسلامی مصلحتوں کی نگہداشت کا حق ادا کیا اور دوسری طرف اہلِ وطن کے سامنے انھوں نے بار بار وہ مسلک واشگاف طریق پر پیش کر دیا جو بین الاقوامی دائرے میں کامیابی و فائز المرامی کا واحد ذریعہ تھا۔

اسی بالغ نظری، اسی حقیقت شناسی، اسی واقعیت دوستی اور فکر و نظر میں اسی توازن کی بنا پر انھیں انجمن اقوامِ متحدہ میں وہ مقام حاصل ہوا جو غالباً مشرقی ممالک کے کسی فرد کو میسر نہ آسکا۔ انجمن اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو ان کی رائے اور صحتِ تدبیر پر جتنا اعتماد تھا اس کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔

اگر بخاری صاحب کو حیاتِ مستعار کی مزید مہلت ملتی تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ فضائل و مکارم کی کن بلندیوں پر پہنچتے۔ کمال یہ ہے کہ ان کے دل میں سب کے لیے محبت اور الفت موجزن تھی۔ عداوت کسی سے نہ تھی۔ وہ ایک نادر الوجود انسان تھے اور عمل و سرگرمی کے جس حلقے میں پہنچے انھوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار پیش کیا۔ اسی وجہ سے سب لوگ انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اصلاً علمی آدمی تھے۔ آل انڈیا ریڈیو میں پہنچے تو وہاں بھی اپنی علمی خصوصیات کو بہتر سے بہتر انداز میں نمایاں کیا

اور انجمن اقوام متحدہ کی مشیر بھی ان کی علمی صلاحیتوں کی حلقہ وسیع سے متعارف [illegible] مجموعہ [illegible] میں [illegible] شیخ کو نصیب ہوئے۔

بخاری صاحب کی [illegible] خصوصیت [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کی اشاعت ہو رہی ہے
چند خطوط شائع ہو رہے ہیں [illegible] کے ملاحظے سے واضح ہوگا [illegible] ان کی [illegible] سے رکھی تھی [illegible]
چاہتے تھے کہ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ان کی [illegible] وقت پر سکے سے
کر لیا تھا کہ جن لوگوں [illegible] عمل مجھے [illegible]
اس وقت تک [illegible] خلاف ہوگا جو ہے
محکمے سے باہر نہیں جانے [illegible] بخاری صاحب کی [illegible] کے [illegible] ان کے [illegible] کرنے سے
مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔

جس وقت ان کا معاہدہ وزارت پنجاب میں [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی [illegible]
صورت پیدا ہو گئی جس کی تفصیل خطوط کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ بخاری صاحب [illegible]
کہ مجھے لکھا میں [illegible] کے معاملے کو اپنے معاملے پر بھی ترجیح دیتا ہوں۔
دوستوں کے لیے ان کے جذبہ ایثار کی اور مثالیں بھی میرے پیش نظر ہیں لیکن میں [illegible] کے اس حصے کو فی الحال
زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔

یہ چند چیزیں بے اختیار زبانِ قلم پر آگئیں۔ بخاری صاحب کے متعلق لکھنے کے اصل حقدار [illegible] اور [illegible] جنہیں مرحوم
کے ساتھ مجھ سے بدرجہا زیادہ گہرا تعلق تھا اور ان کی معلومات بھی مجھ سے بہت زیادہ ہیں۔ میں اس بارے میں ان معنوں سے محروم
نہیں ہوں لیکن طفیل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ایک عزیز اور محترم دوست کی یادگار میں خاص نمبر مرتب کرتے وقت مجھے بھی دعوت شرکت
دے دی۔ اس طرح دوسروں کے شاداب و دل آویز گلدستوں کے ساتھ مجھے بھی چند [illegible] شامل کر دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔
مرحوم افراد کے متعلق ذکر کا ایک عام شیوہ یہ ہے کہ جو جگہ انھوں نے خالی کی وہ پُر نہ ہو سکے گی لیکن بخاری صاحب یقیناً ان
معدودے افراد میں سے تھے جن کی جگہ پُر کرنے کے لیے متعدد اور گوناگوں خصوصیتوں کا جامع شخص درکار ہے۔ افسوس کہ زمانے کی جو روش ہے
کو دیکھتے ہوئے ان خصوصیتوں کا جمع ہونا مشکل ہے۔ مشرقی و مغربی علوم میں غیر معمولی مہارت، فکر و نظر میں غیر معمولی توازن، رائے اور ذوق
میں غیر معمولی اعتدال، پھر اخلاق و عادات میں مشرقی شرافت اور مغربی محاسن کا غیر معمولی امتزاج، یہ چیزیں فرداً فرداً بھی شاذ ہی نظر آتی ہیں
ان کی جامعیت کے نظارے کے لیے آنکھیں بظاہر ترستی ہی رہیں گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

میرا شہرہ آفاق اُستاد

ڈاکٹر حمید الدین

میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سینکڑوں نہیں تو بیسیوں ایسے احباب سے معذرت طلب کرنی چاہیے جو مجھ سے کہیں زیادہ پروفیسر بخاری سے واقفیت کا دم بھرتے ہیں۔ میں پروفیسر بخاری کی روح سے بھی معذرت خواہ ہوں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے میں اپنے بیان میں بعض ایسی باتیں کہہ جاؤں جو مرحوم کی شخصیت کے بارے میں سو فیصدی درست نہ ہوں۔

جب مجھے پروفیسر بخاری کا خیال آتا ہے۔ تو میرا ذہن دوسری دہائی کے آخری برسوں اور تیسری دہائی کے آغاز کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اُن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اور وہ کیمبرج سے تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ جہاں انھوں نے انگریزی ادب میں وہ امتیاز حاصل کیا تھا۔ جو اُن سے پہلے کسی ہندوستانی کو نصیب نہ ہوا تھا۔ کیمبرج میں کئی ہندوستانیوں نے داخلہ لیا۔ مگر وقیوں کے سوا کسی کو اُن جیسی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

دراز قد، خوبرو، عالمانہ پیشانی، تیز دلکش آنکھیں۔ کہنے کے باعث پروفیسر بخاری دور دور سے بھی دیگر پروفیسروں سے الگ پہچانے جاتے اور ممتاز نظر آتے تھے۔ پروفیسروں کی اس جماعت میں دبلے پتلے، لمبے تڑنگے مونچھوں والے پروفیسر ڈیک ہارن، ملٹن گوبال سنگھ جیسے منکسر اور پروفیسر فرخ جیسے سراپا حرکت لوگ شامل تھے۔ اس سے پہلے پروفیسر مرزا سعید شاید کسی ڈگری کالج کے پرنسپل ہو کر باہر جا چکے تھے۔ اور ایک دو سال بعد پروفیسر ڈکنسن بھی علی گڑھ سے یہاں آ گئے تھے۔

مجھے پروفیسر بخاری سے پہلی بار واسطہ اس وقت پڑا جب میں تیسرے یا چوتھے سال میں تھا۔ وہ ہمیں مختصر افسانہ پڑھاتے تھے۔ ہماری جماعت اُس کمرے میں بیٹھتی تھی۔ جسے نوکری کا سکل پرنسپل اور کالج کے دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ جماعت صبح کے وقت ہوتی تھی۔ وہ ہمیں سٹیونسن کی ما رخایم پڑھا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے پہلے لیکچر کے بعد ہمارے تاثرات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ خاص طور پر مختصر افسانہ اس طریقے سے مختلف تھا جس کے ہم عادی تھے۔ انھوں نے دو تین لیکچر دیئے جس کا مطلب یہ تھا کہ پورا ایک ہفتہ زیادہ تر یہ بتانے پر صرف کیا کہ انھوں نے لندن میں ایک عام آدمی کو کس حال میں دیکھا۔ انھوں نے مصنف اور اس کی کہانی کے متعلق ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اگرچہ بعد میں ایسا ہوا کہ لندن کے عام آدمی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ بتایا تھا۔ اُس کا ڈانڈا مارخایم سے خود بخود مل گیا۔ اور ہم اس فیصلے پر پہنچے کہ پروفیسر بخاری دوسروں سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی ان سے سوال پوچھتا یا اُن پر نکتہ چینی کرتا تو وہ اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد پروفیسر بخاری کی ذات کا جائزہ ہمارا موضوع بن گیا۔ ہم مدت سے سارے انداز میں اُن کے ظاہر بدن کے ظاہری آثار معلوم کرنا چاہتے تھے مگر یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اُن کی ظاہری دلچسپیوں سے اس طرح آگاہ نہیں تھے جیسے طلبا عام ہوتے ہیں۔ اُن کے جیکٹ کے سخت کالر کے ساتھ ایک خوش پوش آدمی کا نشان ہے۔ اُن میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی آدمی کہہ سکے کہ وہ … شعوری طور پر مرعوب ہونے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ اُن سردیوں میں وہ روزانہ ہلکے خاکی رنگ کے ٹوئیڈ کی جیکٹ اور … پہنتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا کوٹ … نہایت صفائی سے استری کیا ہوا ہوتا تھا۔ ہم نے … کے انتخاب میں بھی ان میں کوئی … نازک مزاجی کا ثبوت ملا۔ معاملہ کپڑے پہننے کی کمزوری تو اُن میں شروع سے آخر تک پائی گئی۔ وہ عمدہ … کا انتخاب ہی کرتے … معیوب نہ سمجھتے تھے۔ البتہ اچھی ٹائی لگانے کا شوق ہمیشہ رہا۔

اس طرح قریب سے جائزہ پڑتال کرنے کے باوجود ہم اُن کی وضع قطع کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جان سکے۔ ہم جہاں تھے وہیں رہے اور ابھی تک یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اُن میں ایسی کون سی بات تھی جس کی وجہ سے … پروفیسر … یہ مانا جاتا تھا گورنمنٹ کالج میں کوئی استاد ایسا نہ تھا جو دوسرے سے پانچویں سال کے طلبہ کی شرارتوں کا تختۂ مشق نہ رہا ہو۔ … انگریزی کے استاد … نو وارد … کو کام آتی تھی۔ دراصل ایسا استاد جتنا نیک ہوتا اور جتنا زیادہ رعب جمانے کی کوشش کرتا اتنا ہی زیادہ وہ بے رعب ہو جاتا۔ لیکن پروفیسر بخاری ہمیشہ تمام شرارتوں سے بچے رہے۔

جذبۂ خلوص ہی ایک ایسی خوبی ہے جس کی بنا پر تمام دنیا کے شاگرد اپنے استادوں کی قدر کرتے ہیں۔ پروفیسر بخاری میں ایک استاد کی حیثیت سے یہ وصف نمایاں تھا۔ اُن کے شاگرد شروع ہی سے جان گئے تھے کہ پروفیسر بخاری کی ادبیت ایک استاد سے کہیں زیادہ … صورت رکھتی ہے۔

پروفیسر بخاری کے نزدیک ادب پڑھانے کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ مشکل الفاظ کے معنی بتا دیے جائیں یا محاوروں کی تشریح کر دی جائے یا کسی شاہکار کی ہیئت اور ساخت کا تجزیہ کر دیا جائے یا کسی عظیم مصنف کے فن، تکنیک اور پرکاری پر روشنی ڈال دی جائے۔ یہ سب کچھ کرنے کے علاوہ بہت کچھ اور بھی تھا۔ دراصل تو اپنے آپ کو کسی شاہکار میں کھو دیتے تھے۔ پھر اپنی حقیقی زندگی اس کے سانچے میں ڈھالی کہ ایسا بنا دیتے تھے کہ مغائرت کا احساس باقی نہ رہتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں علم کو ہی شخصیت کی ہر سطح میں … اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اس کام کے پہلے حصے میں کامیابی حاصل کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ البتہ اس کا دوسرا حصہ خاصا مشکل ہے۔ کیونکہ صرف وہی معلم اس خواب کو پورا ہوتے دیکھ سکتا ہے جو ادب کو ایک ذہنی پیشے یا مشغلے کے طور پر نہیں بلکہ زندگی کی رہبری کے طور پر اختیار کرتا ہے۔

بہت جلد پروفیسر بخاری کی جماعتوں کی شکل کچھ سے کچھ ہو گئی۔ ان کا ترجیحی کام ایک استاد کے بے کیف لیکچروں اور طلبہ کے نوٹ لینے کا نام نہ تھا، ان میں گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ ہر طالب علم کسی نظم یا ڈرامے کے ٹکڑے کی تکنیک کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتا تھا۔ یہ سوقیانہ ہے، یہ ارفع ہے، اس میں یہ خوبی ہے، یہ عیب ہے۔ پروفیسر بخاری خود بحث کا آغاز کرتے بلکہ اسے چلانے کے لیے خود بھی حصہ لیتے۔ عموماً ایسا ہوتا کہ وہ … کے حق میں دلیلیں دیتے ہوئے … لیکن بہت جلد معلوم ہو جاتا کہ وہ کلیتہً اس کے حق میں نہیں بلکہ جزوی طور پر اس سے متفق ہیں۔ ایسی بحثوں کا ایک پہلو نہایت قابل تعریف ہوتا۔ وہ یہ کہ کوئی شخص محض منطق کے زور پر الجھن قائل نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی بات منوانے کے لیے لازمی طور پر زیر بحث مصنف کی تخلیق ہی کے اندر پناہ ڈھونڈنی پڑتی تھی۔ اس کی دلیل بظاہر کتنی ہی وزنی کیوں نہ ہو اُس وقت تک قابل قبول نہ سمجھی جاتی تھی جب تک وہ یہ ثابت نہ کرے کہ اس نے اصلی کتاب کو عقلمندی سے سمجھ سوچ کر پڑھا ہے۔ اس طرح پروفیسر بخاری کی نظروں میں مقبول ہونے کے لیے ایک طالب علم کو اپنے میدانِ مطالعہ میں چاروں چوکس رہنا پڑتا تھا۔

اپنے طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا کرنے کا جذبہ پروفیسر بخاری میں عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس سے نہ وہ بوجھ محسوس کرتے تھے نہ ان کے اپنے مشاغل

میں کمی واقع ہوتی گئی۔ [illegible] ان تمام شاعروں کے مطالعہ کے لئے بھی جو ہنر کا کام دیتا تھا جن کے بغیر مطالعہ ادھورا رہتا ہے۔ پرسکون [illegible] ادب اور زبان سے گہری شیفتگی تھی۔ ان کے دوست جانتے ہیں کہ ان کی بذلہ سنجی اور اسلوب بیان کے حسن [illegible] ان کی شخصیت کے چھپے ہوئے پہلوؤں کی غمازی [illegible] اور اہم ترین نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ [illegible] ایک نقطہ ہے۔ مگر ان کی تلاش ایک زندہ تحریک تھی۔ وہ اسے ایک ایسا جال تصور کرتے تھے جس کے ذریعے ہو سکے [illegible] زندگی کے [illegible] نقاط [illegible] تعلقات استوار کر سکیں۔

وہ نہایت اور خوبصورت [illegible] سے محبت کرتے تھے [illegible] وہ ہر لمحہ اور ہر حال میں جدید گوئی کا قائل رہتے تھے [illegible] بخاری [illegible] خوش بیانیوں میں سے ایک تھے جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسی سحر آفرینی کے باعث ان کا حلقہ احباب وسیع ہوتا گیا اور سب ہی مداحین [illegible] بڑھتا گیا۔ جو ان کے نزدیک تاہم قیمت پر چند لمحے ان کے ساتھ گزارنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا۔ وہ ایک ایسے دانشور تھے جن کی طنز و ظرافت [illegible] ان کے اتفاقی [illegible] علمی [illegible] اور فہم و فراست کے مطابق حظ و فرحت حاصل کرتے تھے کند ذہن آدمی ہنسی کی بات سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ان کا مزاج ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ ہنستے تھے ان پر نہیں ہنستے تھے۔ ان کا مذاق نہیں اڑاتے تھے۔ بلکہ ان کی کلفت و پریشانی ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ ان کی طنز ان کی ادراکی قوت کی پیداوار ہوتی تھی۔ وہ اونچے سے اونچے آدمی کی کمزوری بھی اسی طرح بے نقاب کرتے تھے۔ جس طرح بڑے سے بڑے اکڑ باز اور طرح دار کی۔ زندگی کا سارا تانا بانا ان کے لئے میدان کارزار تھا اور ان کی دیانت ان کی شمشیر، وہ کسی کو نہ بخشتے تھے اور کسی سے یہ توقع نہ رکھتے تھے کہ انھیں معاف کرے۔

پروفیسر بخاری نے جتنے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں طلبہ اور طالبات کو پڑھانے میں صرف کئے ان کا جائزہ لینے کے بعد آدمی کہہ سکتا ہے کہ اپنی قابلیتوں کو بروئے کار لانے اور شاگردوں میں ذہنی اوصاف اور رجحانات پیدا کرنے کے لئے کالج اور کلاس روم بے پناہ امکانات رکھنے کے باوجود ان کے لئے محدود جولاں گاہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے اردگرد ارباب فضل و ہنر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ انھیں صرف منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ مجلس اردو اسی کی ایک شکل ہے۔

یہ سوسائٹی کالج کے ذہین نوجوانوں اور پروفیسر بخاری کے زیادہ تجربہ کار احباب کے لئے قائم کی گئی تھی۔ ہر وہ شخص جو طبع زاد افسانہ، ڈرامہ، تنقیدی مضمون یا نظم لکھ سکتا تھا، اس مجلس میں بار پا سکتا تھا۔ اسے خوش آمدید کہا جاتا تھا اور اسے اجازت ہوتی تھی کہ وہ اس شام کو پڑھی جانے والی ہر ادبی کاوش پر تنقید کرے خواہ وہ کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو۔ تنقید کا معیار اتنا بلند رکھا جاتا تھا کہ اس میں اردو، فارسی اور عربی کے قدیم اصول تنقید کے علاوہ مغرب کا جدید انداز تبصرہ بھی شامل ہوتا تھا۔

پروفیسر بخاری نے مجلس اردو کو بہت جلد ایک ایسی پرکشش جماعت بنا دیا کہ ہر ہونہار نوجوان جو لاہور کی ادبی مجالس کی روح رواں تھا۔ یہ محسوس کرنے لگا کہ اسے مجلس اردو یا اس کی حریف بزم فروغ اردو میں سے کسی ایک میں شامل ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ بزم فروغ اردو ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر جیسے مشہور شاعر اور فاضل کی نگرانی میں اپنی سرگرمیاں اسلامیہ کالج لاہور میں جاری کئے ہوئے تھی بالکل اسی طرح جس طرح پروفیسر بخاری گورنمنٹ کالج لاہور میں مجلس اردو چلا رہے تھے۔

جن اصحاب کو معلوم ہے کہ بخاری اور تاثیر نے اپنے نوجوان ادیب دوستوں کے لئے ان مجالس کے ذریعے کیا کچھ کیا وہ یہ کہنے میں کبھی دریغ نہ کریں گے کہ ان جماعتوں نے اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور کیا کہ ہمارے علاقہ خطے کی ادبی تربیت کی تاریخ میں ان دونوں عظیم استادوں کا نام محفوظ

دنیا جس پر ہم ہمیشہ فخر کریں گے۔

ہم میں سے تو [illegible] بہت سے [illegible] کر [illegible] سے محروم کر دیا۔ اگر آپ ان کی بات [illegible] پوچھیں تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ [illegible] اس دنیا میں لوٹ آئیں اتنا ہی بہتر ہے۔

وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ [illegible] جیسے مدنی صدر [illegible] ستائش مذمت کرنے کے باوجود [illegible] کی ضرورت [illegible]

ختم کرنے سے پہلے مجھے ایک ذاتی لیکن بہرحال [illegible] بات کا ذکر کرنے کی اجازت دیجئے۔ [illegible] انگریزی [illegible] کی حیثیت سے پروفیسر بخاری کا کارنامہ صرف انگریزی تک محدود نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے [illegible] پڑھا ہو تھا جتنا انگریزی ادب کے لئے۔

اگر کسی صاحب کو نقوش نمبر [illegible] پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ [illegible] جلدوں کو وہی شرف حاصل تھا جو میکالے کی ہسٹری آف انگلش کی پانچ جلدوں کو [illegible] شیکسپیئر کی تصانیف۔ وہ پشتو، پنجابی اور اردو میں بھی اتنے ہی خوش گفتار تھے جتنے انگریزی میں۔ ان تمام زبانوں پر ان کا علم یکساں وسیع تھا۔

(ترجمہ)

اقوامِ متحدہ میں پروفیسر بخاری سے ملاقات

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

مغربی اور مشرقی فن میں اصولی فرق میرے نزدیک ایک یہ بھی ہے کہ مغربی فن کی تصویر کو دور سے دیکھنے سے جو اس کی خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ نزدیک سے دیکھتے دکھائی دیتے ہیں یعنی اس کی صحیح نمائش دور سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مشرقی فن کی تصویر کے صحیح خط و خال اور خوبیاں اس کو جس قدر بھی قریب سے دیکھا جائے گا زیادہ نظر آئیں گی ورنہ دور سے ایک مدہم اور یکساں رنگ کی دھندلی سی سطح معلوم ہوگی۔ چنانچہ ہم مرحوم احمد شاہ بخاری کو جب بھی دور سے دیکھتے تو صحیح معنوں میں کسی یورپی یونیورسٹی کے ایک سجے سجائے مکمل پروفیسر نظر آتے۔ مگر جب بھی ان کے پاس بیٹھ کر گفتگو سننے کا موقع ملتا تو ان کے برجستہ مسکراہٹ لئے ہوئے مادری زبان میں بے ساختہ جملے ظاہر کرتے کہ ان کا نہایت مکمل ظاہری مغربی لباس ان کی مشرقیت پر ایک ملمع ہے۔ اور ان کی مشرقیت کے جوہر آہستہ آہستہ گفتگو کے مدارج طے کرتے کرتے واضح ہوتے چلے جاتے بلکہ ان کی تمام انگریزی اور انگریزیت ان کی مشرقیت کے تابع نظر آنے لگتی۔

میں مرحوم کو ایک طرح دور سے اسی زمانے سے جانتا تھا جب کہ وہ ہنوز طالب علمی کے ابتدائی مدارج لاہور میں طے کر رہے تھے کیونکہ وہ ہمارے محلے کے قریب ہی تکیہ سادھواں میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم کے بڑے بھائی محمد امین مرحوم کے ہم زلف تھے جن کے ہاں وہ اکثر رہائش رکھتے۔ اور محمد امین کے بھائی ڈاکٹر محمد سعید سعدی سے بخاری کی خاصی بے تکلفی تھی۔ ان کی اور مولوی بشیر الدین مرحوم (بن مولوی احمد دین وکیل مرحوم) کی وجہ سے کبھی کبھی ان کی گفتگو میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملتا جس کے بعد وہ ایم اے کا امتحان انگریزی ادب کا پاس کر کے اپنی خاص طبع روشن اور بعض اچھوتی تحریروں کی وجہ سے لاہور کی زندگی میں نمایاں طور پر رچ بس گئے۔ یوں کہئے کہ علمی محفل میں وہ جزو لاینفک تصور ہونے لگے۔

میں نے ان کو اس وقت سے زیادہ دیکھا ہے جب وہ لاہور میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں مسٹر واتھن پرنسپل کے ماتحت ایک معلم، پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے معتمد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت استاد زبان انگریزی متعین تھے مگر ان کی شہرت آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے زیادہ وسیع ہوئی جہاں وہ کئی سال تک ناظم اعلیٰ رہے۔

ابھی پاکستان بننے کے آثار نمودار ہو رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مدظلہ العالی نے جامعہ ملیہ دہلی کی جوبلی منائی۔ جس میں دور دور سے علمی حضرات نے شرکت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرکز میں ایک عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ راقم کو بھی دکن کالج پونہ سے اسی ضمن میں نمائش کی ترتیب کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت پُر رونق علمی میلہ تھا جس میں ہر طرح کے پڑھے لکھے حضرات نے حصہ لیا۔ جب میں نے بالکل غیر متوقع طور پر یہاں ڈاکٹر تاثیر اور بخاری کو دیکھا اور ان سے قریب دس سال بعد ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے فوراً اپنے الگ کیمپ میں لے گئے جس میں وہ

دوانی فروکش تھے۔ اس وقت وہ دونوں حکومت ہند کے شعبۂ نشر و اشاعت میں تھے۔ دونوں علوم جدیدہ اور قدیمہ سے بہرہ ور نہایت روشن ضمیر اور بڑے پائے کے تنقید نگار تھے۔ مجھے یہاں غیر معمولی بات یہ نظر آئی کہ یہ دونوں یکتا و دوست ہمیشہ ایک ہی بام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کو ایک ہی کیمپ میں بیٹھے محبت و خلوص سے اپنے اپنے فرائض انجام دیتے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ رقابت موہوم کی خاطر مثال یہی ہے خواہ جس قدر بھی منفرد و عظیم ہو ایک جا پر امن وابستہ رہ سکتا ہے۔

مجھے وہ سال ہرگز نہیں بھولتا جب ایک روز بعد دوپہر ایک ہی بیٹھک میں قائد اعظم محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، لیاقت علی خاں، راج گوپال اچاریہ، ولبھ بھائی پٹیل، باچا خان عبدالغفار خاں وغیرہ کو دیکھا تھا۔ اور بخاری اپنے نشر میں مقررین کے بعض جملوں پر خوب داد دیتے رہتے تھے۔ ایک روز یہاں مرحوم سر شیخ عبدالقادر نے کنوکیشن ایڈریس بھی دیا تھا جو پہلے چھپ چکا تھا۔ ان کی ان تھکی ذہنی دوستوں نے نہایت ہوشیاری سے بے ربط تعریف کی اور ڈاکٹر ذاکر صاحب کو داد دی کہ انھوں نے اس طرح پروگرام مرتب کیا۔ غرضیکہ اس ہوٹل کی عملی کارروائی جس قدر بھی بہتر میں اور ریڈیو پر نشر کیا گیا وہ تاثر اور بخاری کا حصہ تھا جس کا لوگوں کو کم علم ہے۔

جب پاکستان قائم ہوا تو بخاری لاہور تشریف لائے اس کے بعد ان دنوں میں جتنی گھڑی ہوئی لائبریریوں کو یکجا کیا۔ کچھ پریشان کن چشم دید حالات جو مہاجرین کے ساتھ پیش آئے ہوں تو ان کے لئے مگر عوام کو زیادہ تر یہ علم ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے ضمن میں لندن گئے جس کے بعد ۱۹۵۰ء میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ بن گئے جہاں اپنی ذاتی قابلیت سے انھوں نے دنیا کے قابل ترین حضرات کو اس قدر مرعوب اور مطمئن کیا کہ ان کو آخر میں ۱۹۵۱ء سے شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا اس جگہ مرتے دم تک (۵ دسمبر ۱۹۵۸ء) نہایت معزز طریق پر فائز رہے اور اسی ادارہ اقوام متحدہ میں راقم نے ۲۴ اپریل ۱۹۵۷ء کو ان سے آخری ملاقات کی تھی۔ جس کی مختصر سی کیفیت جو مجھے یاد ہے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

اقوام متحدہ کا ادارہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے عظیم ترین شہر نیویارک کے مشرقی جانب دریائے ایسٹ کے کنارے ۴۲ - ۴۸ سٹریٹ پر اوّل ایونیو میں واقع ہے۔ اس کے شمالی طرف سے داخل ہوتے ہی بہت بڑے ہال میں نمایاں ترین کرایک وجاہت خاتون سے سابقہ پڑتا ہے جس سے باقاعدہ تمام ہدایات حاصل ہو جاتی ہیں اور کوئی دیر نہیں لگتی۔ اسمبلی کے ہال پر گنبد ہے جس میں کل نشستیں ۲۱۵۰ ہیں جو مندوبین، ناظرین، اخباری نمائندوں اور پبلک پر مشتمل ہیں۔ اس کے جنوب کی طرف اصل سیکرٹریٹ ۳۹ منزلہ عمارت تمام آبی رنگ کی اینٹوں کی کھڑی ہے جس میں بخاری صاحب غالباً دسویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۰۲۷ میں بیٹھتے تھے اگر صحیح اندازہ لگایا جائے تو اس عظیم الشان ادارہ کی عمارات کا سلسلہ قریب قریب ۵۰۰ فٹ لمبائی سے کم نہیں ہے۔ زائرین اس پرشکوہ عمارت کے اوّل ہال ملاقات میں ایک بلند نمایاں چبوترے پر یونانی دیوتا غالباً جیوپٹر کا قد آدم مجسمہ سیاہ دھات کا بنا ہوا اور ننگا برہنہ کھڑا ہوا مشاہدہ کرتے ہیں جو بادی النظر میں کافی بے حیائی کا منظر پیش کرتا ہے۔

میں یہاں دو تین بار گیا۔ اسمبلی کی میٹنگ ہال نمبر ۲ میں کچھ وقت بیٹھا اور کارروائی دیکھی۔ رسالے بھی خریدے اور سیکرٹریٹ کے ملاقات کے ہال میں آکر بخاری صاحب سے ملاقات کی کوشش کی مگر انھوں نے فون پر کارکن خاتون کے ذریعے ۲۴ اپریل کی تاریخ ایک بجے کا وقت طے کیا۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں صبح صبح گھر سے نکلا اور گھومتے گھومتے ادارہ اقوام متحدہ پہنچا۔ بخاری صاحب سے ملنے کی خواہش کی تو خاتون نے ان سے فون پر اجازت حاصل کر کے مجھے ایک مطبوعہ چٹ پر وہاں کے دستور کے مطابق تاریخ، میرا نام، جس سے ملنا ہے اس کا نام (پروفیسر بخاری) اور کمرہ نمبر وغیرہ لکھ کر میرے حوالے کی اور اشارہ کیا کہ وہاں لفٹ کے آگے کھڑے ہو جائیے ابھی کمرہ کھلے گا اور آپ اوپر چلے جانا۔ چنانچہ جب میں اوپر پہنچا تو مجھے فوراً اند

تک ایک اور خاتون جہاں کی مددگار تھی لے گئی۔ بخاری مجھے دیکھ کر کہنے لگے میں گیارہ بجے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں کیونکہ یہی وقت میں نے دیا تھا۔ مجھے غلطاً انتظار کرتا رہا ورنہ چلا گیا ہوتا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے یہی وقت دیا گیا تھا مگر انہوں نے مجھے اپنی میز کی ڈائری دکھائی جس پر گیارہ بجے کا وقت لکھا تھا خیر یہ مغالطہ تھا جو غالباً مجھ سے ہی یا سننے میں ہوا۔ بہرحال میں نے بہت معذرت کے بعد خیریت پوچھی۔

آپ نے اوّل امریکہ میں آنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ میں نے کہا میں لیڈر پروگرام کے تحت یہاں آیا ہوں اور آپ سے ملے بغیر چلے جانا کوئی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا جس پر آپ نے فرمایا کہ میں بھی اسی لئے گیارہ بجے سے اس وقت تک (ایک بجے) بیٹھا رہا کہ ملاقات ضرور کرنی ہے ورنہ مجھے دوسرا اہم کام بھی اس وقت تھا۔ آپ نے لاہور کے احباب مولانا سالک، مسٹر فیض اور بعض دیگر احباب کی خیریت دریافت فرمائی۔ میں نے کہا کہ لاہور سے نیا علمی رسالہ لیل و نہار فیض صاحب نے جاری کیا ہے جو ہفتہ میں ایک بار طبع ہوتا ہے آپ کے پاس ضرور آیا ہوگا۔ فرمانے لگے اگر آیا بھی ہوگا تو کہیں نہر سویز پر اٹکا ہوگا (جو اصل ۱۹۵۶ء کے واقعات سویز کی طرف ایک اشارہ تھا)۔ میں مسکرایا پھر میں نے کہا آپ لوگوں نے ہی تو نہر بند کرائی تھی ورنہ دنیا میں کیا سے کیا ہو جاتا جس پر انہوں نے چند جملوں میں وہ تمام واقعہ سنایا کہ کس طرح مسٹر ڈاگ ہیمرشولڈ نے اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ یہ ہنگامہ بہ عجلت بند ہونا چاہیے اور کس طرح انہوں نے دنیا کے اخبار نویسوں کو نیچے پریس برانچ میں جمع کیا پھر یہاں سے لفٹ میں پہنچ گئے تمام کمرہ بھر چکا تھا اور ابھی تک کسی شخص کو علم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے جب انہوں نے ترک جنگ کا اعلان کیا تو دنیا حیران رہ گئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ آج رات پاکستان ہاؤس میں ایک لیکچر اقبال پر ہے۔ میں نے کہا میں ضرور سننے آؤں گا۔ ویسے لیکچر تو آپ نے خوب عمدگی سے لکھ لیا ہوگا فرمانے لگے کہ کچھ کیا ہی ہے۔ جس پر میں نے کہا کہ حال ہی میں میں نے یونیسکو کے مجلہ کوریر COURIER میں ایک مضمون بعنوان "دنیا کے بہت زیادہ ترجمہ شدہ مصنفین ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء" فروری ۱۹۵۰ء کے شمارے میں دیکھا ہے جس میں اقبال کو بھی شامل ہونا چاہیے تھا کیونکہ اگر آج ہم صحیح جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کا کلام چین و جاپان کے سوا قریب قریب سب ملکوں نے اپنے ہاں ترجمہ کیا ہے۔ میرے خیال میں یہاں بین الاقوامی شہر نیویارک میں سامعین و حاضرین جلسہ کو بتانا چاہیے اگر آپ کے مضمون میں اس امر کی طرف اشارہ نہیں ہے تو ضرور آنا چاہیے چنانچہ انہوں نے اس مشورہ کو مفید خیال کیا اور کچھ نوٹ بھی کیا فرمانے لگے کہ لاہور کے میلے ساجے یعنی لاہور کی زندگی کا کیا حال ہے؟ جس پر میں نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو لاہور کی اس قسم کی گہما گہمی کا بڑا خیال رہتا ہے تو مسکرا کر فرمانے لگے کہ یہی تو ایک شہر ہے جو ہماری تمام جدوجہد کا آئینہ ہے۔ میں نے کہا تو بہ قول آپ کے لاہور سب شہروں سے افضل ہے۔ جس شہر میں علامہ اقبال دنیا کا بہترین شاعر و فلسفی، گاما پہلوان رستم زماں، آغا حشر کاشمیری بہترین اردو ڈرامہ نویس، عبدالرحمٰن چغتائی بہترین مشرقی مصوّر، حاجی دین محمد کاتب، مولانا ظفر علی خاں جیسا اخبار نویس اور پطرس جیسا مزاح نگار ہو اس کی خوش نصیبی کی تو قسم کھانی چاہیے۔ دراصل میں نے ان کے کبھی کے کہے ہوئے ان جملوں کا اعادہ کیا ہے کہ یہ ان کا تصوّر ایمان کی حد تک تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ پنجاب کو زندگی کا آئینہ تصوّر کرتے تھے۔ بات کاٹ کر فرمانے لگے کہ چغتائی کی تصویریں بھی یہاں دیکھی ہیں؟ میں نے کہا ہاں دیکھی ہیں۔

دراصل نچلے ہال میں ایک نمائش کا حصہ ہے جس میں تین تصاویر عبدالرحمٰن چغتائی کی لگی ہوئی ہیں جن کو غالباً اسی سال پاکستان گورنمنٹ نے اقوام متحدہ کو ہدیہ کیا تھا اور اس میں بھی بخاری صاحب کا انتخاب اور جدوجہد شامل ہے ورنہ یہ کام نہ ہوتا واقعی یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ کئی ہزار کی تعداد میں ناظرین روزانہ دیکھتے ہیں۔

میں نے تجویز کیا کہ بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ کسی قدیم مصوّر کی تصاویر ہیں اس کو رفع کرنے کے لئے ان پر مصوّر کے نام کے آگے محض تاریخ پیدائش لکھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔ تاکہ معلوم ہو کہ آرٹسٹ زندہ ہے اور آج کل یہ طرز مصوّری اس ملک کی خصوصیت ہے جسے آپ نے قبول فرمایا۔

یہ علم نہیں کہ اس پر عمل ہوا یا نہیں۔ ابھی تک کسی دوسرے ملک کے آرٹسٹ کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔

پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ بتاؤ اس اقوام متحدہ کو کیا پایا جس پر میں نے سکرٹری جنرل کے جواب میں پنجابی کا محاورہ "گھر سے چک کوٹھے تے" پیش کیا یعنے یہاں جو آدمی اول مرتبہ شمالی دروازے سے ملاقات کے ہال میں داخل ہوتا ہے تو اس کی نظر فوراً مشرقی جانب دروازہ پر نام نہاد یونانی دیوتا جیوپٹر کے قد آدم بلند نشست مجسمہ پر پڑتی ہے تو وہ متحیر ہوتا ہے کہ ایسے شائستہ عالمی ادارہ میں اس طرح کی عریانی اس کے لئے ایک مسئلہ بن جاتی ہے خواہ اس مجسمہ میں بہت وسیع الخیال فلسفہ اور حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ اس تمام ادارے کی سیر کرتا ہے اور پھر ایک بار اس جیوپٹر کے بت پر نظر کرتا ہے تو اس کا ذہن اس طرف مزید منتقل ہوتا ہے کہ یہ مقام بطور تفریح گاہ تمام دنیا کی زندہ اقوام کے نمائندوں کا مختلف رنگوں اور لباسوں میں ایک عجائب گھر یا چڑیا گھر ضرور ہے مگر اس ادارے سے اقوام کی داورسی ہرگز متوقع نہیں کیونکہ یہ شکایت جو یہاں کا علامتی نشان Symbol قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں کچھ نہیں رکھا: جامہ ندارم دامن از کجا آرم۔ بخاری صاحب نے اس مزاح کو سن کر حسب عادت ایک قہقہہ لگایا اور اس کے بعد فرمایا کہ اب رات کو پاکستان ہاؤس میں اقبال کے لیکچر میں ملاقات ہوگی۔

چنانچہ ہم اپنے ہوٹل وڈ شاک نیویارک ٹائمز چوک سے پروفیسر حبیبی، محمد حبیب گرامی ڈھاکہ یونیورسٹی اور ایک اور صاحب جو کراچی سے آئے تھے مل کر نکلے اور قریب نو بجے وہاں پہنچ گئے۔ لیکچر ہمارے جانے کے بعد شروع ہوا تمام پاکستان ہاؤس بھرا ہوا تھا۔ یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر جلال عبدہ ایران کے مستقل نمائندہ اقوام متحدہ نے کی تھی ابتداء میں انہوں نے بخاری مرحوم کی علمی قابلیت کی نہایت تعریف کرتے ہوئے تعارف کرایا اور اعزاز صدارت کا شکریہ ادا کیا۔ بخاری صاحب نے اپنا مقالہ قریب ۴۵ منٹ میں ختم کیا اور لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ موضوع یہ تھا کہ اقبال نے شاعری کو اپنے افکار کے اظہار کے لئے ایک موزوں ذریعہ قرار دے کر کیا کیا علمی خدمات انجام دیں۔ بعد میں اس پر کوئی سوال جواب نہیں ہوئے صدر ڈاکٹر جلال عبدہ نے فارسی شاعری میں اقبال کے مقام پر کچھ مزید روشنی ڈالی۔ جلسہ کے اختتام پر میں نے پروفیسر بخاری کی معرفت ڈاکٹر جلال عبدہ سے تعارف حاصل کیا۔

دو روز بعد میں نے تہران کے دفتر ایمپائر بلڈنگ کی باسٹھویں منزل پر جا کر ان سے ایک تعارف نامہ بنام ڈاکٹر سید مصطفوی ناظم محکمہ آثار قدیمہ ایران حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ تعارف نامہ انہوں نے بطیب خاطر فارسی زبان میں لکھ کر عنایت کیا۔ نیویارک میں ایمپائر بلڈنگ یکصد منزل سے زیادہ کی ہے اور بلند ترین عمارت ہے حسن اتفاق سے جب میں ان کے کمرہ میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا تو ہوائی جہاز گزرا میں نے ظرافتاً کہا کہ دیکھو ہوائی جہاز آپ سے نیچے اڑ رہا ہے یہ محض اس عمارت کی بلندی کی خصوصیت کی طرف ایک اشارہ تھا۔

میں نے امریکہ سے روانہ ہوتے وقت جون کے نصف میں بخاری سے پھر ملنے کا ارادہ کیا مگر وہ ۱۳ تاریخ کو جنیوا جا چکے تھے اس کا علم مجھے ان کے مددگار آغا اشرف سے ہوا۔

میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ پروفیسر بخاری مرحوم کے علمی کارناموں پر کوئی تبصرہ کروں مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان کا ایک خاص انداز تھا یعنے روزانہ کے حالات اور تجربات زندگی ان کو موضوع بخشتے تھے اور وہ اپنی تحریر کو اس قدر نفسیاتی طور پر لئے جاتے تھے کہ ہر مطالعہ کرنے والا اس پر خود گھومتا نظر آتا تھا اور اس سے اس قدر لطف اندوز ہوتا تھا کہ ختم کرنے کے بعد محسوس کرتا تھا کہ وہ واقعی اسی ماحول میں چلا گیا ہے چنانچہ ۱۹۵۷ء میں جب میں طہران پہنچا اور ایک شب مسٹر رحمان پاکستان کے ادارہ سفارت کے ہاں دعوت پر ایک اور سیکرٹری مسٹر صدیقی سے مذاکرہ ہوا تو بخاری کا ذکر آگیا پھر کیا تھا ان کے بعض خاص خاص موضوعات پر بھی گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ان کو بخاری کا مضمون "مبائیکل" ایک طرح زبانی یاد ہے انہوں نے اس مضمون کے بعض حصے اس طرح سنائے کہ تمام محفل پرلطف ہو گئی جو آج تک نہیں بھولتی۔

جنابِ پطرس

محمد طفیل

پطرس نے جب بھی لکھا، لفظوں کے تاج محل بنا دیئے۔
پطرس کو جب بھی کسی دوست نے پکارا، لبیک کی آواز آئی۔
پطرس جس بھی راہ سے گذرے۔ اپنے نقش چھوڑ گئے۔ اپنے جھنڈے گاڑ گئے۔

بخاری صاحب سے میری یاد اللہ الفی زیادہ پرانی نہیں۔ نئی بھی نہیں، اس لئے کہ مرحوم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا نہیں، سنا تو ہے۔ اگر ملنے جانے کی حد تک، میں ان کی خدمت میں نووارد ہوں تو سننے سنانے کی حد تک بیگانہ نہیں۔

جب یہ طالب علم تھے تو انہوں نے "پطرس کے مضامین" لکھی۔ (غالباً ۱۹۲۸ء) جب میں طالب علم تھا، تو میں نے یہ کتاب پڑھی۔ بظاہر ان کا لکھنا اور میرا پڑھنا زمانہ طالب علمی کی داستان ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور بھی ہے۔ جب میں بچہ تھا۔ اُس وقت بھی میں نے اسے پڑھا۔ اب جبکہ بچوں کا باپ ہوں تو بھی یہ چھوٹی سی کتاب میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہر وقت اکسائی رہتی ہے۔ مجھے پڑھو، مجھ سے سیکھو، پہلے جو فقرے مجھے ہنسنے ہنسانے پر آمادہ کرتے تھے۔ آج غور و فکر پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بوڑھا ہوں گا تو نہ جانے، یہ کتاب کیا کیا سلوک نہ کرے۔

پطرس کے بارے میں لکھنا، آسان نہیں الداس جیسا ایک فقرہ لکھنا، قیامت ہی قیامت، میرا خیال ہے جس نے پطرس جیسا ایک بھی فقرہ لکھ لیا وہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، وہ کم بخت ادیب ضرور ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی میں، جو کچھ بھی لکھا ہو۔ اُس کے ایک ایک لفظ پر غور کر کے لکھا ہو۔ اب کوئی اس کے بارے میں، بغیر غور کئے لکھ دے تو یہ زیادتی ہے یا نہیں۔ سچ جانیئے غور کرتا ہوں تو میرے بھی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ قلم رک جاتا ہے۔ بات آگے نہیں بڑھتی۔ مجبوراً طے کرنا پڑا۔ لکھوں پہلے، غور بعد میں کروں۔

مرحوم کے جتنے بھی قریبی دوست تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ سب غور ہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ کچھ نہ کچھ تو لکھ ہی لیتے۔ اب جس سے عرض کرتا ہوں ——— بھائی! اپنے یار پطرس پر کچھ لکھئے تو ان میں سے ہر ایک یہی جواب دیتا ہے۔ غور کر رہا ہوں ——— کچھ عرصے کے بعد دوبارہ عرض کیا غور کر لیا ہو تو کچھ لکھ ڈالیے، پھر جواب ملا۔ جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

یہ جواب مرحوم کے ایک دوست کا نہیں۔ تقریباً سبھی کا ہے۔ نہ جانے یہ قصور پطرس کے قابو میں نہ آنے والی شخصیت کا ہے یا مرحوم کے دوستوں کا، اس کا فیصلہ مجھ سے نہ کرائیے۔ اس لئے کہ مجھے آئندہ بھی پرچہ چھاپنا ہے۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً مجھی کو مرحوم کا قریبی دوست بننا پڑا ہے۔ حالانکہ اس بندۂ پُر تقصیر نے مرحوم کو صرف ایک بار دیکھا

تھا۔ ان سے خط و کتابت ضرور تھی۔ وہ بھی مختصر۔ دو تین خط میرے نام آئے تھے اور بس۔

میں نے پچھلے دنوں رشید احمد صدیقی کا مضمون "مولانا ابوالکلام" پڑھا۔ اس میں ایک جگہ مولانا آزاد سے میری صرف چند منٹ کی ایک ملاقات ہے۔ اور دو خط مولانا کے میرے نام آئے تھے۔ یہ پطرس بخاری کا فقرہ ہے۔ سوچا پطرس سے میرا رشتہ اس سے زیادہ کا ہے اس لئے میں کیوں چپ رہوں۔ رشید صاحب کی سی لائن چاہیئے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرحوم ایک ایک لفظ کو کئی طرح سے سوچتے، سمجھتے تھے۔ تب کہیں جا کر کوئی حرفی سمت لفظ ان کے قلم سے لکھا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا۔ امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، مولانا مہر کی محفل جمی ہے۔ گپ شپ ہو رہی ہے۔ لطیفے تصنیف کئے جا رہے ہیں۔ مگر ان کے دماغ میں وہی لفظ گھوم رہا ہے۔ سب کے لئے یہ آن پریشان ہے۔ رہا نہ گیا، سوال کر دیا۔ چند الفاظ جوڑ کر کہا یہ پورا فقرہ یوں ہے اور حوالہ یہ۔ لہٰذا اس جگہ اس مفہوم میں کون سا لفظ سجے گا۔

کسی نے کہا یہ، کسی نے کہا وہ۔ انہوں نے کہا۔ سب غلط۔ ابھی پورے فقرے کی ساخت پر غور کرو۔ مضمون کے پس منظر پر نظر رکھو۔ یہ دیکھو کہ مزاج کو جانچو، پھر بتاؤ، میرے لفظ سے زیادہ موزوں کوئی لفظ اور ہے؟

مرحوم انگریزی اتنی جانتے تھے، جتنی اہلِ زبان جانتے ہیں، اور جتنی جانتے تھے۔ اتنی اردو کے سارے پروفیسر ملکر بھی نہیں جانتے۔ اگر کسی پروفیسر کو میرا یہ تبصرہ برا لگے تو وہ مرحوم جیسا ایک جملہ لکھ کے دکھائے۔

۱۹۲۸ء کے آس پاس اہل پنجاب اور یو۔ پی والوں کے درمیان چلی اور خوب چلی۔ اُدھر سے بھی بڑے بڑے بقراط سامنے آئے۔ اِدھر سے بھی۔ اُدھر والوں کو میں نہیں چھیڑتا۔ اِدھر والوں کی بات کرتا ہوں۔

اُس وقت یو۔ پی کے کئی رسائل نے پنجابی اہلِ قلم کو مطعون گردانا۔ مگر ان میں تدبر ذرا کم تھا۔ گرم ہی گرم پیشترین اور جو حملے تھے۔ اُدھر والوں کا سارا زور زبان کی اغلاط پر تھا۔ اِدھر والوں میں علامہ مشورے کی حد تک، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر تاثیر، امتیاز علی تاج تھے۔ گر جواباً جو کچھ لکھا جاتا تھا۔ سے لکھتے پطرس ہی تھے[1]۔ بڑے بڑے تیز فقرے اُدھر سے بھی کسے، اِدھر سے بھی اٹھائے گئے۔ نیاز مندانِ لاہور کے قلمی نام سے پطرس نے لکھا —

> "اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو۔ پی۔ حیدر آباد دکن اور لاہور۔ لیکن اہلِ بینش بھی یہ بات کبھی کبھی بھول جاتے ہیں کہ یو۔ پی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدر آباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشو و نما محض خونِ عشاق کی رہینِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خودرو ہے۔ وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نشو و نما کو ہو سکتا ہے:

[1] ایک دو مضمون تاثیر نے بھی لکھے تھے۔ جو کہ از نیاز مندانِ لاہور یا ادب آموز کے نام سے چھپے تھے۔

" بلکہ اس سے بھی تیز فقرے :—

"یو۔ پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوتِ نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یو۔ پی میں اردو ادب ایک سسکتا ہوا سانپ ہے۔ جو کبھی کبھی ایک خفیف سی پھنکار مارتا ہے اور بس، اب یو۔ پی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑا پن اس کا مربیانہ انداز، اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔"

پطرس کے یہ فقرے تیکھے ضرور ہیں۔ گر دل آزاری کا سلسلہ دونوں طرف تھا۔ بُری بات تھی تو دونوں طرف، اچھی تھی تو دونوں طرف، گر میں جو بات یہاں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مرحوم کو زندگی کے ہر مرحلہ پر سرداری کا چسکا رہا۔ جب اہلِ پنجاب ان کے سننے بیٹھ جاتے تھے تو یہ کیسے چپ بیٹھے رہتے جس بزم میں بیٹھتے تھے۔ چاہتے تھے۔ میری باتیں، میرے جملے، حاصلِ بزم رہیں۔ بزمِ ادب میں بھی انہوں نے اونچی ہی کرسی پر بیٹھنا چاہا۔ بزمِ سیاست میں بھی آئے تو ساری دنیا نے ان کی طرف مڑ مڑ کے دیکھا۔ میرا ایمان ہے اگر وہ یوں سرفراز نہ رہتے تو یقیناً خودکشی کر لیتے۔ ان کے مذہب میں، کسی بھی مرحلہ پر شکست، موت کے مترادف تھی۔

مرحوم پر فقرے وار بھی ہوتے تھے۔ خود بھی ہنستے تھے۔ مطالعہ بھی ان کا خوب تھا۔ حافظہ بھی خوب، جہاں کے مطالعہ کی زد پر آگیا وہ چت، جو ان کی ذہنی پیچ کی زد پر آگیا وہ چت، غالباً قدرت نے انہیں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی فتح کریں، دماغوں کو بھی۔

حصولِ تعلیم کے لئے جب یہ لندن گئے تو انہوں نے تاج صاحب کو کیا عمدہ لکھا تھا:—

"حضرت یہ کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر فرسودہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل ہے۔ یہ وہ دارالعلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ (جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیور کرامویل (CROM WELL) سٹرن (STERENE) کولرج سیموئیل بٹلر، بیکن، ٹینی سن، تھیکرے، میکالے، نیوٹن، بل ورلٹن، پیپے، لارڈ چسٹرفیلڈ مارلو، ولیم پٹ، گرے، اور ملٹن کسبِ فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں اس وقت انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ و بو پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا، ایک غلام قوم کا فرد، نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا، فسانۂ آزاد کا دلدادہ، طبلے اور سارنگی کا شوقین، زمینا اور گردگشتاں کا خریدار، ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا، مغلیہ عیش و عشرت کا خواہش مند اتحادِ اسلامی کے خواب دیکھنے والا، میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔"

بخاری صاحب جب کیمبرج پہنچے تو ان کے سامنے یونیورسٹی کا سارا ماضی تھا۔ چھوٹی بڑی کئی ادبی چٹانیں، انہیں مرعوب زدہ کرنے کے لئے کیمبرج کے صفحات پر موجود تھیں۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ مگر مرعوب نہ تھے وہ سارے نام گو بلند مرتبہ ضرور ہیں گر اس احساس کے ساتھ کہ کبھی میرا بھی نام ان لوگوں کے ساتھ لیا جائے گا۔ مرعوب ہونا تو یہ شروع ہی سے جانتے نہ تھے۔ بلکہ مرعوب کرنا ان کا فن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ غریب ماں باپ کے بچے تھے

اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں بڑا زور رہا۔ جوابی زور رہا۔ یا مت وہ بھی اس حد تک اس کے بس کی بات ہے ——— آج کل (اور اس وقت بھی) لڑکے لندن اس لئے جاتے ہیں تاکہ ڈگریاں لے آئیں۔ پڑھ کر نہیں جاتے ہیں۔ مگر پطرس نے وہاں جا کر صرف پڑھا بلکہ استادوں کو پڑھایا بھی۔ قسمت اگر پطرس کو کچھ کمانے کا موقع دیتی تو پھر ساری دنیا دیکھ لیتی کہ پطرس کا مقام دنیا کے نثر نگاروں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

بخاری صاحب جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے تھے تو وہ کامل سکون اور سکوت چاہتے تھے۔ بالکل الگ تھلگ وہ تنہا۔ جب کچھ لکھ لیتے تو پھر کچھ نہ پوچھئے۔ فوراً اپنی موٹر نکالتے اور بھاگتے اپنے کسی ذہین دوست کے پاس۔ جا کر اسے جو کچھ لکھا ہوتا سناتے۔ جب تک وہ اپنا لکھا ہوا مضمون اپنے سامنے دوستوں کو سنا نہیں لیتے تھے۔ انہیں چین نہیں آتا تھا۔ بے کل رہتے تھے۔

یہی حال، ان کا دوستوں کی تخلیقات کے بارے میں تھا۔ وہ ہر دوست سے پوچھا کرتے تھے سناؤ بھئی کوئی چیز لکھی؟ کچھ لکھا ہو تو سناؤ۔ جب وہ بے چارہ سناتا تو پھر اس میں عیب ہی عیب نکالتے۔

امتیاز علی تاج نے مجھے بتایا میں نے جب بھی پطرس کو کوئی چیز سنائی۔ اس نے ہر جگہ انگلی رکھ دی۔ چنانچہ میں مرحوم کی اس "حرکت" پر پریشان رہنے لگا اور یہ طے کر لیا کہ اب انہیں کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔ چنانچہ ایک دن، میں اپنے کسی دوست کو اپنا کوئی مضمون سنا رہا تھا تو پطرس آ نکلے۔ میں نے انہیں دیکھ کر مضمون تہ کر کے رکھ دیا۔ پطرس نے تاڑ لیا۔ کہنے لگے۔ "اب مضمون کیوں نہیں سناتے؟"

تاج صاحب نے کہا: "آپ کو کوئی خاک سنائے۔ آپ تو ہر چیز میں سو سو کیڑے ڈالتے ہیں۔ اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ آپ کو کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔"

تاج صاحب کہتے ہیں۔ پطرس میرے اس جواب پر بڑے متاثر ہوئے اور بڑے پیار سے کہا: "تاج تو نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں جب بھی تمہاری کوئی چیز سنتا ہوں تو میرے پیش نظر دنیا کے تمام بڑے بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے معیار پر پرکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہارا نام بھی ان کے ساتھ لیا جائے اور تم ہو کہ مجھ سے ناراض ہو۔"

یہ تھی پطرس کی نقادانہ شان اور دوستوں کے فن کے بارے میں خلوص، اب کوئی مانے یا نہ مانے۔ آج پنجاب کے جتنے بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔ تقریباً ان سب کے فن کے نکھار میں پطرس کا بڑا ہاتھ ہے۔ یقین نہ ہو تو میری بات کی تصدیق سالک، تاج، عابد، صوفی، راشد اور فیض سے کر لیجئے۔

ارے بھئی پطرس تو وہ تھا جو علامہ اقبال تک سے بھڑ جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اقبال اور پطرس کی برگساں کے فلسفے پر بات چیت چلی۔ باتیں ہوئیں۔ دلیلیں دیں اور لیں۔ کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ بالآخر اقبال چپ ہو گئے۔ جب پطرس چلے گئے تو اقبال نے ایک نظم پطرس کے بارے میں کہی جس کا عنوان "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" تھا۔ نظم یہ ہے:—

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا ——— زناریِ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی ——— ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی؟ ——— کس طرح خودی ہو لازمانی؟
آدم کو ثبات کی طلب ہے ——— دستورِ حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق ——— مومن کی اذاں ندائے آفاق
میں اصل کا خاص سومناتی ——— آبا مرے لاتی و مناتی

تو سیدِ ہاشمی کی اولاد — مری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سرِّ محمدؐ و براہیمؑ
• دل در سخنِ محمدی بند — اے پورِ علیؓ ز بوعلیؔ چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری — قائدِ قرشی از بہ بخاری •

غور کیجئے اقبال پطرس کے بارے میں نظم کہتے ہیں۔ اقبال اُس وقت اپنے عروج کی آخری بلندیوں پر تھے اور پطرس بلندیوں کی طرف تک رہے تھے مگر حوصلہ دیکھئے۔ پہاڑ سے ٹکر لے لی۔

اب ذرا مضمون میں توازن پیدا کروں۔ ورنہ آپ کہیں گے کہ میں بار بار نیازمندی برتتا چلا جا رہا ہوں۔ مرحوم تو واقعی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی تعریف و توصیف نہ بھی کروں تو بھی ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میرا "بڑا" ہو جائے گا۔ اسی الزام سے بچنے کے لئے مرحوم کے چٹکی لے رہا ہوں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو پطرس بے چارے اوتاروں کے زمرے سے نکل جائیں گے۔ دوسرے پطرس کے بدخواہوں میں سے کوئی مجھے جان سے نہیں مارے گا — وہ تو مرحوم ہیں۔ میں مرحوم بننا نہیں چاہتا۔ موت برحق ہے مگر وہ پطرس کی وجہ سے کیوں آئے۔

پطرس کے ہاں فقروں، ترکیبوں اور خیالات کی تکرار بہت ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو جن خوب صورت الفاظ سے یاد کریں گے، انہی الفاظ اور انہی طرحدار ترکیبوں سے اپنے دوسرے دوست کو زیر کریں گے۔ مرحوم کو کیا پتہ تھا کہ میرے بعد یہ کم بخت میری اس کمزوری کو اچھالے گا۔ یہ نقص مرحوم کے خطوط میں زیادہ نمایاں ہے۔ اُن میں ایک ہی طرح کے الفاظ ملتے ہیں۔ ترکیبیں ملتی ہیں مگر بعض جگہ تو پیرے کے پیرے لڑ گئے ہیں۔ مثالیں کیا دوں۔ خود پڑھ لیجئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

اسی ضمن میں، میں نے ایک لطیفہ سنا ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ راوی اس کا معتبر ضرور ہے۔

دلی میں جب عصمت چغتائی پطرس سے ملیں۔ تو یہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ عہدے کا بھی رعب تھا اور پھر علمیت بھی پطرس کے مقابل میں بھی عصمت تھیں۔ ایک ادیبوں کا امام، ایک ادیبنوں[1] کی امام۔

مرحوم نے تابڑ توڑ کئی خوب صورت فقرے کہہ ڈالے۔ عصمت چپ، خاموشی سے سنتی رہیں۔ جب پطرس ذرا رکے تو عصمت نے کہا: "آپ کے یہ سارے فقرے میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ کوئی نیا فقرہ کہئے۔"

معلوم نہیں یہ دو بڑے ذہنوں کی زور آزمائی تھی، چھیڑ چھاڑ تھی یا افسانہ، عصمت بفضلِ تعالےٰ زندہ ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے اس واقعہ کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں لکھ دیا تو میں وہ آپ کو بھی بتا دوں گا ویسے آپ اسی شمارے میں عصمت کا بھی مضمون پڑھ لیں یہ واقعہ ممکن تو ہے پطرس بھی بلا عصمت بھی بلا ہے۔

---

[1] عصمت کی پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ ملنے میں پہل پطرس کی طرف سے ہوئی۔ مگر یہ واقعہ دلی کا ہے۔

ویسے یہ واقعہ ہے کہ پطرس صحت سے بہت تنگ تھے۔ انہوں نے صحت پر ایک بڑا مضمون لکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ انگریزی میں صحت کے مضمون "ہیروئن" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لوگوں نے بیجا صحت کے فن کی حمایت کی۔

پطرس کے مزاج میں اپج اور لچک تھی۔ زندگی کے عام چلن میں بھی وہ بہت ہی کیا ہے سے اکثر بھی باز رہا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار جب زمانہ میں انہوں نے دیاسلائی کی ڈبیاں چرانے کی ایک سوسائٹی بنائی۔ دوستوں سے سگریٹ سلگانے کے لئے مانگتے۔ نتیجہ سگریٹ سلگاتے، ماچس جیب میں ڈال لیتے۔ شام کو باقاعدہ حساب ہوتا۔ بخاری کی جیب میں باقی ممبروں سے زیادہ ماچسیں برآمد ہوتیں۔ جتنی ڈبیاں برآمد ہوتیں پروفیسر تک ڈبیاں معاف کر دیا کرتے تھے۔ سالک صاحب راوی ہیں کہ ایک بار انہوں نے اپنے ایک پروفیسر سے ماچس مانگی۔ سگریٹ سلگانے کے بعد انہوں نے ڈبیہ جیب میں ڈالی۔ پروفیسر نے چلا کر کہا "بخاری، خدا کے لئے میری ماچس تو چھوڑو"۔ بخاری نے ماچس واپس کر دی۔ اس دن سے یہ سوسائٹی بھی توڑ دی گئی۔ ہوا کیا تھا ۔۔۔ پتہ چل گئی تھی۔

لڑکپن کے زمانے کی بعض شرارتوں کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون "ہوسٹل میں پڑھنا" میں کیا ہے۔ یہاں ان کا اعادہ ان حقیقتوں پر بار ہوگا جن مظلوموں نے وہ کتاب پڑھی ہے اور بار بار پڑھی ہے۔

عابد صاحب نے بتایا۔ ایک رات میں، حسرت، تاثیر، صوفی، اور پطرس موٹر پر گھوم رہے تھے۔ راستے میں شاہ پر گاڑی ٹھہری تو کسی نے کہا، پیاس لگی ہے۔ لیمونیڈ پیا جائے۔ کچھ دکانیں کھلی تھیں۔ جن میں ایک سگریٹ والا بھی تھا۔ اس کے پاس لیمونیڈ تھی۔ بخاری صاحب نے ان سے پیسے واپس سے پوچھا۔ "پیسے ہیں آپ حضرات کے پاس؟" جیبیں ٹٹولی گئیں تو سب کی کل پونجی ساڑھے آنے نکلی۔

سب موٹر ہی میں بیٹھے رہے۔ پانچ لیمونیڈ کا آرڈر دیا گیا۔ جب سب پی کر ڈکار لے چکے تو بخاری صاحب دکاندار سے کہنے لگے۔ "بڑے میاں! یہ لوگ شریفانہ لباس میں ضرور ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب آوارہ اور لفنگے۔ ان کی جیبوں میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ ان لفنگوں کی دوستی میں مجھ جیسے شریف آدمی کا بھی حال پتلا ہو گیا ہے۔ بہرحال ہم اس وقت آپ کے چار روپے کے مقروض ہیں۔ اعتبار کریں تو یہ رقم کل تک بھجوا دوں گا۔ اگر آپ کو میری بات پر اعتبار نہ ہو تو یہ میری ۲۵ ہزار کی گاڑی کل تک کے لئے گروی رکھ لیں۔ ہم آپ کا سارا روپیہ دے جائیں گے تو یہ اپنی موٹر لے جائیں گے"

ابھی دکاندار فیصلہ ہی نہ کر پایا تھا کہ موٹر گروی رکھ لوں یا اعتبار کر لوں۔ بخاری صاحب نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ دکاندار ہکا بکا رہ گیا۔ ضرور سوچتا ہوگا، پانچوں ہی اچکے ہی نکلے[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب یہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ انہوں نے ایک گٹار خریدا اور اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر دلی کی نواحی بستیوں میں گھر گھر جا کر یہ صدا دی۔

"بابا اللہ کے نام پر کچھ دے جا"
"ہم دونوں بھائی کل رات سے بھوکے ہیں۔"
"بھلا کر بھلا ہوگا"
"اپنے بچوں کے صدقے میں ہمیں کھانا کھلا دو۔"

---

[1] ویسے دوسرے دن یہ رقم مع سود کے ادا کر دی گئی تھی۔

معلوم ہے ان کا ساتھی کون تھا؟ سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد!

پطرس کے یہ مشغلے عجیب مزہ کے تھے۔ مگر ان میں زندگی سے پیار اور اس سے لطف اندوز ہونے ہی کے تو سارے رنگ روپ ہیں۔ مرحوم کو معلوم تھا، زندگی بڑی نعمت ہے۔ اسے ہر رنگ میں بسر کر دیکھو۔ میرا خیال ہے وہ دنیا سے اپنی کوئی حسرت ساتھ لے کر نہیں گئے۔ کوئی بھی حسرت، سوائے مجھے کھلنے کے۔

تاج صاحب نے مجھے بتایا، ایک بار حفیظ جالندھری، پطرس سے ناراض ہو گئے۔ دوستوں کی ناراضی پطرس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بے چین اور بے کل رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن کہنے لگے۔ حفیظ مجھ سے ناراض ہے۔ چلو اسے چل کر منائیں۔ چنانچہ میں اور پطرس، حفیظ صاحب کے ہاں پہنچے۔

پطرس نے جاتے ہی کہا۔ حفیظ میری خطائیں معاف کر دو میں آج معافی ہی مانگنے آیا ہوں۔ پطرس نے ہر ہر انداز سے چاہا، حفیظ کی ناراضی ختم ہو مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرحوم آزردہ ہو کر لوٹے۔

کوئی آٹھ دس دن ہوئے حفیظ صاحب میرے دفتر آ نکلے۔ میں نے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ فرمانے لگے۔ "تم نے جو کچھ سنا ہے۔ ٹھیک سنا ہے۔"

"آخر بات کیا تھی؟"

"تمہیں کیا بتاؤں طفیل، بخاری میرا دوست تھا۔ جگری دوست، اس جیسا آدمی پاکستان نے پیدا ہی نہیں کیا۔ ذہانت اس پر ختم تھی۔ دوستانہ حقوق کی بجا آوری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔ مگر ——"

"مگر کیا؟"

"وہ کم بخت پاکستان کی بعض ایسی شخصیتوں کی صلاحیتوں کا منکر تھا۔ جو میرے نزدیک واجب الاحترام تھیں۔"

حفیظ صاحب کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ گئے۔ میں نے بھی سن لیا۔ مگر میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ کوئی بڑا آدمی، اگر دوسرے کی بھی بڑائی کا اقرار کرے تو اس کی اپنی بڑائی پر حرف آ جاتا ہے یا وہ سمجھ لیتا ہے کہ حرف آ گیا —— یہ بھی امکان ہے کہ اس معاملے میں، پطرس کی نظر ہی چوک گئی ہو اور انہوں نے ان بزرگوں کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہو۔ مگر ان کی تحریریں، تقریریں، اور خطوں سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے پاکستان کی بقا کے لئے مرحوم کے کارنامے انمٹ ہیں۔ دنیا میں ان کی حب الوطنی کا شہرہ رہا۔ یو۔ این۔ او کی در و دیوار مرحوم کی پاکستان دوستی کی قسمیں کھانے کو تیار ہیں۔ میرے دعوے کی تصدیق میں، اس ناچیز کی پیش کش میں بھی بہت کچھ ملے گا۔ ایک جگہ نہیں۔ کئی جگہ۔

بخاری صاحب کو کوئی باتوں سے جیت لے۔ یہ ناممکن تھا۔ آغا اشرف بتاتے ہیں کہ لیک سکسس میں بخاری صاحب کا جب پہلی پریس کانفرنس سے واسطہ پڑا تو چہرے سے نڈھال نظر آئے۔ بخاری صاحب کو بھی معلوم تھا۔ میری زندگی اور موت کا فیصلہ آج ہی ہونے والا ہے۔ چنانچہ یہ اپنی جگہ پورے چوکس تھے۔

ہندوستانی اخبار نویسوں کو سوجھی۔ بخاری کا جلوس آج ہی نکال دیا جائے۔ چنانچہ وہ سب بڑھ بڑھ کے سوال کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ مگر ادھر قدرت نے بخاری کو قوت گویائی کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اکھڑتے تو کیسے اکھڑتے۔ یہ پے بہ پے اپنی لسانی اور مزاحی حربوں سے ہندوستانی اخبار نویسوں کو چت کرتے رہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا —— پاکستان تو ہندوستان سے تعاون کرنا ہی چاہتا ہے۔ مگر ہندوستان ہی ماؤ واسٹ پر نہیں منتا۔ قیام پاکستان کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ پاکستانی فوج کو مشترکہ ذخیروں میں سے کئی ہزار جوتے دے جائیں۔ جوتے دینے تو رہ گئے ،

لیکن جب صندوق کھولے گئے تو سارے جوتے بائیں پاؤں کے نکلے۔ دایاں پاؤں ایک بھی نہ تھا۔

یہ اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں۔ جو بخاری صاحب کی غیر معمولی ذہانت و ظرافت کے مظہر ہیں۔ کوئی ان کا کہاں تک ذکر کرے۔ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم راوی ہیں کہ فسادات کے دنوں میں امتیاز علی تاج بڑے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ ایک شام سالک، بخاری اور میں اس طرف گئے تو تاج کو بے حد خوفزدہ پایا۔ وہ بخاری سے کہنے لگے۔ اب کیا ہوگا۔ بخاری صاحب نے کہا۔ کچھ بھی نہیں مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ یا تو پینک میں رہتے ہیں یا (PANIC) پینک میں۔ سب ہنس پڑے۔ تاج صاحب میں بھی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

بخاری صاحب غالب کے بڑے مداح تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ غالب کا خیال ہے کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ لیکن غالب خود حیوان ظریف تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بخاری غالب کے ہم پلہ تھے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ ان کے سبھی دوستوں کو ان کے متعدد لطیفے اور قصے یاد ہیں۔ مجید ملک نے ایک دفعہ بخاری سے کہا کہ آپ اپنے مضامین کا ایک مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام صحیح بخاری رکھیں۔ بخاری نے بے ساختہ جواب دیا۔ عزیز من! آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام "کلام مجید" رکھیں۔

ایک بار ایک صاحب نے بخاری صاحب سے پوچھا "بخاری صاحب آج کل آپ کچھ لکھ رہے ہیں؟"
بخاری صاحب نے جواب دیا: "یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی عورت سے پوچھا جائے۔ تو حاملہ ہے؟"

اگر کوئی بخاری صاحب کے لطیفے، چٹکلے سننے ہی پہ آجائے تو پھر وہ سنتا ہی چلا جائے گا۔ ایک دو نہیں، سینکڑوں لطیفے (واقعی نہ اڑتی لطیفے) اگر میں نے اس سلسلے کو یہیں ختم نہ کیا تو بہت ممکن ہے یہ حصہ بخاری صاحب کی شخصیت پر چھا جائے اور خود بخاری صاحب چھپ جائیں اس لئے یہیں چپ ہوتا ہوں۔

بخاری صاحب کو ڈرامے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے فن سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ جس کا ذکر اور کئی جگہوں پہ آئے گا۔ جب تک وہ گورنمنٹ کالج میں رہے۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب زوروں پر رہی۔ خوب خوب داد حاصل کی۔ ضرورت پڑتی تو خود بھی ڈرامے کا کردار بن جاتے اور لوگ بخاری کی ایکٹنگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ ان کا ارادہ تھا۔ پختہ ارادہ کہ ڈرامے کے فن پر ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ یہ اس ضمن میں اپنے دوستوں کو پکارتے رہے کہ میرا ساتھ دو تاکہ ایک کام ہو جائے۔ مگر یہ خواہش ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئی کہ ان کا کوئی دوست آگے نہیں بڑھا تھا۔

اور بھی کئی تخلیقی کام کرنا چاہتے تھے۔ جن میں ایک بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھنے کا پروگرام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچوں کے لئے ایسی درسی کتابیں لکھ جائیں کہ پھر مدتوں ان کی یاد بھلائی نہ جا سکے۔ اسی ارادے سے انہوں نے ایک اسکیم بنائی۔ جو کسی وجہ سے بار آور نہ ہوئی۔

ایک کتاب ایڈٹ بھی کر رہے تھے۔ نام تھا اس کا A STUDY OF PAKISTAN کئی ابواب میں اسے تقسیم کیا۔ جو بھی جس موضوع پر کام کی چیز لکھ سکتا تھا۔ اسے اس کام کی تکمیل کے لئے پکارا۔ ادبی رجحانات پر خود لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔ غرض بہت کچھ کرنے کے ولولے تھے جو ساتھ لے گئے۔ اگر وہ آخری عمر میں پاکستان سے باہر نہ جاتے تو وہ کچھ نہ کچھ کر گزرتے۔ وہ اسی خوشی میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ کچھ کر کے رہیں گے ـــ اگر انہیں یہ یقین ہو جاتا کہ کچھ نہیں کر پائیں گے اور چل دیں گے۔ تو یقیناً ان کا اجل سے بھی پہلے انتقال ہو جاتا۔

اصل میں بخاری صاحب ادب ہی کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ مگر زندگی کی اڑان میں وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں جتنے بھی صاحب اختیار تھے۔ ان میں بھی کوئی ایسا دیدہ ور نہ ہوا۔ جو بخاری کی شخصیت کو پہچان لیتا اور ان سے ادب کے سنوارنے ہی کا کام لے سکتا۔

بخاری صاحب اپنی آخری عمر میں پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لئے کوشاں رہے۔ مگر انہیں وہ بھی نہ ملی۔ یہ بخاری صاحب کے ساتھ

علم نہیں تھا تو کیا تھا۔ یہ بات ان کے لئے تو باعث فخر تھی کہ وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے۔ بلکہ اس یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی جس کے وائس چانسلر بخاری صاحب ہوتے۔

ایک دو واقعات جناب شورش کاشمیری نے بھی خوب سنائے۔ جیسے شورش صاحب ہیں۔ ویسے ہی یہ واقعات، یعنی ہمت و شجاعت کے قصے۔ مرحوم کی دیانت کے ایسے واقعات پر اور کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

ایک زمانہ میں ایک اخبار نویس کا کام یہ تھا کہ وہ بخاری صاحب کے خلاف لکھا کرتے اور جی بھر کے لکھا کرتے۔ بخاری صاحب پہلے تو دل کو بہلاتے رہے کہ کسی دن یہ اللہ کا بندہ خود ہی راہ راست پر آجائے گا۔ جب مایوس ہو گئے تو ایک دن اس اخبار کے دفتر جا پہنچے۔

اخبار کے ایڈیٹر اپنی امارت پر براجمان تھے۔ انہوں نے اس کے کان میں کہا: "مجھے آپ سے علیحدگی میں ایک کام ہے۔"

وہ صاحب کچھ کام نہ۔ آج ضرور یہ کارگزاریوں کا معاوضہ ملے گا۔ خوش ہو کر اٹھے۔ من میں ہزاروں کی سوچ لی۔

جب بخاری صاحب اور جناب ایڈیٹر صاحب ایک الگ کمرے میں پہنچے تو انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ بڑے اطمینان سے کچھ زور زور سے چانٹا رسید کیا۔ ایک اِدھر، ایک اُدھر، اس کے بعد چٹخنی کھولی اور یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے۔ اب اطمینان سے بیٹھا لکھا کرو۔

متحدہ ہندوستان میں، جب انگریزی کا طوطی بولتا تھا، خلاف حکومت سرگرمیوں کے سلسلے میں، حاکمان وقت کو ارونا آصف علی کی تلاش ہوئی۔ وہ روپوش ہو گئیں۔ یہ بھی انہی دنوں کا قصہ ہے۔ جب بخاری صاحب ریڈیو کے ناخدا تھے۔

ریڈیو پر روز اعلان ہوتا۔ ارونا آصف علی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ جو صاحب ان کا اتہ پتہ بتائیں گے۔ انہیں انعام دیا جائے گا۔ یہ اعلان ایک دن نہیں ہوا کئی دن ہوتا رہا۔

جو محکمہ لوگوں سے یہ کہتا تھا کہ ارونا آصف علی کا اتہ پتہ بتانے والے کو انعام دیا جائے گا۔ اسی محکمہ کے ناخدا کے گھر ارونا آصف علی رہتی تھیں۔ آصف علی سے مرحوم کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حق دوستی کی آخری حد ہے اور دوسری طرف جرأت و ہمت کی ایک عجیب داستان!

بخاری صاحب نے زندگی بھر اپنے دوستوں سے ٹوٹ کر محبت کی اور نبھائی۔ برخلاف اس کے ان کے دوست اتنے عاشق ثابت نہ ہوئے۔ اپنے خطوں میں، انہوں نے کیا کیا گلے نہیں کئے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرحوم کو چھوٹے چھوٹے کئی عارضے تھے۔ اس پر کینسر جیسی خوفناک بیماری۔ موت ان کے سامنے مدتوں ناچتی رہی۔ مگر یہ آنکھیں چرائے، دل کو طرح طرح سے بہلاتے رہے۔ بالآخر اس جیالے مخلص اور عالم کو موت نے آن ہی دبوچا۔ آج یہاں سوگ ہے، عرش پر جشن ہوگا۔

یہ مانگے تانگے کا مضمون ضرور ہے۔ مگر مستند ہے میرا فرمایا ہوا، کی قسم بھی کون کھائے!

پطرس بحیثیت مزاح نگار

محمد احسن فاروقی

[illegible] دہلی میں داخل ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا کہ ایک دن لائبریری میں شفیق وجیہی رضا نے مجھ سے، ہاتھ میں ڈکنس کی ایک ناول دیکھ کر کہا: ”اگر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جانا چاہتے ہو تو مضامین پطرس پڑھو۔“ میں نے آج سے پہلے یہ نام یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے نہیں سنا تھا۔ ادب کی صحبت کا اندازہ اور ادب کی اتنی ہی پرکھ تھی کہ احساس ہے کہ داخل ہوا تھا۔ صاحب ذوق تھا، جس کو مزاحیہ تصنیف سے علاوہ ہر معمولی تصنیف سے نفرت کا اظہار کرنا فرض سمجھتا تھا۔ پھر اس وقت میری ایک ادبی بزرگ کی رائے تھی۔ جو میرے جاننے والوں میں کچھ معقول سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ جسمانی امراض بھی ادبی تاثرات سے دور کئے جا سکتے ہیں۔ اور پیٹ کی خرابی اس وقت ایک عام مرض تھا جس میں میں بھی مبتلا تھا۔ اپنے لفظ کی مثال میں یہ کہا کرتا تھا کہ پیٹ خراب ہو تو ڈکنس کی ناولیں پڑھو، پیٹ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ناول دیکھ کر وجیہی رضا نے یہی تصور کیا تھا کہ جیسے میں دوا کی شیشی لئے جا رہا ہوں۔ اور جیسے لوگ انگریزی دوا کی شیشی ہاتھ میں دیکھ کر کہتے ہیں کہ کبھی ڈاکٹر کے پیچھے پھرتے ہو، حکیم کا علاج کرو، زیادہ فائدہ ہوگا۔ اسی طرح وجیہی رضا نے بھی ڈکنس کی بجائے پطرس سے علاج کا مشورہ دیا۔ مگر جیسے جدید لوگ حکیمی علاج کا نام سنتے ہی صاف ٹال دیتے ہیں اور مشورہ دینے والے کو ہنسی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں ویسے ہی میں نے وجیہی رضا کو دیکھا اور اپنا راستہ لیا۔

پطرس نام عجیب تھا۔ کوئی عیسائی ہے؟ نہیں عیسائی عبرانی نام سے عربی نام پر اترنے کی زحمت برداشت نہیں کرسکتا۔ کوئی لونڈا لاڈی ہوگا جس نے یہ تخلص رکھ لیا اور پھکڑبازی کرتا ہوگا۔ وجیہی رضا اردو کے لکھنے والوں کو اچھالا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو بہت زیادہ جانتے تھے مگر انگریزی میں کم، کہ اس نے پطرس کو ڈکنس کی بجائے پیش کرکے ہم کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

مگر کچھ ہی عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ پطرس کوئی لونڈا لاڈی نہیں جس استاد نے ہمیں انگریزی ہیومر کو سمجھنا سکھایا تھا۔ وہ اور پطرس کیمبرج میں ساتھی تھے۔ پطرس اصل میں پروفیسر بخاری تھے۔ جو ہندوستان کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب پڑھاتے تھے فوراً ہمیں یقین آگیا کہ وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ہیومر کیا چیز ہے مگر ان کا ہیومرسٹ ہونا ابھی تک شبہ میں تھا

مگر جادو وہ ہے جو سر چڑھ کے بولے۔ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہم مانیں چاہے نہ مانیں وہ سر پر چڑھ ہی بیٹھے گا۔ اور پھر ہم کو اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ایک جادو اقبال تھا۔ ”شکوہ“ و ”جواب شکوہ“ پڑھتے ہی ہمارے سر پر ایسا سوار ہوا کہ قیامت کے دن بھی سوار ہی نظر آئے گا۔ دوسرا جادو ’پطرس‘ اس کے سر پر سوار ہونے کا قصہ سنئے۔

کوئی صاحب کی منبع ہی۔ ہم جن کتے نظر آیا کتے ہمارے لیے بھی عجیب ہی ہوتے تھے۔ ہمیں ان سے اس قدر شدید عار تھا کہ جس گلی میں داخل ہوتے تو پہلے دیکھ لیتے کہ دور دور تک کوئی کتا تو نظر نہیں آ رہا ہے اور اگر نظر آتا تو اس گلی میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ بڑھتے بڑھتے نوبت اس بات پر ہوا تو مذاق اڑایا کرتے۔ ہمارے بزرگ فاقا کرتے کہ کتے سے ڈر ہمارے اندر فطری تھا۔

پھر ہم نے اسٹیونسن کی کتاب "ٹریولز ود اے ڈنکی" پڑھی اس نے ایک جگہ کتوں سے خوف کا پر لطف ذکر کیا ہے۔ ہمیں بڑی تقویت ہوئی کہ ایک تو ساتھی ملا۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر جب میری نظر "کتے" اور اس کے نیچے پطرس پر پڑی۔ تو کیا بتائیں کیا ہوا۔ فوراً کتاب لے کر بیٹھ گیا اور پڑھنے لگا —

پہلے ہی جملے نے جادو مارا۔ "علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے۔" اچھل کر دل بول اٹھا یہ تو استادی ہیومر ہے۔ کہیں کوئی غلط نہ سمجھ لے ہیومر لطیفوں اور فقروں کی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک نقطۂ نظر، مزاج کے حقائق سے تصادم، زندگی میں ایک مخصوص کیفیت کے احساس کا نام ہے۔ اس جملے میں ہیومر نہیں، اس سے ہیومر شروع ہوتا ہے یہ جملہ ایک نئی نظر ایک نئی ہستی ایک نئی ادا ایک نئے عالم خیال ایک نئی بے ڈھنگی دنیا کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ کتوں کے ایک نئے عجائب خانے کا رستہ بتا رہا ہے۔

دیکھیے یہ ننھے "کتے" آگئے۔ "یہ کتے کیا کرتے ہیں؟" وفادار جانور؟ "واہ کیا وفاداری ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔" جیسے یہ کتوں کا مشاعرہ گرم ہے "کم بخت بعض تو دو غزلے اور سہ غزلے لکھ کر لائے ہیں" ہنگامہ گرم ہے۔ پطرس آرڈر آرڈر پکار رہا ہے کچھ اثر نہیں مجبور ہو کر کہتا ہے "اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔"

دیکھیے اور "کتے" قومیت کے دلدادہ کتے۔ "پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔" کیسے قوم پرست ہیں!

انگریزوں کے کتے۔ ان کی شائستگی دیکھیے۔ ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں بخ بخ کر رہے ہیں۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ اور ہمارے کتے۔ "بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گلے بازی کیے جاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ پطرس سے ان کے تعلقات کشیدہ ہی رہتے ہیں مگر مسٹر پطرس۔ با اخلاق انسان ہیں طبعی شرافت ان پر غالب آ ہی جاتی ہے۔ ہم انہیں بزدل ہرگز نہ سمجھیں گے۔ ہاں ان کے حال سے بے حال ہو جانے پر ہماری نظر ہے۔ آیۃ الکرسی کی جگہ دعائے قنوت پڑھنے لگے ہیں۔ "رات کے وقت تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں . . . . . . " اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔" بہت ہی کتا۔ ہا۔ہا۔ہا۔ "بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔" ہاہاہاہا۔ اف۔ اف۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے مگر اب اس پر ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے ہیں۔ پطرس سچ مچ ہیومرسٹ ہے۔ پیدائشی ہیومرسٹ ہے۔

معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ناخنوں سے کاٹ لیا ہوتا اور پھر اس کا ہر شے چپ ہو جاتا ہو ..... جب تک کتے بھونکتے رہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں کیا مجال کہ ہم تو اپنے پاؤں نکلنے بیٹھے ہیں ... بھونکنا عجیب چیز ہے۔ اس کے اصول نرالے ہیں۔ متعدی مرض ہے جس سے کتے تو واقف ہیں۔ وہ دو تین تین آنے کے کتے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ اور پھر بھونکتے ہیں جیسے موسیقی کے سامنے آلاپ ہائے رنگ ہی تو لیتے تھے ..... بھونکنا عجیب شے ہے۔ پطرس کے سامنے آنے کو معطل کر دیتا ہے یعنی بھونکنے کا ایک اور منظر۔ پہلا منظر شاعر و مشاعرہ پیچھا اب ایک پر معنی جلسہ باہر سڑک پر تبلیغ کا کام شروع کر رہا ہے پطرس سڑک پر ہے۔ آپ کیسے ہوش ٹھکانے رکھتے ہیں ..... ہمہ صورت کتوں کی یہ بے پروائی دراصل انتہائی بے تہذیبی بے تکلفی ہی ہے ...
پطرس کو غصہ آ گیا۔ پوری مجلس کا یوں منتشر و منتشر ہو جانا پر حسرت زدہ کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل ہی گئے ... مگر کسی کتے کی دل شکنی اسے منظور نہیں .... یہ مضمون کسی ... موزوں کتے کی موجودگی میں ... نہ پڑھا جائے۔

پھر ولایتی کتوں کو چھوڑئیے خارش کتے دیکھیے۔ مسکینی ... بیچ بیچ میں سے لیٹا ہوا ہے گاڑی کے نیچے کوئی اثر نہیں کرتا کسی نے چابک مارا تو ایک گز پرے جا بیٹھا بالکل ایسی بھی چیز ہیں۔ اس سے راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتا ہے ..... رات کے وقت اپنی دم کو تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ ... اگر ان کی دم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا تو راتوں خواب میں بے شمار کتے پاؤں سے لپٹے نظر آتے۔

پطرس کے دل میں ان سے انتقام لینے کی آگ ہے اگر خدا سے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا کرے تو سب کتوں کو کسوئی پہونچا دے۔ کاٹنا اور بھونکنا ..... یہی دو طاقتیں ہیں۔ ... انگریزی میں ایک مثل ہے کہ " بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے " یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔ واہ۔ واہ۔ کیا بات کہی ہے اس کے بعد مضمون کو ختم ہو جانا چاہیے۔

یہ سب کیا ہوا ایک مخصوص پیرائے پر پہنانے والی ہستی دکھائی دی۔ اس نے ہمیں دکھایا کہ دانستہ کیا کرتی ہے۔ ہم جیسا ہے بالکل ہمارا ساتھی ہمزاد۔ اور اس نے کتے دکھائے۔ عجب حالات کے کتے ..... دیکھیے وہ دروازے پر گلی میں کتے بھونک رہے ہیں۔ آس پاس یہ کیا ہوا۔ یہ سب پطرس کے کتے ہو گئے۔ جو کتا دکھائی دیتا ہے وہ پطرس کا کتا ہے ہم پطرس ہیں وہ ہمارا کتا ہے۔ یہ جادو ہے ہمارا نقطہ نظر ہی بدل گیا۔ ... اس لفظ نے معنی نہیں ادا کر سکتا۔

اب سنیے کہ اس مضمون کو پڑھ کر ہمارا کیا حال ہوا ..... ہمارے اندر سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم پر کتابوں کا جنون سوار ہو جاتا ہے اس کی شدت کا اندازہ یوں کیجیے کہ اگر کسی رات کو کسی کتاب کا جنون ہم پر سوار ہو تو ہم بازار جا کر کتابوں کی دوکان کے تالے توڑ کر کتاب نکال کر گھر لے آئیں گے اور بغیر اس کو ختم کیے دم نہ لیں گے ..... تو بس صاحب مضامین پطرس کا جنون ہم پر سوار ہوا فوراً بازار پہنچے اور ایسی جلدی کتاب لے کر واپس آئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کتاب چرا کر بھاگے ہیں۔

اب پطرس میری نگاہ میں پکا ہیومرسٹ تھا۔ اردو کا واحد ہیومرسٹ۔ بلکہ صف اول کا ہیومرسٹ۔ اور پھر ایک ہی جلسے میں ہم سودائی ہو چکے تھے۔ کتابوں کا سودا بہت اچھی چیز ہے ادھر سودا ہوا اور ادھر وصل میسر ہو گیا۔ اتنی آسانی کسی اور عشق میں نہیں ہوتی۔ غرض ہم اور پطرس من تو شدم تو من شدی ہو گئے۔

دیباچہ شروع کیا۔ یہ کتاب ہمیں کیسے ملی؟ ایک مضمون تو مفت ملا۔ اتنا پطرس پر احسان تھا۔ ہاہا احسان پطرس پر۔ باقی کتاب ہم نے

چرانی۔ جب آپ اپنے ساتھ والے کی زندگی گزار رہے تھے وہ مضمون پطرس کے خاندانی چوری کے درجے میں آتی ہے۔ چوری اور بیکلی کا لازم و ملزوم میں آنا ہے
اگر اور چوری نہیں تو یہ چوری ضروری ہوا۔ زمانہ زمانے کی بات ہے کہ یہ کتاب کو خرید کر لیا ہے میں اسے اپنی حماقت کو حق بجانب
ثابت کرنا ضروری ہے۔

بات درست ہی کہاں ہے۔ ہم حماقت کو حق بجانب بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب پر عاشق ہوئے ہیں تو سوم کیا جاتا ہے
ہمارے نزدیک ہیومر کی سب سے بہتر تعریف انعام ہے۔ سوم سٹ کے قدم سے نکل گئی۔ یہ سوئفٹ ٹھیک ہے اور اس نے اپنی کتاب " انگلستان
ہیومر " میں سوئفٹ " SWIFT " پر لکھتے لکھتے یہ فقرہ چھوڑ دیا TRUTH TOPSY - TURVY , AT ONCE TRUE
AND ABSURD ۔ یہ بات کیا ہے حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا حق بجانب کو حماقت ثابت کرنا۔ پطرس پر اتفاق سے وہی کچھ کہہ گیا جو حقیقت
اتفاق ہی ہے کہ گویا ہمیں یقین ہے کہ کوئی سچا مصنف تو نہیں تھا کہ قلم تو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر چلاتی اس کو کوئی روحانی چیز ہے۔ اور یہ روحانی چیز ایک
موج خرام سے ایسے کل اتر جاتی ہے جن کا احساس مصنف کو شعوری طور پر شاید کبھی ہوتا ہے جیسا کہ ہیومر کی روح جب پطرس کا قلم چلا رہی تھی تو اس نے
حقیقت کو حق بجانب ثابت کرنے والا فقرہ کر دیا۔ یہ روح جسے یونانی علم اصنام میں موس MOMUS کہتے ہیں یہی کرتی ہے۔ حقیقت اور حماقت کو اس طرح
گڈمڈ کرتی چلی جاتی ہے کہ حقیقت کے اور حماقت ثابت ہو یہ روح ہمارے عیز نگاروں سے کبھی چھو کر نہیں گزری ان کی حماقتوں کو پڑھئے ہنسی کی ایک
لہر دوڑ سے گی۔ مگر ذرا غور کیجئے تو ان کی حماقت حماقت ہی رہ جائے گی۔ بالکل ناممکن، غلط بات۔ من گھڑت لطیفوں کو ہنسانے کے لئے ٹھیک ہے۔ اس
پر ہنسنا بد مذاقی ہے گر پطرس تو موس سے ہمکنار ہے۔ اس کے قلم کی آواز گویا موس ہے۔

اب بتائیے کہ پطرس کیا ہے؟ اتہ پتہ مل گیا۔ اس کے لئے دیکھئے اس کو کتے بناتے دیکھا۔ اسے خود ہنستے دیکھا اس کا دیباچہ پڑھا اب اس
پہیلی کو بوجھنے میں کیا کسر ہے۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ یہ کہ پطرس جو کچھ بھی ہے گو ہے دیکھنے کی چیز اور برتنے کی چیز شیکسپیئر کا پک PUCK۔ اس کے کان میں کہہ
رہا ہے اس کی روح کے کان میں کہہ رہا ہے۔ O LORD WHAT FOOLS THESE MORTALS BE ! اور اس
کا قلم چل رہا ہے وہ نارمل ہے اس کے چاروں طرف سب ابنارمل ہیں۔ وہ فول ہے اور اس کے چاروں طرف سب فول ہیں۔ یہی دنیا ابھرتی آرہی ہے۔

" ہاسٹل میں پڑھنا " وہ طالب علم ہے اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ ہاسٹل میں پڑھے۔ اس کے گھر والوں کو دیکھئے۔ کھاتے پیتے مسلمان لوگ۔ لڑکے
کو تعلیم دلاتے ہیں مگر تعلیم کے مقصد اور تعلیمی اداروں کے حالات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ صاحبزادے کے لئے تعلیم گاہ تفریح گاہ کے ہم معنی ہے۔ سب سے
زیادہ تفریح ہاسٹل میں پڑھ کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کی کوشش ہے کہ کوئی سال ایسا آجائے کہ ہوسٹل میں داخل ہو سکے۔ اس لئے متواتر فیل ہی ہوتے رہنے
میں ان کو دلچسپی ہے۔ اور ان کے سرپرستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہاسٹل کوئی بری جگہ ہے والدین کی نگاہ میں ہاسٹل کو علم اور اخلاق کا سطح ترین مرکز ثابت کرنے
کی کوشش بار بار مضحکہ خیز ہو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جس جس طرح فیل ہوا ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ایسے بالکل ایسے کتنے لڑکے ہمارے ذہن میں ہیں ان سب
کا فلاں واضحاق قول مشترک ہے وہ ہمارے مشاہدے کی زبردست مضحکہ خیز حقیقت ہے۔

" سویرے جو کل آنکھ میری کھلی " وہی طالب علم ہے پڑھنے سے اس کی دلچسپی کا حال دیکھئے، پڑھنا امتحان کے لئے ہے تیاری کے لئے سویرے
اٹھنا ہے۔ لالہ جی اس کے پڑوسی مضحکہ حد تک مستعد اور منہمک ہیں۔ اس کو صبح جگانے کے سین اور اس کے جاگ کر سو جانے کے حالات وغیرہ کسی طالب علم
نے نہیں دیکھے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طالب علم میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ پطرس اس میں فرد ہے۔

ہماری معصومیت تعلیمی جدوجہد کی تصویر پوری ہو گئی۔ ہم نے سے سیکھے تھے ان سب کو [illegible] اپنے چار [illegible] دن کی ایک گھاٹ بیٹ [illegible] کچھ۔ نکلوایا اور خوب ہنسایا

پھر خانگی زندگی کے حالات دیکھئے۔ [illegible] روز کی آخری کتاب۔ [illegible] ایک عام سے مثال لیجئے۔ ایک میاں ہوں [illegible] بیوی کے درمیان تعلقات میاں کے دوستوں پر بیوی کے [illegible]۔ بیوی کبھی [illegible] میکے جانے پر خوش ہے [illegible] قسم کی آزادی ملی۔ لیکن پھر بھی بیوی کے گھر میں نہ ہونے سے گھبراتے [illegible] یہ ترتیب [illegible] کمال ہے!

اب سیاسی زندگی کا کھیل دیکھئے۔ [illegible] لیڈر کیسے بنتے ہیں [illegible] شروع میں ایک طرح [illegible] سب سے لیڈر بننے کی بن پڑتی ہے۔ آخر میں تقریر کرتے ہیں اسے کیسا بنایا جاتا ہے [illegible] لیڈر تو لیڈری کی حقیقت [illegible]

کالجوں کو دیکھئے انکسار کے مجسمے علم کے مرکز پروفیسر پطرس کو دیکھئے اور ان کے شاگرد ان رشید احمد صدیقی [illegible] پیش کرنے پر غور کیجئے اور پھر ملک معظم وغیرہم کے تحائف پر ان کی سعادت۔ [illegible] کیمبرج یونیورسٹی میں [illegible] رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا جس روانی [illegible] کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا [illegible] سے جذبات کو آسودگی نصیب ہوئی۔" واللہ کیا بات کہی ہے۔ کیمبرج سے لوگ یہی فن سیکھ کر آتے ہیں کیمبرج کی تعلیم کا اثر یہی ہوتا ہے۔

ادب زندگی پر تنقید ہے؟ میتھو آرنلڈ نے اس بات کو کچھ ضرورت سے زیادہ انسپکٹر مدارس کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ جس سے کچھ بات ٹھیک نہیں بنتی دکھائی دیتی۔ ورنہ جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا وہ ٹھیک ہی تھا زندگی کی وہ چیز جو ہمیں دیتے آئے ہیں [illegible] پطرس نے بھی ہمیں [illegible] دیا ہے۔ اب اگر نظریہ حیات، نصب العین، پول کھولنا، مفکرانہ سنجیدگی وغیرہ قسم کے صفات [illegible] الفاظ کا ذکر کیجئے تو [illegible] زندگی کے کمل نقش میں کوئی نظریہ ہے، نصب العین ہے، کسی چیز کے پول کھولنے کی ضرورت ہے کوئی اخلاقی سیاسی وغیرہ قدر یا قدریں ہیں تو وہ پطرس کے یہاں بھی ہیں ورنہ ان کے ذکر پر یک کا جملہ یاد کیجئے اور خاموش ہو جائیے یہ شیکسپیئر والا ہیومر ہے۔ صاف خالص ہیومر طنز وغیرہ کی گندگی سے پاک ع

بے ادب پامنہ اینجا کہ عجب درگاہیست

اب دیکھئے پطرس کیا ہے۔ سب مضامین کو ملائیے اور دیکھئے کیا نکلتا ہے۔ الف لیلہ میں ایک قصہ ہے جس میں ایک [illegible] سمندر کے کنارے ایک بوتل پڑی پاتا ہے اس بوتل کو کھولتا ہے تو اس میں سے ایک جن نکلتا ہے جو لڑکے کو کھا جانے کو تیار ہوتا ہے۔ پطرس بھی ویسا ہی ایک جن ہے، مگر یہ جن آدم خور نہیں ہے آدم خوردہ ہے۔ یہ ہمیں نہیں کھاتا اپنے تئیں ہم کو کھلاتا ہے۔ اس کو پھر شیشے میں نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ الف لیلے والا احمق جن تو ہے نہیں کہ ایک لڑکے کے کہنے پر پھر بوتل میں واپس ہو جائے۔ اور ہم اسے بوتل میں واپس جانے کو کہیں ہی کیوں۔ وہ تو ہماری خوراک ہے۔ بڑے مزے کی خوراک ہے۔

یہی بہادر جن سروانٹیز کے دماغ سے ڈان کوئکزٹ کی صورت میں روزینانت پر بیٹھ کر سانکو پانزا کو ساتھ لے کر ڈلسینیہ کے عشق میں سرد آہیں بھرتا ہوا دنیا کو فتح کرنے نکلا ہے۔ یہی اب پطرس کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ جدید دور کے سب ہتھیار اس کے پاس ہیں۔ جدید تعلیم، کیمبرج کی ڈگری، پروفیسری کا عہدہ۔ اس کی ڈلسینیہ مدرشن آتا ہے جس کو وہ آہ سرد کا تار بھیجتا ہے اس کا بھی ایک سانکو پانزا ہے یعنی کبوتر باز مرزا صاحب جو

روشن دماغ رہے لفظوں اکسو تربازی، دو تاش بازی کے منصوبوں سے سامان ہوتا ہو " میبل کا عشق " یہ کہاں سے ساتھ ابھرتا ہے یادو سکے پطرس ایسا جن
جو اپنے تئیں ملامت کرتا ہے چنانچہ بس کا اسٹاپ اس کو پریشان کرنے میں کمال رکھتا ہے سینما کا ذوق۔ بعض مرزا صاحب کا ساتھ نبھانے میں پڑتی ہے تو تماشا
شروع ہو جانے کے بعد پہونچنا لازمی ٹھہرا۔ اس لئے سینما کی ہر شریف ہستی کے لئے کوئی نہ کوئی چھکیلا وال مصرع ! اُف اُف وہ مرزا خوب پھلتے ہو

مگر مرحوم نشانہ بازی مفید چیز ہے پچانس کہ نس کرکے بھی مگر مرد ہے اپطرس کو ششم بنایا ہے بنا کہ سنے تو اسے وہ سواری دی جس
کو دیکھ کر روز قیامت بھی ... کے بارے باہر ہو جاتی ہے اور ایسی بھاگتی ہے کہ پھر نہیں لوٹ آتی۔ وہی مرحوم جس کی یاد داستان کے ساتھ وابستہ ہو گئی
ہے بلکہ اردو زبان کے ثبات کی ضامن ہے۔

کیا سواری ہے وہ مشین بنانے والے انسان کی ذہنیت کا معجزہ جدید دور کی سب سے زیادہ تعجب انگیز سواری، اگر شان کہنہ آج کل
تشریف لائیں تو شاید آج کل کی سب سے زیادہ تعجب میں ڈال دینے والی سواری بائیسکل کے سوا اور کوئی نہ دکھائی دے گی یہ ہوا پر اڑنے والی چڑیاں
پر چلنے والی ... کی غلام سواریاں کیا رقم ہیں!

پطرس اس معجزہ نما سواری کو دنیائے ادب کی مضحک ترین سواری بنا کر پیش کرتا ہے یہ مرزا صاحب کا تحفہ ہے نہیں موس ... کا عطیہ ہے۔
رات ہی میں آگئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پرانے تنے کا اوزار بھی لائی ہے یہ اوزار ہی اس کا علاج دردِ دل بلکہ اس کی روح ہے۔ کیا شکل پائی ہے "دیکھنے
سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بائیسکل ہے لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پل اور راسٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی
ہوئی ہے۔ پل اور راسٹ اور چرخہ اس کے مقابلے میں جدید ایجادات ہیں۔

اور اس کی چال بھی کیا کمال ہے پطرس "آخر کار میں پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی
مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ بائیسکل اپنی آوازوں میں گم ہے۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور
پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چرچرخ۔ چرچرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔

جوڑ و بند کی حرکات ملاحظہ ہوں۔ زنجیر "میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی
تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔"

پہیے! "پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دہنے سے بائیں اور بائیں سے دہنے کو بھی حرکت
کرتا تھا چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔"

مڈگارڈ! "مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب
مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔"

اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو
یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔"

اس کی چال میں ارتقا بھی ہے" جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے
جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے ...... اف اف۔ ایک نظموں کے گھوڑے کیا اڑیں گے۔ یہ سائیکل بالکل آسمان سے اتری ہے
..... موسی نے پطرس کے لئے یہ براق بھیجا ہے!

کیا قیامت کی بائیسکل ہے۔ اس کے سامنے سٹریلی کی پسپائی کے میں۔ دو فریدا ... کی بارہ ان میں کی بات چیت ۔ یہ عبداللہ بچو کا انگلیشہ ہے۔ الدین کو مرشد بائیسکل کے رستے ہاتھوں میں سے سے آفاق پرچلا آیا ہے۔ مرحوم فاتحہ کیا لکھتے "KATRENT OF THE BROKEN BICYCLE MASTER SHALLOM."

ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ پروفیسر بخاری کہاں پیدا ہوئے یہاں لاہور ہے۔ رقبہ ... ہے۔ ہر پہتے قریں سے ملتے تم میں کا موقع نہ ملا۔ اچھا بھی میاں صاحبیں ان سے کیا مطلب تھا ہمیں پطرس سے غرض ہے اور سے ہی شخص رہتی دنیا تک ... ہے ... یہ ... کا ایک فرمودہ اس کالا مور یہ جان فاتحان کا نسبہ ہے یہ لاہور لاہور ہی ہے تنگے تو ہیں اس کے پاس ایک دیا لیا رہتا ہے۔ ہیسے کا شغل ... سے بند ہے حلقا روں کی آما جگاہ ہے۔ یوپی کے علاوہ دلی تک کے ... سے یہاں آتے ہیں اور اہل زبان کہلاتے ہیں۔ ... کے ... مسوخ ہو چکے۔ آب و ہوا کا سوال نہیں البتہ آب کی جگہ پانیوں میں پانچ دریا اور دریا اور آکسیجن اور ہوا کی جگہ گرد۔ دوخاص حالات میں ... ملتا ہے۔ عبد الرحمٰن کی سڑکیں میں پھیلا دینے والے ملتے ہیں۔ مکانوں پر اشتہارات کے پیشتر پیشتر لگانے کے میں یہاں کی صنعت ... سی حد تک ... سازی ہے جیسی ... کے زمانہ میں ... بازی تھی۔ یہ برانچ پر یہاں بھی اسی طرح ایک انجمن موجود ہے جیسے شکسپیر کے لنڈن میں تھیٹر موجود تھے۔ یہاں کی ... پیدا وار طلبا ہیں۔ اور قسم قسم کے ہیں۔ ... پروفیسر ... سے ... ہے کہ دودھ چلنے والے جانوروں میں سے ہوں ؟ یہاں کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔ ... ہر ... کا ... ہے۔

پطرس کا کام کھیل دکھانا ہے۔ لفظوں کا کھیل۔ فقروں کا کھیل۔ چست جملوں کا کھیل۔ ... کا کھیل کھیلتا ہے۔ مگر یہ اس کا خاص کھیل نہیں۔ اس کا کھیل پک کا کھیل ہے۔ مرقعوں کا کھیل۔ ڈرامائی حالات کا کھیل۔ ہر مضمون ہی کھیل دکھاتا ہے۔

ہاسٹل میں پڑھنے والا والدین کو نصیحت کا مطلب سمجھا رہا ہے۔

سویرے آنکھ کھولنے والو چنگ پر ... لالہ جی کی ... پر ... سن رہا ہے۔ جاگنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

"میں بہت ہی کتا ہوں۔"

"باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔"

فرمانبردار میاں چور بنا ہوا ہے ...... برقعہ پوش ...... منہ سے برقعہ اٹھا تو ... آر

مرید پور کا پیر تقریر کر رہا ہے۔ پیارے ہم وطنو ...... !

پروفیسر پطرس پر عقیدت کی انگلیاں چڑھائی جا رہی ہیں۔

سینما کے اندھیارے میں آب حیات کی تلاش ہو رہی ہے۔

ایک کتب ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کی مشق کر رہا ہے۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ تماشا لیا ہے۔ سین نمبر ایک۔ مرزا سے گفتگو۔ سین نمبر دو۔ سائیکل کا معائنہ۔ سین نمبر تین۔ رفتار کا ایک منظر نمبر چار۔ مرمت کی دکان۔ نمبر ۵ فروخت۔ نمبر چھ ٹوٹی بائیسکل والا ہیرو۔ نمبر سات۔ ہو سکے کیوں نہ غرق ہو گیا۔

لاہور لاہور ہی ہے

کھیل ختم

ختم؟

یہ کھیل ختم نہیں ہوا، پطرس کا تماشا دیکھو، پطرس کا تماشا دیکھو! ہم لوگ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ اب آپ پکٹ والوں کا تماشا دیکھیں گے جو پطرس نے پیش کیا ہے۔ . . . یہ پروگرام ہر سٹیریو سیٹ پر بیک وقت سنا جا سکتا ہے اور نشے سے زیادہ دیکھا جا سکتا ہے

• • •

اس کھیل کے سلسلے میں ایک نیا اعلان سن لیں۔ اردو ادب میں متبان تنقید یا تنقید ماہر رسالتی میدانوں کی طرح پہلی بار میں پطرس کے کھیل کو یہ ہرگز نہ دیکھیں ورنہ . . . پکٹ نے ان کے لیے اب تک کوئی رعایت نہیں کی۔

ان میں سے ایک بڑے بابو کو پکڑ لیا گیا ہے وہ فرسٹ ہو اپنے بار کو سیکنڈ کلاس کا اور اقبال کو انٹر کلاس کا ٹکٹ دے گئے تھے۔ اس وقت انہیں معاف کر دیا گیا تھا مگر اب ان کی جرائم پیشگی پختہ ہو گئی اور سطر سوئی ہو گئی۔ انہوں نے اردو کی مزاحیہ نگاری پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور پطرس پر کچھ کہا ہے۔ اس کی سزا ان کو اچھی طرح دی جائے گی۔

مضامینِ پطرس کا مطالعہ

تسکین کاظمی

پطرس ایک ذہین اور ذکی ادیب اور فن کار تھے۔ ان کا مطالعہ بہت ہی گہرا اور معلومات وسیع تھیں۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ ساتھ [illegible] انہیں سائنٹفک [illegible] آرٹ [illegible] چاہیے [illegible] وہ پیشہ ور [illegible] صحافت [illegible] اور جب تک جی نہ چاہتا تھا نہیں لکھتے تھے چنانچہ [illegible] انہیں مزاحیہ مضامین [illegible] چنانچہ [illegible] اور میں پطرس سے بے تکلف ہو گیا ــــ ان ہی کی خواہش اور تحریک پر میں نے بعض شخصی خاکے بھی لکھے تھے

اس زمانے میں [illegible] پطرس اور میں نکالا کرتے تھے۔ مزاح نگاری میرا اپنا شغل تھا۔ احباب کے تقاضوں پر [illegible] رہا تھا چنانچہ جب میرا مجموعہ "غنچۂ تبسم" شائع ہوا تو نیاز فتح پوری نے میرے خلاف [illegible] پطرس نے شخصی طور پر مجھ سے معافی [illegible] اور اس محاذ سے الگ [illegible] اور اسی زمانہ سے میری دلچسپی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد [illegible] نے ترک کر کے نہیں [illegible] چھوڑ دیا [illegible] میں بھی "خوش مذاق" چھوڑ کر ادب اور تاریخ کی طرف متوجہ ہو گیا

مضامین پطرس تو بعد کو مجموعہ کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ میں نے ان مضامین کو طبع ہوتے ہی پرچوں سے علیحدہ کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ اور [illegible] ایک مضمون کے متعلق ان سے میری مراسلت ہو چکی تھی۔ ملک کے آزاد ہونے سے پہلے میں نے [illegible] جاری کیا تو پطرس سے بھی مضمون کی خواہش کی تھی اور انہوں نے بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا تھا مگر چند ہی مہینوں کے بعد ہنگامے شروع ہو گئے اور [illegible] بند ہو گیا۔ جن دنوں ریڈیو پطرس سے متعلق تھا۔ میری مراسلت ان سے ہوئی مگر اس کے بعد نہ تو میں نے انہیں خط لکھا اور نہ انہوں نے مجھے۔ کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے دور ہو گئے۔ مرتے مرتے ہوئے چند خطوط جو بعض رسائل میں طبع ہوئے ہیں ان کی اردو انشا پردازی کے آخری نمونے ہیں جو لافانی ہیں

زیادہ لکھنا کوئی خوبی نہیں ہے ہم بعض ایسے "پُرنویسوں" سے واقف ہیں جو بہت لکھنے والے تھے اور جن کی بیسیوں کتابیں چھپیں۔ مگر بارہ پندرہ سال بھی ان کی کتابوں نے زندگی نہیں پائی۔ آج کتابیں تو کیا نظر آئیں گی نام بھی سننے میں نہیں آتے۔ ان کے مقابلے میں بعض ایسے "کم نویس" بھی نظر آتے ہیں جن کی کتابیں گنی چنی ہیں مگر لوگ انہیں سر آنکھوں پر لئے پھرتے ہیں انہیں آخر الذکر لوگوں میں پطرس کا شمار بھی ہے چند مضامین، چند ترجمے، چند ناول صرف یہی کائنات پطرس کی ہے۔ گو یہ "بہ قامت کہتر" چیزیں قدر و قیمت میں بہتر سے بہتر ہیں اور آئندہ ان کی قیمت اور بھی بڑھ جائے گی۔

آئیے اب ذرا پطرس کے مضامین کا مطالعہ کریں۔ پطرس نے اپنے مضامین کا پہلا مجموعہ [illegible] شائع کیا ہے۔ اس میں شاید گیارہ مضامین

نہیں ہیں بلکہ کچھ کم ہی بعد کے ایڈیشنوں میں اضافہ ہو تا گیا۔

سب سے پہلے پطرس نے اپنے استاد پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی سے "اظہار عقیدت" کیا ہے کہ انہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا پھر اس بات پر فخر بھی کیا ہے کہ "مجھے اب بھی ان سے شرف تلمذ حاصل ہے :"

پطرس کی طبیعت کا سلجھاؤ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں لغزشوں کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کر لیا ہے۔ اور پھر اس بات پر اظہار افتخار بھی کیا ہے کہ انہیں اب بھی پروفیسر مرزا محمد سعید سے تلمذ حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ادبی دنیا یہ معلوم کر کے کہ پروفیسر محمد سعید پطرس کے استاد ہیں، بہت زیادہ احترام کرنے لگے گی مگر اس اعتراف سے علمی طبقے میں پطرس کا احترام بہت زیادہ بڑھ گیا کہ وہ برخود غلط اور "مسند سے میرا فرمایا ہوا" کہنے والے ادیب نہیں بلکہ حقیقی معنی میں عالم ہیں۔ جو اپنے آپ کو طالب علم کہتے ہیں میں تو ان کی اس ادا سے بہت متاثر تھا۔

دیباچے میں تو پطرس نے غضب ہی کر دیا ہے۔

"اگر

یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے

اگر

آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد

سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لئے "وتا" "تا" واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔

آپ!

تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں :"

یہ دیباچہ پوری کتاب سے زیادہ دلچسپ اور پطرس کے سارے مضامین سے زیادہ دل فریب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قلم برداشتہ لا تکر و تردد بیک گردش قلم لکھا گیا ہے اس لئے اس میں اختصار، حقیقت، طنز سبھی موجود ہے۔ خصوصاً آخری چوٹ تو ایسی بھرپور ہے کہ ہر مترجم قسم کا ادیب یا انشا پرداز تڑپ اٹھتا ہے۔ غور فرمائیے سینکڑوں کتابیں ایسی ترجمہ ہوتی ہیں جو لٹریچر کے سر پا ایک بوجھ ہیں۔ کاش یہ مترجمین ترجمہ کرنے سے پہلے اہل ملک سے مشورہ کر لیتے۔ نام بتاؤں تو آپ خفا ہوں گے اس لئے ذرا اردو میں جو ترجمے سامنے سامنے ہیں انہیں دیکھ لیجئے پھر غور فرمائیے کہ پطرس نے کتنی زہریلی گولی شکر میں لپیٹ دی ہے۔

"ہاسٹل میں پڑھنا" آپ کی نظر میں اپنے تئیں مبتلا کرنے کی داستان ہے یا پطرس کی آپ بیتی ہے یا پڑوسی کی؟ آپ صرف یہ ملاحظہ فرمائیے کہ پطرس نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے یا نہیں۔ جب آپ اس نقطۂ نظر سے غور فرمائیں تو آپ کو یہ مضمون صحیح اور بالکل صحیح معلوم ہوگا۔ پرانے لوگوں اور محتاط بزرگوں کا یہی رویہ رہا ہے جو اس مضمون میں پطرس نے اپنے والدین کا بتایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بیشتر طالب علموں پر بیتی ہیں۔ جبکہ اس روشن زمانے میں بھی بعض لڑکے اس میں مبتلا ہیں۔ یہ اچھی ہے یا بری؟ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں، میں اور نہ کوئی اور۔ انسان کی طبائع مختلف ہوتی ہیں اور ہر طبیعت الگ الگ باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ ہاسٹل میں پڑھنا مفید ہے یا غلط، ہاسٹل میں رہنا مضر ہے یا یہ بھی۔ ہم سینکڑوں ایسے لوگوں سے واقف ہیں جنہوں نے ہاسٹل میں رہ کر سگریٹ نہیں پیا، چائے نہیں پی، سینما نہیں دیکھا، اور زیادہ پڑھے اور بہت پاس ہوتے گئے اور سینکڑوں ایسے بزرگوں سے بھی واقف ہیں جو گھر پر اپنی نگرانی میں رکھے گئے تھے مگر سگریٹ کے عادی، چائے کے رسیا، سینما کے شوقین اور دوسری علتوں کے پورے پورے پابند ہو گئے۔ بعضوں نے نہ چھپنے والی کا ذریعہ بھی منہ کالا کیا اور بعض علی الاعلان دلکش رنگوں میں مبتلا ہو گئے۔ پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ دولت شادی کا جو کسی نے کہا ہے کہ "عصمت زن اور تربیت فرزند من جانب اللہ ہے" بالکل صحیح بات ہے۔ اس کیلئے کوئی اصول مقرر ہی نہیں کئے جا سکتے۔

پطرس نے اپنے اس مضمون میں جس عمدگی سے طالب علموں کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور جو خاکہ کھینچا ہے وہ درحقیقت انہیں کا حصہ ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بڑی ہی تفصیل سے لکھا ہے۔ اور پھر بڑا کمال یہ ہے کہ ایک دیہاتی اور قصباتی طالب علم کی پوری پوری نمائندگی کی ہے اور بڑی ہی صفائی سے یہ تک ظاہر کر دیا ہے کہ لندن اور لاہور میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان کی معراج یہ ہے کہ ہر طور ہر طالب علم اپنے والدین اور بزرگوں سے بحث کرنے لگتے ہیں اور شخصیت کی تشریح میں نیاز مند ہو جاتے ہیں تو سیرت میں پناہ لیتے ہیں۔ اور اس کے معنی یا مطلب چال چلن قرار دے کر جب وضاحت کرنا چاہتے ہیں تو پرنسپل صاحب کی جلسۂ تقسیم انعامات والی تقریر کا خیال آتا ہے مگر وہ تو الفاظ میں محفوظ ہی نہیں ہوتی کیونکہ اسے توجہ سے سننے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تھی۔ یہ سارا مضمون اسی معصومانہ ذہنیت کا مظہر اور طالب علمانہ کشمکش ذہنی کا آئینہ ہے جو اپنی طرز کا بہترین مضمون ہے۔

اس مضمون میں جگہ جگہ ایسی "پچی کاری" کی ہے کہ اس کی جدت سے آنکھیں منور ہو جاتی ہیں چنانچہ آخری فقرہ تو لاثانی ہے۔

"یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔"

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" بھی بڑا ہی نفیس مضمون ہے۔ اس سے تقریباً نوے فیصدی قارئین متفق ہوں گے۔ کیونکہ سو میں دس آدمی بھی بمشکل سحر خیز ہوتے ہیں۔ خصوصاً طالب علمی میں تو سحر خیزی بڑی تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ پطرس کی شامت جو آئی تو اپنے ایک پڑوسی سے صبح جگا دینے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور یہ پڑوسی بھی ایسے مستعد ہوتے ہیں کہ سحر کاذب ہی میں پطرس کے کمرے پر دھاوا بول دیتے ہیں اور بمباری شروع کر دیتے ہیں ان کی اس بمباری سے متاثر ہو کر پطرس کے قلم سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل جاتا ہے۔

"یہ سوتوں کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔"

یہ مضمون ہاسٹل والے مضمون کے بعد ہی لکھا گیا ہے اور لکھا اس لئے ہے جیسے ہاسٹل میں رہنے کا ارمان تھا وہ ارمان اس نے اس طرح نکالا ہے۔

سے مقرر ... میت صاحب نے ساتھ بیٹھے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھنے بارہ بجے، تو
سیر ہوئے اور چار بجے کے قریب چوتھی منزل کی سیر کو نکل گئے
تو جب لوٹ کر ہوسٹل میں وارد ہوئے تو وقت شب قریب تھا کہ اس پر شام کا ارمان ابھی تک
ابھی نہایت شدت تھا۔ صحت بھی ذرا اچھی ہو گئی تھی ہم ذرا ترنگ میں گنگناتے ہوئے کمرے
میں داخل ہوئے کہ

جلائیں زلف جاناں کی اگر بیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر!"
ہم اس وقت نہایت پھرتی بجانے لگے تھے سو انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی
طرف لگ گئے ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟ (زور آپ پر) میں نے کہا جی میں کس لائق
ہوں لیکن خیر فرمائیے!
بولے ... وہ میں ... ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

اس خرابی کے بعد پطرس دوسرے پڑوسی کو گھیرتے اور اس سے چھ بجے جگانے کی فرمائش کرتے ہیں اور وہ غریب چھ بجے انہیں جگا بھی
دیتا ہے اس کے بعد کی واردات خود پطرس سے سنئے۔

"اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب ہیں۔ مؤرخوں کے متعلق روایات میں کسی قدر
اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں
میں نے کھول دی تھیں پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت
بھی پڑھا پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچہ کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر پتہ
نہیں شاید لحاف اوپر سے اتار دیا شاید سر اس میں لپیٹ دیا یا شاید کھانسا کہ خدا جانے
خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے
کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے، نہیں ہمارا
خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ
آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔
خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ
قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

دوسرا دن بھی یوں ہی آتا ہے جس کے متعلق پطرس کہتے ہیں :—

"یہ معاملہ مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر
نکالا، اور وردِ زور وظیفہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے اس میں نہ معلوم کیا بھید

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تمہیں چھوڑنا ــ اچھے پرخلوص ...

ان محفلوں ... ایک ... ہوا ... ٹھیک ہے

ٹھیک ہے ... وقت ... ہوا تھا

سچ ... سب سے نمازی ... آپ ... ہیں ... صاحب ہی نے

اس قسم کی دردناک باتیں کہی ہیں ان کی اپنی مخصوص عادت تھی ... بڑے بڑے ... عموماً ... میں

میں ... سطروں کی ... کا ... یہ فقرہ بھی ہے۔

اب تو ہمارا معمول ہو گیا ہے جاگنا نہ ایک چھوٹے سا ... اس دوران میں

لالہ پی آوازدیں تو نازنیں

آپ یہ سمجھ لیں کہ چلیں صرف خوش مذاق کے دلدادہ تھے اور طنز و مزاح اور پیروڈی ہی لکھتے تھے بلکہ یہ بھی جان لیجئے کہ چلیں ایک ادیب

اور انشاپرداز بھی تھے اور لطف لطیف پر بھی انہیں خاصا عبور تھا ذیل کا انشائیہ اسی منقولہ بالا مضمون کا ٹکڑا ہے پڑھیے اور لطف اٹھایئے

"جب دل مرحوم ایک جوان آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے" ہمارا فرش نازک

محو بالش کم خواب ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں

کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں

سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک

آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو

تم جاگو موہن پیارے

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار

طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق

کی گرمی محسوس کر رہا ہو آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور

میں رو حصہ دکردے دو گیت

ساوری صورت توڑ دی من کو کھائی

کے سب تو ہی سر دھوپ میں ڈوب جائے"

یہ بھی ترز سے لطیف مگر اس کے بجائے غریب کوئی خاص محاورات کی زبان سے سنئے۔

"پیٹ سے ہڑ بڑ کی آواز دروازے کی مدد سے سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چپ ہو گئے بعد کلاک کا گھڑیاں دماغ کے رہتے رہتے ہیں دس بجانا شروع کر دیتے ہیں اور میں چار گھنٹے کے عرصے میں گردیوں کے گر پڑنے ... کھڑکیوں کے الٹ جانے دروازوں کے بند ہونے برتنوں کے جھاڑنے کرسیوں کے گھسیٹے کلیاں اور ہوا فسوں کرنے کنگھی کرنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا الگ یہ کھڑکیاں ہیں اندازہ کیجئے کہ ان سازوں میں سرتال کی کس قدر گنجائش ہے"

پطرس کا یہ مضمون ان مضامین میں سے ہے جو انہیں زندہ رکھیں گے۔ اس میں خوش مذاقی، شائستہ لطیف طنز اور روانی بولی ہے اور ایک طالب علم کی ہاسٹل کی زندگی کا پورا پورا نقشہ اس میں موجود ہے۔ مجموعہ کے یہ دو (ان مضمون ۱ پہلا اور دوسرا) ہاسٹل کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ ہوسٹل کی زندگی اس سے زیادہ عمدگی اور لطافت سے پیش کی جا سکتی ہے اور نہ یہ تفصیل کہیں مل سکتی ہے۔

کتے! یہ شاہکار ہے پطرس کا۔ بعض جانوروں سے بعضوں کو نفرت یا خوف ہوتا ہے چنانچہ اس کی تفصیل اکثروں نے لکھی ہے میرا حافظہ جہاں تک کام دے رہا ہے سب سے پہلے "دلدار کا مارا آنا" مضمون نصیر حسین خاں خیال نے لکھا تھا جو ایک آغا صاحب کے بیان کے بلی سے ڈرنے جھگڑنے اور نفرت کرنے کی تفصیل سے پُر ہے یہ بڑا دلچسپ مضمون ہے مگر اس میں وہ لطافت نہیں جو پطرس کے مضمون میں ہے کیونکہ ایک آغا صاحب واقعی بلی سے ڈرتے تھے ان کی حرکات کو دیکھ کر خیال نے یہ مضمون لکھا ہے اس لئے واقعیت زیادہ اور اپج کم ہے بخلاف اس کے پطرس نے اپج ہی اپج پیش کی ہے جو واقعات کے ساتھ مل کر اتنی لطیف ہو گئی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

کتے سے نفرت کرنے والے کا کردار افسانوی صورت میں سمرسٹ ماہم نے بھی پیش کیا ہے (جو بدنصیبی سے بصورت ترجمہ میری نظر سے گذرا ہے اصل میرے دیکھنے میں نہیں آیا) اس میں ایک کتوں سے نفرت کرنے والے کا کردار بڑی چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے مگر یہ کوئی مضمون نہیں افسانہ ہے اس لئے میں افسانے کو اس اپجی مضمون پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

اس موضوع پر اپجی اور واقعاتی مضمون صرف پطرس ہی نے لکھا ہے کتوں اور پھر سڑک کے کتوں سے کون نالاں نہیں۔ پھر ان کا بھونکنا کسے نہیں کھلتا؟ مگر اس بھونکنے اور ایک دوسرے کے سُر ملانے کو مشاعرے سے تشبیہ دینا اور اس نفرت خیز حرکت کو اس نفاست سے بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ دیکھئے یہ کتوں کا مشاعرہ کس عمدگی سے شروع ہوتا ہے۔

".. ... رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی

> لے تو چلے ہی ہے۔ بیٹھے اور ہمارا پہلا مطلع ملا کہ لئے اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔

یہ تو کتوں کے مشاعرے کی روداد تھی جو دیسی کتوں سے متعلق تھا۔ ان دیسی کتوں کی حرکت ایک ... پطرس کو سب سے اچھی وہ ان کی قوم پرستانہ ذہنیت بھی تھی۔

> "اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔"

مگر جس کتا جب ولایتی ہوتا اور صاحب کے بنگلے پر جو کتا ہے تو پطرس اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

> "ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا، خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں، گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔"

کتے سے ڈرنے والے کا حال آپ نے بارہا دیکھا ہوگا مگر اس کی تصویر اس عمدگی سے آپ نہ کھینچ سکیں گے جس چابک دستی سے پطرس نے کھینچی ہے ملاحظہ ہو کتنی سیدھی سادھی واقعی تصویر ہے جس میں مبالغہ یا رنگ آمیزی ذرہ بھی نہیں۔

> "کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے مواقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے مواقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی اس کی جگہ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔"

> بعض اوقات یہ بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے اس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ فرمائیے آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویئے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی لیکن کیا مجال کہ ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔"

یہ خیال۔ کہ پطرس کو بھی کتے نے یا پھر انہوں نے کبھی کتے کو کاٹا ہے جس کی وجہ سے ایسا تنفر، خوف، ڈر یا اختلاف ہے۔ یہ بھی نہیں ہوا چنانچہ اس غلط فہمی کو خود پطرس نے رفع کر دیا ہے۔

> "چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا، اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا
> "کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو"

لیکن

> کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
> مجھے کیا برا تھا مرنا ، اگر ایک بار ہوتا !

کتے کی آواز یا اس کا بھونکنا پطرس کے لئے قہر سے کم نہیں جس طرح چوہے بلی کی میاؤں سے ادھ موا ہو جاتے ہیں اسی طرح پطرس بھی کتے کے بھونکنے سے اپنے آپ کو ملک الموت کے قریب پاتے ہیں اس بھونکنے کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں انہیں سے سنئے۔

> "جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہئے)

لیکن یہ تمکنت دو دفعہ سر ... وہ دوڑ کر تین آدمی کے پیچھے ہی جا نکلتے ہیں ... نہیں آتے
ایک آوارہ سا کتا ... بھی اندازہ لگا کر بھونکتے ہیں ... کی روش ... پہنچتی
ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ گیا، گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب؟ یہ خاکسار
موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں، لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کرے
گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو
معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک
پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دیتا ہے تو آپ ہی کہئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی
طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب)،
بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری)، اس ہنگامے میں دماغ بھلا
خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے
گا؟ بہرحال کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے۔"
اس طرح ... کتوں سے ... در گزر کرتے ہیں مگر نیک کتوں کا ... ہم نے ... بھی ہے ... کیسے ہونے میں ... سکے ۔
خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے
خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب
چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بار گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ
کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند
کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے
نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ
آوازیں دیں، تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت حالات
کو ایک نظر دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے
ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے، اور خیالات کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹ گیا تھا، وہیں
سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔
ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔
رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تابہ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس
سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس
پر پاؤں رکھ دیا، انہوں نے غیظ و غضب کے لہجے میں آپ سے پرسش شروع کر دی: "بچہ!

تیتروں کو چھیڑتا ہے؟ نظر نہیں آتا۔ ہم سارے لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ بس اس تیتر کی بد دعا
سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں
کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے چمٹے ہیں اور چھوڑنے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی
کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔"

یہ تو سب معمولی باتیں تھیں مگر اصل حقیقت جو یہاں ظاہر ہوئی ہے وہ خود پطرس کا جوش انتقام ہے یہ آرزو بھی رکھتا ہے اور سارے کتوں پر بھونکیں ہی نہیں بلکہ کاٹ بھی کھائیں چنانچہ اس آرزو کو انہوں نے ظاہر بھی کر دیا ہے

"اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے
تو جنون انتقام میرے پاس کافی مقدار میں موجود ہے رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی
پہنچ جائیں۔"

جب یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو جھنجھلا کر ان اشعار کی طرف توجہ کی جن میں کتوں کا ذکر آیا ہو چنانچہ سب سے پہلے عرفی کا ایک شعر ذہن میں آگیا بس پھر کیا تھا بے چارے عرفی کی شامت آگئی کہتے ہیں

ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعث ننگ ہے انگریزی میں ایک مثل ہے
کہ ــــ

بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے

یہ بجا سہی مگر کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے

انشا پردازی یہی ہے کہ انشا پرداز کو اتنی قوت حاصل ہو کہ ہر موضوع پر بے تکلف لکھ سکے اور شروع سے آخر تک اپنا رنگ بھی برقرار رکھے یہ بات پطرس میں پوری طرح موجود تھی۔ کتے جیسے حقیر، پامال اور پیش پا افتادہ موضوع پر اتنا جامع، شگفتہ اور رواں دواں مضمون لکھنا ان کا اور صرف ان کا ہی کام تھا ہر شخص اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا

اردو کی آخری کتاب، یہ پیروڈی ہے اور اردو زبان کی سب سے پہلی پیروڈی ہے۔ آپ فرمائیں گے پہلی کس طرح ہوئی پطرس سے پہلے بھی لوگوں نے پیروڈی کی ہے اس کے متعلق میرا یہ جواب ہے کہ پیروڈی کو پیروڈی سمجھ کر، اور پیروڈی کے طور پر سب سے پہلے پطرس نے لکھا ہے۔ ورنہ یوں تو رتن ناتھ سرشار نے جو "خدائی فوجدار" ترجمہ کیا ہے وہ بھی پیروڈی ہے مگر سرشار نے اسے محض ایک مزاحیہ کتاب سمجھ کر ترجمہ کیا ہے پیروڈی کی حیثیت سے انہوں نے کبھی نہیں پیش کیا اور اگر پیش بھی کیا تو غیر کا مال تھا جسے صرف ترجمہ کیا گیا، خود سرشار نے کوئی پیروڈی نہیں لکھی اس کے بعد سجاد حسین نے حاجی بغلول میں مولویوں کا مذاق اڑایا اور مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد میں حاجی بغلول یا بلغ العلام سے دو تین بزرگوں نے اسی طرح مولویوں کا مذاق اڑایا جسے آخر میں ملا رموزی نے گلابی اردو بنا کر اپنا مستقل رنگ ہی بنا لیا تھا مگر یہ پیروڈی نہ تھی یہ مولویوں کا منہ چڑھاتے چڑھاتے خود ان لوگوں

سفر نامہ سنئے پڑھا گیا تھا اور خود ۶ میں تبرہ حق کر کے

لے منہ بھی چومنے دیتے تھے آپ یاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

بہ حال ان نزولوں و ماں میں ملع سعاد و مزاح کی [illegible] نظم [illegible] ہے تو ہے گیا بچہ تھا وہ پیروڈی بھی کو زک تھی [illegible]
حقیقت میں پیروڈی تھی

پیروڈی لوگ سے پہلے لوگوں سے پایا اور اردو میں پہلی کوشش [illegible] کی تو کی وہ اردو ادب کی [illegible] ہے پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مولانا
محمد حسین آزاد سے ایک سلسلہ اردو نصاب کا مرتب کرایا تھا جو سلسلہ [illegible] میں آگیا [illegible] کی پہلی کتاب [illegible] ان کے نوگوں میں سے بھی
ہے تھا اس لیے کہ [illegible] "ماں بچوں کی کتاب" کہتے تھے۔ اسی نام [illegible] تھا اس سلسلے میں "ماں بچوں" کے نام سے مشہور کر دیا گیا اور اس
بچوں کی پہلی ماں بچوں کی [illegible] ماں بچوں کی سیر کی کتاب کھلائے گی [illegible] یہ سلسلہ ترکیب سے بہت تھا اور پطرس کے علم [illegible] کی زبانی
معلوم نہیں کہ کب سے اس کے متعلق سوچ رہے تھے آخر وہ نہ رکے [illegible] یہ پیروڈی لکھ دی۔
اس پیروڈی کو لکھتے وقت پطرس کے آگے صحافی پروگرام تھا [illegible] تدریس کی مقصدیت طریقہ تھا [illegible] مزاح نہایت
ہی مختصر ہے یا چالیس سطر کی پیروڈی ہے مگر پطرس نے جان ڈال دی ہے
ماں بچے کے سبق کا خاکہ انہوں نے اس طرح اڑایا ہے

"ماں کی مصیبت"

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا
ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ
کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

۱۔ وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟
۲۔ بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔
۳۔ دولہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں
۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟
۵۔ تو کب کمائے گا؟
۶۔ آپ کب کمائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو
بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ
ہو جاتا ہے جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے تو یہ بے چین
ہو جاتی ہے سامنے بگڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اچھی لٹا دیتی ہے۔ رات کو
اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک

پڑتے ہیں اور چلتے ہوئے ان سے ساز [illegible] بجتے ہیں۔ بجلی ندی میں دسنے مقابلے میں ہے تب بھی پانی مانا
کی رنگ [illegible] جاکر [illegible] ایک [illegible] ہیں ہے جب [illegible] کلتی ہے تو آپ بھی
[illegible] تت [illegible] کے [illegible] دن چڑھے منہ اندھیرے آنکھوں میں
[illegible] [illegible] کرتی ہے [illegible] اصل [illegible]"

[illegible] سب [illegible] ملاحظہ فرمائیے یہ [illegible] کی پیروڈی ہے "[illegible] رہا ہے" [illegible]
[illegible] رہا ہے

"کھانا [illegible] آپ [illegible] ہی ہے ورنہ اصل میں کام میاں کا ہے [illegible] کیا [illegible]
[illegible] صندوق [illegible] صندوں [illegible] ابھار
بیچ [illegible] ہیں [illegible] کسی میں [illegible] کسی میں [illegible] اور
پانی کا [illegible] پاس ہے کہ جب چاہے آگ جلائے جب چاہے پانی [illegible] گرد
[illegible] چاول [illegible] چولہے میں [illegible] تار [illegible] ہیں [illegible] ہے [illegible] کام
[illegible] ہے لیکن یہ پھر بھی [illegible] میاں جب آتے ہیں کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے پیچھے کبھی
نہیں رکھتی۔ کھانا پکنے پر [illegible] دیتی ہے [illegible] تو میاں کے سامنے
ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سیتی [illegible]
ہے کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے کیوں نہ ہو بابا گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں آپ
[illegible] جائے تو ڈاکٹروں سے علاج کروانا پڑے"

[illegible] تیسرا شہپارہ جس کا عنوان "دھوبی کپڑے دھو رہا ہے" [illegible] یوں پڑھتا ہے
"دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے شام کو بھٹی چڑھاتا ہے دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی بیل پر
[illegible] لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑے والے
کبھی [illegible] جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم
میں کام کرتا ہے دوپہر ہونے کو آئی۔ اب تک پانی میں کھڑا ہے راستے [illegible] شام ہو جائے
گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے دریا کے اس پار ایک
[illegible] دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔
دیکھا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا کپڑا پڑے پر رکھ کر اس سے باتیں
کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے اب دھوبن گانا گائے گی دھوبی دریا سے نکلے گا
دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا

یہاں ایک ایسا [illegible] ہاں ہے [illegible] صاحب [illegible] کی [illegible]
جو کیا اسے دیکھا [illegible] کے لئے [illegible] میں [illegible] پاس [illegible]
[illegible] سے [illegible] ہیں [illegible]
وہ بہت [illegible] صاف [illegible]

[illegible] لطف [illegible] کتاب [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] کتاب [illegible] نقل [illegible]

اس [illegible] کتاب [illegible] جملے [illegible] کی [illegible]
نگاری کی پہلی کوشش [illegible] کامیاب [illegible] ہے [illegible] کوشش [illegible]
[illegible] مضمون [illegible] ہے [illegible] سال [illegible]
وسطانی جماعتوں کے لئے [illegible] کا [illegible]

اب [illegible] کے ساتھ تمہید [illegible]

• لاہور لاہور ہے اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع بیان ہوتے ہوئے دو بڑی غلط فہمیاں رفع کی ہیں ایک یہ کہ

• لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب جو پنج آب تھا اب پنج آب نہیں رہا [illegible] پنج دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں دریا لیٹا رہتا ہے بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے اس لئے اب یہ بتانا مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

دوسری غلط فہمی اس طرح رفع کی ہے۔

• لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ جغرافیہ میں بڑی چیز ہے پطرس نے بڑی خوبی سے لاہور کے حدود اربعہ بیان کئے ہیں۔

"کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبا کی سہولت کے لئے
یونیورسٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے، اور
روز بروز واقع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک
صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔"

آب و ہوا میں پطرس نے جو ندرت پیدا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے سنئے۔

"لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب
غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ
اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس
نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے، اور
لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ
غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ
مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری
سے کام لیں چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص
حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے
لئے مرکز کھول دیئے ہیں جہاں یہ مرکب مفت تقسیم ہوتا ہے۔"

آب رسانی کی جو تفصیل لکھی ہے وہ تو بس غضب کی ہے۔

"پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر
نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے
ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی
کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر
آسکے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لئے نل
ضروری ہیں چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیئے ہیں۔ فی الحال
ان میں آکسیجن اور ہائیڈروجن بھری ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ
گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ
نکلتے ہیں اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ

عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ سنہرے لمحوں میں بہت خوب کہا ہے
کہ:

"عجائب گھر میں جو چیزیں حفاظت سے رکھی گئی ہیں وہ قابل دید ہیں :-

چونکہ کھدائی کا کام ماہرین کے ہاتھوں میں ہے اس لئے ان میں سے بہت اہم
سے اہم چیزیں حاصل ہوئی ہیں اور یہ آثار قدیمہ پر ہی ختم ہوتی ہے۔
اور ہر عجائب گھر کی نمائش سے دیکھی جاتی ہے جن میں کسی قسم کا تو ان کو شیشہ بند
جاتا، وہ قدیم تاریخ کا حصہ ہے اور خندق جس کی تہوں میں انہوں نے اپنی سلطنتوں سے گئے
اٹھائے، گئے آج کل ہم کو ان کے تحفے یہاں ملتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر
انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تحفوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پیسے
لگا لیتے ہیں اور سامنے در لگا کر اس میں ایک گھڑا لٹکا دیتے ہیں۔ اصلاح میں اس
کو کانا لگا کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ ڈال دیتے ہیں تاکہ دیکھنے میں سہولت ہو،
اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خاص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام کرتے ہیں قصابوں کی دکانوں پر
ان کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے تانگوں میں ان کی بجائے سائیکل گھوڑے
استعمال کئے جاتے ہیں بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے کیونکہ
اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے حرکت کرتے وقت اپنی دم کو
دبا لیتا ہے اور اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک
کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک
مسام لطف اندوز ہو سکے۔"

قابل دید مقامات بھی بڑے ہی لطیف ہیں یوں تو یہ سارا مضمون طنز کی ضرب ہے مگر یہ پارہ تو بڑا ہی گہرا طنز ہے سنئے :-

"لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت
کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور
پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا ہی جاتا ہے، شروع
شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں مثلاً "اہل
لاہور کو مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے
مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً گریجویٹ درزی ہاؤس یا سٹوڈنٹوں کیلئے

دور میں یہ کھیتی ہے کہ کس طرح خدا نما سا نکیا، رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائریکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے، دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر کمپنی سرا دھت کے جلسے کا پروگرام ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے متائج حالات پر وضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ جتنی دیوار پر سرکس کے تماشہ گروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نورجہاں کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوائے گئے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا جلسہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی اطلاع شہر والوں میں ہر کسی چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو دقت پیش آتی ہے

لیکن جب سے لاہور میں یہ دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے دیوار پر خوش نقش کر دئے جاتے ہیں یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دوامی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹتے وقت وہاں مالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے چنانچہ اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں "بجرت علی" "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ انقلاب کا دفتر ہے جہاں "بجلی پانی پنجاب کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "قاسم تیمی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب کا مکان ہے "کرشنا بوٹ کریم" تالا مار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت میں تو پطرس نے کمال کر دیا ہے لکھا ہے۔۔

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالہ کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے، اور فن تنقید ترقی کرتا ہے

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں چونکہ ان انجمنوں کے اغراض

[illegible]

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تمھیں کی ہوتی ہیں یہ سب کی تصویر ہے [illegible] کے بچے [illegible] چھوٹے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے ان کا شکوہ و جلال دیدنی ہوتا ہے [illegible] ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکلتے ہیں اور [illegible] فخر سے تنتے ہوئے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی اس لیے ہوسٹل میں [illegible] نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے یہ اکثر روپ اور اخلاق [illegible] اور جمہوریت پر آزادانہ تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں آرٹ اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے ہیں۔ جسمانی صحت کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے علی الصباح پانچ چھ ڈنڈ پیلتے ہیں۔ اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے مزے میں لیکن اکثر بے سُرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خاکی طلبا کی ہے یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں

جیتے اور تعلیم الانساب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح
بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح
سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف
قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی ماں کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں ان کی
وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر یہ شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ سے صرف وہی لوگ پروفیسر
مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات میں کوئی خاص بات نہیں بتائی گئی صرف یہ لکھا گیا ہے کہ
"لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں"

البتہ سوالات بڑے ہی لطیف ہیں بسم اللہ آپ بھی ان کے جواب دیجئے:

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

لیجئے اس شان سے یہ طنزیہ شاہ کار ختم ہوتا ہے اس میں پیروڈی کا کمال طنز کی انتہا اور مزاح کا لطیف ترین پہلو موجود ہے پڑھتے اور مزے لیتے جائیے۔ کاش پطرس ایسے ہی دو چار مضامین اور لکھتے جو اردو ادب کی جان ہوتے۔ یہ دونوں مضامین ان کی جوانی کی امنگوں کے زمانے کے ہیں بعد میں وہ اس قسم کے مضامین اگر چاہتے بھی تو لکھ نہ سکتے۔

ابتدا طنز و مزاح مجھے بھی پسند تھا اور میں نے بھی چند مضامین لکھے جن میں سے دو ایک مضمون پطرس نے بہت پسند کئے تھے مگر وہ مضامین بھی میں نے اسی عمر میں لکھے تھے جس عمر میں پطرس نے یہ مضامین لکھے ہیں۔ اس عمر کے بعد یعنی چہل سال عمر عزیز گذار کر میں نے پھر ویسے ہی مضامین لکھنے کی کوشش کی تو کامیابی نہ ہو سکی

مزاح نگاری اور طنز نویسی کا تعلق اپچ سے ہے جس شخص میں جتنی اپچ ہوگی وہ اتنا ہی بہترین مزاح نگار اور طنز نویس ہوگا مگر یہ اپچ عنفوان شباب سے شروع ہو کر تیس پینتیس برس کی عمر میں ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں شک نہیں کہ خیالات میں پختگی طرز تحریر میں لوچ اور اپنا ایک اسلوب اور ڈھنگ الگ ضرور بن جاتا ہے مگر وہ جو چیز اپچ کہلاتی ہے باقی نہیں رہتی اب کہنے کو یوں کہہ دیجئے

گھٹا نہ زور مشق سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

مگر حقیقت یہ ہے کہ لطافت تحریر اور قلمی البیلا پن مفقود ہو جاتا ہے۔

"میں ایک میاں ہوں" یہ سو فیصدی مزاحیہ مضمون ہے ممکن ہے اس میں تھوڑی بہت حقیقت بھی ہو یا پھر بالکل ہی فرضی ہو مگر ہے بڑا ہی لطیف مضمون، اس میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جو ایک شادی شدہ اور نئے شادی شدہ نوجوان کو پیش آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے ان سب دوستوں سے جلنے لگتی ہے جو اس وجہ سے تکلف اور چہیتے ہوں کیونکہ اسے ایک قسم کی رقابت محسوس ہوتی ہے وہ یہ چاہتی ہے کہ ہر طرح صرف وہی اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز بنی رہے ولی اور شخص یا اشخاص اس میں حصہ دار نہ ہوں یہ عورت کی فطرت ہے اس لئے یہ مطالبہ بالکل فطری ہے اس سے کچھ کا... مرد کا نظریہ یہ ہے کہ عورت پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ دوستوں سے آپ کو محبت ہے یا آپ کے دوست آپ سے محبت کرتے ہیں چنانچہ اسی حقیقت کو پطرس نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں بیان کیا ہے جو کہ "

دل روشن آرا کا اور پھر بیاں ہیا

ہے اس سے شوخی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

ہر شخص کی جب شادی ہوتی ہے تو اسے ابتداءً اپنی زندگی میں تبدیلی دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ یہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور پھر وہ وہی تنہائی اور بے لگامی پسند کرنے لگتا ہے چنانچہ اس متاہلانہ زندگی میں اگر اتفاقاً بیوی سے تھوڑی بہت عارضی دوری کا موقع مل جائے تو فوراً خوش ہو جاتا اور بڑی مسرت کا اظہار کرنے لگتا ہے مگر صرف چند گھنٹوں تک اس کے بعد پھر یہ عمل شروع ہوتا ہے اور تنہائی بری طرح ستانے لگتی ہے چنانچہ پطرس نے بھی اسی تجربے کو بڑی ہی سادگی سے لکھ دیا ہے۔ وہ بیوی کے جانے کے بعد جتنے خوش تھے ایک رات گزرتے ہی اتنے ہی مغموم ہو گئے اور نہ صرف مغموم ہوئے بلکہ بیوی کو تار دے دیا کہ "فوراً آ جاؤ"۔

گھر خالی ہو اور بے تکلف احباب جمع ہو جائیں تو جوانی میں بالکل یہی کیفیت ہوتی ہے جو تاش کھیلنے میں پطرس کی ہوئی چنانچہ جو بنے ہوئے چلم بدست کلاہ کاغذی بر سر روسیاہی کے عالم میں بیوی نے دیکھ لیا اس کے بعد کی کیفیت پطرس کہتے ہیں۔

"روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی
اور پھر کہنے لگی ... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز میرے کانوں تک
جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔"

اس کے بعد پطرس نے صفائی پیش کی ہے گو یہ حصہ وہ نہ لکھتے تب بھی تو بہتر تھا اس خلاصے پر بھی قاری سب کچھ سمجھ لیتا دیکھ لیتا پا لیتا سوچ لیتا اور محسوس کر لیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون بڑا ہی نفیس ہے یہ کلاہ کاغذی جس کے سر پر رکھ دیجئے بقول بن جاتا ہے صاحب ذوق جوانوں میں اسی فیصدی ایسے نظر آئیں گے جن پر اس قسم کے حادثات گزر چکے ہیں مگر دس فیصدی بھی اتنے صاحب کردار نظر نہ آئیں گے جو ڈنکے کی چوٹ ان حادثات کا ذکر کر سکیں اور اگر وہ ایک ہمت کر بھی لیں تو انہیں اسلوب نگارش نصیب نہ ہو سکے گا۔

بظاہر ایک سیدھا سادا سا واقعہ بیان کر دینا کوئی بات نہیں مگر اس عمدگی اس تسلسل اس ہم آہنگی اس روانی اس ڈھٹائی اس صفائی اس شوخی اس شستگی اس خوب صورتی اس نفاست اس ندرت اور اس ہمت سے لکھنا کمال ہے اور یہ کمال پطرس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔

"مرید پور کا پیر" یہ مضمون پطرس نے معلوم نہیں کسی ایک شخص کو سامنے رکھ کر لکھا ہے یا کئی ایک اشخاص کو کیونکہ یہ بعض خاص خاص لوگوں کی چٹکی کھاتا ہے ممکن ہے محض قیاسی اور ذہنی ہو مگر ہے بڑی اچھی چیز، بیشتر حضرات اس قسم کے بن چکے ہیں۔ چنانچہ میں بھی ذاتی طور پر مرید پور کے کئی ایک پیروں سے واقف ہوں جو لیڈر بنتے بنتے رہ گئے اور رہے بھی تو ایسے کہ کہیں کے نہ رہے، نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

ایسے ہی ایک بزرگ کو ادھر ادھر سے مرعوب ہو کر کسی اور کا نام لینا پڑ جاتا ہے جس میں خلل ڈال لیا تھا اس سے پطرس نے بچے آپ ہی کو مدیر اور کاہن ثابت کرنے کیلئے کہ آپ بار بار دیکھ کر پطرس میں سیڈرن کا ایک جو سلسلہ تھا اور نہ دوستی نہ ذوق کے ذریعے شہرت پیدا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کے سب تعلقات دوست سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کس کی مثل پیدا کی گئی ہے۔ اب مسٹر سائکس صاحب ہی پر روشنی ڈالیں اور مدیر پورے پیرائے میں تبصرہ کریں۔

ایک جاہل اور سیاسیات سے ناواقف شخص لیڈر بننے کے لئے کس طرح کوشاں رہتا ہے اور لیڈری کی تیاری کس طرح کرتا ہے یہ مضمون آپ کو ساری تفصیل سمجھا دے گا۔ اگر اسے پڑھ کر آپ بھی لیڈری فرمانے لگیں تو بسم اللہ!

"انجام بخیر" پڑھ کر پھر فوراً معلوم ہوتا ہے کہ پطرس نے اس عمدگی سے اپنایا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ اسے آپ چاہے مکالمہ کہیں یا ایک ایکٹ کا ڈرامہ، یہ ڈرامہ بہرحال بڑی ہی عمدہ چیز ہے۔

"سینما کا عشق" بقول پطرس اس مضمون کا عنوان موزوں نہیں ہے مگر اس کے پڑھنے کے بعد تمام توقعات پوری ہو جاتی ہیں کیونکہ اس میں پطرس نے ہم پر دل کے داغ دکھائے ہیں۔

دراصل یہ جو نام ہے پطرس کے دوست مرزا کا اور ان کا کردار میں کے پطرس نے اپنا غصہ دور کیا ہے۔ ایسے دوست اکثر ہوتے ہیں اور ان سے نباہنا پڑتا ہے۔ ایسے دوست جب ساتھ نہیں ہوتے تو ان کی بے تکلفی یاد آتی ہے اور ان کی تفریح کے وقت ساتھ لے جاتے ہیں۔ اب چنانچہ پطرس نے کس ایسی ہی دوستی پائی ہے وہ جب بھی سینما دیکھنا چاہتے ہیں مرزا کو ساتھ لے جاتے ہیں اور مرزا اپنی کاہلی کی وجہ سے وقت پر پہنچتے ہی نہیں اور پھر سینما دیر سے پہنچنے کے بعد جو دقتیں ہوتی ہیں ان کی بعینہ تفصیل پطرس نے لکھی ہے۔ یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب کہ بولنے فلم شروع نہیں ہوئے تھے، ساکت فلم تھے۔ ایسے فلم میں درمیان میں پہنچنے، فلم شروع ہونے کے بعد پہنچنا کس قدر فضول ہوتا تھا کیونکہ ان کا سمجھنا اور کہانیاں ملانا مشکل ہو جاتا تھا صرف اس قدر سمجھ سکتے تھے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ وقت اور روپیہ خراب کرنے کے بعد اتنی سی بات معلوم کرنے سینما پہنچنا تو نہایت ہی دیوانہ پن ہے۔ اسی بات پر پطرس کو غصہ آتا ہے اور وہ دل کی بھڑاس اس مضمون میں نکال لیتے ہیں۔

یہ مضمون اپنی روانی، تسلسل اور زور کے لحاظ سے بڑا ہی یکساں، دلچسپ اور پرمزہ ہے۔ اس میں انسانی جھنجھلاہٹ کے سارے پہلو نمایاں کئے گئے ہیں اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے۔ یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے۔ جسے لوگ صرف واقعات کا اظہار سمجھ کر بھی پڑھ لیتے ہیں اور صاحبانِ بصیرت اس سے عبرت بھی حاصل کرتے ہیں اور اہلِ دل اس کے طنز سے لطف اٹھاتے ہیں۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ کسی کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں کسی واقعی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی ایک سادہ لوحی کا نقشِ جمیل ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک روز پطرس کو اپنی "پیدل زندگی" پر کوفت ہونے لگی، اور انہوں نے مرزا سے گفتگو کی تو مرزا نے عجیب و غریب رویہ کا اظہار کیا۔ اس پر نتیجہ کہ انہوں نے موٹر کی خریداری کا ارادہ ظاہر کیا اور مرزا نے سنجیدگی سے موٹر کی قیمت کی ادائیگی کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ بالآخر موٹر کی بجائے سائیکل کی خریداری طے ہوئی تو مرزا نے اپنی سائیکل پیش کی کہ بلا قیمت لے لو، مگر پطرس کو بلا قیمت سائیکل قبول کرنے سے انکار رہا اور انہوں نے مبلغ پالیس روپے سائیکل کی قیمت کے طور پر مرزا کی جیب میں ڈال دیئے۔ اور اسی رات ہی میں مرزا نے سائیکل بھجوا دی۔ جسے

جب پطرس نے دیکھا تو خوشی خوشی اس پر سوار ہو کر سیر کو چلے۔ یہ سائکل ان کی تخلیقات میں سے تھی مجاز کارنگ ہو گئی تھی اب اس پر جو گزری ہو گا کیا حال ہوا۔ اس کی تفصیل پطرس نے جس چابک دستی سے لکھی ہے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اس طرح کا ایک مضمون یا مضمون میں اسی طرح کا ایک پارہ سجاد حیدر یلدرم نے بھی آج سے پچاس سال پہلے لکھا ہے اور اس کے پڑھنے میں ... لطف ... لکھنے کے بعد جو بات پطرس نے پیدا کی ہے وہ سجاد حیدر کو نصیب نہ ہو سکی تھی۔

اس مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو بے ہودہ ہو۔ کوئی عبارت ایسی نہیں جو مضحکہ خیز ہو۔ صرف سائیکل پر سیر کی کیفیت کی تفصیل نہایت معصومانہ اور سیدھے سادے الفاظ میں ہے جو کمال ہے پطرس کی انشا پردازی کا۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص پڑھے اور مارے ہنسی کے لیٹ نہ جائے۔ جو ہو سکے پطرس کے مرحوم کی یاد میں یہ شاہکار ہے تو صرف بے ساختہ ہے بلکہ انہی کی فن کاری سے لکھا گیا ہے کیونکہ اس سیکل سے اگر پیچ و تاب کھاتے ہوئے ... میں ڈال آتے ہیں اس سے انہوں نے مرحوم فرض کیا ہے اور اس قصہ کو مرحوم کی یاد سے تعبیر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی لطیف طنز و مزاح کا آئینہ ہے۔

اس مضمون میں پطرس نے سماجیت، ثقافت، تہذیب، تمدن، روزمرہ زندگی اور فطرت انسانی کے بڑے بڑے مسئلے حل کر دئے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔" دیکھئے نفسیات کا کتنا پیچیدہ مسئلہ اس نکتے نے حل کر دیا۔ اس کے بعد کمیونسٹ ذہنیت کا نقشہ کس صفائی سے کھینچا ہے۔

"میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں مجھے مذہب کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔"

فرمائیے اس سے بہتر تشریح کمیونسٹ ذہنیت کی کوئی کر سکتا ہے۔ اور اس پر اس سے بہتر طنز کبھی آپ نے سنی ہے؟ پیدل روی اور انسانی پیدل زندگی سے متعلق پطرس کی ہیں جب مرزا پر اثر نہیں کرتی تو پطرس ان سے یوں انتقام لیتے ہیں:

"میں نے اپنے دانت پیس لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف بڑھا دیا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔"

آپ جانتے ہیں پطرس نے مرزا سے کیا کہا؟ صرف اتنا "مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں" اور پھر اس کی توضیح و تشریح بھی الفاظ و اشارات سے کی مگر مرزا بھی ایسا خبیث تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اس نے "ہوں" پر گزارا کیا اور مسلسل "ہوں" کی رٹ لگا دی جس سے پطرس بگڑ گئے اور ...

"میں نے کہا مرزا صاحب یہ تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج کی درگاہ پر دو دو تین تین برس پیشانی گھسی ہے اور اس کے علاوہ کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھر سے نہیں سیکھے جاتے پھر بھی اس وقت تمہارا کلام موزوں سے آگے نہیں بڑھتا اتنا میں سمجھتا ہوں اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عرفی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مگر مرزا نے بڑی دھیمی آواز سے پوچھا

"تم نے کہا تھا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحب اسے خرید کر ایک ایسا عمل کرو کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے وغیرہ کا بندوبست تو کوئی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

اس کے بعد پطرس نے اپنی قیمتی اشیاء بیچ کر موٹر کی قیمت جمع کرنی چاہی مثلاً سگریٹ کیس وغیرہ مگر یہ قیمتی اشیاء بہت ہی کم قیمت ثابت ہونے لگیں مجبوراً اس خیال کو ترک کر دینا پڑا اگر مرزا نے حق دوستی ادا کر دیا اور اپنی سائیکل مفت دینے کی پیش کش کی اس پیش کش سے پطرس کو کتنی مسرت ہوئی ان الفاظ سے ظاہر ہے —

"ایسے موقع پر جو مسرت میں نے محسوس کی اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، بہتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ واپس نہ آئیں۔"

اس کے بعد بڑی دیر تک یہ واقعہ ہوتی رہی کہ پطرس مفت لینے کو تیار نہ تھے اور مرزا مفت دینے کے خواہشمند تھے بالآخر طے ہوا کہ پطرس قیمت مرزا کی جیب میں ڈال دیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا تو چالیس روپے ملے جن میں سے چالیس روپے انہوں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور مرزا چلتے بنے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ مرزا نے رات ہی کو سائیکل بھجوا دی تھی۔ اور ایک اوزار بھی ساتھ ہی بھجوا دیا تھا یہ سائیکل کیسی تھی پطرس ہی سے سنئے: —

"رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو مرزا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔"

اس ناکارہ بائیسکل پر جسے مرزا نے سائیکل بتایا تھا اور پطرس بھی سائیکل ہی سمجھ رہے تھے پطرس سوار ہوئے اور تماشا بنے ہوئے گھومتے رہے بالآخر تنگ ہو کر ایک مستری کی دکان پر پہنچے تو اس نے درستی کی اجرت چالیس روپے مانگی مگر انہوں نے پوری مشین درست نہیں کرائی صرف ہینڈل اور سیٹ (گدی) اونچی کر کے کسا دی اور دو آنے پیسے دے کر جانے لگے تو مستری نے کہا۔

"میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

اس پر پطرس نے فرمایا

"بدتمیز کہیں کا، تو دو آنے پیسے مفت میں لے رہا ہے؟"

مستری بھی دلیوں میں ہنستا رہا۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا

"جناب! آپ کا بائیسکل بھی تو مفت میں لی ہوئی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا [illegible] یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ سچائی تو یہ ہے [illegible] بائیسکل [illegible]"

یہ سن کر پطرس بگڑے کہ

"وہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر آیا جایا کرتے تھے۔ ان کو ابھی بائیسکل چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مگر مستری نے ترکے جواب دیا

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔"

اس بات چیت سے اندازہ کیجئے کہ مستری نے گھوڑے کی بابت جو یہ کہا تھا کہ آدم اسی پر سوار ہو کر جنت سے نکل آئے تھے اسی طرح یہ بائیسکل بھی وہی تھی جو موجد نے پہلے پہل تخلیق کی تھی۔

اس طرح مستری سے تنگ آ کر پطرس نے اس مشین کو فروخت کر دینا ہی مناسب سمجھا چنانچہ ایک دکاندار کو دکھایا تو اس نے بڑی رد و قدح کے بعد تین روپے قیمت لگائی۔ یہ سن کر پطرس کا خون کھول اٹھا اور انہوں نے غصے سے کہا

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے کمینے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بے ہودہ گفتاری سے اس بے جان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔"

اسی غصے میں وہ اچھل کر سیکل پر سوار ہو گئے اور لگے اندھا دھند پاؤں چلانے مگر بمشکل بیس قدم گئے ہوں گے کہ ایک پہیہ ہی الگ ہو گیا اور حضرت گر گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سائیکل کا باقی ماندہ حصہ اور علیحدہ شدہ پہیہ ہاتھ میں لئے وہاں سے رفو چکر ہو جاتے چنانچہ ایسا ہی کیا مگر راستہ والوں کے نعرے، پھبتیاں، جب برداشت نہ ہو سکے تو بوجھ اٹھائے ہوئے سیدھے دریا پر پہنچے اور پل پر کھڑے ہو کر یہ کمبخت غرق کر دیا اور پھر مرزا کے گھر پہنچ کر اس اوزار کو جسے مرزا نے سائیکل کے ساتھ دیا تھا یہ کہہ کر نذر کر دیا کہ

"مرزا صاحب! آپ ہی اس اوزار کو شوق فرمایا کیجئے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

پھر وہاں سے گھر آ کر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا جو ایک مدت سے پڑی تھی۔ معلوم نہیں اس مطالعے سے بم بنانے کا نسخہ معلوم کرنا تھا یا خودکشی کے لئے زہر کا انتخاب مقصود تھا۔ بہرحال صرف اتنی سرگزشت سیکل کی تھی۔

"میبل اور میں" یہ ایک افسانہ اور طنزیہ افسانہ ہے۔ مرد عام طور پر نیک اور سادہ لوح واقع ہوا ہے وہ ہمیشہ عورت کو نیک اور معصوم سمجھتا ہے اور پھر اگر تعلیم یافتہ مرد ہو اور عورت یورپ کی ہو تو اس کی نیک نیتی اور سادہ لوحی اور بڑھ جاتی ہے چنانچہ ایسا ہی معاملہ میبل سے ہوا ہے۔ عورت ہمیشہ مرد کو دھوکہ دیتی ہے اور شرماتی نہیں مگر مرد کسی عورت کو کبھی دھوکا دیتا ہے تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے چنانچہ یہی اس افسانے کا ماحصل ہے شکر ہے کہ یہ عقیدہ پطرس پر میبل کی وجہ سے عنفوان شباب ہی میں حل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ آئندہ زندگی خصوصاً آخری زندگی میں محفوظ اور مطمئن رہ سکے ورنہ بڑے پریشان ہوتے۔

بس یہ کائنات ہے پطرس کے مضامین کی اتنے ہی مضامین ان کے مجموعہ میں ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ان کی طالب علمی کے زمانے کے چند اور مضامین بھی ہیں جو راوی میں چھپتے رہے۔ پطرس نے کالج راوی · شاید امتحان کے تب بھی کئے ہیں مگر افسوس کہ وہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہیں۔

پطرس نے اس ساٹھ سالہ مدت میں بہت کم لکھا ہے۔ ان کی نگارش کی ابتدا تقریباً بیس سال عمر سے ہوتی ہے۔ اس طرح وہ چالیس سال لکھتے رہے مگر اس چالیس سال کی قلم کاری اگر اکٹھی کی جائے تو بہ مشکل نقوش کے تین سو صفحات پر محیط ہو سکے گی مگر یہ کمی دراصل انشاپردازی کی زیبائی سے متاثر نہیں ہوتی انشا میں اصل چیز ندرت اور نفاست ہے بہتات نہیں ورنہ بعض کم سوادوں نے آٹھ دس سال میں ہزاروں صفحات سیاہ کر دئیے ہیں مگر ان کی نگارش میں کوئی بات نہیں۔ پطرس نے انگریزی ادب کی روح کو ہندوستانی مزاج دے کر اپنی نگارش میں ایک خاص لطف، نکھار اور گھر رکھاؤ پیدا کر لیا تھا جو اپنی وضع کی ایک ہی چیز ہے۔

پطرس کی موت نے علم و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کی ایک ہی صورت ہے کہ ان کا پورا کلام اکٹھا کر کے شائع کیا جائے اور لوگ ان کی پیروی کی کوشش کریں۔ کاش طفیل صاحب اس پطرس نمبر میں پطرس کا پورا کلام شریک کر دیں یہ بہترین خراج عقیدت ہوگا پطرس کی روح کو۔

افسوس ہے کہ طفیل صاحب نے مجھ سے ایسے وقت میں مضمون کی خواہش کی ہے جبکہ میں دمہ اور خفقان کے دورے میں مبتلا ہوں اس پر ان کا تقاضا بھی ہو رہا ہے بہرحال اس مضمون کو میں نے بڑے ہی ناسازگار حالات میں ختم کیا ہے اگر پطرس کا حق مجھ پر نہ ہوتا تو تقاضا یہ نہ لکھ سکتا مگر مرحوم کا حق مجھ پر ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ انہیں خراج عقیدت ادا کروں، رہا مضمون کی ناہمواری اور بے ترتیبی اس کے لئے مجبور ہوں کیونکہ علالت کی وجہ سے دل قابو میں ہے نہ دماغ نہ قلم۔

پطرس کی تحریف نگاری

وزیر آغا

پطرس کی تحریف نگاری کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل تحریف یا پیروڈی کے مزاج کے بارے میں چند باتوں کا اظہار ضروری ہے۔
پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی نقل یا نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ تحریف کا بنیادی اور امتیازی عنصر "نقل" ہے لیکن نقل بذاتہ کوئی مضحک پہلو پیدا نہیں کرتی۔ مثلاً فیشن ایک خاص انداز یا انداز ملبوس کی نقل ہی تو ہے لیکن یہ اساساً سنجیدگی سے متصف ہے۔ اور ہنسی کو تحریک نہیں دیتا۔ اسی طرح بچے غیر ارادی طور پر اپنے بڑوں کے اعمال کی نقل کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور دراصل یہ نقل فطرت کا وہ طریق کار ہے جو تجربے کے عمل کو کلیتہً ترک کر کے تہذیبی ارتقا کی دوڑ میں انسان کو سرگرم عمل کرتا اور اسے جلد از جلد گزرے ہوئے تہذیبی مراحل سے آشنا کرتا ہے لیکن جب یہی نقل اس مقصد کے ساتھ عالم وجود میں آئے کہ اصل کی تضحیک سے سامان خندہ بہم پہنچ سکے تو تحریف یا پیروڈی کی صف میں شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ تحریف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ تحریف عمل اشیاء یا تخلیقات کی "عظمت" کو زندگی کے غیر اہم مظاہر سے وابستہ کر کے "عظمت" کے سحر کا پردہ چاک کرتی اور ناظر کو کھلکھلا کے ہنسنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دراصل تحریف کی کامیابی کا راز بھی اسی بات میں ہے کہ یہ عقیدت، جذباتی وارفتگی اور اندھا دھند تقلید کے عمل اور اس عمل کی بیزار کن یکسانیت کا ناظر کو احساس دلا سکے اور "عظمت" کے حصار سے ناظر کو لمحہ بھر کے لیے رہائی دلانے میں کامیاب ہو سکے۔ چنانچہ جتنی جذباتی کوئی کیفیت ہوگی اور جتنے انہماک، خود سپردگی اور والہانہ پن کا یہ مظاہرہ کرے گی، اتنا ہی تحریف کی زد میں بھی آجائے گی۔ شاید اسی لیے کامیاب ترین تحریف ہمیشہ وہی ہوتی ہے جو مقبول عام نظریات کی جذباتی قبولیت کو طشت ازبام کرتی۔ اور ایک خاص ڈگر پر چلتی ہوئی زندگی کا رخ موڑ دیتی ہے چنانچہ قابل تحریف تخلیقات یا نظریات کے لیے پہلے زبان زد خاص و عام ہونا ضروری ہے ورنہ تحریف کا وہ ڈھیلا نقطہ ابھر کر سامنے نہیں آسکے گا جو مقبولیت کے ساتھ مربوط ہو کر ایک مضحکہ خیز صورت حال کو جنم دیتا اور جذباتی ابال میں شگاف پیدا کر کے زندگی کو اپنی نارمل سطح حاصل کرنے میں مدد بہم پہنچاتا ہے۔

تحریف کا مقصد کیا ہے؟ — مقصد کے تعین کے سلسلے میں تمام اہل نظر متفق نہیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ تحریف کا مقصد بجز تفریح اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی سنجیدگی، کام کاج، جذباتی انہماک اور خود سپردگی کے ایک طویل وقفے کے بعد اعصاب اور کیفیات کی درشتی کو کم کر کے تفریح مہیا کرنا ہی تحریف کا سب سے بڑا مقصد ہے لیکن بعض اہل نظر اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تحریف ایک سنجیدہ مقصد سے کر برآمد ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر معاصر ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور ان کی اصلاح کرنا ہی اہم ترین مقصد ہے۔ اصل بات ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے یعنی تحریف کا مقصد نہ صرف تفریح بہم پہنچانا ہے۔ اور نہ اس کے پیش نظر محض اصلاح کا نظریہ ہوتا

چاہیے۔ چنانچہ تحریف، پیروڈی ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی [illegible] کے حصول میں مدد لیتا ہے اور طنز نگار اس کا سہارا لے کر سماج کی ناہمواریوں کو ہدف طنز بناتا ہے۔ چنانچہ تحریف کے ضمن میں اصل بات کسی مقصد کا تعین نہیں بلکہ یہ ہے کہ تحریف نگار اصل کی ایسی نقلی نقالی کا نمونہ پیش کرسکے کہ اصل کی تضحیک ہوسکے۔ تضحیک کے بنیادی عناصر مزاح تک بھی محدود ہوسکتے ہیں اور بعض اوقات طنز کا سامان بھی کرسکتے ہیں۔ اور یہ چیز موضوع اور ماحول کے تابع ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریف کا حقیقی عنصر اس کی اپنی ہیئت ہے۔ جتنی کامیاب اس کی ہیئت ہوگی اور جتنی کامیابی سے یہ اصل اور نقل میں ہم آہنگی اور تضاد کو نمایاں کرسکے گی۔ اتنا ہی یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگی چاہے یہ مقصد محض آسودگی کی تحصیل ہو یا غیظ یا اظہار کی تسکین۔

پطرس کے ان تحریفوں کے یہ دونوں رخ ملتے ہیں۔ یعنی ان کی ایک تحریف نے تو آسودگی کے احساس کو ابھار دیا ہے اور دوسری نے بعض ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو ہدف طنز بنایا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی ان دونوں تحریفوں میں ایک نمایاں فرق ہے۔ ایک تحریف قطعاً لفظی ہے اور اس میں بعض الفاظ کی معمولی تبدیلی سے اصل کا حلیہ اس طور بگاڑ دیا جاتا ہے کہ اصل سے ناظر کا جذباتی تعلق بڑی حد تک ختم ہوجاتا ہے اور ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے۔ دوسری تحریف لفظی نہیں بلکہ صرف ایک مخصوص طریق کار اور ایک خاص انداز فکر کی نقل تک محدود ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلی تحریف براہ راست اصل سے متعلق ہے لیکن دوسری نے اصل کا سہارا لے کر ایک بالکل مختلف میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ پہلی تحریف "اردو کی پہلی کتاب" پر پطرس کی مشہور پیروڈی ہے۔ اور دوسری میں انہوں نے جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کا تو ایک خاص حد تک لیکن بعض سماجی بے اعتدالیوں کا ایک بڑی حد تک مذاق اڑایا ہے۔ تاہم ان دونوں تحریفوں میں تحریف کے بعض بنیادی عناصر کو اس درجہ خوبی سے برتا گیا ہے کہ ہم ان کو اردو زبان کی بہترین تحریفات میں شمار کرنے پر مجبور ہیں۔ پطرس کی پہلی تحریف "اردو کی آخری کتاب" سے یہ چند نمونے دیکھیے:

"دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے وہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا اور کسی میں چوہے۔ چکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلائے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے غرضیکہ سب کام ہوچکا ہے لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔"

———— کھانا خود بخود پک رہا ہے

"بڑی محنت کرتا ہے شام کو کھیتی چڑھاتا ہے دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی بیل پر لادی لاتا ہے اور قلفت کا دستہ لیتا ہے کبھی نالے پر دھوتا ہے۔ کبھی سیا پہ تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑا نہ جا سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے......

[illegible]

[illegible]

پطرس کی اس تحریف کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے [illegible] مقصد نہیں [illegible] سے قوت اور استحکام حاصل کرتی ہے اس کی ساری کامیابی اس آسودگی کے احساس میں ہے جو [illegible] سے پیدا ہوتا ہے۔ [illegible] میں بھی ایک کفایت (ECONOMY) پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ تصویر کا [illegible] سے ملنے پر پطرس نے ایک ایسا [illegible] انداز اختیار کیا ہے کہ [illegible] اصل سے نفرت کا جذبہ پیدا [illegible] اصل سے محظوظ ہونے لگتا ہے

پطرس کی دوسری تحریف کا عنوان ہے — "لاہور کا جغرافیہ"۔ اس تحریف سے یہ چند نمونے قابلِ غور ہیں۔

تمہید — تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔

محلِ وقوع: لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں "راوی ضعیف" کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی

کے علاوہ دلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور فوری
اور فوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس
میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

آب و ہوا: لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے ـــ لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دیئے ہیں۔

صنعت و حرفت: اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔

پیداوار: لاہور کی سب سے مشہور پیداوار رسالے اور طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔

طبعی حالات: لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں۔"

پطرس کی مندرجہ بالا تحریف کے دو پہلو قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا تو یہ کہ یہ تحریف لفظی نہیں بلکہ ایک خاص اندازِ تحریر کی نقل پیش کرتی ہے۔ جغرافیہ لکھنے کا ایک خاص انداز اب اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ اس انداز کی سنگلاخی کیفیت میں لچک کی اس قدر کمی ہے کہ تحریف نگار کی تگ و تاز کے لئے ایک وسیع میدان عالمِ وجود میں آ گیا ہے چنانچہ پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں جغرافیہ کی کسی خاص کتاب کو نہیں بلکہ جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ تاہم اگرچہ یہ تحریف نقل تو جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کی پیش کرتی ہے۔ اس کا روئے سخن ایک بالکل مختلف صورتِ حال کی طرف ہے۔ اور یہی اس تحریف کا دوسرا قابلِ ذکر پہلو ہے۔ پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں آب و ہوا، پیداوار، صنعت و حرفت، طبعی حالات اور بعض دوسرے عنوانات کے تحت لاہور کا جغرافیہ بیان کرنے کی سعی کی ہے لیکن ان عنوانات کے تحت غیر متعلق باتوں کا ذکر کر کے نہ صرف جغرافیائی معلومات کے بارے میں ناظر کی توقعات کو منسخ کیا ہے بلکہ لاہور اور اہلِ لاہور کی بعض ناہمواریوں کو بھی ہدفِ طنز بنایا ہے لیکن شاید اس لئے کہ پطرس بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں ان کی اس تحریف میں طنز کی نشتریت بہت کم پیدا ہوئی ہے اور ہمدردانہ اندازِ نظر اور محظوظ ہونے کے رجحان نے اندازِ نظر کی تلخی کو قطعاً ابھرنے نہیں دیا ہے۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ حملہ آوروں کے تذکرے میں پطرس نے ازراہِ مذاق یو پی کے حملہ آوروں کا ذکر کیا ہے لیکن بات کو اس سے آگے نہیں بڑھایا کہ یہ لوگ اہلِ زبان ہیں اور تخلص کرتے ہیں اور اقلیمِ سخن کی وسعت کے لئے قریبی علاقوں

پیروڈی کرنے میں اتنی سی بات نے کسی قدر اور بھی اثر انگیز بنا دی اور وہ سا فرق [illegible] یہاں جب کنہیا لال کپور نے اسی ایک مقالہ لکھ کر ایک پورا مضمون اہلِ زبان کے بارے میں لکھ ڈالا اور اس مضمون میں تیز تیز نشتر بھی استعمال کئے تو صرف ایک مکمل طنزیہ صورت حال سامنے آئی جو بعض مقامات پر انتہائی [illegible] اور ظرافت شروع ہو گیا چنانچہ ناگزیر ہے دیکھئے تو محسوس ہوا کہ اگرچہ اپنی اس تحریف میں پطرس نے طنز کا استعمال بھی کیا ہے تاہم ان کا ظرافتی [illegible] نفاست اور خوش مزاجی کا رجحان پورے مضمون پر غالب ہے اور طنز اختیار کو تحریف دینے کی بجائے نفسی انبساط کا سامان مہیا کرتا ہے۔

خاتمے سے قبل اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اردو نثر میں تحریف نگاری کے سلسلے میں پطرس کو ایک مقامِ امتیاز حاصل ہے۔ یہ اس لئے کہ پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے ملتے ہیں اور اس ضمن میں رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی اور اودھ پنچ کے بہت سے معاونین کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن نثر میں پطرس سے قبل اوّل تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں چنانچہ بعض دوسرے ادبا کے علاوہ پطرس کی تحریف نگاری کو تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ اردو طنز و ظرافت کے طالب علم کے لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

پطرس کے مضامین

کا سرسری جائزہ

آثر لکھنوی

پطرس کے مضامین میں ظرافت عام عادت سے ہٹ کر ہے۔ اور اس کا آغاز مقدمہ دیباچے ہی سے ہوتا ہے۔

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے (یعنی آپ کی حماقت سے ہمدردی ہے) اب مصلحت یہی ہے (کہ آپ اپنی حماقت کو نامیں) اور اسے حق بجانب ثابت کریں۔"

معلوم یہ حقیقت ہے یا یہ بھی تنک بھری طبیعت کہ پطرس نے اظہار حقیقت کے تہ میں بھی ظرافت کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے کیوں کہ اپنے استاد کی خدمت میں اعتراف ممنونیت ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض نزاکتوں سے پاک کیا" جس کا مفہوم میرے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جہاں کوئی بات ہوش مندی کی دیکھی اسے حماقت میں بدل دیا۔

کتاب میں گیارہ مضامین ہیں جو بظاہر ہولا خبطا پن کے شاہکار ہیں مگر فی الحقیقت سوسائٹی اور تمدن کی دکھتی رگوں کو چھوتے ہیں۔ اور خاکساریوں اور سفیہانہ رواسم و توہمات کا پردہ فاش کیا ہے۔ پطرس نے اپنا مطلب زیادہ تر مزاح میں طنز کی پٹ دے کر نکالا ہے۔ بخلاف دیگر ظرافت نگاروں کے جو تمسخر کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں باوجود اس احساس کے کہ ہم کو (اور معاف کیجئے گا آپ کو) بے دال کا بودم بنایا جا رہا ہے جھنجھلاہٹ کے بجائے گدگدانے کی ادا نکلتی ہے اور اسی کے ساتھ غور و تعمق کی دعوت ہوتی ہے۔

ان مضامین کے کاتب کو بھی ظرافت سے کافی بہرہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ علاوہ دیگر تصرفات کے "ہاسٹل میں پڑھنا" کے عنوان کو ہر جگہ "ہاسٹل میں پڑنا" بنا دیا ہے۔

مضمون میں ظرافت کی چاشنی پہلے ہی فقرے سے شروع ہو جاتی ہے۔

"ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا۔" 'رفتہ رفتہ' اور 'بھی' کی معنویت دعوت نظر دیتی ہے۔ آگے چل کر بی اے کے قلعے اس خوبی سے گنوائے ہیں کہ بایدوشاید۔

مضمون میں ایسے خاندان کی ذہنیت کا خاکہ ہے جو مہذب اور اطلاق پسندیدہ کا مالک ہونے کے باوصف قدامت پسند ہے اور حال کو

ماضی کے تجزیے میں مختلف نظریوں سے دلچسپی رکھنے والے ... اتفاق ہے ... کہ پطرس نے ... مسائل کا ... بھی ... مثالی تقسیم کی جاتی ہے۔ ... خوش حالی ... عدالت کھینچنے کی مستقل ترین ... ہے کہ ... سے کسی ... ابھی تک ... رکھا تھا؟

... انسان کے ... ایک ... جس سے رشتہ ... کی نوعیت معلوم ... طہارت کا ایک کعبہ اور ... حقیقت ... عبادت کے ... دنیا ... کو گوشہ ... کے لئے ... انتفاع میں ... کو ... پطرس کے الفاظ میں :—

جس سے تفصیل ... ہو کہ ... کچھ ...
سوچا ... ہے بھی
... اختیار ... ہے ... کہ ... روحانی ترقی ...
... اور ... اصل مقصد فوت ہو جائے گا ... ہو۔"

معاشرے ... کی شرح ہے ... مقامات میں ... نہیں ہوتا ... صلاحیتوں ... رکھا۔ صاف گوئی اور رستگاری کا ... اختیار کرنا ... فلسفے ... چھپ کر ... آزادی ... انسان ... کا اصل مقصد ہے:

پطرس نے مسئلے کے اس پہلو کی ظریفانہ انداز میں ... حسن و خوبی سے وضاحت کی ہے کہ ... تفصیل میں جاتا مضمون کی لذت کو فنا کر دیتا ہے۔ پڑھئے اور لطف اندوز ہوجئے۔

کتاب کا مقصد بھی ... فوت ہو جائے گا اگر اس کے مضامین کی چیر پھاڑ کی گئی۔ کتاب ... انگریزی کے اس مقولے کی بہترین ترجمان ہے "مذاق کے پردے میں بہت سی سنجیدہ باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔" (Many a serious thing is said in joke)

نقشِ گم گشتگی

شدی تا باعثِ آرام جاں آرام جاں گم شد
حدیثِ نام تو تا بر زباں آمد زباں گم شد

میرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے
چو آوازِ جرس ہر سو دوید و ہر زباں گم شد

نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوقِ من آں آستاں گم شد

مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی
بہ اظہارِ سخن چوں لب کشودم رازداں گم شد

مگر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمراہیِ خود ہم ز راہ گمرہاں گم شد

مخزن۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء

غزل

ہم آں داغے کہ بر دل از نوید مرہم جانم شد
ہم آں چشمے کہ نامحرم سخنگوئے رازدارم شد

دلے بود و در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم از سرگذشت و آسمانم شد

بپرس اے داور محشر چہ مے پرسی چہ می پرسی
نگاہ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد

نگہ وز دیدہ افگندی بدل چوں ناز جاں دارم
نظر کردی بہ جیبا کی و فصل داستانم شد

دگر قدح جنوں در دہ کہ ہم در منزل اوّل
خیالِ وحشتم واماند و گردِ کاروانم شد

ہزارہ ستان، ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمودۂ پطرس

اے حسن تو زیاد تماشا کنم ترا
عمرم دراز باد تمنا کنم ترا
برہم نظر مکن من ناکردہ کار را
گر ابتدائے بوسۂ بیجا کنم ترا

بہ تبسم چہ تسلی بہ نگاہے چہ قرار
شکر آرزوئے از لبم انگیختہ
بر سرِ خاکِ من تشنہ لبے ریختہ باد
قطرۂ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختہ

(کارواں)

دوراہا

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی در میری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہر احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے ہر آرزو معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لغزش خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے الفت کی تہ پہ مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شب وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آ کے ملی وقت کے دوراہے پہ
کہ صبح زیست بھی ہے۔ موت کی گھڑی بھی ہے

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

میں خُم کے سامنے یوں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر مُنارۂ کسرےٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

(سویرا)

دو شعر

اُڑ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جون

اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی تخ
یہ چمن یونہی رہے گا اور ——— الخ

یہ دو شعر پطرس نے شملہ سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی دلی کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔ جون کے ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب ہے لیکن الخ کا قافیہ یوں اور کون لا سکتا ہے۔

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دہلی گیا

واں جو پہنچا تو دیکھا

کہ اس جا کے لڑکے ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنّے ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلّی ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس ہیں بیس اور بیس

اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

(پطرس)

مارخائیم

آر۔ ایل۔ اسٹیونسن

(ترجمہ)

پطرس

دکاندار بولا۔ حضرت ہماری کمائی کو کیا پوچھتے ہو۔ طرح طرح کے ذریعے ہیں۔ کوئی جاہل گاہک آجاتا ہے تو میں اپنے علم و دانست سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ کوئی اُچکا آجائے (اور یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے شمع کو اتنا اونچا اٹھایا کہ روشنی اچھی طرح اجنبی کے چہرے پر پڑنے لگی) تو اپنی نیکی اور دیانت سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

مارخائیم ابھی ابھی دکان میں داخل ہوا تھا۔ باہر گلی بازاروں میں سورج کی روشنی ابھی خاصی تھی اور دکان کے اندر کی تاریکی سے جس میں چمکتی ہوئی چیزوں کی روشنی ملی تھی۔ آنکھیں ابھی مانوس نہ ہوئی تھیں۔ پھر ان پُرمعنی الفاظ کو سن کر اور کچھ شمع کی لو کو اس قدر اپنے قریب پاکر اس انداز میں آنکھیں جھپکنے لگا جیسے مدہوش ہو رہا ہو اور نگاہیں ایک طرف کو پھیر لیں۔

دکاندار ہنس دیا اور کہنے لگا۔ تم آج کرسمس کے دن میرے پاس آئے ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اکیلا ہوں۔ نرخ جو چڑھا رکھے ہیں اور کاروبار قطعی بند کر رکھا ہے۔ تو حضرت اس کی آپ کو قیمت ادا کرنی ہوگی۔ میں اس وقت اپنا حساب کتاب درست کر رہا تھا۔ میرے وقت کا جو حرج ہوا۔ اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اور پھر اس خاص رویے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑے گی جو میں آج نمایاں طور پر آپ میں پاتا ہوں۔ رازداروں کا رازدار ہوں۔ اور کبھی کسی سے آڑے ٹیڑھے سوال نہیں کرتا۔ لیکن جب کسی گاہک کا انداز اس قدر مجرمانہ ہو کہ مجھ سے نظریں چار نہ کر سکے تو پھر اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دکاندار دوبارہ ہنس دیا اور پھر حسب معمول اپنے کاروباری لہجے میں (جس میں پھر بھی کچھ کچھ طنز پایا جاتا تھا) کہنے لگا۔ تو تم سب سے پہلے اس بات کا اطمینان کرا دو گے کہ یہ چیز تمہارے قبضہ میں کہاں سے آئی؟ پھر وہی اپنے چچا کی الماری میں سے؟ حضرت یہ آپ کے چچا جان نے بھی دنیا جہان کے عجائبات جمع کر رکھے ہوں گے!

دکاندار کوتاہ قد، زرد رو، خمیدہ پشت، پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ عینک کے سنہری فریم کے اوپر سے نظریں ڈالنے لگا۔ اور سر کو یوں ہلانے لگا کہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ مارخائیم کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ مارخائیم نے دکاندار کی آنکھ سے آنکھ ملائی تو نظر سے انتہا درجے کا رحم اور تھوڑی سی ہیبت ٹپک رہی تھی۔

بولا۔ اب کے تم غلطی پر ہو۔ میں بیچنے نہیں کچھ خریدنے آیا ہوں۔ میرے پاس اب کوئی عجائبات نہیں جن کے دام وصول کروں۔ چچا کی الماری دیوار تک خالی ہو چکی ہے اور نہ ہوتی جب بھی میں سٹہ بازی میں اس قدر روپیہ کما چکا ہوں کہ اس الماری میں تحفہ

بجائے کچھ اضافہ ہی کر سکتا ہوں۔ آج جس کام کو آیا ہوں وہ تو بہت معمولی سا کام ہے۔ مجھے ایک خاتون کے لئے کرسمس کا تحفہ مطلب ہے (اس تقریر کے دوران میں جو وہ پہلے ہی تیار کر کے لایا تھا۔ اُس کے لفظوں کی روانی ذرا مدھم پڑ گئی) اور میں جانتا ہوں لڑائی کی بات کے سلسلے میں سنسنانا تو میرا کام تھا۔ اس کے لئے مجھے ہر طرح کی معذرت کرنی چاہئے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے کل یہ کام کرنا بھول گیا۔ آج ہی کھانے کے وقت مجھے اپنا یہ حقیر سا تحفہ پیش کرنا ہے۔ اور تم خود جانتے ہو جس ملازمی سے بہت سارا روپیہ ملنے کی امید ہو اسے پکا کرنے میں غفلت نہیں کرنی چاہئے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکاندار اس دفعہ میں اجنبی کی بات کو تول رہا ہے۔ لیکن اُسے کچھ یقین نہیں آیا۔ اس خاموشی کے دوران میں دکان کے عجیب و غریب سامان میں جو بہت سی گھڑیاں پڑی تھیں اُن کے ٹک ٹک کرنے کی آواز اور سامنے ہی بازار میں جو گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اُن کے پہیوں کے مدھم شور کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

دکاندار بولا۔ اچھا حضرت یونہی سہی۔ آخر تم پرانے گاہک ہو اور اگر تمہیں ایک اچھی جگہ شادی کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو بھلا میں اس میں کیوں روڑا اٹکاؤں۔ یہ لو تمہیں عورتوں کے پسند کی چیز دیتے دیتے ہیں۔ یہ دستی آئینہ ہے۔ پندرہویں صدی کا بنا ہوا ہے۔ اگر جھوٹ ہو تو میرا ذمہ۔ اور یہ ملا بھی ایک ایسے گھر سے جہاں بڑے بڑے کمال کے عجائبات ہوتے۔ نام تمہیں اُس شخص کا نہ بتاؤں گا۔ آپ کے گاہک کی رازداری واجب ہے اور حضرت وہ بھی تمہاری ہی طرح ایک ایسے شخص کا بھتیجا اور واحد وارث تھا۔ جسے عجائبات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔"

دکاندار کرخت اور تیز آواز میں یہ باتیں کرتے کرتے جب آئینے کو اپنی جگہ سے اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو مارخائیم کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی گزر گئی۔ ہاتھ پاؤں یک لخت تھرتھرا اٹھے اور ہزاروں طوفانی جذبات دفعتہً لپک کر چہرے پر چھا گئے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مارخائیم سنبھل بھی گیا۔ اور ان جذبات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ بجز اس کے کہ جب آئینہ ہاتھ میں لیا تو ہاتھ ذرا کانپ رہا تھا۔

بھیگی بھری آواز میں بولا "آئینہ؟" کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر صاف آواز میں دوبارہ بولا "آئینہ؟ کرسمس کے لئے؟ یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے؟" دکاندار بولا "ہو کیوں نہیں سکتا؟ آئینے میں کیا حرج ہے؟"

مارخائیم اس کی طرف ایک ایسے انداز سے دیکھ رہا تھا جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ بولا "تم مجھ سے پوچھتے ہو اس میں حرج کیا ہے؟ یہ دیکھو! اپنا چہرہ دیکھو! کیا تمہیں دیکھنا گوارا ہے؟ ہرگز نہیں! تمہیں۔ مجھے۔ کسی آدمی کو گوارا نہیں!"

مارخائیم نے جب یوں دفعتہً آئینہ اُس کے سامنے کر دیا۔ تو دکاندار یک لخت پیچھے کو ہٹ گیا تھا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہنس دیا اور کہنے لگا "تو جناب آپ کی ہونے والی اہلیہ محترمہ بہت ہی کم رو ہوں گی۔"

مارخائیم بولا "میں نے تم سے کرسمس کے لئے تحفہ مانگا۔ اور تم مجھے یہ لا کر دے رہے ہو۔ یہ مکروہ واہیات چیز— جو ہر وقت بڑھاپے کی آمد اور گناہوں اور حماقتوں کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ سیدھی سی تمیز کیا تمہارا اس سے یہ مطلب تھا کہ میں یہ خرید لوں؟ تم نے کچھ سوچا بھی تھا؟ مجھے بتاؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم مجھے بتا دو۔ لو آؤ مجھے اپنا حال سناؤ۔ میرا اندازہ ہے کہ تم پوشیدہ طور پر بہت ہی خیرات کرتے ہو؟"

دکاندار نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ عجیب بات ہے کہ مارخائیم ہنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ چہرے میں خواہش اور امید کی جھلک تو ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن ہنسی کا نام و نشان تک نہیں۔

مارخائیم مجھے میں ہوتا۔ تم کہ ہمت نہیں۔ دیدار ہیں۔ پائیدار ہیں۔ نہ کسی سے محبت رکھتے ہو۔ نہ کسی کے محبوب ہو۔ ایک معلق سے جس کے مصاحبوں کو پرواہ پورا کرتے ہو۔ ایک مجبوری ہے جس میں سنبھالے رکھتے ہو۔ بس تمہاری بست ولادی ہے۔ وہ دارا سے بیزاری کیا ہے۔

وہ مار کے دانت سے بولا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں اندیرا جس دیا اور رکھے لگا۔ میں بھی ایسی ہی ہستی ہوں معاشقے کی تشکول ہے اور تم اسی خاتون کے محبت کے معاملے پوچھتے رہے ہو؟"

مارخائیم کو ایک عجیب قسم کی دلچسپی سی ہو گئی۔ بولا۔ "اچھا! تو تم بھی عشق کر چکے ہو۔ مجھے اس کا حال سناؤ؟"

دکاندار بولا۔ "میں اور عشق! مجھے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی۔ اور پھر بھی مجھے اس قدر وقت ہے کہ میں اس بے معنی گفتگو میں اور پیسا وقت گنواؤں۔ آئینہ خریدتے ہو یا نہیں؟"

مارخائیم نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے؟ یہاں ٹھہرنے میں ایسے ہی جو مزا ہے۔ اور زندگی اتنی مختصر اور ناپائیدار ہے کہ میں تو باتیں کبھی کسی لطف سے مُنہ موڑنے میں جلدی نہ کروں۔ خواہ وہ اس لطف کی طرح معمولی سا ہی کیوں نہ ہو۔ جو لطف نہایت عجیب ہو۔ اس کے ساتھ چھٹ جانا چاہیئے۔ جیسے کوئی گرتا ہوا آدمی پہاڑ کی چٹان سے چمٹ جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو زندگی کا ہر لمحہ ایک چٹان ہے۔ سل اور اونچی چٹان اتنی اونچی کہ وہاں سے چھوٹ کر گریں تو زمین سے ٹکرا کر اس ہستی کا تمام جسد ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اسی لئے مرنے کی باتیں کرنے سے بہتر ہے۔ چلو تم مجھے اپنا حال سناؤ۔ میں تمہیں اپنا حال سناتا ہوں۔ حساب برابر ہوں حاصل ہے۔ آؤ پیار کی باتیں کریں۔ کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے دوست ہی بن جائیں؟"

دکاندار بولا۔ "مجھے صرف ایک بات کہنی ہے۔ سودا خریدنا ہے تو خریدو ورنہ دکان سے باہر نکل جاؤ!"

مارخائیم نے کہا۔ "سچ ہے سچ ہے۔ کافی دل لگی ہو چکی۔ اب کام کی بات کرنی چاہیئے۔ اچھا کوئی اور چیز دکھاؤ؟"

آئینے کو پچھلے طاق پر رکھنے کے لئے دکاندار پیچھے جھکا تو اس کے ماتھے سے سنہری رنگ کے بال اس کی آنکھوں پر آ گرے۔ مارخائیم ذرا اور بھی قریب کو سرک آیا۔ ایک ہاتھ اوور کوٹ کی جیب میں تھا۔ تن کے کھڑا ہو گیا اور ایک لمبا سانس کھینچ کر چھاتی پھیلائی۔ چہرے پر کئی مختلف جذبات ایک ساتھ جھلک رہے تھے۔ ڈر بھی تھا۔ ہیبت بھی تھی۔ کچھ نہ کچھ کر چکا ہے سو رہی ہے اور کچھ مسعودی۔ بالائی ہونٹ جیسے ناتوانی کے انداز میں اوپر کو اٹھا ہو اور دانت جیسے باہر کو جھانک رہے تھے۔

دکاندار بولا۔ "یہ شاید پسند آجائے؟" یہ کہہ کر سر اوپر اٹھانے لگا کہ مارخائیم پیچھے سے اس پر جا پڑا۔ سیخ کی شکل کا ایک لمبا سا خنجر چمکا اور پھر نیچے کو اترا۔ دکاندار مرغ بسمل کی طرح تڑپا۔ کنپٹی طاق پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو کر فرش پر جا گرا۔

دکان میں وقت کی کئی چھوٹی چھوٹی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعض اپنی عمر کے شایان شان آہستہ آہستہ اور وقار کے ساتھ بول رہی تھیں۔ بعض جلدی جلدی گڑبڑا رہی تھیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ پیچ در پیچ ملی ہوئی آوازیں ٹک ٹک کر کے گنے گن رہی تھیں۔ باہر سڑک کے فرش پر کوئی لڑکا کھٹ کھٹ دوڑتا ہوا گزرا جس کے پاؤں کی آہٹ نے ان چھوٹی چھوٹی آوازوں کے تسلسل کو برہم کر دیا۔ مارخائیم چونکا اور اسے یک لخت اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ ہیبت خوردہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شمع دکان کے تختے پر جل رہی تھی۔ اور شعلہ ہوا سے ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔ شعلے کی اس خفیف حرکت سے ایک بے آواز سا ہنگامہ بپا تھا۔ اور کمرہ سمندر کی مانند لہریں مار رہا تھا۔ لمبے لمبے سائے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ تاریکی کے مہیب دھبے پھیلتے سمٹتے اور رنگ بدلتے تھے جیسے ہانپ

بہت سی تصویروں کے چہرے صدیوں سے بت پانی کے عکس کی مانند لرزاں اور متغیر تھے۔ اندر کا دروازہ ذرا کھلا تھا۔ وہاں سے روشنی کی ایک لکیر سی باہر
کی اس دنیا میں یوں جھانک رہی تھی۔ جیسے کوئی انگلی اشارہ کر رہی ہو۔

اس کی سہمی ہوئی نظریں ان چیزوں سے ہٹنے کے بعد پھر اس پر آ کر رک گئیں۔ جو فرش پر کچھ بڑی کچھ چھوٹی پڑی تھیں۔ بہت سی چھوٹی موٹی
زندگی میں جس قدر حقیر مفلسوں اور مسکینوں کا سا لباس اور بہت معمولی بدنما انداز معلوم ہوتا تھا لکڑی کے بڑے سے کا ڈھیر پڑا ہے۔ جائیداد کا خیال تھا۔
میں اس کے دیکھنے سے ہیبت کھا جاؤں گا بلکہ وہ تو کچھ بھی نہ نکلی۔ لیکن پھر بھی اس نے دیکھتے دیکھتے اس پرانے کپڑوں کے ڈھیر اور اس خون کے دھبے میں
عجیب معنی پیدا ہونے شروع ہو گئے تو یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اب کوئی بھی ہو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے کیا کام لے سکے۔ یہ تو کسی کے اس معجزے کو پھر
زندہ کر دکھائے۔ جب تک کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اور جب کسی کو معلوم ہو جائے گا؟ ہاں تو پھر؟ تو پھر یہ مردہ ایسے پیچ مارے گا جو [illegible]
پھر میں گھرا رہے گی۔ اور تمام دنیا تعاقب کی گرجوں سے تھرتھرائے گی۔ مگر کبھی پیچھے پڑا رہے گا۔ اس نے سوچا ایک وقت ایسا بھی تھا جب انسان کا بھیجا
پاش پاش ہو جاتا تھا تو پہلے ہی الفاظ نے اسے چوکنا کر دیا۔ وقت اب کر کام تمام ہو چکا۔ وقت جو مردہ شخص کے لئے ہمیشہ کو ختم ہو گیا۔ وہ قاتل کے
لئے دفعتاً اہم بن گیا ہے۔ جو کچھ کرنا ہو ابھی اور اسی وقت . . . .

یہ خیال ابھی اس کے دل میں تھا کہ گھڑیوں نے یکے بعد دیگرے ہر رفتار اور ہر قسم کی آواز کے ساتھ۔ کوئی مینار کلیسا کے گھنٹے
کی طرح گھمبیر کوئی باریک آواز میں وائلن کی صدائیں سرسراتے ہوئے سہ پہر کے تین بجانے شروع کر دیئے۔

اس خموش دنیا میں یک لخت اتنی زبانوں کے بول اٹھنے سے مارے خوف کے گھبرا گیا اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے شمع ہاتھ میں لئے آگے
پیچھے پھرنے لگا۔ متحرک سائے اسے چاروں طرف سے گھیرے پھرنے لگے۔ اتفاقیہ کہیں روشنی کا عکس دکھائی دے جاتا تو دور تک کانپ اٹھتی
اسے اپنا چہرہ طرح طرح کے بھیس بدلتا ۔۔۔ بعض ولایتی بعض دیسی یا اسٹریم کے بنے ہوئے آئینوں میں عکس در عکس دکھائی دیا۔ جیسے جاسوسوں کی
فوج اسے دیکھ رہی ہو۔ اس کی نظریں اپنی ہی نظروں سے چار ہو کر۔ اور اس کے جرم کو پا لیں۔ اس کے قدموں کی آہٹ کو اس کے قدم بہت ہی
ہلکے پھلکے پڑ رہے تھے۔ ارد گرد کی خاموشی کو برہم کئے دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی جیبیں بھرے چلا جاتا تھا دل نے اس کے منصوبے کی ہزاروں
خامیاں اسے بار بار سمجھائیں۔ یہاں تک کہ وہ اس تکرار سے تنگ آ گیا۔ تمہیں سر کا درسی اور وقت کرنا تھا۔ جب کسی کے مل جانے یا آ جانے کی بالکل
ہی توقع نہ ہوتی۔ اس بات کا انتظام کر رکھنا تھا کہ ضرورت پڑے تو ثابت کیا جا سکے۔ میں اس وقت یہاں نہیں کسی اور مقام پر تھا۔ تمہیں بہت
محتاط ہونا چاہئے تھا۔ دکاندار کی صرف مشکیں کس لیتے اور منہ بند کر دیتے۔ جان سے نہ مارتے۔ تمہیں اور بھی جرأت کر کے خدمتگار کا کام بھی تمام
کر دینا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ کسی اور طرح کرنا تھا۔ طرح طرح کے افسوس اس کے دل کو مجروح کئے دیتے تھے۔ ذہن مسلسل اس تھکا دینے والی
کشمکش میں مصروف تھا۔ کہ ان باتوں کو کس طرح بدل ڈالے۔ جن کا بدلنا اب ناممکن تھا۔ وہ تجویزیں سوچ رہا تھا۔ جن کا سوچنا اب بالکل بیکار
تھا۔ گویا مٹنے والے ماضی کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اور ان تمام ذہنی مصروفیت کی تہہ میں قسم قسم کے حیوانی خوف
اس کے دماغ کے نہاں خانوں میں کھیل مچا رہے تھے۔ جیسے کسی ویران اور تنگ و تاریک کوٹھڑی میں چوہے دوڑ رہے ہوں۔ سپاہی کا ہاتھ زور سے
کندھے پر پڑے گا۔ تو تمام اعصاب یوں جھٹکا کھائیں گے۔ جیسے مچھلی کانٹے میں لگ کر جھٹکا کھاتی ہے۔ عدالت کا کٹہرہ اور قید خانہ اور پھانسی کا
تختہ اور سیاہ رنگ کا تابوت سب ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔
رنگینیوں کا خوف اس کے دل کے سامنے ایک مردہ فوج کی طرح جم کے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا اس کشمکش کی کوئی ذکر کوئی آواز ضرور آئی

کانوں تک پہنچی ہوگی۔ اور وہ خود معمولی [illegible] جانتے ہوں گے [illegible] اب [illegible] کے طور [illegible] جب بیٹھے ہوں گے۔ تنہا
زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی قسمت میں [illegible] یادوں [illegible] ان سے شفقت آمیز
خیالات ایک لذت بن کر [illegible] ہوں گے۔ جو اپنے گھروں میں اپنے اہل کے ساتھ بیٹھے [illegible] ایک لذت
بن سکتے ہوں گے [illegible] طبیعت [illegible] بیٹھ گھروں میں بیٹھے۔ گو بس
یادوں کے گویا احساس [illegible] کرتے ہوں گے [illegible] معلوم ہوتا [illegible] اور [illegible] بے ہودہ
[illegible] سے [illegible] جیسے [illegible] ڈال دیا ہے [illegible] گھر یا
کرنا چاہتا تھا کہ سب [illegible] ساتھ [illegible] سے سمت [illegible]
موجب معلوم ہوتا تھا [illegible] خاموشی [illegible] تو ندامت [illegible] دیا اب
کے بیچ میں [illegible] موت کی [illegible] کے [illegible] اس طرح [illegible] جیسے گویا [illegible] گیا ہو۔

لیکن ان مختلف خیالات نے اس کا [illegible] کر دیا [illegible] کی روح کا ایک حصہ اب بھی [illegible] اور [illegible] تھا [illegible] دوسرا حصہ
دیوانگی کے کنارے پر کانپ رہا تھا۔ خصوصاً ایک وہم سے تو اس کے [illegible] پوری طرح تسلط جما لیا [illegible] جیسے [illegible] کی [illegible]
سن رہا ہو یا کوئی [illegible] چلتے چلتے کچھ شبہ کرکے یک لخت رُک جانے۔ اس طرح کے لوگ زیادہ دیر [illegible] شک ہی کر سکتے [illegible] اصل بات
علم اور یقین تو ہو نہیں سکتا۔ اینٹوں کی دیوار اور بند کھڑکیوں میں سے تو صرف آوازیں ہی باہر جا سکتی ہیں لیکن خود گھر کے اندر ——— کیا جہاں
وہ جانتا تھا کہ میں اکیلا ہوں۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ گھر کی عورتیں اپنے بہترین کپڑے [illegible] جیسے [illegible]
جا رہی ہیں [illegible] باہر گئی ہے۔ اور اس کے [illegible] اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے [illegible] باہر
گئی ہے ——— تو پھر میں اکیلا ہی تو ہوں۔ لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا کہ مکان کی بالائی منزل سے [illegible] خالی پڑی [illegible]۔ قدموں کی ہلکی ہلکی
آہٹ سنائی دے رہی ہے نہ معلوم کیوں، لیکن کسی ہستی کے موجود ہونے کا احساس بہت زبردست تھا جس کے تعاقب [illegible] مکان کے
[illegible] اور کونے کونے میں پھر گیا۔ کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس موہوم ہستی کا چہرہ [illegible] لیکن پھر بھی دیکھنے کی [illegible]
معلوم ہوتی تھیں مرے ہوئے دکاندار کی شکل دکھائی دیتی۔ جیسے مکاری اور نفرت کی روح نے پھر زندہ کر دیا ہو۔

بعض اوقات دل کڑا کر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتا تو نظریں اس سے متنفر واپس آتیں۔ مکان کی چھت [illegible]۔ روشندان
چھوٹا سا اور میلا تھا۔ موسم کا یہ حال تھا کہ کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جو روشنی چھن چھن کر نچلی منزل تک پہنچتی وہ بہت ہی کم تھی۔ اور دکان کی
دہلیز پر مدھم سی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے یہ شبہ ہوتا تھا کہ اس خفیف سی روشنی کے کرشمے میں کوئی سایہ معلق [illegible] ہے۔

دفعتہً باہر بازار سے کسی خوش طبع آدمی نے اپنی چھڑی کے ساتھ دکان کے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ساتھ ہی کچھ بولتا
جاتا تھا۔ اور بلند آواز سے ہنس ہنس کر کئی ایسی مذاق کی باتیں کرتا جاتا تھا جن میں کئی دفعہ اُس نے دکاندار کا نام لے کر بھی پکارا۔ مارخائم کا خون جم
گیا۔ اور اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ اب وہاں پہنچ چکا ہے۔ جہاں آوازوں کی رسائی نہیں۔ وہ
سکوت کے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ اور اس کا نام جیسے کبھی وہ طوفان کے شور میں بھی سن لیتا۔ اب ایک بے معنی سی آواز ہے۔ تھوڑی دیر بعد
اس خوش طبع آدمی نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔

یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ جو کچھ کرنا باقی ہے بہت جلد کرنا چاہیے۔ اس مخدوش علاقہ سے باہر نکل کر فوراً ان گمنام بام کے تلے میں کود پڑنا چاہیے اور دن ڈھلنے سے پہلے پہلے بستی اور بظاہر معصومیت کی جسے پناہ میں اپنے رستے پر پہنچ جانا چاہیے۔ ابھی ایک منٹ باقی تھا۔ ابھی کوئی دوسرا کھانسنے اور وہ شاید اس آسانی سے نہ نکلے۔ ارتکاب جرم کے بعد جو کچھ وصول ہونا تھا اس سے محروم رہ جانا یہ تو ایسی ناکامی ہے کہ طبیعت اسے قبول نہیں کرتی۔ اب اسے فکر تھی تو روپے کی اور تلاش تھی تو چابیوں کی جن کے ذریعے یہ حاصل کیا جاسکتا تھا

سر پیچھے کو گھٹے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھتا ہوا وہ ... کانپ رہا تھا، میز کے قریب آیا۔ کسی ذہنی اذیت کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی معدے کی نسوں میں تھنچا سا لگا۔ لاش کی رعنائی دم تو مفقود ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھدے سے ڈھیلے تھے۔ اور وہ مڑ تڑ سا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کپڑوں کے اندر انسانی جسم نہیں، تھوڑا سا بھوسہ بھرا ہے۔ لیکن پھر بھی طبیعت اس سے متنفر تھی۔ دیکھنے کو وحشیانہ اور بے حقیقت تھی لیکن ڈرتا تھا کہ ہاتھ سے چھوؤں تو شاید ایسی حقیر معلوم نہ ہو۔ لاش کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور پرے لٹا دیا۔ کچھ عجیب ہلی ہلی اور ڈھیلی ڈھیلی سی تھی۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی عجیب عجیب ہئیتیں بن جاتیں۔ جیسے ٹوٹنے ہی والے ہوں۔ چہرے پر جذبات کی کوئی کیفیت باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ موم کی طرح بے رنگ تھا۔ ایک کنپٹی خون آلود تھی۔ جس کے دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مارخائیم کو یہی ایک بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے فوراً ہی ایک خاص میلے کا دن یاد آجاتا۔ جو اس نے مچھیروں کے ایک گاؤں میں گزارا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ پیتل کے باجوں کی بلند آوازیں اور ڈھول کی دنادن سنائی دے رہی تھی۔ ایک داستان گو گویا ناک میں گا رہا تھا۔ ایک لڑکا جسے کچھ ڈر بھی تھا۔ کچھ شوق بھی تھا۔ بھیڑ میں ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ آخر کار سب سے زیادہ رونق کے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں ایک چبوترہ سا بنا تھا۔ اور ایک لمبے چوڑے پردے پر تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر براؤن رگ اور اس کے شاگرد کی تھی۔ ایک میں مسٹر اور مسز میننگ اور ان کے مقتول مہمان کی تھی — ایک تصویر میں ویئر اپنے قاتل تھرٹل کے خونی پنجے میں گرفتار نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں جرائم کی تصاویر پیش نظر تھیں۔ یہ تمام نظارہ اسے اس وضاحت کے ساتھ یاد آرہا تھا۔ جیسے کسی شعبدہ باز نے ماضی کو پھر زندہ کر دیا ہو۔ اپنے آپ کو پھر از سر نو وہی لڑکا سمجھنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ میں پھر وہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ان مکروہ تصاویر کو دیکھ کر پھر میرا دل کراہت سے بھر گیا ہے۔ اور اس ڈھول کی آواز سے میں پھر جیسے سُن سا ہو گیا ہوں۔ اس موسیقی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اسے یاد آگیا۔ اور اس کی وجہ سے پہلی دفعہ اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اسے متلی سی ہوئی۔ جوڑوں میں ایک لخت ایک ضعف سا محسوس ہونے لگا۔ جس پر قابو پانا ضروری تھا۔

عقلمندی اسی میں تھی کہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی بجائے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ لاش کے چہرے کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔ اور اپنی طبیعت پر زور ڈال کر اپنے جرم کی ماہیت اور سنگینی کو پوری طرح محسوس کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی یہی چہرہ مختلف جذبات کے زیر اثر تیور بدلتا رہا تھا۔ یہ ہونٹ بول رہے تھے۔ اس جسم میں فرماں پذیر قوتوں کی آگ بھری تھی۔ اور اب میرے ایک ہی فعل سے کارخانۂ حیات کا پرزہ یک لخت تھم گیا۔ جیسے ساز اپنی خمیدہ انگلی سے کسی گھڑی کی حرکت کو روک دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو ہزار سمجھاتا۔ لیکن بے سود۔ کسی تاسف کا احساس نہ ہوتا تھا۔ وہی دل جو جرم کی نقلی تصویروں کے سامنے کانپ اٹھا تھا۔ اب حقیقت کو دیکھ کر بھی نہ پسیجتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے دکاندار پر تھوڑا سا رحم آتا۔ کہ اسے بھی خدا نے وہ تمام قوتیں عطا کی تھیں جن سے دنیا کو ایک عجیب و غریب طلسماتی بہشت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سے اس نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ کبھی زندہ ہی نہ تھا۔ بس اس بات پر اسے کچھ ترس آتا تھا۔ لیکن تاسف یا ندامت کا شائبہ تک اس کے دل میں موجود نہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے ان حالات کو دماغ سے نکال دیا اور بیا بیوی تلاش کرنے دہاں سے نکلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ بوندا باندی کی بارش شروع ہو گئی تھی اور دیہہ کی فضا پر سے خاموشی مفقود ہو چلی تھی۔ کسی سمت ہوتے ہوئے ہوا کی سرسراہٹ [illegible] طرح طرح کی آوازوں سے جو لوہے اور بھی خوفناک تھیں۔ اور جو کھڑکیوں کی کھٹ کھٹ سے مل کر ایسا شور پیدا [illegible] رہی تھیں۔ [illegible] مارخائیم دروازہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اس سے پہلے پہلے [illegible] کی آہٹ [illegible] نے دروازہ [illegible] چلا گیا ہے۔ وہ ۔ [illegible] ابھی تک دہلیز پر کانپ رہا تھا۔ اس سے [illegible] کی طرف کھینچ [illegible]۔

گھر چھپا ہوا تھا سا [illegible] کی مگر [illegible] اس [illegible] پر جو [illegible] کے موڑ پر واقع [illegible] رکتا ہوا تھی۔ اور روشنی ہوتی سیاہ جو بی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں اور جو [illegible] پر بھی پڑ رہی تھی۔ [illegible] مار خائیم [illegible] کی مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پانیوں کی آہٹ اور [illegible] سے [illegible] کھٹ کھٹ اور دوسرے بجنے کی جھنکار اور دروازوں کے ہلنے جلنے اور ہوا کے ساتھ لگنے کی بھی ہیں۔ [illegible] کے ساتھ مل ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ احساس کہ میں اکیلا ہوں [illegible] ہو گیا اور اس کی حد سے بڑھ گیا۔ [illegible] کچھ پیچھا [illegible] طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ بلکہ اوپر سے کمروں میں چلتی پھرتی معلوم ہو رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے [illegible] پڑھنا شروع کیا۔ [illegible] معلوم ہوا جیسے اوپر کوئی [illegible] بھاگ گیا ہے اور کوئی چلتے چلتے اس کے پیچھے چڑھ رہا ہے۔ جا اگر میں ہوا ہوتا تو اس وقت روح کو کسی اطمینان ہوتا۔ لیکن پھر سو جا [illegible] بیدار حواس ہی تو ہیں۔ جو اس وقت میری زندگی کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے ہیں۔ اس [illegible] سے اپنے کچھ [illegible] اور پہلے سے بھی زیادہ توجہ سے ساتھ کان لگائے رہا۔ [illegible] بار بار پیچھے مڑ [illegible]۔ اس کی آنکھیں [illegible] تھیں۔ اور ہر طرف [illegible] رہی تھیں۔ لیکن ہر طرف کامیاب ہونے ہوتے رہ جاتیں۔ کیونکہ ادھر ادھر دیکھتیں ادھر ہی کسی نامعلوم بھاگتی ہوئی چیز کا پچھلا حصہ غائب ہوتا نظر آتا۔ پہلی چھت تک چودہ سیڑھیاں تھیں اور ہر ایک سیڑھی ایک قیامت معلوم ہوتی تھی۔

اوپر کی چھت پر تینوں دروازے کھلے پڑے تھے۔ اور یہی کمین گاہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مارخائیم یوں کانپا۔ جیسے پولیس کے دستے نظر آ رہے ہوں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب گویا لوگوں کی تیز نظروں سے پوری طرح کسی نہ کسی طرح بچ سکوں گا۔ جی چاہا کہ کسی طرح اپنے گھر کے اندر پہنچ جاؤں۔ جہاں چاروں طرف دیواریں کھڑی ہوں گی۔ اپنے بستر میں جا کر چھپ جاؤں گا۔ اور سوائے خدا کے اور کسی کی آنکھیں مجھے نہ دیکھ سکیں گی۔ اس خیال پر اسے کچھ تعجب سا ہوا۔ اسے اور نافرمانوں کے قصے یاد آئے جو کہا جاتا ہے انتقام خداوندی سے خوف کھاتے تھے۔ کم از کم مارخائیم کے دل میں اس بات کا خوف نہ تھا۔ خدا سے تو نہیں البتہ قوانین قدرت سے ضرور ڈرتا تھا کہ ممکن ہے میری موجودگی کے بعض ایسے آثار باقی رہ جائیں۔ جو اثبات جرم میں مدد دیں۔ ان آثار کو تو قوانین قدرت کی بے رحم اور سائل کار فرمائی کبھی محو نہ کرے گی۔ اس سے بھی دس گنا زیادہ وہ اس بات سے خوف کھاتا تھا۔ وہم پرست ضعیف الاعتقاد لوگوں کا سا خوف کہ کیا معلوم کوئی ایسی بات ظہور میں آ جائے جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ کیا معلوم قدرت خود اپنے قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ میں ایک ایسا کھیل کھیل رہا ہوں جس میں ذہانت اور فراست کی ضرورت ہے جس میں کامیابی خاص قواعد و ضوابط پر مبنی ہے۔ جس میں آتلیہ [illegible] کی طرح خاص اسباب و علل سے خاص نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر قدرت اس جابر و مطلق العنان بادشاہ کی طرح جو کھیلتے کھیلتے شطرنج کی بساط الٹ دیتا ہے۔ یک لخت علت و معلول کا یہ سلسلہ برہم کر دے تو کیا ہو گا۔ مورخ لکھتے ہیں جب موسم نے اپنی آمد کا وقت بدل ڈالا تھا۔ تو نپولین کا یہی حال ہوا تھا۔ کیا معلوم مارخائیم کا بھی یہی حال ہو! کیا

علاوہ ان نقوش پادروں میں شیشے کی یہ خاصیت پیدا ہو جانے اور بیرونی ماحولات باہر سے اندر آ نے لگیں۔ جیسے کسی شیشے کے بکس میں شہد کی مکھیوں کی حرکات نظر آتی ہیں۔ فرش سے رضیہ دیکھتے سے رکی ریت کی طرح بیٹھ جائے اور ولدل کی طرح مجھے اپنی گرفت میں پھنسا لیں یا یہ تو وہ کی باتیں ہیں۔ کیا معلوم کہ مکان ہی گر پڑے اور میں اس ملبے کے نیچے دب جاؤں۔ یا سارا غصہ گھر میں آگ لگ جائے اور آگ بجھانے والے لوگ سب طرف سے اندر گھسیں۔ ان چیزوں سے وہ ضرور خوف کھاتا تھا۔ ان کو جا ہو تو لگا ہو کہ خداوندی انتقام سمجھ لو۔ لیکن خود خدا کی ذات سے وہ بالکل نڈر تھا۔ دل سے کہتا میرا یہ فعل تجاوز سہی۔ لیکن اس کی وجہ بھی تو خاص ہیں اور خدا کو ان کا پورا پورا علم ہے۔ یہی نہیں بلکہ انصاف کا یقین بھی خدا ہی پر تھا۔ انسانوں پر نہ تھا۔

جب صحیح سلامت ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا اور دروازہ بند کر لیا تو اُسے محسوس ہوا۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ کمرہ بالکل بے آراستہ تھا۔ فرش پر قالین تک نہ تھا۔ جا بجا خالی بکس اور اٹھل بے جوڑ سا فرنیچر پڑا تھا۔ کئی لمبے لمبے آئینے تھے جو مختلف زاویوں سے ملتے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر ہو۔ کئی تصاویر بعض چوکھٹوں میں لگی ہوئی۔ بعض بغیر چوکھٹوں کے۔ دیوار کے ساتھ الٹی کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے کے کمرے کی شیشہ والی الماری، ایک اور الماری جس میں لکڑی کی پچی کاری کی ہوئی تھی اور ایک بہت بڑا پرانی وضع کا پلنگ تھا۔ جس پر دبیز قیمتی کپڑے کے پردے لگے تھے۔ کھڑکیوں کی چوکھٹ فرش تک پہنچی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا نچلا حصہ بند تھا۔ اس لئے پڑوس کے لوگوں کی نظر پڑ سکتی تھی۔ مارخانیم نے ایک بکس کو الماری کے سامنے کھینچ لیا اور کنجیوں کے گچھے میں سے ایسی کنجی تلاش کرنے لگا جس سے الماری کا قفل کھل سکے۔ کنجیاں بے شمار تھیں۔ اس لئے یہ کام لمبا تھا۔ اور طبیعت گھبرانے لگی تھی۔ اس خیال سے اور بھی گھبراہٹ ہوتی تھی کہ ممکن ہے الماری میں کچھ بھی نہ نکلے۔ اور وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس پوشیدہ مصروفیت سے اس کے حواس پھر درست ہو گئے۔ دروازہ کو کنکھیوں سے بلکہ بعض اوقات نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا جیسے کوئی فوجی سپہ سالار اپنی حفاظت کے انتظامات کو مستحکم پا کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بالکل مطمئن تھا۔ باہر ابھی تک مینہ برس رہا تھا۔ اور بارش کا شور طبیعی اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد دوسری طرف سے حمد و مناجات کے گیت کے ساتھ پیانو بجنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بہت سے بچے مل کر گیت گا رہے تھے۔ گیت کی موسیقی خوش آہنگ تھی۔ اور اس کے سروں سے ایک خاص وقار ٹپکتا تھا۔ بچوں کی آوازیں پیاری اور بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ مارخانیم مسکراتا ہوا اُن کو سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کنجیاں گھما گھما کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ دل میں اسی قسم کے تصورات اور خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ کبھی گرجا جاتے ہوئے بچوں اور آرگن کے بجنے کا خیال آتا۔ کبھی کھیلتے کودتے بچوں کا تصور بندھ جاتا کہ ندی کے کنارے نہانے کو جمع ہیں۔ یا کھلے میدان میں گھوم رہے ہیں۔ یا جب آسمان پر ہوا بادلوں سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ تو پتنگ اڑا رہے ہیں۔ سرکس اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ پھر گرجے کا خیال آ جاتا گرمیوں کا موسم ہے۔ اتوار کا خواب اور دن۔ پادری بلند آواز اور شائستہ لہجے میں وعظ کر رہا ہے (اس پر ذرا مسکرا دیتا) روغنی جگمگاتی ہوئی منقش اور کلیسا کے مشرقی حصے میں ترنم سے حروف میں لکھے ہوئے دس احکام آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔

ایسی باتیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یک لخت چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً برف کی سی خنکی خون کا ابلتا ہوا فوارہ۔ آگ کا ایک شعلہ اس کے جسم میں دوڑ گیا پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ اور جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ کسی شخص کے سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی ہاتھ نے دروازے کے دستے کو گھمایا۔ قفل سرکتا ہوا سنائی دیا اور دروازہ کھلا۔

خوف نے جیسے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اب کیا ظہور میں آئے گا۔ خود مقتول ہی اپنے پاؤں چل کر آ گیا ہے۔ یا عدالت

کا کوئی کارندہ ہے یا [illegible] جس کی شہادت سے [illegible] لیکن جب دروازہ کھلا
تو ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا [illegible] مارخائیم کو [illegible] پہچان [illegible]
پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا [illegible]
اجنبی پھر واپس آ گیا [illegible] سے دیکھنے لگا۔

[illegible] مجھے جانا تھا [illegible]

مارخائیم [illegible]
نظر آتی تھی جیسے [illegible] پھر
خیال آتا مجھ سے [illegible] نہیں۔
نہ خدا کی تحقیق میں سے ہے۔

لیکن عجیب بات تھی [illegible] اجنبی [illegible] مارخائیم کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا [illegible] جب اس
نے یہ پوچھا کہ روپے کی تلاش میں ہو؟ تو [illegible] روزمرہ کی عام گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ مارخائیم نے کچھ جواب نہ دیا۔

اجنبی بولا: "میں تمہیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ ملازمہ اپنے چاہنے والے سے جلد ہی رخصت ہو گئی ہے اور اب یہاں پہنچا ہی
چاہتی ہے۔ اگر مسٹر مارخائیم اس گھر میں پکڑے جائیں تو نتیجہ جو ہوگا وہ تم جانتے ہی ہو۔"

قاتل نے پوچھا: "تم مجھے جانتے ہو؟"

اجنبی مسکرا دیا اور بولا: "تم مدت سے میرے منظور نظر رہے ہو۔ میں تمہیں دیکھتا رہا ہوں اور بارہا میں نے چاہا ہے کہ تمہاری
مدد کروں۔"

مارخائیم بولا: "تم کون ہو؟ کیا شیطان ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں تمہاری جو خدمت کرنا چاہتا ہوں اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ میں کون ہوں۔"

مارخائیم بولا: "ضرور پڑ سکتا ہے! میں تم سے مدد چاہوں! تم سے! یہ ہرگز نہ ہوگا۔ تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔ خدا کا
شکر ہے تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔"

اجنبی نے ایک مشفقانہ درشتی بلکہ تحکم کے ساتھ جواب دیا: "میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہاری روح تک سے واقف ہوں۔"

مارخائیم بولا: "مجھے جانتے ہو! مجھے کون جان سکتا ہے؟ میری زندگی خود میرا ہی بگڑا ہوا نقشہ اور خود مجھ پر ایک تہمت ہے۔
میں نے عمر بھر اپنی فطرت کو جھٹلایا ہے۔ ہر انسان کا یہی حال ہے۔ ہر انسان اس لبادے سے بہتر ہوتا ہے جو وہ اپنے اوپر چڑھاتا
رہتا ہے اور جس کے اندر اس کا دم گھٹا جاتا ہے۔ ہر انسان کشاں کشاں جدھر زندگی لے جائے ادھر ہی کھنچا چلا جاتا ہے، جیسے
رہزن کسی کو پکڑ کر اس پر کمبل ڈال دیتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اپنے اوپر اختیار ہو، اگر کبھی وہ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دیں تو
تم انھیں اس سے کہیں مختلف پاؤ گے اور ان کے چہروں پر نامور بہادروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کا سا نور چمکتا نظر آئے گا۔ میں
بہت سوں سے بڑا ہوں۔ مجھ پر جھوٹ کی بہت موٹی تہ جمی ہے اور میرا عذر مجھے اور میرے خدا کو معلوم ہے۔ لیکن اگر مجھے مہلت ہو

تو میں اپنی اصل حقیقت آشکار کر سکتا ہوں۔"

اجنبی نے پوچھا: "مجھ پر؟"

ہاتف نے جواب دیا: "سب سے پہلے تو میں تمھیں عقلمند سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب تم آ ہی گئے ہو تو کم از کم میرے دل کا حال بھی جان لوگے لیکن افسوس پھر بھی تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! ذرا سوچو تو میرے افعال سے! دیوؤں کے ملک میں پیدا ہوا اور میں نے دیوؤں کے ملک میں زندگی بسر کی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے حالات و واقعات کے دیو مجھے کلائیوں سے پکڑ کر گھسیٹتے پھرتے ہیں اور تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو۔ تمھیں میرا باطن نظر نہیں آتا؟ تم یہ نہیں سمجھتے کہ مجھے بدی سے نفرت ہے؟ تمھیں میرے سینے کے اندر ضمیر کے احکام صاف صاف لکھے ہوئے نظر نہیں آتے؟ میں نے اکثر ان کی تعمیل سے گریز کیا ہے لیکن دیدہ و دانستہ کبھی ان کی غلط تاویل نہیں کی۔ اپنی مرضی کے خلاف گناہ کرنے والوں کی مثالیں تو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوں گی۔ کیا میں تمھیں دنیا کا انسان معلوم نہیں ہوتا؟"

جواب ملا: "تم نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے لیکن اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ بدی سے نفرت کرنے کے باوجود بھی انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ تمھیں کون سے واقعات کس طرف قدم اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ غرض تو اس سے ہے کہ جس رستے پر چلو وہ رستہ ٹھیک ہو لیکن وقت نکلا جا رہا ہے۔ ابھی تک تماشا کرتے کرتے اور اشتہاروں کی تصویریں دیکھتے ماکو دیر ہو گئی ہے تاہم وہ آئی ہے جیسے پھانسی کا تختہ۔ بازاروں میں کرسمس کا ہجوم گو دوڑتا ہوا تمھاری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ کہو تو میں تمھاری مدد کروں۔ میں جو سب کچھ جانتا ہوں تمھیں بتاؤں۔ روپیہ کہاں رکھا ہے؟"

مارخائیم نے پوچھا: "مجھے قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں یہ خدمت کرسمس کے تحفے کے طور پر کرنے کو تیار ہوں۔"

مارخائیم سے نہ رہا گیا۔ ایک تلخ سے احساسِ تسخیر کے ساتھ مسکرا دیا اور بولا: "نہیں۔ میں تمھارا احسان کبھی نہ لوں گا۔ اگر پیاس کے مارے میری جان نکل رہی ہو اور پانی کا پیالہ تمھارے ہاتھ میں ہو جب بھی مجھ میں اتنی ہمت ضرور ہوگی کہ میں انکار کر دوں۔ یہ میری سادہ لوحی سہی لیکن میں اپنے آپ کو بدی کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتا۔"

اجنبی نے کہا: "مرتے وقت توبہ کر لینا۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔"

مارخائیم نے زور سے جواب دیا: "تمھیں اسی لیے عذر نہیں کہ تم جانتے ہو مرتے وقت توبہ کرنا بے سود ہے۔"

اجنبی نے جواب دیا: "میرا یہ خیال نہیں لیکن بات یہ ہے کہ میں ان باتوں کو اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ جب زندگی ختم ہو جائے تو پھر مجھے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایک انسان عمر بھر میرے حکم کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ دینداری کے بھیس میں سیہ کاری پھیلاتا رہتا ہے یا اپنی کمزوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر گندم کے کھیت میں حنظل بوتا ہے۔ جب اس کی مخلصی کا وقت قریب آتا ہے تو میں اس سے صرف ایک اور خدمت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ گناہوں سے توبہ کرلے اور اس جہان سے مسکراتا ہوا رخصت ہو۔ یعنی میرے باقیماندہ پیروؤں میں سے بزدل لوگ ذرا کم حوصلہ ہیں انھیں ہمت دلائے، انھیں آس لگی رہے کہ عفوِ خداوندی مرتے وقت بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کچھ ایسا جابر آقا تو نہیں۔ مجھے آزما لو۔ میری مدد قبول کرو۔ اب تک تم نے جو دل چاہا کیا، اب بھی جو دل چاہے کرو بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عیش اور

اطمینان کی زندگی بسر کرو اور جب رات پڑ جائے تو اولادیں اپنے بستر پر جا لیٹیں، میں اپنے وقت میں تمہاری ستی کے صدقے جایا کرتا ہوں۔ اس وقت مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خدا کی آغوش شفقت میں جا بیٹھا ہوں۔ بس اسی جگہ سے آیا ہوں وہاں اسی طرح کا ایک تائب انسان بستر پر پڑا تھا کہ وہ تم تاروں سے کہہ رہا تھا جو اس نے آخری دعا کو بڑی توجہ سے سن لیا تھا۔ زندگی میں اس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ استغفار کی جھلک تک اس نے نہیں دیکھی۔ آج بھی بیس برس کے وقت کی چمک اور اس کا مسکراتا درخشاں نظر آتا تھا۔"

مارخائیم نے پوچھا "تو تم بھی ایسی صورت میں موجود انسان سمجھتے ہو، مجھے جو بیزاری تمہاری اس بات سے ہے کہ جو عمر ساری گزار دوں اور آخری وقت خدا کو یاد کرنے لگوں، پیچھے جنت میں داخل ہو جاؤں۔ میرا دل یہ سوچ کر دھڑکتا ہے۔ کیا تم نے بنی نوع انسان کو ایسا ہی پایا ہے؟ یا تمہیں میرے ہاتھ خون آلودہ دکھائی دیتے ہیں اس بات کا گمان ہے کہ قتل کا گناہ اتنا بڑا ہے کہ نیکی کا احساس بالکل ہی مر جاتا ہے؟"

اجنبی نے جواب دیا "قتل کو میں کسی خاص قسم کا گناہ نہیں سمجھتا۔ جس طرح عام زندگی ایک جنگ ہے اسی طرح ہر گناہ ایک قتل ہے۔ میرے نزدیک تو تمام بنی نوع انسان کی مثال ان ملاحوں کی سی ہے جو ایسے ڈوبتے ہوئے جہاز کے تختوں پر تیر رہے ہوں جن کے پاس کچھ نہ ہو کھانے کے واسطے اور اپنے ساتھیوں کو چیر پھاڑ کر کھا رہے ہوں۔ یہاں تک کہ مزدوری پر اتر آتے ہیں۔ میری نگاہ عین اس لمحے سے کہیں پرے نکل جاتی ہے جس میں جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کا انجام موت ہے۔ میری آنکھوں کو وہ حسین لڑکی جو ناچ پر جانے کے لیے ہزار اداؤں سے اپنی ماں کو بے بس کر رہی ہے اور صاحب قاتل دونوں یکساں خون میں لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں بدی کے نتائج کو سوچتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ میں نیکی کے مسئلے پر بھی غور کرتا ہوں۔ مجھے دونوں میں ہرگز فرق نظر نہیں آتا۔ گویا دونوں ایک ہی منزل کی راہیں ہیں جن سے موت کا فرشتہ فصل کاٹ کر لے جاتا ہے۔ جس بدی کے لیے میری زندگی وقف ہے وہ افعال کی بدی نہیں سیرت کی بدی ہے۔ مجھے گنہگار انسان محبوب ہے۔ گناہ کے فعل سے محبت نہیں۔ بڑے کاموں کا ثمرہ شاید بڑی بڑی نیکیوں کے پھل سے بھی زیادہ شیریں نکلے۔ لیکن یہ ہمت کس میں ہے کہ قرنوں اور صدیوں کے دھندلاتے ہوئے آثار کی تہہ تک پہنچ کر بدی کے نتائج کا مطالعہ کر سکے۔ میں جو اب تمہاری دستگیری پر آمادہ ہوں تو وہ اس سبب نہیں کہ تم نے ایک دکاندار کو قتل کر ڈالا ہے بلکہ اس لیے کہ تم مارخائیم ہو۔"

مارخائیم نے جواب دیا "میں تم سے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کرتا ہوں۔ یہ جرم میرا آخری جرم ہے اور پیشتر اس کے کہ یہ مجھ سے سرزد ہوا مجھے کئی سبق مل گئے۔ یہ خود ایک سبق تھا، بہت بڑا سبق۔ اب تک جو کچھ میں نے کیا وہ میری مرضی کے خلاف تھا لیکن سرکشی نے مجھ سے سب کچھ کرا دیا۔ میں افلاس کا مظلوم اور مجبور غلام تھا۔ بعض اوقات انسان کسی نیک کام کے لیے بیٹھے کا لالچ کرتا ہے۔ مجھے صرف عیش پسندی کی ہوس تھی لیکن آج مجھے اس جرم سے دولت اور عبرت دونوں چیزیں حاصل ہوئیں گویا میں اپنے اصلی روپ میں خود کو آسکنے کے لیے ارادہ اور سامان دونوں مہیا ہو گئے ہیں۔ اب میں اپنے افعال کا پورا پورا مختار ہوں اب میں بالکل بدل جاؤں گا۔ ان ہاتھوں سے نیکی کروں گا اور اس دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔ میری گذشتہ زندگی کے بعض جذبات پھر میری طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ اتوار کی شام کو جب گرجا کا آرگن بج رہا ہوتا یا جب کسی مقدس کتاب کی تلاوت سے میری

آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے یا جب میں معصومیت کے زمانے میں اپنی ماں سے باتیں کیا کرتا تھا تو اس وقت اپنی آئندہ زندگی کا جو تصور میرے سامنے تھا وہ اب سچ ہو کے رہے گا۔ میں چند سال بھٹکتا پھرا ہوں لیکن اب مجھے منزل مقصود پھر نظر آ رہی ہے۔"

اجنبی نے پوچھا: "یہ روپیہ تم سٹہ بازی میں لگاؤ گے؟ جہاں میں سمجھتا ہوں تم پہلے بھی کئی ہزار ہار چکے ہو۔"

مارخائیم نے کہا: "ہاں لیکن اب کے میرا جیتنا یقینی ہے۔"

اجنبی بولا: "اب کے پھر ہار دوگے۔"

مارخائیم نے کہا: "ہاں! مگر میں آدھا روپیہ اپنے پاس رکھوں گا۔"

اجنبی بولا: "وہ بھی ہار دوگے۔"

مارخائیم کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ بولا: "اچھا! کیا مضائقہ ہے؟ فرض کرو میں سب روپیہ ہار دوں اور فرض کرو میں پھر مفلس اور قلاش ہو جاؤں تو کیا میرا نفس ایک حصہ اور بھی اسفل، یوں ہی آخر تک اسفل رہے گا اور رفتہ رفتہ نیکی کی قوت کو سلب کر دے گا؟ نیکی اور بدی دونوں زبردست ہیں اور اپنی اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ مجھے دونوں سے محبت ہے۔ میں بڑے بڑے کارنامے سوچ سکتا ہوں، اپنے نفس کو مار سکتا ہوں، نیکی کے رستے میں جان تک قربان کر سکتا ہوں اور گو میں اتنا ذلیل ہوں کہ قتل تک سے دریغ نہ کیا لیکن رحم سے بالکل ناآشنا نہیں۔ میں غریبوں پر رحم کھاتا ہوں، مجھ سے زیادہ ان لوگوں کی مصیبتوں کو کون جانتا ہے؟ میں محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں وہ ہنسی اور خوش دلی چاہتا ہوں جو اطمینانِ قلب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی اچھی بات ایسی نہیں جس سے مجھے دلی محبت نہ ہو، تو کیا صرف بدیاں ہی میری رہنمائی کریں گی؟ اور کیا میری خوبیاں کوڑے کرکٹ کی طرح بے کار پڑی رہیں گی؟ ہرگز نہیں۔ نیکی بھی افعال کی رہبر ہو سکتی ہے۔"

لیکن اجنبی نے اپنی انگلی اوپر کو اٹھائی اور بولا: "تمہیں اس دنیا میں آئے چھتیس سال ہو گئے۔ اس دوران میں تمہاری قسمت نے کئی دفعہ پلٹا کھایا اور تمہاری طبیعت نے کئی رنگ بدلے لیکن میں چھتیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ تم برابر قعرِ مذلت کی طرف جا رہے ہو۔ آج سے پندرہ سال پیشتر تم چوری کے خیال سے بھی کانپ اٹھتے۔ آج سے تین سال پیشتر قاتل کا نام سن کر تمہارا رنگ فق ہو جاتا لیکن اب کیا کوئی بھی جرم، کوئی بھی سفاکی، کوئی بھی ذلت ایسی ہے جس سے تمہاری طبیعت متنفر ہو اور پانچ سال میں تم ان سب کے مرتکب ہو چکے ہوگے۔ تم دن بدن پستی کی طرف جا رہے ہو اور بجز موت کے اور کوئی چیز تمہیں نہیں روک سکتی۔"

مارخائیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "یہ سچ ہے۔ میں نے ایک حد تک بدی کے احکام کی تعمیل کی ہے لیکن سب کا یہی حال ہے۔ محض اس جہان میں بسر کرنے کی وجہ سے پاکیزہ ترین انسان بھی دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔"

جواب ملا: "میں تم سے ایک سیدھا سادا سوال پوچھتا ہوں۔ جواب پانے پر میں تمہاری آئندہ اخلاقی زندگی کا حال تمہیں بتاؤں گا۔ بہت سی باتوں میں تم نیک و بد کی چنداں پروا نہیں کرتے اور ممکن ہے تم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔ بہرحال ہر انسان کا یہی حال ہے لیکن کوئی ذرا سی بات بھی ایسی ہے جس میں تم اپنے افعال کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہو؟ یا ہر بات میں بے حسابی سے کام لیتے ہو؟"

مارخائیم کو جیسے جواب سوچنے میں بے حد تکلیف ہو رہی ہو۔ بولا: "کوئی ذرا سی بات ایسی ہے؟ نہیں کوئی نہیں میں

ہر طرح ذلیل ہوں۔"

اجنبی بولا: "تو پھر اسی پر مطمئن رہو کیونکہ یہ تمہارا مقدر ہے۔ وہ ماسٹر اسٹیج پر جو بات نصیحت ادا کرتا ہے اس کے الفاظ مقرر ہیں اور ان میں ردّ و بدل کا کوئی امکان نہیں۔"

مارخائیم بہت دیر تک چپ کھڑا رہا بلکہ دوبارہ بھی پھر اجنبی ہی نے بولنا شروع کیا۔ "تو پھر مجھے بتاؤ کہ روپیہ کہاں رکھا ہے ——؟"

مارخائیم نے پوچھا: "اور معافی خداوندی؟"

جواب ملا: "وہ تم آزما چکے ہو۔ دو تین سال ہوئے تم ہی تو تھے جب میں نے مذہبی جلسوں کے پلیٹ فارم پر سب سے بلند آواز میں حمد و مناجات کے گیت گاتے سنا تھا۔"

مارخائیم بولا: "یہ سچ ہے۔ مجھے اپنا فرض صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس سبق کے لیے دل و جان سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میری حقیقت اب مجھ پر آشکارا ہو چکی ہے۔"

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی کے بجنے کی تیز آواز سارے گھر میں سنائی دی۔ اجنبی کا رویہ یوں بدلا جیسے گھنٹی کا بجنا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا تھا اور وہ بس اسی کے انتظار میں تھا۔

بولا: "وہ ماما آ گئی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ واپس آ جائے گی۔ اب تمہارے لیے فقط ایک مشکل کام انجام دینا باقی رہ گیا ہے۔ اس سے کہنا تمہارا آقا بیمار ہے۔ خود جا کے دروازہ کھولنا۔ تمہارے چہرے سے گھبراہٹ نہیں بلکہ سنجیدگی مترشح ہونی چاہیے۔ مسکرانا مت۔ بہت زیادہ اطمینان کا اظہار بھی نہ کرنا۔ میرے کہے پر عمل کرو گے تو یقین مانو تمہارا راز کبھی فاش نہ ہو گا۔ بس لڑکی اندر آ جائے اور دروازہ بند ہو جائے تو جس ہوشیاری سے تم نے آقا کو ٹھکانے لگایا ہے اسی طرح اس آخری کانٹے کو بھی اپنے رستے سے ہٹا سکتے ہو۔ پھر تو ساری شام اور اگر ضرورت ہو تو ساری رات پڑی ہے۔ گھر کے سب مال و اسباب کی اچھی طرح تلاشی لے لینا اور پھر مزے سے نکل جانا۔ ماما کے آ جانے میں بھی ایک عجیب حکمت ہے۔ اٹھو! میرے دوست اٹھو! تمہاری زندگی اس وقت ایک کچے دھاگے سے بندھی ہے۔ اٹھو! کچھ کر لو۔"

مارخائیم اپنے صلاح کار کو غور سے دیکھتا رہا اور بولا: "اگر میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میری ہر حرکت بدی اور گناہ ہی کے لیے وقف ہے تو نجات کا ایک دروازہ تو اب بھی کھلا ہے۔ میں ہاتھ پاؤں ہلانا ہی کیوں نہ بند کر دوں؟ اگر میری زندگی ناپاک ہے تو میں اس زندگی سے دستکش ہی کیوں نہ ہو جاؤں؟ تم سچ کہتے ہو میں ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا غلام ہوں لیکن اب بھی میں ایک ہی فیصلہ کن جنبش کے ساتھ ان سب خواہشات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ نیکی کی تمنا کبھی پوری نہ ہو تو اچھا یونہی سہی لیکن بدی سے نفرت تو اب بھی باقی ہے اور تمہیں یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہو گی کہ میں اسی نفرت سے طاقت اور جرأت دونوں چیزیں حاصل کر سکتا ہوں۔"

اجنبی کا چہرہ بدلنا شروع ہوا۔ اس کے خدوخال حسین و جمیل ہوتے گئے اور ایک شفقت آمیز احساسِ تسخیر کے ساتھ چمکنے لگے اور پھر فوراً ہی مدھم ہو کر غائب ہو گئے لیکن مارخائیم اس تغیر کو دیکھنے یا سمجھنے کے لیے ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ اس نے

دروازہ کھولا اور کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کی گذشتہ زندگی کا صاف اور صحیح نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ خواب کی طرح بدنما اور تکلیف دہ بے ترتیب اور بے جوڑ۔ گویا شکست کا ایک منظر پھیلا ہوا ہے۔ جب اپنی زندگی یوں نظر آئی تو جینے کی ہوس باقی نہ رہی لیکن زندگی کے اس پار اسے اپنی کشتی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان کے دروازے کے پاس پہنچا تو رک گیا۔ دروازے میں سے جھانکا۔ شمع ابھی تک لاش کے پاس جل رہی تھی اور ایک عجیب خاموشی طاری تھی۔ نظریں مبہوت تھیں اور ذہن میں دکاندار کے متعلق خیالات کا ایک ہجوم برپا تھا۔ گھنٹی جیسے بے صبری کے ساتھ دوبارہ بجی۔

دہلیز کے پاس ماما کے روبرو کھڑا ہوا تو چہرے پر مسکراہٹ سی تھی۔ بولا "پولیس کو بلا لو تو بہتر ہے میں نے تمہارے آقا کو قتل کر دیا۔"

(مل گرطہ میگریں)

گونگی جورو

یہ ترجمہ بھی ہے اور خلاصہ بھی۔ اس دوگانہ وجہ سے اصل کامیڈی کی سب لطافتیں فنا ہو گئی ہیں صرف کہانی باقی رہ گئی ہے لیکن صرف کہانی ہی کا منتقل کرنا مقصود بھی تھا۔ مولیئر فرانس نے اس قصہ کو مشہور فرانسیسی مصنف رابیلے سے اخذ کیا ہے۔ رابیلے نے [illegible] سنا دیا تھا۔ گویا کہانی دراصل بہت پرانی ہے۔ مولیئر فرانس نے اسے نیا رنگ دے کر کامیڈی کی شکل میں پیش کیا۔

جو خاکہ اب آپ کے سامنے ہے، اس میں خوبیاں اساتذہ کی ہیں خامیاں میری ہیں۔

(پطرس)

پہلا ایکٹ

(ژیراں نامی پیرس کے ایک جج کا کمرہ)

(ماسٹر آدم ایک بیرسٹر اس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔)

آدم۔ (جھک کر آداب بجا لاتا ہے) زہے قسمت کہ آپ سے پھر ملاقات ہوئی۔

ژیراں۔ واہ خوش قسمتی تو ہے میری، کہئے۔ فرمائیے پیرس میں کس طرح آنا ہوا؟

آدم۔ (کرسی پر بیٹھ کر) شارتے سے آیا ہوں۔ ایک سفارش کرنے کے لئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ جس کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ اس پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ اس کا سرپرست اس کی سب جائداد ہضم کر گیا ہے بس اس مقدمے پر ہی اس کی قسمت کا دار و مدار ہے۔ اگر جیت گئی تو [illegible] ہو سکتا آپ کی مدد کر سکے گی ورنہ.....

ژیراں۔ اچھا اچھا ہم غور کریں گے۔

آدم۔ اب کچھ اپنی کہئے۔ تنہائی میں دن مشکل سے کٹتے ہوں گے۔ شادی کا ارادہ نہیں کیا؟

جمال۔ تم نے نہیں سنا؟ پچھلے ہی مہینے تو میں نے شادی کی ہے۔ ایک بہترین لڑکی سے۔ کیتھرین نام ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گونگی ہے۔

آدم۔ تو شادی سے پہلے تمہیں اس کا علم نہ تھا؟

جمال۔ معلوم تو تھا۔ لیکن یہ بات بھی کب تک چھپ سکتی تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ ایک تو خوب صورت دوسرے بہت سا جہیز۔ میں نے سوچا چلو ہو گیا۔ جیسے بھی بنے گی روپیہ بھی ہاتھ آئے گا۔ ہاں اب پچھتاتا ہوں۔ کچھ بات چیت کر سکتی۔ مقدمے والوں کی خاطر مدارات کرتی وہ بھی ہماری تو منع کرتے۔ کوئی مرغیاں تو! کوئی شراب کا پیپا دے جاتا لیکن اب تو یہ حالت ہے کہ گذر وشکل سے ہو سکتا ہے اور میں خود بھی پژمردہ اور اداس رہتا ہوں۔ بیوی کیا ہے۔ ایک مشین ہے۔

آدم۔ بہری تو نہیں؟

جمال۔ نہ۔ خیر سنتی تو تم ہم سے بھی زیادہ ہے۔

آدم۔ تو پھر کچھ مشکل نہیں۔ اگر کوئی گونگا شخص ساتھ ہی بہرہ نہ ہو تو اس کا علاج سہل ہے۔ آپ کے گھر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ اس کا آپریشن اس بارے میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

جمال۔ میں ابھی اس کو بلاتا ہوں۔

آدم۔ تمہاری مرضی۔ لیکن اس کو بلانے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لو۔ گونگی عورت کے جہاں کئی نقصان ہیں۔ وہاں کئی فائدے بھی ہیں۔

(آدم چلا جاتا ہے۔ جج اپنے ملازم کو ڈاکٹر کے گھر بھیجتا ہے۔ اس کے بعد
جج کی بیوی کیتھرین داخل ہوتی ہے)

جمال۔ (کام کرتا کرتا رک جاتا ہے) آہا۔ میری جان۔ تم آگئیں مجھے تمہاری آہٹ تک سنائی نہیں دی۔ تم پریوں کی طرح خاموشی کے ساتھ گذر جاتی ہو۔ تم ایک خوشگوار خواب کی مانند ہو۔ تم قدرت کا ایک معجزہ ہو۔ تم میں سوائے ایک گویائی کے باقی تمام صفات موجود ہیں۔ اگر تمہیں گویائی کی قوت بھی عطا ہو جائے تو کیا تم خوش نہ ہوگی۔ جو جذبات اب مجھے تمہاری آنکھوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں وہ تمہارے ہونٹوں سے ادا ہوں گے۔ تمہاری روح بے نقاب ہو جائے گی۔ تم اپنے منہ سے محبت کا اظہار کرو گی۔ اپنے شوہر کو اپنی زبان سے پکارو گی۔ میری جان میں تمہیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر ابھی آکر تمہاری زبان کھول دے گا۔ تھوڑی ہی دیر میں تم چہچہانے لگ جاؤ گی۔

(کیتھرائن اشاروں سے بے انتہا مسرت کا اظہار کرتی ہے اس کے بعد ڈاکٹر آتا ہے۔ اور
سب کے سب آپریشن کی تیاری کے لئے ساتھ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

(جج کا کمرہ ـــــــ شام کا وقت)

آدم۔ آپ نے میرے موکل کے مقدمے پر غور کیا؟

بٹال۔ ابھی نہیں۔ تم تو ملاقات چھوڑ گئے تھے۔ ہمیں پچھلے ہفتے کی فرصت نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ تمہارے مشورے پر عمل کیا۔ اب جان عذاب میں ہے۔ ڈاکٹر نے "آپریشن" کیا اور میری بیوی بولنے لگی۔

آدم۔ خدا کا شکر ہے۔ کیا کہا اس نے؟

بٹال۔ کہنے لگی۔ خدا امید رکھتا ہے وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ میری جان! میری سالگرہ کے دن مجھے ساٹن کا ایک گون لا دو گے نا؟ — ساٹن کا گون اور ایک ٹوپی جس کے اندر مخمل کا استر لگا ہو۔

آدم۔ اس کے بعد اس کی زبان بند تو نہیں ہوئی؟

بٹال۔ نہیں بلکہ وہ متواتر بغیر رکے، بغیر رکن، بغیر تھکے بولتی رہی۔

آدم۔ شروع شروع میں تو یہ چاہیے تھا۔ برسوں کی رکی ہوئی باتیں سب یک لخت نکلیں گی۔ بعد میں بولنا ذرا کم ہو جائے گا۔ میرے مقدمے کا خیال رکھئے اس خاتون کا نام لیڈی آرسلین ہے۔ خدا حافظ!

(آدم چلا جاتا ہے۔)

بٹال۔ (کاغذات پڑھنے لگ جاتا ہے) دوسرے صاحب لیڈی آرسلین . . .

(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین۔ کیا کر رہے ہو میری جان؟ تم مصروف معلوم ہوتے ہو! تم ہمیشہ مصروف رہتے ہو۔ تم بہت کام کرتے ہو۔ آنکھوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں کہتی ہوں کبھی آرام بھی کیا کرو، اور بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم کیا کر رہے ہو؟

بٹال۔ میری جان......

کیتھرین۔ کیا کوئی راز کی بات ہے جس کے پوچھنے کا مجھے حق نہیں؟

بٹال۔ میری جان...

کیتھرین۔ کوئی راز کی بات ہے تو میں نہیں پوچھتی۔

بٹال۔ یہ بات تو کرنے دو میں ایک مقدمے کا فیصلہ لکھنے لگا ہوں۔

کیتھرین۔ تو بڑا ضروری کام ہوگا؟

بٹال۔ بہت ضروری!

کیتھرین۔ تو میری جان تم اپنا فیصلہ لکھو میں کچھ نہ بولوں گی۔

بٹال۔ مقدمے کے واقعات یہ ہیں..... لیڈی آرسلین....

کیتھرین۔ میری جان تمہاری رائے میں مجھے ریشم کا گون اچھا لگے گا یا ترکی مخمل کا؟

بٹال۔ مجھے کیا معلوم، مجھے تو.....

کیتھرین۔ میرا خیال ہے میری عمر کی عورت کو ساٹن اچھی لگے گی۔ بشرطیکہ ہلکے رنگ کی ہو اور اس پر چھوٹے چھوٹے پھول ہوں۔

بٹال۔ ممکن ہے۔ مگر......

کیتھرین۔ اور دیکھو میری جان! تمہارے خیال میں گھر کو بہت ہی زیادہ رکھنا بڑی بات نہیں۔ گھر ہونا تو چاہیے اور معلوم بھی ہونا کہ گھر
پہن رکھا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی فضول ہے۔ تم دیکھنا یہ فیشن بھی اتر جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟

بنال۔ بے شک مگر ....

کیتھرین۔ اور جوتے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ عورت کا اندازہ ہی اس کا پاؤں دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ دراصل عورتیں جوتوں کا خیال سب سے
زیادہ رکھتی ہیں۔ ٹھیک سمجھتا؟

بنال۔ ٹھیک ہے مگر ....

کیتھرین۔ اچھا تم اپنا فیصلہ لکھو۔ میں نہ بولوں گی۔

بنال۔ بہت اچھا (کاغذات اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے) " مذکورہ بالا خاتون کے سرپرست نے خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہو کر .... "

کیتھرین۔ کل ہی مجھ سے ایک سہیلی کہہ رہی تھی کہ دنیا کا حال دن بہ دن بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر طرف بے ایمانی بڑھتی جاتی ہے۔ لوگوں میں دیانتداری
اور شرافت نام کو نہیں۔ کیا یہ سچ ہے یا میری سہیلی یوں ہی مبالغہ کر رہی تھی؟ بولو میری جان!

بنال۔ مہربانی کر کے یا تو تھوڑی دیر کو چپ ہو جاؤ یا کہیں اور جا کر بولتی رہو۔ میرے کام میں حرج ہوتا ہے۔

کیتھرین۔ میری جان! تم اطمینان رکھو میں بالکل کچھ نہ کہوں گی۔

بنال۔ اچھی بات (پڑھنے لگتا ہے) " مذکورہ بالا سرپرست نے اس خاتون سے بہت سا روپیہ ... "

کیتھرین۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں چیزیں مہنگی کتنی ہو گئی ہیں۔ پھر بھی تو ہم لوگ کفایت شعاری نہیں کرتے۔ دسترخوان پر جب تک دس دس کھانے نہ ہوں
چین نہیں آتا۔ میں تو سمجھتی ہوں تھوڑی سی یخنی، تھوڑا سا گوشت، اور ایک میٹھی چیز بس یہ کافی ہونا چاہیے۔ لیکن لوگ پیٹو بھی تو بہت ہوتے
جاتے ہیں۔ میری جان! تم کو ایسے لوگوں سے نفرت نہیں ہوتی؟ اور یوں کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا کھانے کے بغیر گزارہ کس طرح
ہو؟ لیکن ذرا سوچو تو۔ لوگ کیسی کیسی بدمزہ اور غلیظ چیزیں کھاتے ہیں۔

بنال۔ میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

کیتھرین۔ میری جان! میں اب اور کچھ نہ کہوں گی۔ ممکن ہے تمہارا حرج ہوتا ہو۔ میں دبان تک نہ ہلاؤں گی۔

بنال۔ تمہاری بڑی مہربانی۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ دیکھا میری جان! میں اب کچھ کہتی ہوں؟ بالکل چپ بیٹھی ہوں۔

بنال۔ ٹھیک۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ اب تو تمہارا حرج نہیں ہوتا؟

بنال۔ بالکل نہیں۔

(وقفہ)

ب۔ اطمینان سے اپنا فیصلہ سنو کیا ختم نہیں ہوا ابھی؟
ر۔ تم نے زبان بند کی تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ (مسئلے میں مصروف ہو جاتا ہے)
(ایک گھنٹہ گھڑی بجاتی ہے) اطہر! معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے۔ لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے (تھامس کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نہیں۔
میں بھول پر ہوں۔ خدا کا شکر ہے آگ نہیں لگی۔ اب تو جب کہیں آگ لگتی ہے تو کیسی مصیبت ہوتی ہے۔ گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے
لوگ اپنا اسباب دریا میں پھینک دیتے ہیں اور کھڑکیوں میں سے کود کود۔ باہر نکل آتے ہیں خوف اور ڈر کے مارے لوگ دیوانے سے
ہو جاتے ہیں۔
بس اب اس سے زیادہ برداشت کرنا ناممکن ہے اگر یہی حالت رہی تو مجھ سے کوئی شدید جرم سرزد ہو جائے گا۔ (نوکر کو آواز دیتا ہے) دیکھو
جا کر ڈاکٹر صاحب کو ابھی بلا لاؤ۔ کہو کہ بہت ضروری کام ہے۔ ذرا آ جائے۔
کیا ہے میری جان! تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ موسم کی خرابی ہے یا کھانے میں کچھ نقص تھا؟
ا۔ اے کاش! میں نے تمہاری زبان نہ کھلوائی ہوتی۔ لیکن گھبراؤ نہیں ابھی ڈاکٹر آ کر ایسی دوائی دے گا جو تمہاری زبان کو بند کر دے گا
(کاغذ اٹھا کر کیتھرین کے منہ پر مارتا ہے۔ کیتھرین چیخیں مارتی ہوئی کمرے سے
باہر نکل جاتی ہے ——— ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)
۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو اپنی بیوی کے علاج کے لئے بلایا ہے۔
کیا انہیں کوئی تکلیف ہے؟
۔ اسے؟ اسے کیا تکلیف ہوتی۔ بدقسمت ستم رسیدہ مظلوم تو میں ہوں۔
تکلیف آپ کو ہے علاج آپ اپنی بیوی کا کرانا چاہتے ہیں!
ا۔ ڈاکٹر صاحب اسے گویائی کی طاقت آپ نے بخشی تھی تو اس قدر فیاضی سے کیوں کام لیا تھا۔ کیا اس کی زبان کسی طرح بند ہو سکتی ہے؟
۔ بالکل ناممکن! بولتے ہوئے آدمی کو گونگا بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔
ا۔ آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے میں اجڑ گیا اب تو میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اپنے گلے میں ایک بھاری سا پتھر باندھ کر دریا میں کود پڑوں۔
۔ تمہاری بیوی کا تو کوئی علاج نہیں البتہ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔
ا۔ وہ کیسے!
ر۔ بہت بولنے والی بیوی کا دفعیہ تو صرف یہی ہے کہ شوہر کو بہرا بنا دیا جائے۔ میرے پاس ایک سفید سفوف ہے جسے کان میں ڈالتے ہی انسان
ہمیشہ کے لئے بہرہ ہو جاتا ہے
ا۔ ہمیشہ کے لئے!
ڑ۔ ہمیشہ کے لئے!
ل۔ نہیں مجھے یہ ہرگز منظور نہیں۔ میں بہرا بننا نہیں چاہتا۔
(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین۔ اوہ! یہاں تو ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ بیگم آپ کو اب بولنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟

کیتھرین۔ ڈاکٹر صاحب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ شروع شروع میں تو صرف چند فقرے ہی بول سکتی تھی لیکن اب روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتی ہوں تاہم میں ضرورت سے زیادہ نہیں بولتی۔ ابھی ابھی میرا شوہر کچھ کہہ رہا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھی سن رہی تھی لیکن پھر بھی میرے شوہر کو شکایت ہے کہ تمہارے بولنے سے میرے کام میں ہرج ہوتا ہے (شوہر سے مخاطب ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ناخوش کس بات پر ہو؟ آخر وجہ کیا ہے؟ کوئی بات تو ایسی ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتاتے! للہ مجھے کچھ تو بتاؤ۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری آسائش کا خیال رکھوں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں آئندہ کے لئے احتیاط کروں گی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اماں جان کو خدا جنت نصیب کرے کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی بات نہ چھپانی چاہیئے۔ بے چاری سچ کہتی تھیں۔ دل میں کبھی کوئی بات نہ رکھنی چاہیئے۔ جو ہو صاف صاف کہہ دینا چاہیئے۔ میرا خدا جانتا ہے میں نے کوئی قصور نہیں کیا اگر پھر بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ میں گنہگار ہوں تو بے شک ڈاکٹر کے سامنے سب حال بیان کر دو۔

بوتال۔ (بے بس ہو کر) ڈاکٹر صاحب! خدا کے واسطے وہ سفید سفوف میرے کان میں ڈال دیجئے۔ (ڈاکٹر بوتال کے کان میں سفوف ڈال دیتا ہے)

کیتھرین۔ میری جان۔ میرے سرتاج! آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا میں ایسی ہی بے رحم ہوں کہ تمہیں ستاؤں؛ میں نے تم سے کبھی کوئی دغا کی ہے؟ کبھی تمہیں دھوکا دیا ہے؟

بوتال۔ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) آہا! زندگی کس قدر شیریں ہو گئی ہے! مجھے اب ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔

کیتھرین۔ بوتال! میری بات سنو! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے دل کا حال سناتی ہوں۔ میرا دل بچپن ہی سے نرم تھا جب میں سات سال کی تھی۔ تو میرے پاس ایک چھوٹا سا کتا تھا۔۔۔ سن رہے ہو؟ میری جان! میری روح! میرے شوہر! (بوتال کو جھنجھوڑتی ہے)

بوتال۔ زندگی اب ایک جنت ہے۔

(آزاد)

صید و صیاد

۲ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے کنارے پل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے عالمِ بقا کے لیے اپنا تعلق منتقل کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ جاتا، اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔

یہ نوجوان جس کا نام ایڈمنڈ سیورین تھا، جب پل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو جنگلے پر جھکا، کچھ دیر تک پانی کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ذرا کانپا، اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور خاطر خواہ انداز میں ورزش کرنے لگا۔

ورزش کرنے کے بعد اس نے ہیٹ پل پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوطی سے پکڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ابھی کودنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے حضرت۔"

اس موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے ہٹا دیا اور پھر چھلانگ لگانے لگا لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا اور پھر وہی آواز آئی "حضرت! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے لیے ٹھہر جائیے۔ کیا اتنا بھی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیورین نے مڑ کر دیکھا۔ اجنبی درمیانہ قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش باریک جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی۔ صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

لیکن موسیو سیورین کو غصہ سا آگیا۔ اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا اس کا یوں رائیگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔

وہ جھلا کر بولا "آپ ہوتے کون ہیں؟"

اجنبی نے کہا "حضرت یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا۔ ورنہ میں کاہے کو مخل ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدا سا ہے لیکن میں کیوں دخل دیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ یقین جانیے میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

سیورین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا "تو تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر میں یہ (اس نے دریا کی

طرف ہاتھ پھیلا دیا۔ "اس بات کی خوشی ہے کہ میں یہاں جان کا حرج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کرسکتا ہوں؟"

اجنبی بولا "قصور ایک عورت کا اور آپ سب مردوں کو الزام دے رہے ہیں۔ اب انکار نہ کیجیے میں آپ کے منہ سے 'نہ' نہیں سنوں۔ فقط دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی مدد کیجیے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹہ ملتوی کر دیجیے۔ محض ایک گھنٹہ۔ کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس وقت سے لے کر ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے آپ اس کے مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹہ بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"

سیورین نے جو باوجود تاریکی ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا، پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اجنبی نے کہا "یہ دیکھیے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں یہاں سردی ہے۔ آپ اتنی مہربانی کیجیے کہ اپنا اوور کوٹ پہن لیجیے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک چلیے۔ وہ جس طرف روشنی نظر آرہی ہے۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سن لیجیے۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بے شک واپس آ جائیے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

سیورین نے دیر تک ایک سرد نظر سے دیکھا اور اجنبی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہو لیا۔

اجنبی نے کہا "شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح ملے اور سمجھانے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بد تمیز کہیں کے۔ میری سنی ہی نہیں میں کرتا کیا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں۔ اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں ——— یہ لیجیے ہم پہنچ گئے۔ یہ شراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے...... پہلے آپ صاحب۔"

دونوں کمرے میں ایک طرف کو مڑ کر بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یوں دیکھنے میں بُرا نہ تھا۔ موسیو سیورین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیہاتیوں کا، رنگ ذرا زرد۔ بولا "تو تمہارا کیا مقصد ہے؟"

اجنبی نے کہا "مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی فرصت نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ "شیر شکاری" کھیلیے۔ "شیر شکاری" کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟"

"نہیں۔"

"افسوس! انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا؟ مجھے پول کہتے ہیں۔"

سیورین نے کہا "کہتے جاؤ۔ میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا۔"

پول مایوسی کے لہجے میں بولا "جب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنیے۔ جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں ان کے لئے میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ جس پر انہیں کسی طرح کی ملامت نہ ہو سکے اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہوگا۔"

سیورین نے کہا "جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلدی کہو۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر چکا ہے اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔"

یرل نے کہا "میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ دیکھئے [illegible] ہوتی ہے [illegible] پہنچ سکتا ہے
صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں، لندن ایک حیوانی تمدن ہے۔ تم یا حقوق نسواں کے نام سے [illegible] بیٹھے ہیں [illegible]
زندگی کے آخری لمحوں میں بھی پیدا کرنا ضروری ہے۔ [illegible] کا انتقاد ہوتا ہے۔ یا آپ دوست ہیں [illegible] جب [illegible]
ایسے موجود ہیں جو آپ کو اکثر [illegible] تیار کیا؟ [illegible] آدمی [illegible]
زیادہ پُر لطف بلکہ زیادہ خوبصورت بنا دیا جا سکتا ہے۔ [illegible]
کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ [illegible] ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے۔ زندگی سے [illegible] فیصلہ کر لیتے
ہیں کہ کون شخص [illegible] اور کون شکاری۔ اس کے بعد [illegible]
ایسے تمام چراغ گل کر دئے جاتے ہیں [illegible] تاریکی میں چھوڑ دیا جاتا ہے [illegible] موسیقی [illegible]
جاتی ہے۔ پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے [illegible] حرکت [illegible] ایک دفعہ [illegible] پھر ایک
دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دئے جاتے ہیں۔ اگر تیر خطا ہو گیا ہو تو وہ یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ [illegible] زہر آلود ہوتی ہیں۔ [illegible] دونوں بچ جاتے ہیں تو شخص [illegible]
سے [illegible] شکاری [illegible] ہو جاتی ہے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک ختم
ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا، لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی، تو عورتوں نے بھی اس میں شرکت کی درخواست
کی۔ یہ بات کس قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے، ایک مرد کا ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر [illegible]
کے [illegible] ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے۔ میں نے اس میں [illegible] کبھی کبھی ایک عالی
کلاس بھی بھر دیتا ہوں۔ صرف یہ ہے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے۔ اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ معزز حضرات اور
معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ [illegible] میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پرلطف موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

سیتون نے پوچھا "لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ
ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمہیں اپنے اس قبیح فعل کے لئے کسی فیس کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملے گی۔ میں واپس چلا
جا رہا ہوں۔ اور نہیں سمجھتا کیونکر تمہارا ممنون ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

یرل نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا "خدا کے لئے پانچ منٹ یہاں اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک
ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے۔ ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا
سکتا ہے۔ اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ [illegible] یہ خبر پہنچی تو میری نامردی میں خلل آ جائے گا۔ آپ چل
کر ڈیوک کی جگہ لے لیجئے۔ اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنائیے۔ اگر خدا نخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے تو آپ اسی پر اکتفا
کر کے واپس یہاں تشریف لے آئیے۔"

سیتون نے گھبرا کے پوچھا "تم چاہتے ہو میں اس کی جان لوں۔"

یرل نے کہا "یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے

چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مر جانا یا ایک ندی میں پڑے سڑتے رہنا۔ حالاں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ ٹھالیہ رکی خدائی قہر ہو کے کر نہ بچے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی تسلی کو کہا کہ تم یہ خیال تو ہوگا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔

سیوین نے کہا "ممکن ہے میں باز ہو رہے کہ ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو۔ جس کی بدولت تم خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مار رہے ہو۔"

موجد بولا "حضرت آپ بہت کج نگاہی سے کام لے رہے ہیں آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے ذرا آپ غور تو فرمایئے۔ میں نے تو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مر جاؤ۔ میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں جنہوں نے مر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا ہے یہ دیکھئے (جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر) یہ میرے بہی کھاتے کا حساب سنئے۔ آج تک سال بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں جن میں سے ۵۲ مردوں کی تھیں اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جا چکی ہیں۔ نتیجہ؟ بیالیس اموات۔ اب حضرت! اگر میرے مربی اپنا طریقہ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی ہے نہیں؟ جناب من، میں تو مصیبت زدہ نوع انسان ہوں۔ میں تو جانیں بچاتا ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں؟"

"حضور مجھے معاف کیجئے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے۔ ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گلی کے چھپنے کا ڈر ایک منظر۔ مگر شدید انتظار مرگ مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر میں جا کر طبعی موت ہی مریں۔ ــــ حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں۔ اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ آپ زندہ بچ گئے۔"

سیوین نے کہا "خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں۔ بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟"

نول بے انتہا مسرور ہوا اور بڑے سجے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیوین نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا "بل ادا کر دو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔"

شراب خانے سے نکلے تو نول آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آدھ لالٹین لیمپ تاکام روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ نول نہایت روانی سے باتیں کرتا جاتا تھا شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس ہو جانے کا ارادہ نہ کرے۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا کبھی دربار شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایکٹر نے بہت بری طرح ایکٹ کیا۔ اور گھٹتے وقت بے سری ہوگئی۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی۔ سیوین بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر بڑے مکان کے دروازے کے سامنے آ کر ٹھہر گئے۔ نول نے

ایک گھنٹی سی بجی اور تھوڑی دیر کے بعد دروازہ نیم وا ہوا ایک لڑکی نے سر باہر نکال کر پوچھا " دروازے پر کون ہے ؟"

پول نے کہا " میں ہوں دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھلا اور یہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ پول نے پوچھا " وہ خاتون ابھی بیٹھی ہیں ؟" جواب ملا " ہاں صاحب لیکن ۔ ویرس آگئے ہیں ؟" جواب ملا " نہیں صاحب ۔"

پول نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا " آئیے "

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بجھا دیا دلے ساتھ کا کمرہ تھا ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ کرسی پر ایک عورت سوئی پڑی تھی شکل حسین تھی۔

سیمون نے آہستہ سے مڑ کر پوچھا " کیا یہی وہ خاتون ہیں ؟"

پول نے کہا " نہیں صاحب ۔ یہ تو بدبو بچانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں ڈال دیجئے۔ اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے اسے بھی ادا کر دیجئے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجئے۔ گستاخی معاف یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے ۔۔۔ ٹھیک ۔ اب ادھر تشریف لائیے۔"

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر تھوڑا مگر جس قدر بھی تھا اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی ۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی " اب تک کیا چکر ۔ اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔"

پول نے کہا " بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں کچھ مشکلات پیش آگئی تھیں جن کی وجہ سے میں رک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں۔ یہ ان بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجئے۔ یا دنیا کے لئے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالیے۔"

عورت نے اٹھ کر کہا " نہیں میں فرصت سے ۔ یا دو انتظار کر چکی ہوں ۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی ؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے ؟"

سیمون نے کہا " سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر ہوئی میں فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ پول کی باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے تعجیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیے مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سمندر تک پہنچ گیا ہوتا۔"

خاتون نے کہا " جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب ! لیکن افسوس کہ میں اس وقت اپنی ملاقات میں کوئی دلپذیری پیدا نہیں کر سکتی۔"

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ جس میں سیمون اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا لیکن پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان، چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوب صورتی جو بالوں کے گھونگر میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لئے کافی تھیں کہ سیمون نقاب پوش حصے کے متعلق غور کرنے لگ جائے شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہرحال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو جاتی تھیں۔

"اتنے میں خاتون بولی" جناب! اگر میں اپنی زندگی کے آخری لمحے بھی گذار سکتی ہوں تو ہنس کھیل کے بھی گذار سکتی ہوں۔ وہ لمحے خاموش بیٹھی رہ سکتی ہوں۔ خدارا میرے دل کو نہ جلنے دیجئے۔ خدا کے لئے بات ہی کیجئے۔"

سیوین نے کہا" بیگم! بہتر ہے شروع کروں۔ کیا بات کروں۔ اچھا استعارے میں بات کرتا ہوں۔ جب میں ادھر آ رہا تھا تو رستے میں تو ان ستاروں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے مجھ سے پوچھا تھا "یہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی؟" اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ زہرہ یہاں کیسے آ گئی؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو حسن کا فریب کھا سکے۔ دلوں کے توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی۔"

خاتون نے جواب دیا" جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی بیہودہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے۔ جس کی ظاہرا شکل و صورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی۔ لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا۔"

سیوین نے کہا" اس کے اور حالات سے بھی آگاہ کیجئے۔"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا" میں اس سے زیادہ کیوں بتاؤں۔ میں مانتی ہوں کہ بس اسی راز کا اظہار کر سکتی ہوں۔ گمنام صاحب! آپ بتائیے۔ آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟ (معاف کیجئے میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارتی)"

"بیگم صاحبہ! میرے یہاں آنے کا باعث حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہوا ہے جو میرے ساتھ قران میں آیا ہے۔ اور کچھ عرصے تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا۔ لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سیاہی کی آغوش میں چھپ گیا ہے۔ یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لئے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟"

"کبھی نہیں۔ اسی لئے میں نے قسم کھائی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آئے گا۔"

"آپ کے خیال میں وہ خاتون اس قابل ہے کہ اس کے لئے جان یوں قربان کر دی جائے۔"

"کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟"

خاتون نے جوش میں آ کر کہا" ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں موت کو دل شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلبگار ہوں۔ آپ کا شاید یہ خیال ہو لیکن میں تو صرف اس لئے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا دربار شاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی میں پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر یوں ہو! مرد بھی کیسے دغا باز ہیں۔"

"بیگم صاحبہ! ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں۔"

بات کو یہاں پہنچا کر دونوں غمزدہ نظروں سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سیوین نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں۔ آپ میری اتنی بات مان لیجئے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے۔"

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا "کیوں ؟"

"میری آنکھ نے ابھی اس خاتون کی شکل دیکھی تھی۔ جو ابھی ابھی یہاں سے گزری وہ آپ جیسی دکھائی دیتی تھی اور مجھ سے چند منٹ پہلے وہ اس جگہ پہنچ گئی۔"

جواب ملا "فضول تھا۔ ہے آپ کو چاہیئے کہ اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ اور ارفع خیالات میں مصروف رکھیں۔"

سیون نے کہا "بیگم صاحبہ! یہ نہ کہیے۔ ابھی ابھی کوستہ نواں سے کہا تھا کہ سامان تیار کرو۔ میں بیمار ہوں اس لیے ہم ایک طویل طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر میں نے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہا ہوں تو یہ کون سی عجیب کی بات ہے۔ معاف کیجئے۔ آپ کو میرا شرمندہ احسان ہونا چاہیئے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا سبب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا اور پھر آپ کی گولی کا نشانہ بنایا آپ کو اپنا شکار بنانا کوئی معمولی سی بات ہے؟ ـــــ مجھے اپنی شکل دکھا دیجئے۔"

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "جناب کی حقیقت تو یہ ہے کہ میں آپ کی احسان مند ہوں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے بجز چارہ نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجئے۔"

دونوں نے اپنے نقاب اتار دیئے اور دونوں غور سے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ سیون نے جس شکل کا تخیل باندھا تھا اس خاتون کے چہرے کے حسن نے اس کو آشفتہ کر دیا تھا۔ سیون کی توقع سے بالا تھا۔ لیکن عجیب رد عمل تھا کہ کسی خوش مذاق مصور کی تصویر سی حسین صورت، آنکھیں، بھویں لمبی لمبی پلکیں، آنکھوں کی پتلیوں کی گہرائیاں۔ سیون کا دل بڑھنے لگا۔

خاتون نے کہا "کیا آپ کو میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آئی ہے جس کی وجہ سے دور رہ کر مجھ سے یوں منہ پھیر لیں۔"

سیون نے کہا "جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آ رہا ہے اس سے تو ہر ایک شخص ہی مسحور ہو سکتا ہے۔ کیا ان دونوں پہلے آپ سے بے وفائی کی گئی؟ اس کی وجہ اس موہنی صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ کیا انہوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی؟"

"ایک سبب وفا کا میرا افلاس ناگوار تھا۔ جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا ہوا بھی رخصت ہو گیا ادھار کی نے مجھے آن گھیرا۔ تو میرا چہیتا ایک دن مجھ سے ملنے آیا۔ عشق و محبت کی داستان رک رک کے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ آواز میں عجز تھا۔ نماز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھربار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے ـــــ حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ اندیشہ واقع ہو گئے تھے۔"

سیون نے جیسے ایک دم محسوس کر کے کہا "وفدا ایسی شکل کو دیکھنا اور پھر دور اندیش رہنا۔ اور آپ کے عشق کا دوسرا شخص۔ آپ کا طلبگار۔ وہ بھی دور اندیش تھا؟"

"نہیں اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مر جانے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا۔ میرے سودائی کا دل اور شیر جیسے تک میری قدم بوسی کرتے رہے۔ لیکن آہ میں کیا کہوں۔ جو آنکھ ایسے نہیں ہوا کیا کرتے۔ لیکن انہوں نے حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا آپ کا عندیہ ملاحظہ فرمائیے۔ میری دردمندی کا بھی خیال کیجئے۔ جو کہ آپ کہتے ہیں" رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔ اب تک وہ الجھا تھا ایک نئی ذہن نے اسے بصارت بخشی۔ اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔"

سیون نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے۔ اس سے پیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں

سے پیار تھا معلوم ہوتا تھا تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب میں نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا۔"

"حضرت آپ کسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹہ پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن، سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کے رکھے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اور مجھے شہر سے نفرت تھی۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین جانتا تھا، اس لئے کہ میں نے ابھی آپ کو دیکھا نہ تھا؟

نفرت آمیز جواب ملا۔ "شاعر صاحب کیا کہنے! آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لحظہ بدلنے والے ہیں۔ آپ بھورے رنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے لئے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں اور بمشکل ایک گھنٹہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ مرغوب ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لئے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں۔"

سیورین نے کہا "میں نیلے رنگ کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات نظر سے دیکھیں تبھی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی ـــ

"جناب آپ یقین مانیے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق و فنا کر دیتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیورین نے آہستہ سے کہا "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا۔"

خاتون نے جوش میں آ کر کہا "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہوگی۔"

شاعر نے کہا "اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ دور اندیش صاحب نے اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم ہونا نیلی آنکھوں کو نہیں سجتی۔ آپ بہت بے رحم ہیں۔ لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے شعریت سے بالکل مبرا تھا۔ آپ کا عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے وہ اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک عالم میں کہیں سورج نظر آ رہا ہے۔ پھر اس پر بادل گھر آتے ہیں پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو ذرا اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا، جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ لعنت افسوس میں۔ آپ کو فردوس پر فضا گلشنوں میں حسرت ہو کہ اے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی۔"

اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی۔

"سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھاپنا بھی گوارا کرتا ہے؟"

شاعر نے فخر و غرور سے کہا "بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ سیورین ہے۔"

"کون سیوین؟ وہی مشہور ناول نگار، بڑے والا؟"

"شاعر نے کہا: "میں وہی ہوں۔ آپ نے میری نظموں میں سے اس کی پسند ہے "حسن شیریں"، "عشق بیتاب"؟"

"نہیں، میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں۔ شاعر سیوین کا نام میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی بیوی اس نیلی آنکھوں والی کا نام نیتھا ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ مگر آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟"

"میرا لیگیان، میرا شوہر، میرا اور وہاں کا نوکر ہیں۔ وہ پادل سے چلا ہے۔ مجھے ان سے معلوم ہوا تھا کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک مجنوں شاعر کی دلدادہ تھی۔ اب وہ ایک جنگ جو، بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا شوہر وہاں سے خط لکھتا رہتا ہے۔ خاصا مفصل لکھا کرتا ہے۔"

غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ بیتاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار بولا۔

"تو بیگم صاحبہ آپ بھی میری طرح بے وفائی کے ساتھ ہیں، خوشی میری بات ہے۔ مجھ سے ہمدردی ہے اگر آپ چاہیں تو بس سہارا دے کر اپنے پاس سنبھال کر رکھیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزار دوں۔ میں شہر ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک لٹیرا آکر لوٹ لے جائے گا۔"

اس نے تالی بجائی جس سے کمرہ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گونج گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گرمی تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا۔ اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش ربا تھا۔

حسن اور اس پر شاعر کی نگاہ، سیوین کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا ـــ وہ ایک پیکر التجا ہو کر بولا ـــ

"بیگم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے شوہر کو بھلا دیں اور میں اپنی بے وفا بیوی کو بھول جاؤں اور ـــ"

"اور کیا؟"

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں؟"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔ اتنی دیر تک کہ سیوین توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی

"شاعر صاحب! مجھ سے آپ کے عشق کی پائیداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا البتہ میں آپ کی جدت طبع کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس دانشمندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنا چھوڑ دی ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہے اسے کچھ کر کے بتانا پڑے گا۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی جو آج نیلی آنکھوں پر مرتا ہے اور پھر قوس قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے ـــ اس لئے ـــ"

اتنے میں دروازہ کھلا اور نوکر اندر داخل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا: "یہ سخت بے قاعدگی ہے۔ آپ از راہ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے۔"

خاتون نے کہا "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے۔ یول! تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں۔ آپ شاعر ہیں۔ مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ میں شاعروں کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں۔"

یول نے ایک تھیلی آگے بڑھا کے کہا "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں۔ آپ ایک ایک کترن نکال لیجئے۔ جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی اسے شکار بننا پڑے گا۔"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ سیوین نے بھی اپنی قسمت آزمائی۔ کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا —

خاتون پکار اٹھی "میں شکاری ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور میں شکار ہوں۔ بیگم صاحبہ اگر گولی بالکل سیدھی چلائیے۔ یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے گا۔"

یول نے کہا "یہ دیکھئے۔ یہ گھنٹی ہے۔ اسے سینے میں لٹکا لیجئے اور ہلا کے دیکھئے ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب آپ اس دیوار کے سامنے ہی رہیئے اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو تین قدم چلئے اور گھنٹی کو بجنے دیجئے اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجئے! اب عرض ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوش گوار و دل پذیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی پسند ہے؟"

سیوین نے کہا "کوئی دردناک ساز بجاؤ۔ جس میں امیدوں کا خاک میں مل جانا ہو۔ جس میں نیلی آنکھوں کی سفاکی ہو جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ لیجئے جو انتقام آپ کو مرد کی جنس سے لینا ہے۔ وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجئے۔"

یول نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لیمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں ایک بے تابی پیدا کر دی تین منٹ تک یہی حالت رہی اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ یول لیمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

یول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا "گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں وہ دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دے دیجئے۔ اور میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔"

یول کونے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا —

"بیگم صاحبہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہو گی۔"

خاتون نے کہا "شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے۔"

یول نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا "آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے؟"

جواب ملا: "کوئی کسی پرواہ کی چیز ہو۔" وہاں سکتے میں حسن۔

دروازہ بند ہوگیا... ایک ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سنائی دیا۔ آخر وہ بھی نہ ہوگیا ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

صید نے آواز دی: "شاعر صاحب۔ پستول۔ بانچ رکھے چلیے۔"

صیاد نے کہا: "نیچے نشان والی۔ خدا حافظ۔"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا: "بے وفا شاعر خدا حافظ۔" اور پھر گھنٹی گئی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی کوئی زمین پر جیسے گرا۔

یرل روشنی لے کر اندر آیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیرین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ خود فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیرین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی۔

"میرے شاعر، میرے پیارے شاعر، تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا اور میں نے یونہی تیرا مضحکہ اڑا دیا۔ میرے خوبصورت شاعر تو کیوں مر گیا۔"

یرل نے شب کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا: "لیکن وہ کیسے مر سکتا ہے۔ کارتوس تو خالی کارتوس تھا۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا اس کا نشان ڈیزی پر موجود ہے اس لئے دوسرا کارتوس بھی خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں، صرف بے ہوش ہوگئے ہیں! وہ بھی نہیں۔ دیکھئے۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں!"

سیرین نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ حسن عشق کے دربار میں نیازمند ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: "تو گویا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑی ہوتی کہنے لگی: "نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں۔"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ پیرس میں! کیا لغو بات ہے؟" سیرین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان اس بات کا شاہد ہے۔"

یرل بولا: "وہ خالی کارتوس تھا۔ آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے۔"

خاتون نے کہا: "اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجئے۔ مجھے آج ہی دو سیلز پہنچنا ہے۔"

یرل نے کہا: "بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے دیکھئے ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو

بلانے لگا، یہ پی لیجئے۔"

"صاحب! آپ اپنے لیے ذرا اور گاڑی منگوا دیجئے۔ آپ سنتے ہیں؟"

یوں مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سیوں آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔ خاتون نے پوچھا "میرے اچھے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟"

"تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لئے اپنی جان دے دوں! افسوس وہ بھی نہ ہوا!"

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا "پیارے آپ کیا جانیں؟" اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی "میرا نام ورن سینیز ہے۔ میں ملک کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد واسیلز میں آ کر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر ——"

"اور پھر کیا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں کی ہناؤں کی باتیں کریں گے۔"

شاعر نے پوچھا "ان دو ننھے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا "یونہی سہی"

"پطرس"

(مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء)　　　　(ماخوذ از فرانسیسی)

عشق کی خودکشی

مقصد زیں تحریر کے پڑھنے سے جل جائے گی ۔ ل ۔ شوقی میں پسند کے جواب میں
دوست تاسو کی پھانسی سے پہلے مجھ سے قدوار کے ملاقات کی فون دار دل جل کے
مہربان سے دستیاب ہو سکے تاسو کی زندگی ترتیب اور کیفیت کے سر جھکا دینے
والے جذبات سے معمور تھی آج دوسری دنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ کچھ
محبوب بیوی رینیہ کو بھیج چکا تھا۔ ان دونوں کی روحوں کو راحت عطا فرمائے (ادارہ)

(۱) شاید مجھے داروغۂ جیل کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس کی اجازت سے میں یہ چند سطور تحریر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل خالی ہے۔ میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے جب کوئی چیز روشنی اور مکان کا خواب آلود سکون شب عیش شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بے رنگ اور بھیانک کر دیتا ہے میرا دل ایک کھنڈر ہے جس میں زندگی نہیں آتا ہیں۔ جہاں حال بیدار نہیں ، ماضی خفتہ ہے ، جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ ، فقط ایک ویران سی گزرگاہ ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں جو نوائے زندگی اور غلغلۂ حیات نہیں۔ ایک خندۂ بے مسرت ، ایک فریاد بے درد ہے

کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دی جائے گی۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔ ہر شخص اس کے لئے تیار رہتا ہے۔ موت کے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ موت اسی لئے موت ہے کہ ناگہانی ہوتی ہے۔ ہر ایک موت ناگہانی موت ہے۔ موت کا وقت معین ہے اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بے موقع آئے۔ اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو تو ہماری تمام زندگی اس موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو جو ریل کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے۔

(۲) انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہو جس میں عشق کی ناپائیداری حسن کی بے وفائی کی طرح ہو جہاں تعمیر ایک غلطی ہو جہاں اعتبار ایک حماقت ہو۔

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے اس لئے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا اسے منہدم کر چکا ہوں مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی۔ میری آرزوؤں کے محل ، میری توقعات کے قصر ، میرے ارادے کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے۔ لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔

شروع میں جب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ تو کئی لوگ مجھے سچا جانتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا اور شاید مجھے بے گناہ سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے کتنی مدت سے جانتا تھا۔ بیسیوں لوگ مجھ پر رحم کھانے لگے اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے۔

چند ایسے بھی تھے جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے۔ ان کا گمان تھا۔ رضیہ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے وہ بھی مجھ پر رحم کھاتے تھے لیکن مجھے حقیر جانتے تھے۔

یہ دونوں غلط تھے۔ میرے اعتراف جرم کو دیوانگی سمجھنے والے سن لیں کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے اسی دائیں ہاتھ نے جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اس کے سانس کو ہمیشہ کے لیے بند کیا ہے میرے انکار جرم کو میری بزدلی اور دروغ گوئی سمجھنے والے سن لیں کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر بلا تامل کہہ دیا تھا کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں تو میرے دل اور زبان میں یہی سچائی تھی جس نے مجھ سے بعد میں اعتراف کروایا۔ میں ایک نہیں، دو ہوں۔ شاید میں دس بیس ہوں۔ مجھے اب اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں معلوم ہوا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی۔ رضیہ کو چاہنے والا ہی انسان تھا جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے۔ میں کیسے قاتل؟ اگر میں ایک ہوں تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں ـــــ کہ میں نے رضیہ کو اس لیے قتل کیا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ کتنی لغو بات معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہی ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ میں سب کچھ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے میں ایک کمزور ہوں سب انسان کمزور ہوتے ہیں۔

(۳) دو سال ہوئے میں اور رضیہ بیاہے گئے۔ اس کے سنگدل والدین نے اب تک اسے معاف نہیں کیا میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ اگر ہمارے محلے میں حسن اتفاق سے ایک نہ ہوتا تو شاید چند اور والدین بھی اس وقت اپنی بیٹیوں سے ناخوش ہوتے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مامون رہنے کی وجہ ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے۔ کیا شاعرانہ خیال ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصالی پر فخر کرتے ہیں۔ اس صفت پر فخر کرتے ہیں جو مردوں کے وہم و تخیل نے عورت کو بخش دی ہے۔ ان سے کہہ دو تو مجھ سے بگڑ گئے ہیں کہ اصل وجہ ان کی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں میری عالی نگاہی تھی جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے گوارا نہ کر سکتی تھی یہ نقادان اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اس کی بد چلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ لہٰذا جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کس نے مارا؟ شاید میں نے! یہ نہ کہو۔ تم رضیہ سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لے گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین مانو کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی۔ محض میری خاطر اس نے تمام جہان کے الزامات اپنے سر لیے۔ دنیا بھر کے مصائب اس نے میرے ساتھ مل کر برداشت کیے۔ ٹھیک وقت پر میرے لیے کھانا تیار کرنا اور بڑے اہتمام سے میرے بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی۔ اسے یہ دکھو کہ میں نے اسے مارا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ پوچھ لو۔

عورت اگر چاہے تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ نفرت ہے دلوں کے توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اس لیے بنائے ہیں کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لیے ہیں کہ یا ہم ان کو دیکھیں

یا پھر ان کے لئے دیں۔ محبت کو خارج کر دیا جائے یا خارج شدہ۔ اس وقت سے وہ شوہروں پر حکمرانی کرتی ہے۔ وہ جگہ ہے جہاں ظلم ہوتا ہے اور ایک جہنم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ وہ رات تھی۔ میرے پاس اسے آگ بنا دوں اور بہت کچھ میں چاہتا تھا کہ جو چاہت ہو۔ وہ چپ چاپ پانی کی طرح بہتی تھی اور میں اسے شعلوں کی طرح جلانا چاہتا تھا۔ میں رات کی خاموشی میں پہروں گھنٹوں تک متواتر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا رہتا۔ میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا۔ دیوی کے پجاریوں کی طرح اس کی پوجا کرتا۔ وہ بت کی طرح بیٹھی رہتی۔ میں اس سے کہتا "اے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ! میں تیرا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تیری محبت کرنا میرے لئے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟" وہ کچھ نہ بولتی۔ میں اس کی یہ بے رخی دیکھتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی کیونکہ اب پھر بھی وہ کچھ نہ بولی۔ تم کہو گے شرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے۔ تمہیں نسوانیت کا کچھ علم نہیں۔ تم صرف مرد ہو۔ تم میں روحانیت نہیں۔ تمہارے ان گناہوں میں عبادت کی قابلیت نہیں۔ تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں۔ اور عورت نے کہا! تم مجھے کچھ نہ کہو۔

میں کئی دفعہ رات کو دیر میں گھر آیا۔ اس نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا "رضیہ میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟" وہ کہتی "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی"۔ تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے تو تمہارے لئے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سوچو۔ تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں۔ تم میں غیرت نہیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ رضیہ جب تم میری ہو تو پھر کیسے ہے کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو؟ تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔" وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ میں نے اس کے کپڑے جلا ڈالے۔ وہ روتی رہی اور کھانا پکاتی رہی۔ ان کتابوں اور کپڑوں کے لئے روتی رہی۔ جن کو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔ میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا لیکن جلد غائب ہو گیا۔ اور میں مٹھیوں کو بند کر کے رہ گیا۔ دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا۔ تم کہو گے لڑتی تھی، پھر تغافل کیسے کہتے ہو؟

کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ جب پروانے کو شمع کے جلتے جلتے مر جانا چاہئے تھا۔ وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے۔ رضیہ! تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں۔ دنیا میں! میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی تو اس کا الزام مجھ پر نہیں عاید ہوتا۔ وہ اسی قابل تھیں کہ ایک رات کے لئے بد مہر ہوتیں اور بس۔ ان کو چند لمحوں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاقِ سلیم کا خون کرنا تھا۔ اس پر اگر اہلِ دنیا مجھے قصوروار کہتے ہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ مجھے کل مار ڈالیں گے۔ اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں۔ افسوس! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائے گا تو اب ناکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی۔ کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندھا تھا جس کو توڑتے ہوئے میرے دل کو ذرا بھی رنج ہوتا۔ میں رضیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس کی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا جس نے چپ کے سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چھپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے فنا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے۔ اسی

شادی کرنا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے تھک کر بیٹھی ہوئی تھی اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اپنے دل کی بے قراری کا نغمہ بہتے ہوئے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے لفظوں میں بیان کر رہا ہے۔ "رضیہ تم نے مجھ پر کیا جادو پھونک دیا ہے؟ میرے جسم میں کوئی روح ہے تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے میرے دل میں کوئی سرور ہے تو وہ تم ہو۔ میری زندگی میری راحت، اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں۔ رضیہ صرف تمہارے ہوتے ہوئے میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اٹھتی ہیں۔ آنے والی کا ایک طلسم بپا ہوتا ہے۔ تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا ساز ہستی کے تمام تاروں کو ان چھیڑ دیتا ہے جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گزر گیا ہے۔ دل میں نغمے گونجتے ہیں کہ تو ان کو سنے۔ کیا تو سنتی ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا "رضیہ سنتی ہے؟" کہنے لگی "سنتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اور بے اختیار ہو کے کہا "رضیہ کچھ تو کہو"۔ اس نے کچھ نہ کہا یا شاید یہ کہا "میں کیا کہوں"۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے سکون کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی بے پروائی کو دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اس کے گلے کے قریب آ گئے۔ میری انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے دیوانہ بنا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں سے کٹ گیا۔ میرے داہنے ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کی نظروں میں وحشت نظر آئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور وحشی ہو گیا۔ میرے پنجے کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اس نے کچھ کہا۔ لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے۔ میں اس کا گلا بھینچتا گیا۔ حتیٰ کہ میرا ہاتھ تھک گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سی سرخی پھر گئی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا۔ چلا چلا کر پوچھتا۔ "آہ! رضیہ! میری جان!! تم کیوں چپ ہو؟ تم کو کس نے مار ڈالا ہے! رضیہ میری پیاری رضیہ! تمہارا قاتل کون ہے۔" وہ کچھ نہ بولی ———

(۲) وہ بے چاری مر گئی۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی۔ میں نے اسے مارا میں کل مر جاؤں گا۔ اس نے میرا دل دکھایا۔ میں اس کے لئے مرتا تھا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ قدرتی قوانین کی گرفت مضبوط ہے اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریق احسن ہو۔ وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے، راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی۔ انتظار دیتی ہے۔ اپنے قریب آنے کا راستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا کہ مجھے خوش کرے۔ میں نے اسے مار ڈالا کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے۔ عورت کی محبت ایک افسانہ ہے۔ روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو۔ کل خدا جانے کیا ہو گے؟

قاسم

"پطرس"

(مخزن جون ۱۹۲۱ء)

تائیس

رومان از اناطول فرانس

اوپرا از موسیو گیلے

اناطول فرانس کی "تائیس" بہت مشہور کتاب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ناول کی صورت میں لکھی گئی ہے جس میں تائیس اور اسکندریہ کے رومانی مناظر اور راہب پفنوتیس کے کرب و اضطراب کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ زیر نظر "تائیس" موسیو گیلے کے اوپرا کا ترجمہ ہے جو اناطول فرانس کے ناول سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں ڈرامہ کی مخصوص قیود کی وجہ سے واقعات اور مناظر محدود کر دئے گئے ہیں اور چند کرداروں کے نام بھی بدل دئے گئے ہیں۔

اوپرا ڈرامہ کی ایک ایسی قسم ہے۔ جس میں ڈرامائی واقعات تو موسیقی کے ذریعے سے اور متفرق جذبات الفاظ کے علاوہ اسٹیج کی آرائش اور اداکاری سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو خیالی سٹیج اور خیالی اداکار وضع کرنے پڑتے ہیں اس کے بغیر اوپرا سے محظوظ ہونا ممکن نہیں۔

پطرس کے ترجمے کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنے والے کا کام ہلکا کر دیا ہے یہاں تک کہ ذہنی گرفت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی الفاظ کی روانی اور موسیقی، فقروں کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ڈرامائی متانت و حرکت سے نہ صرف کرداروں میں جان ڈال دی گئی ہے بلکہ تائیس اور اسکندریہ کی دھندلی اور دور دراز فضا وقت کے کسی دلفریب خواب کا جزو معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسلوب یکساں ہموار اور پر ترنگ ہے اور ترجمے کے بعض حصوں میں نثر کے ٹکڑے نظم بلکہ غزل سے جا ملتے ہیں ——— (ادارہ)

افراد

تائیس ——— سکندریہ کی ایک حسین رقاصہ

اتانیل ——— ایک راہب

پالیمون ——— ایک بڈھا راہب

نسیس ——— سکندریہ کا رئیس

کرتال }
کروبیل } ——— نسیس کی خادمیں

البین ——— راہبہ عورتوں کی سردار

چند اور راہب

باب اول

پہلا منظر

(صحرائے تھیبس دریائے نیل کے کنارے بیشتر راہبوں کی جھونپڑیاں۔

ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا۔

بارہ راہب ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہیں ان کے بیچ میں بڑھا پالیمون اس غریبانہ طعام کی صدارت سے زیادہ انکام سے رہا ہے جو میز پر چنا ہے۔

ایک جگہ خالی ہے جہاں آتائیل کر بیٹھتا ہے)

ایک راہب۔ یہ روٹی بھی ہے۔

دوسرا۔ اور یہ نمک ہے۔

تیسرا۔ اور یہ پودینہ ہے

چوتھا۔ اور یہ شہد ہے۔

پانچواں۔ اور یہ پانی ہے۔

پالیمون۔ (کھڑا ہو کر بڑے جوش کے ساتھ) آسمان سے ہر صبح شبنم کی طرح ہمارے باغیچے پر برکات کا نزول ہوتا ہے۔ آؤ اس خدا کی ستائش کریں جو ہمیں نعمتیں بخشتا ہے آؤ اس کے حضور میں دعا مانگیں کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے۔

راہب۔ (بہت نرم آواز سے) اے خدا! جہنم کے شیاطین ہمارے راستے سے دور ہو جائیں۔

(راہب چپ چاپ کھانا کھاتے ہیں)

ایک راہب۔ (مہر سکوت توڑ کر) اے خداوند! ہمارے بھائی آتائیل پر اپنے بازو کے قوت پھیلائے رکھ۔

بہت سے راہب۔ (افسوسناک لہجے میں) آتائیل!

چند اور راہب۔ (اسی لہجے میں) کتنا عرصہ گذر چکا اور وہ ابھی واپس نہیں لوٹا!

دوسرے راہب۔ مگر وہ کب واپس آئے گا؟

پالیمون۔ (جیسے کسی راز کو چھپا رہا ہو) اس کی واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں نے کل رات اسے خواب میں دیکھا اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے اور وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔

راہب۔ (جوش کے ساتھ) آتائیل خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے (تقدس کے لہجے میں) وہ خواب میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

(آتائیل[1] داخل ہوتا ہے اور بہت آہستہ آہستہ قریب آتا ہے جیسے غم اور تھکن سے چور چور ہے)

---

[1] ناول میں اس کردار کا نام پفنوتیس ہے اوپیرا والوں نے پفنوتیس کے نام کو بھدا سمجھ کر اسے بدل دیا۔

راہب۔ (اس کے ساتھ ہو لیتا ہے)

آنانیل۔ وہ جہاں بھی گیا ہو گا معلوم ہو جائے گا [illegible]

پالیموں (راہب سے)۔ بھائی تم یہ معلوم کرو [illegible] کہ [illegible] ہو جاتے ہیں تو بہت [illegible] [illegible] ہی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ کہ

[illegible]

(آنانیل تھوڑا سا خاموشی میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے)

آنانیل۔ نہیں میرا دل تسلی سے رہتا ہے [illegible] [illegible] معصیت کے چنگل میں [illegible] ہے [illegible] جس نے یہ گندگی اور

حیا سوزی کا جال پھیلا رکھا ہے اور اس کے ہاتھ سے جہنم کی طرف [illegible] [illegible] کر رہا ہے

راہب۔ (معصومیت اور سادگی کے انداز میں) ... آخر یہ کون ہے؟

آنانیل۔ (تھوڑی دیر کے لئے جیسے خواب سے بیدار ہوتا ہے) وہ جو [illegible] ہے [illegible] ایک [illegible] پکارتی [illegible] [illegible] [illegible]

سے جیسے کسی گئے گزرے زمانے کے واقعات (دہرا رہا ہو) [illegible] اس وقت جب میں کم عمر تھا [illegible] [illegible] کی روح پر رحمت

خداوندی کا نزول ہو [illegible] [illegible] (گھبراہٹ کے عالم میں) ایک دن [illegible] [illegible] [illegible]

اس کے عشق [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نے [illegible] عطا فرمایا جہاں میں نے اس

گناہ سے کنارہ کشی اختیار کی جو شاید مجھ سے سرزد ہوتا۔ آہ! میری روح میں ایک خواہش ہے [illegible] [illegible] حیا سوزی [illegible] [illegible] سے میرا

دل خون ہے تمنا ہے کہ میں اس عورت کی روح کو خدا کے نام پر [illegible] کر دوں۔

پالیموں۔ (نرمی کے ساتھ دانشمندانہ انداز میں) میرے بیٹے! ہم ناصبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے دور رہنا واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو عقل اور [illegible]

نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے ... [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

(راہب پالیموں کے اور تقدس کے انداز میں [illegible] [illegible]

ہوئے ایک ایک کر کے دعا مانگتے ہوئے [illegible] [illegible] کر چلے جاتے ہیں)

پالیموں۔ اے خدا! جہنم کے سیاہ شیاطین ہمارے راستے سے دور ہٹ جائیں! اے خدا! ہمارے رزق اور پانی کو برکت دے۔ اے خدا! ہمارے

باغوں کے پھلوں پر اپنی رحمت نازل کر! ہمیں وہ نیند نصیب کر جسے بدخوابی برہم نہ کرے اور وہ آرام عطا فرما جس میں کوئی کھٹکا نہ ہو!

(اندھیری رات میں سکون اور خاموشی کے ایک لمحے کے بعد تاریکی کے درمیان ایک روشنی

نمودار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ روشنی کی اس دھند میں سکندریہ کے تھیٹر

کا اندرونی حصہ دکھائی دیتا ہے۔ بنچوں پر ہزاروں لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک اسٹیج ہے جس پر

تائیس نیم برہنہ لیکن نقاب پوش اڈونس کے عشقیہ جذبات کو حرکات رقص سے ادا کر رہی

ہے۔ تماشائی بلند آہنگی کے ساتھ رہ رہ کر داد دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام آوازیں یوں سنائی

دیتی ہیں جیسے بہت دور سے آ رہی ہوں۔ تائیس کا نام اس ہجوم میں ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن

کانوں تک بہت مدھم ہو کر پہنچتا ہے۔ شور و ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے اور تائیس کی حرکات اور

کی پرستش ہوتی جاتی ہیں پھر یہ تمام منظر دفعتاً غائب ہو جاتا ہے ——— دن نکل آتا ہے)

اتانئیل۔ (آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہو کر یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آواز خفقہ اور رنج سے بھری ہے) شرم! شرم! قہر! ابدی تاریکی! اے خداوند میری مدد کر! (جیسے میں گر جاتا ہے) اے خداوند! اے خدائے ذوالجلال! جس نے ہماری روح اور ہمارے دل میں رحم ڈالا، تیری تعریف بھی کرے، میں اس خواب کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ (جوش سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں اس عورت کو گناہ سے نجات دلاؤں گا۔ میں اسے نفس کے بندھنوں سے آزاد کراؤں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان کے ماتم زدہ فرشتے اس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے خدا کیا روح تیرے ہی مبارک دم کا ایک سانس نہیں؟ اس کا گناہ جس قدر تاریک ہو اتنا ہی رحم کا سزاوار ہے لیکن میں بچاؤں گا۔ اسے میرے حوالے کر دے اور اے خداوند پھر میں اسے تیری نذر کروں گا۔ تاکہ اسے حیات ابدی نصیب ہو (راہبوں کو بلاتا ہے جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) اے بھائیو! سب کے سب اٹھ کھڑے ہو۔ آؤ۔ مجھے غیب کی طرف سے اشارہ ہوا ہے۔ مجھے پھر اسی سدوم شہر کی طرف لوٹنا ہے۔ خدا نہ کرے کہ گناہ کے سمندر میں اور بھی ڈوب جائے۔ خدا نے مجھے منتخب کیا ہے کہ میں تائیس کو اس کے پاس لے آؤں۔

(اتانئیل پالیموں کے سامنے جھکتا ہے)

پالیموں۔ (نہایت پرسکون لہجے میں نرمی کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے ——— خدا ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے۔

(راہب اتانئیل کے ساتھ ساتھ سڑک تک جاتے ہیں اور پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اتانئیل کی دعاؤں کو دہراتے ہیں جس کی آواز صحرا کے تھیس کی تنہائیوں میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے۔)

اتانئیل کی آواز۔ (دور سے) نور اور رحمت کی مقدس روح۔ میرے دل کو تقویت دے۔

راہب۔ اس کے دل کو تقویت دے۔

اتانئیل کی آواز۔ (بہت دور سے) اور مجھے معلم الملکوت کی سی طاقت دے تاکہ میں بدی کی چالوں کا مقابلہ کروں۔

راہب۔ اور اسے معلم الملکوت کی سی طاقت دے۔ تاکہ وہ بدی کی چالوں کا مقابلہ کرے۔

(مکمل خاموشی۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

دوسرا منظر

(اسکندریہ۔

تیس کے گھر کے باہر کا چبوترہ آس پاس بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں۔ چبوترے پرے شہر اور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ دائیں طرف بھاری بھاری پردے لٹک رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک عالیشان ایوان ہے جو ضیافت کے لئے آراستہ

(نقش آہستہ آہستہ مدھم ہو کے اوجھل ہو جاتا ہے

ایک غلام سیڑھیوں پر سے اتر کر اس کی طرف بڑھتا ہے)

غلام۔ اے فقیر! یہاں سے دور ہو جا اور کہیں اور جا کر بھیک مانگ۔ یہ آقا تجھ جیسوں کو پاس نہیں آنے دیتا

اتانیئل۔ (نرمی کے ساتھ) میرے بیٹے مجھے تیرے آقا نسیس کا دوست سمجھ ... میں مدت سے ... اس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔

غلام۔ جا! یہاں سے دور ہو جا (سیڑھی پر چڑھ جاتا ہے)

اتانیئل۔ (نرم لہجے میں مگر رعب کے ساتھ) ... تو جا، اپنے آقا کو میرے آنے کی اطلاع کر دو۔ جاؤ۔

(اتانیئل کی پر جلال نگاہوں کی تاب نہ لا کر غلام پیچھے ہٹ جاتا ہے

جھک کر سلام کرتا ہے اور پھر گھر میں غائب ہو جاتا ہے۔

اتانیئل تنہائی میں تھوڑی دیر کے لئے چبوترے پر سے سامنے

پھیلے ہوئے منظر کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔)

اتانیئل۔ بدکار شہر! ——— خدا کی پناہ! سکندریہ! اے جہاں میں گناہ میں پیدا ہوا۔ اور جہاں میں نے شرارت کی سے پرورش پائی ... میں سانس لیا ہوا ... سمندر جہاں میں نے زریں چشم ترک نازنین کا ... یہی میرے ... سکندریہ میرا ... اے میرے وطن! سکندریہ میں نے تیرے عشق سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ مجھے تیرے ... تیری دولت سے، تیرے علوم و فنون سے، تیرے حسن سے نفرت ہے میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں ——— اور تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے یہاں اس عبادت گاہ کی طرح معلوم ہوتا ہے ... پاک روحوں نے اپنا بسیرا بنا لیا ہو۔ آسمانی ہوا کے جھونکو! جنت کے فرشتو! آؤ اور اپنے پروں کی جنبش سے اس زہر آلود فضا کو اٹھا کر چاروں طرف سے مجھے گھیر لو معطر بنا دو!

(آوازیں اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نسیس کرولی اور مرتال دو حسین کنیزوں

کے کندھوں پر ہاتھ رکھے داخل ہوتا ہے۔ اتانیئل کو دیکھ کر رک جاتا ہے اور لونڈیوں کو

چھوڑ کر اپنے دونوں بازو پھیلائے تپاک کے ساتھ اتانیئل کی طرف بڑھتا ہے۔)

نسیس۔ (گرمجوشی کے ساتھ) اتانیئل! تم ہو؟ میرے مکتب کے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی۔ ہاں میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ گو تمہاری صورت اب انسانوں کی بہ نسبت حیوانوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ آؤ، آؤ۔ مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ۔ تم صحرا کو خیرباد کہہ آئے ہو؟ تم پھر ہم میں شامل ہونے آئے ہو؟

اتانیئل۔ نہیں۔ تم اس رقاصہ تائیس کو جانتے ہو؟

نسیس۔ (ہنس کر) یقیناً میں اسے جانتا ہوں۔ صرف جانتا نہیں بلکہ وہ میری ہے صرف ایک اور ایک دن کے لئے۔ میں نے اپنے تاکستان اس کی خاطر بیچ ڈالے۔ اپنے تاکستان اور اپنی زمینیں اور اپنی چکیاں اور اس کی خاطر میں نے نظم قصیدوں کے تین دیوان مرتب کئے لیکن یہ سب کچھ بے سود

تھا۔ اس کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے میری استعانت کوشش بھی لاحاصل ہے۔ اس کا عشق خواب کی مانند نازک اور جلد غائب ہو جانے والا ہے۔ آتانیئل! تم کو اس سے کیا کام ہے؟

آتانیئل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔

نسیس۔ (کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے) میرے سادہ لوح دوست! وہ دیس کی پجارن ہے۔ وینس کے قہر کو مت جگاؤ۔

آتانیئل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔ جانسیس! میں تائیس کو اس ناپاک محبت سے جدا کر کے جاؤں گا۔ میں اسے یسوع مسیح کی دلہن بناؤں گا اور وہ اپنی زندگی راہبہ خانے میں بسر کرے گی۔ تائیس آج میرے ساتھ جائے گی۔

نسیس۔ (آتانیئل کے کان میں ہنس کر) وینس کے قہر کو مت جگاؤ۔ وہ انتقام لے گی۔

آتانیئل۔ خدا میرا نگہبان ہوگا۔ (اکیلے کے بعد اس عورت سے میں کہاں مل سکتا ہوں؟

نسیس۔ یہیں پر۔ آج وہ میرے دسترخوان کی زینت ہوگی۔ آج آخری دفعہ وہ اس نشاط پرست محفل کی رونق ہوگی۔ آج رات وہ تھیٹر میں رقص کر رہی ہے اور وہاں سے سیدھی یہاں آئے گی۔

آتانیئل۔ اے دوست مجھے ایسا لباس پہننے کو دو تا کہ میں اس ضیافت کے شایان نظر آؤں۔

نسیس۔ اے تائیں! جاؤ اکروبیل اور مرتال! جلدی کرو آتانیئل کو لباس پہنا دو۔

(نسیس اور آتانیئل رفیقانہ گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مرتال تالی بجاتی ہے۔ ایک خدمتگار حاضر ہوتا ہے اور مرتال کا حکم پا کر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد غلام ایک صندوق اٹھائے داخل ہوتے ہیں۔ جس میں سے کروبیل اور مرتال آتانیئل کے لئے سنگھار کا سامان نکالتی ہیں ایک چمکدار نقرئی آئینہ آتانیئل کو دکھاتی ہیں اور ہنس دیتی ہیں۔ آتانیئل اسی طرح بیٹھا نسیس سے باتیں کرتا رہتا ہے لونڈیاں اس کے بالوں کو خوشبودار تیل لگاتی ہیں۔ اور اس کے سر اور داڑھی کو کنگھی کرتی ہیں۔ نسیس مسکراتا ہوا ان کو دیکھتا رہتا ہے۔)

نسیس۔ اب میں ایک بار پھر تمہیں ویسا ہی دیکھوں گا جیسے کبھی پہلے دیکھا کرتا تھا۔

آتانیئل۔ ہاں میں جہنم کا مقابلہ کرنے کے لئے جہنم ہی کے ہتھیاروں سے سجوں گا۔

نسیس۔ مغرور فلسفی! انسان کا دل کمزور ہے۔

آتانیئل۔ جب خداوند میرا رہبر ہے تو میں غرور سے خوف نہیں کھاتا۔

کروبیل۔ (مرتال سے) جوان ہے!

مرتال۔ (کروبیل سے) خوب صورت ہے!

کروبیل۔ اس کی داڑھی کے بال لمبے ہوئے ہیں۔

مرتال۔ اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

کروبیل۔ اس کے سر کے گرد یہ پٹی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

مرتال۔ یہ کمخواب پہن لو۔

کروبیل۔ اپنے بازو ننگے کر ڈالو۔

مرتال۔ اور اپنی انگلیاں۔

مرتال اور کروبیل۔ جاؤ سہانا لباس درست ہے۔ اداس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

مرتال۔ (ٹھٹھا کر) نوجوانو! کھلے ہو، یہ لباس پہن لو۔

کروبیل۔ (خوشامد سے) یہ سیاہ پشم کا کرتا اتار ڈالو۔

آتانیل۔ (ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے) ہٹ جاؤ، مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔

(کروبیل اور مرتال پہلے تو اس کے درشت انکار سے ڈر کر پیچھے
ہٹ جاتی ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی ہیں)

کروبیل اور مرتال۔ (سیاہ پشم کے کرتے پر باس نافہ چھڑک کر) یہ لبادہ زہد و تقویٰ کا اس نرم نفیس لباس سے ڈھانپ دو۔

نسیس۔ (آتانیل سے، ان کی ہنسی مذاق سے سنجیدہ نہ ہو) مہمانوں کے سامنے اپنی نظروں کو نیچا نہ رکھو بلکہ آنکھیں اٹھا کر ان کے حسن کی داد دو۔

آتانیل۔ (اپنے آپ سے) اے نور کی روح! آ اور میرے دل کو اس جنگ کے لیے مضبوط بنا دے کہ مجھے بدی کی قوتوں سے لڑنا ہے۔

کروبیل۔ اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے اگر ہیبی اسے دیکھ پائے تو اس خشک زاہد کے سینے پر اساؤں کا سا دل دھڑکنے لگ جائے۔

مرتال۔ (آتانیل سے) آؤ ہم تمہیں کفش زریں پہنا دیں۔

کروبیل۔ (آتانیل سے) آؤ ہم تمہارے رخساروں پر عطر چھڑک دیں۔

کروبیل اور مرتال۔ (ایک دوسری سے) اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے۔

(بہت دور سے تحسین کے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے نسیس چبوترے
پر جا کر شہر کی طرف دیکھتا ہے پھر واپس آ کر مسکراتا ہوا آتانیل سے مخاطب ہوتا ہے)

نسیس۔ اپنے آپ کو سنبھالو رقیب بڑھا چلا آ رہا ہے۔

(رقاصوں اور ایکٹروں کے گروہ جن کے ساتھ نسیس کے فلسفی دوست بھی
شامل ہیں، تائیس کے آگے آگے چبوترے پر داخل ہوتے ہیں۔)

ایکٹر اور فلسفی۔ (تائیس کے گرد جمع ہو کر اور اس کے سامنے جھک کر) تائیس! خواہر کریتز! اسکندریہ کا پھول! تائیس محبوب ترین دولت! تائیس!
تائیس! تائیس!

(نسیس اپنے مہمانوں سے مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد ایوان
ضیافت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غلام پردے اٹھا دیتے ہیں۔)

نسیس۔ تائیس! پیاری تائیس! ہرمادورے! ارستوبولے! کلی کریٹی! ڈورین! میرے دوستو! میرے مہمانو! مقدس دیوتا تمہارے ساتھ
رہیں۔

(سب مہمان ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ تائیس بھی اور مہمانوں کے پیچھے پیچھے ایوان میں داخل ہونے لگتی
ہے لیکن نسیس اسے تھام لیتا ہے اور اس کے پاس ہی ایک نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کھڑکی تک
ہے جو نسیس پایۂ منبر پر ہے نسیس اس کی الفت بھری حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے)

تائیس۔ ہاں یہ تائیس ہے وہ جس کے حسن و تاج آخری مرتبہ تیرے پھولوں سے آراستہ دسترخوان کی زینت بننے کو آئی ہے۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

نسیس۔ ہم نے سات دن تک ایک دوسرے سے عشق کیا۔ مگر سات دن تک بے وفائی نہ کرنا بہت بڑی وفا ہے۔ میں شکوہ نہیں کرتا۔ اب تم میرے
دروں کو خالی چھوڑ کر بالکل آزاد ہو جاؤ گی۔

تائیس۔ نسیس! آج تو بہت خوش ہو۔ مسرت نے تم کو کشادہ دل و دست بنا دیا ہے اور اس آخری رات سے جو ایک مختصر حیات مسرت اور فرحت کی
ہے، دیکھو۔ سوچو کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

(کئی فلسفی جن میں اتانیل بھی شامل ہے مباحثۂ علمی میں مشغول ایوان کی طرف سے داخل
ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ چبوترے تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اتانیل بائیں طرف
سے علیحدہ ہو جاتا ہے بے حرکت کھڑا رہتا ہے اور تائیس کو غصہ کی نظروں سے دیکھا رہتا ہے)

تائیس۔ (نسیس سے) یہ اجنبی کون ہے جو مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ میں نے اسے کبھی ضیافت میں نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کون ہے!

نسیس۔ (جیسے نہایت معمولی سی بات ہو) ایک سیدھا سادا فلسفی صحرا کا رہنے والا راہب (طنز کے ساتھ) تم سے ملنے آیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ!

تائیس۔ ساتھ کیا لایا ہے؟ عشق؟

نسیس۔ کوئی نسائی کمزوری اس کے دل کو نہیں ہلا سکتی۔ وہ تمہیں اپنے مقدس عقیدے پر لانا چاہتا ہے۔

تائیس۔ اس کا عقیدہ کیا ہے؟

اتانیل (آگے بڑھ کر) اپنے جسم سے نفرت، دکھ اور رنج سے محبت کرو، نفس کو کچل ڈالو اور گناہوں کی تلافی کرو۔

تائیس۔ (تھوڑی دیر تک اس کو چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے) جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں صرف عشق پر ایمان لائی ہوں۔ کوئی اور طاقت مجھ پر
قابو نہیں پا سکتی۔

اتانیل۔ (غصہ کی حالت میں اس کے کلام کو سنتا رہتا ہے اور آگے بڑھ کر درشتی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے) کفر مت بک!

(ان الفاظ کو سن کر فلسفی اپنی باتیں چھوڑ تائیس کے قریب آتے ہیں۔ خدام سب مہمانوں کو اس
ـــــ واقعہ کی اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ مہمان ایوان ضیافت سے باہر نکل آتے
ہیں اور آہستہ آہستہ اضطراب اور حیرت کے عالم میں تائیس اور نسیس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں)

تائیس۔ (اتانیل سے ایسے لہجے میں جس میں طنز اور خوبصورت عورتوں کی آمیزش ہے) تم کس لئے اس قدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں سے جو روشنی
چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟ ـــــ وہ کون سی منحوس طاقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے؟ ـــــ انسان عشق
کے لئے بنا ہے اور تم دھوکہ کھا رہے ہو ـــــ انسان علم و فن کے لئے بنا ہے تمہاری آنکھیں کیوں اندھی ہو رہی ہیں؟ ـــــ تمہارے
ہونٹ زندگی کی شراب سے ناآشنا ہیں ـــــ تم عشق کی پختہ کاری کو نہیں جانتے ـــــ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور پھولوں کا تاج پہن

ہ۔ عشق کے سوا باقی سب موت ہے۔۔۔ سپہ، روشنی لے آؤ، چھپا دو

آتانیل۔ (بہت جوش کے ساتھ) ابھی نہیں! میں تمہاری بے حقیقت کاریوں سے نفرت کرتا ہوں۔۔۔ تم نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ خاموشی کی ساعتیں

کو یقین ہے سیاہ کر رہی ہیں جس محل کی طرف تجھے لے جاؤں گا ۔ وہ تو ہر شے پائدار ہمیشہ پائندہ ہو

تائیس نیسیاس اور باقی لوگ۔ پھولوں کا تاج پہن لو۔۔۔ عشق کے سوا باقی سب موت ہے۔ روشنی لے آؤ چھپا دو۔

آتانیل۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے اور غصے ہوتے ہوئے) اب رہا کاٹ ہو رہی ہے میں جس محل میں آگ لگا دوں گا۔

نیسیاس اور باقی لوگ۔ (آتانیل کو لعنت ملامت کرتے اور غضب سے برگشتہ کرتے ہوئے) بہت ہو چکا

تائیس۔ (افروڈائٹی کے مشتبہ مجسمے اور تصاویر میں سے اٹھا لاکر) پاس سے ہوتے ہوئے وہ آتانیل کو رفتہ رفتہ (ناکام) ہونے سے بچتی ہوئے آ

بہت ہو چکا۔

عاشق نیسیاس کا گیت پھر سے شروع کر دیتے ہیں ۔۔۔ آتانیل

انتہائی غصہ سے پیچ و تاب کھاکر وہاں سے چلا جاتا ہے۔

باب دوم

پہلا منظر

(تائیس کا محل

سورج کی روشنی چمن اور تالاب کے اس پار سے ایوان تک پہنچ رہی ہے اس سے اس وقت

کے ایوان مختلف رنگین ہے اور آنکھوں کو تسکین بخشتی ہے۔

سامنے وینس کا بت استادہ ہے اور اس کے پائے کے پاس ایک اونچے جام میں سے خوشبودار

دھواں اٹھ رہا ہے۔ فرش پر بیش بہا قالین اور ان پر کامدار تکیے اور صحرائے بسنے تیتروں کی

کھالیں بچھی ہیں۔ جا بجا پھولدان میں موسم بہار کے پھول سجے ہیں۔

تائیس مغنیوں اور رقاصہ لڑکیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ان سب کو ایک اشارے سے چلے جانے کا حکم دیتی ہے)

تائیس۔ (تنہا، مایوسی اور رنج کے لہجے میں) آہ! تھکن اور اداسی سے میری زندگی بھاری ہو رہی ہے ۔۔۔ مرد سب کے سب بے پروا اور ہوس کار ہیں۔

عورتیں حاسد اور بد خواہ ہیں ۔۔۔ اور زندگی کی گھڑیاں بوجھل ہو رہی ہیں ۔۔۔ میرے دل میں ہوکیں اٹھتی ہیں ۔۔۔ مجھے آرام کہاں نصیب

ہوگا اور مسرت کہاں حاصل ہوگی؟ ۔۔۔ (سوچ میں ڈوبی ہوئی آئینہ اٹھا لیتی ہے) اے میرے وفادار آئینے۔ مجھے ڈھارس دے

۔۔۔ مجھ سے کہہ کہ میں اب بھی حسین ہوں۔ مجھ سے کہہ کہ میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے۔ اور

میرے بالوں کی سنہری چمک کبھی مدھم نہ ہوگی ۔۔۔ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ۔۔۔ (متفکر اور غور

سے کون حاکم آسکتی ہے گویا کسی عجیب نامعلوم مقام سے دل آواز کچھ کہہ رہی ہے) آہ! اسے یہ تو آواز کا گوش ہو گیا ... آواز ... مجھ سے کہہ
ہے۔ ایسی تمہارا حسن ڈھل جائے گا ـــــ تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تائیس تائیس نہ رہے گی، جنہیں ... بسے ...
نہیں آتا ـــ اگر کوئی مخفی ترکیب کوئی سحر کا فن ایسا نہیں جو حسن کو برقرار رکھ سکے! تو اسے وینس! تو ہی مجھے اس کے ابدی ہو
کا یقین دلا (وینس کے بت سے مخاطب ہو کر زیر لب دعا مانگتے ہوئے) وینس! ـــ جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود!
وینس! مجھے جواب دے مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے،
میرے بالوں کی سنہری چمک مدھم نہ ہو گی ـــ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ہمیشہ کے لئے! ہمیشہ کے لئے
ہمیشہ کے لئے!

(اس کی نظر آتانیل پر پڑتی ہے جو چپ چاپ اندر آ کر دہلیز کے پاس ٹھہر گیا ہے۔)

تائیس۔ (اخلاق کے ساتھ) اجنبی تم پہ کہنے کے مطابق آ ہی گئے۔

آتانیل۔ (زیر لب دعا مانگتے ہوئے) اے خداوند! اس عورت کا درخشاں چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ اس کی دلربائی کا جادو میرے ارادے کے سامنے بے کار ہو جائے۔

تائیس۔ (مسکرا کر) کہو کیا کہتے ہو؟

آتانیل۔ لوگ کہتے ہیں تم بے مثال ہو۔ اس لئے میں تم سے ملنے کا آرزومند تھا اور اب جبکہ میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ تم پر قابو پانا میرے لئے کس قدر فخر کا باعث ہو گا۔

تائیس۔ (مسکرا کر) تمہارا عجز بلند مرتبہ ہے تمہارا غرور اس سے بھی زیادہ سرکش ہے۔ خود سر اجنبی! ہشیار رہو، کہیں مجھ سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ۔

آتانیل۔ (عجز کے ساتھ) تائیس میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا ہوں۔ لیکن ویسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ میں مقدس روح کے نام پر حق اور راستی کے نام پر تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں جس عیش کا وعدہ دلاتا ہوں وہ تمہارے پھولوں سے آراستہ عشرت کدوں اور ایک مختصر شب وصال کے خواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو راحت میں آج تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا کوئی انجام نہیں۔

تائیس۔ (طنز آمیز لہجے میں) اچھا تو مجھے اس عجیب و غریب محبت کے کرشمے دکھاؤ۔ سچا عشق تو صرف بوسوں کی زبان سے بولتا ہے۔

آتانیل۔ تائیس! میری ہنسی مت اڑاؤ۔ جو عشق میں تمہیں سکھانے آیا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

تائیس۔ (بے پروائی سے) دوست! تم بہت دیر میں آئے۔ میں ہر لذت سے واقف ہوں۔

آتانیل۔ جس عشق سے تم واقف ہو وہ شرم اور حیا سوزی سے ہم کنار ہے۔ جو میں تمہیں سکھانے آیا ہوں۔ صرف وہی ایک عشق بلند پایہ ہے۔

تائیس۔ احمق ہو کہ جس کے ہاں مہمان ہو، اس کی توہین کرتے ہو!

آتانیل۔ توہین! ـــ میں تو صرف تمہیں راہِ حق پر لانا چاہتا ہوں۔ (اس کا جوش بڑھتا جاتا ہے) آہ کون ہے کہ جو میرے الفاظ کو شعلوں کی طرح بھڑکا دے تاکہ میرے ایک سانس سے اے رقاصہ! تیرا دل موم کی طرح پگھل جائے۔ کون ہے جو مجھے میرے حوالے کر دے۔

تائیس۔ (مجھ سے ڈر کر) تو کیا تانیئل اسی طرح نفرت سے دیکھتے ہو۔ ہم سے بات کیوں نہیں کرتے!

آتانیئل۔ وہی بات، وہی معنے۔

تائیس۔ (اپنے دل سے) میں اس کی ... ہوں ... سب ... مجھ سے ... کی ہوں۔

(ایک ... سے ... ہے)

تانیئل۔ (گھبرا کر اپنے آپ سے) ... کے طوفان میں ... خیالات ... رہے ہیں ... اس عورت ... آنکھوں کو خود ... سے

... تائیس ... کے ... رہو ... تائیس بھی

... رہتے ... ہے!

تائیس۔ ... ہے۔

آتانیئل۔ ... کی ... استقلال کے ساتھ ... ہے۔

تائیس۔ ... مجھ ... سعیدی ... سے راحت ہے

اور ... ہے۔

آتانیئل۔ (اپنے دل کو ... کے ... بڑے ... کر ... ہیں میں ... آتانیئل ہوں

میں مقدس صحرا سے آیا ہوں اور میں نفس امارہ پرست ... ہوں اور اس ... پرست ... ہوں جس کے ... ہے۔ اور

اے عورت! میں تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہوں گویا کسی ... کے سامنے کھڑا ہوں اور تجھ سے ... ہوں ... میں! خدا کے حکم سے

زندہ ہو جا!

(تائیس کا رنگ خوف کے مارے فق ہے ــــ وہ ہاتھ جوڑے

روتی اور سسکیاں بھرتی ہوئی آتانیئل کے قدموں میں گر پڑتی ہے)

تائیس۔ مجھے سزا مت دو، کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ صحرائے مقدس کے لوگ ان ہستیوں سے نفرت کرتے ہیں جو عشرت کا کھلونا بن

جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے نہ تقدیر پر، نہ فطرت پر اختیار تھا اور میرا کیا قصور کہ میں حسین ہوں۔ مجھے جان سے مت مارو

کہ میں موت سے خوف کھاتی ہوں۔

آتانیئل۔ (جوش کے ساتھ) نہیں تم ابد تک زندہ رہو گی اور ہمیشہ کے لئے یسوع مسیح کی محبوبہ اور دلہن بنی رہو گی۔ وہ یسوع مسیح جس کی تم دشمن

تھیں۔

تائیس۔ (جوش مسرت کے ساتھ) میری روح مسرت اور تازگی سے بھر رہی ہے میں تھر تھرا رہی ہوں، لیکن مسرور ہوں۔ یہ مجھ پر کیا جادو کر رہا ہے۔

(نسیس کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے، اور آہستہ آہستہ قریب تر ہوتی جاتی ہے)

نسیس کی آواز۔ ہائے تائیس! نازک اندام حسینہ! میں آخری مرتبہ تیرے پھول سے ہونٹوں کا عشق تجھ سے طلب کرتا ہوں۔

تائیس۔ (اس آواز کو نفرت سے سنتی ہے) آہ نسیس! (گھبراہٹ کے عالم میں اپنے آپ سے) میری روح اب میرے بس میں نہیں۔ مجھے محبت

کرو۔ (یہ ایک نفرت کے ساتھ) اس نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ اسے صرف عشق سے عشق ہے۔

آتانیئل۔ تم اس کی آواز سن رہی ہو!

تائیس (آتانیئل سے) ہاں ہاں! اس سے کہہ دو کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

آتانیئل۔ (تحکم کے لہجے میں) اچھی ہی دلہن! طلوعِ آفتاب تک میں تمہارا انتظار کروں گا۔

تائیس۔ (سرکشی کی آخری کوشش کرتے ہوئے) نہیں میں رقاصہ تائیس ہوں اور رقاصہ تائیس ہی رہوں گی۔ مجھے کسی چیز پر یقین نہیں۔ اور مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں۔ نہ اس کی نہ تمہاری نہ تمہارے خدا کی۔

(دیوانہ وار ہنستی ہے اور پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ اور گدیلوں پر منہ کے بل گر کر رونے لگتی ہے آتانیئل تقدیس اور احترام کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے موسیقی اگلے سین کے آغاز تک جاری رہتی ہے۔

دوسرا منظر

(صبح کاذب۔

تائیس کے محل کے سامنے کا چوک۔

محل کی ڈیوڑھی کے پاس ایروس کا ایک چھوٹا سا بت ایستادہ ہے اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن ہے ابھی چاند کی روشنی پھیکی نہیں پڑی۔

ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے سامنے آتانیئل فرش کے پتھروں پر سر رکھے سو رہا ہے۔

دور دائیں طرف کو ایک مکان ہے جس میں نسیاس اور اس کے ہمراہی جمع ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اور محفلِ نشاط کی موسیقی مدھم سی سنائی دے رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد تائیس کے محل کا دروازہ کھلتا ہے اور تائیس باہر آتی ہے۔ چراغ کو سر سے اوپر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے۔ جب اس کی نظر آتانیئل پر پڑتی ہے تو چراغ کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ پھر آتانیئل کی طرف واپس آتی ہے۔)

تائیس۔ (آتانیئل کی طرف جھک کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) اے مقدس باپ! میں نے خدا کا پیغام تیری زبان سے سنا۔ میں حاضر ہوں۔

آتانیئل۔ (اٹھ کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) تائیس! خدا تمہاری راہ تک رہا تھا۔

تائیس۔ (اور بھی نرم لہجے میں اور عجز کے ساتھ) تمہارے الفاظ میرے دکھے ہوئے دل کا مرہم تھے۔ میں دعا مانگتی رہی صبح تک میں آنسو بہاتی رہی ہوں۔ میری روح کے اندر نور کے چشمے ابل رہے ہیں ——— میں نے ہوس اور نفسانیت کی بے مائیگی کو دیکھ لیا ہے تم نے آ بے کا

حکم دیا تھا۔ میں آگئی ہوں۔

اتانیل۔ اے میری بہن! بہت بڑی مسرت کی بات ہے۔

تائیس۔ (مورتی ساتھ لے کر گئی ہے)

اتانیل۔ یہاں سے قریب مغرب کی طرف ایک راہبہ خانہ ہے۔ جہاں کنواری دوشیزائیں دوسروں کی نظروں سے چھپی ہوئی زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ مقدس بی بی البینا مسیح ان سے محبت کرے۔ جیسا کہ بی بی البینا مسیح کی طرف نظر اٹھائے عصمت میں ... انہیں اپنی آغوش میں لئے ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور تمہیں اس مقدس بی بی کے حوالے کر دوں گا

تائیس۔ البینا، دودمان سیزر کی دختر!

اتانیل۔ (سادگی سے) اور سیزر کی پاکیزہ ترین لونڈی (دیہات دار لونڈی)۔ ہاں میں تمہیں ایک تنگ کوٹھڑی میں بند کر دوں گا اور پھر میٹھے یسوع مسیح آکر تمہیں نجات دلائے گا۔ اس کا جوش بڑھ رہا ہے، تو پر یقین رکھو اور خوف سے ... دے گا اور تمہاری روح کی گہرائیاں تھر تھرا اٹھیں گی۔ جب وہ اپنی ارکی انگلیوں سے تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے تمہارے رخسار کو چھوئے گا۔

تائیس۔ (مسرت سے) آہ مقدس باپ مجھے البینا کے گھر لے چل۔

اتانیل۔ ہاں۔ مگر پہلے ان سب چیزوں کو مٹا کر دو جو ناپاک تائیس کی ملکیت تھیں۔ پہلے محل کر ... کہ اس مال و اسباب کو جو تمہارے ... کا نشان ہے سب کو پھونک دو سب کو فنا کر دو۔

تائیس۔ (مقابلے کی تاب نہ لا کر) مقدس باپ ایسا ہی ہوگا (گھر کی طرف جانے کے لئے مڑتی ہوئی) ... میں اپنے ساتھ اپنی گذشتہ زندگی کی کوئی یادگار نہیں لے جانا چاہتی کیونکہ ... بجز اس ہاتھی دانت کے بت کے جو قدیم زمانے کی ہنرمندی اور دستکاری کی ... ہے۔ یہ ایروس کا بت ہے۔ ایروس جو عشق کا دیوتا ہے (نرم بچے اور پاکیزہ سمجھتا ہی ہے) اے مقدس باپ! ہم اس پر بے رحمی کیسے کر سکتے ہیں۔ عشق ایک ... میری تردامنی عشق نہیں۔ عشق کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے آہ مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے عشق کو پہچانا تسلیم کیا بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ میں نے اس کے احکام کو غلط سمجھا۔ عشق کا حکم ہے کہ جو مرد میرا نام لئے بغیر اپنی آغوش پھیلائے اس کی آغوش سے کنارہ کرو۔ اس قانون کی وجہ سے اس کا احترام واجب ہے۔ اسے لے کر کسی راہبہ خانے میں رکھ دینا کہ جن کی نظر اس پر پڑے وہ پھر خدا کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ عشق ہی تو لازوال حقیقت ہے (ذرا ایک لمحے بعد) جب نیسیاس مجھے چاہتا تھا تو اس نے مجھے یہ بت تحفے کے طور پر دیا تھا۔

اتانیل۔ (غصے سے بے تاب ہو کر) نیسیاس! آہ ان مردود ہاتھوں پر لعنت ہو جن سے یہ تحفہ تجھے ملا۔ اس کا تو نام بھی باقی نہ رہنے دو۔ (بت کو چھین کر زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے اتانیل اس کے ٹکڑوں کو ٹھوکروں سے بکھیر دیتا ہے) اور اپنا سب کچھ شعلوں کے سپرد کر دو یا کسی گہری غاروں میں دھکیل دو۔ تائیس! اپنی گذشتہ زندگی کو پھر خاک میں ملا دو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی یاد دل سے محو کر دو۔

تائیس۔ (سر جھکائے کانپ رہی ہے) سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو جائے گا۔ آہ!

• تائیل۔ چلو

(تائیل اور تائیس کے چلے جانے کے بعد نسیس اور دیگر بزم کے تمام اشخاص داخل ہوتے ہیں
شور مچاتے ہوئے اور ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے ہیں نسیس سب سے پیش پیش ہے خوشی کے عالم میں
ذرا لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے)

نسیس اور اس کے ہمراہی۔ دوستو! میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ قسمت نے تائیس کی قسمت سے تیس گنی مسرت میرے دامن
دی ہے اس لئے ایک بار نہیں سو بار خوشی مناؤ۔

مشرق کی رقاصہ لڑکیوں کو بلاؤ۔ رقاصہ لڑکیوں کو پیسے دو، سونا دو، اور رقص کا ہنگامہ صبح تک نہ تھمنے دو۔

میخواروں کے سردارو! کشمش و مشعلیں روشن کر دو۔ سورج کو شرما دو۔ برف میں لگی ہوئی شراب سنبھالو۔ نرم نرم قالین بچھا
دو اور کرومیل اور مرتال تم بھی میری آغوش میں آجاؤ۔

زندگی کے سوا باقی۔۔۔ جھوٹ ہے۔ دیوانگی کے سوا باقی سب حماقت ہے

(نسیس کے ہمراہی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کے احکام بجا لاتے ہیں وہ خود عیش پرست انداز
میں گدیلوں پر گر پڑتا ہے اس کے اردگرد کرومیل، مرتال، بہت سی لونڈیاں اور رقاصہ لڑکیاں
جمع ہو جاتی ہیں۔)

(ہنگامہ رقص)

(کئی قسم کے رقص ہو چکنے کے بعد ساحرہ داخل ہوتی ہے)

نسیس۔ آہ وہ حسینۂ بے مثال آگئی ——— کرومیل اپنا رباب اٹھاؤ۔ مرتال اپنی سارنگی سنبھالو اور دونوں مل کر حسن کا گیت گاؤ۔

(کرومیل اور مرتال دونوں ساز بجاتی ہیں اور گاتی ہیں، ساحرہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اور
آہستہ آہستہ اپنے جسم کو لچکاتی ہوئی رقص کرتی ہے اور نرم آواز میں کرومیل اور مرتال کے ساتھ مل
کر گاتی ہے)

کرومیل اور مرتال۔ (۱) وہ حسینہ آگئی جس کا حسن ملکہ صبا سے بھی زیادہ دلاویز ہے جو آئینوں پر رقص کرتی تھی!

(۲) اور اس کے نقاب کے اندر سے اس کی سریلی آواز آگ کے تیروں کی طرح نکل رہی ہے۔

(۳) اس کا رنگ کہربا کی مانند ہلکا سنہری ہے اس کے ہونٹ لہو کی مانند سرخ ہیں۔ اس کی آنکھیں رات کی مانند کالی ہیں۔

(۴) اس کی حرکات سرکنڈے کی جنبش کی مانند نازک اور کسی پرندے کی پرواز کی مانند لطیف ہیں۔

(۵) اس کی منزلوں کے بام پر کئی دل گرفتار ہیں۔ اس کی نگاہیں بے پناہ ہیں

(۶) وہ دل چھین لیتی ہے اور دل کی لذت لوٹ لیتی ہے اس کے سامنے حسن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا

(۷) وہ سنگ دل صنم کی مانند ہے جسے علم نہیں کہ وہ جب چاہے تباہ کرسکتی ہے

(رقص کچھ دیر جاری رہ کر ختم ہو جاتا ہے)

(عین اس وقت اتانیل یہ پوشش شمس [illegible] خلعت جلدی جلدی [illegible])

نسیس۔ (خفا ہو کر پیچھے ہی اس سے یہ تو وہ ہے۔ یہ تو اتانیل ہے۔

ہمراہی۔ اتانیل! عاشق منزلوں کے راہب مقدس! تم پر سلام ہو! تائیس نے تمہاری عقل و اندھا کر دیا؟ (ہنس کر) وہ دیکھو وہ دیکھو۔ اس راستے درختاں چہرے کی طرف دیکھو!

اتانیل۔ (مشعل کو زمین پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ بجھ جاتی ہے) اپنی زبان روک لو۔ تائیس خداوند کی دلہن ہے۔ اب وہ تم لوگوں کی ملکیت نہیں ہے۔ ناپاک تائیس ہمیشہ کے لیے مر چکی۔ اور اب ایک دوسری تائیس ـــ وہ دیکھو آ رہی ہے!

(تائیس داخل ہوتی ہے)

اس کے بال کھلے ہیں اور اس نے موٹا اونی لباس پہن رکھا ہے۔ وہ بیڑیاں دست رو اس کے پیچھے پیچھے آتی ہیں۔ وہ بار بار مڑ کر محل کی طرف دیکھتی ہیں۔

محل سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا ہے تھوڑی دیر میں آگ کے شعلے نکلنے لگیں گے اور آگ سین کے اختتام تک بڑھتی جائے گی۔

شور و غوغا اور قہقہوں کی آوازیں کر آہستہ آہستہ چوک میں ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا ہے

اتانیل۔ (تائیس سے) مقدس بہن! آؤ اس شہر سے ہمیشہ کے لیے بھاگ جائیں۔

لوگوں کا ایک گروہ۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔

ہجوم اور نسیس کے ہمراہی۔ (حائل ہو کر) کیا یہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے!

تائیس۔ ہاں یہ سچ کہتا ہے۔

نسیس۔ تائیس! تم ہم سے چلی جاؤ گی کیا یہ ممکن ہے؟ (تائیس کو بازو سے پکڑ لیتا ہے)

اتانیل۔ (تائیس کو چھڑا کر) ناپاک شخص! ہاتھ لگایا تو جان سے مار دیا جائے گا۔ اس کا جسم مقدس ہے! یہ خدا کی ملکیت ہے۔ (تائیس کو اپنے قریب لا کر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے) آگے سے ہٹ جاؤ۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) نہیں نہیں۔ یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ یہ صحرا کو واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟

ایک گروہ۔ (اتانیل کو دھکا کر) بن مانس! یہاں سے دور ہو جاؤ!

ہجوم۔ یہ تائیس کو ہم سے لے جائے گا! اچھا؟ ہم زندہ کیسے رہیں گے؟ میرے محلات! میرے ہار! میرے گھوڑے! میرے جواہرات! ہمیں ان کی قیمت کون ادا کرے گا؟ کیا کوئی قانون ہماری مدد نہیں کرسکتا؟ یہ تائیس کو ہم سے چھین رہا ہے۔

خوفزدہ عورتیں۔ (جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کر کے) شعلے! اُف! محل جل رہا ہے۔

ہجوم۔ (شور مچاتے ہوئے) آتانیل کہاں ہے؟ اس شخص کو جان سے مار دو! اسے کسی شعلے میں دھکیل دو! اسے پھانسی پر لٹکا دو! اسے چیونٹیوں کے آگے ڈال دو۔

ہجوم میں سے ایک شخص۔ (ایک پتھر اٹھا کر آتانیل کے مارتا ہے جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو جاتا ہے) مردود! یہ لے!

آتانیل اور تامیس۔ (ایک دوسرے کے بالکل پاس کھڑے ہو کر نہایت خوف و اضطراب کے عالم میں دیکھ رہے ہیں شعلے بلند تر ہوتے جاتے ہیں) آہ! اگر موت کی گھڑی سر پر آگئی ہے تو آؤ جان خدا کے سپرد کر دیں اور اپنے خون کی قیمت سے ایک لمحے کے اندر ابدی مسرت خرید لیں۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) اسے جان سے مار ڈالو!

نسیس۔ (ہجوم کے رستے میں حائل ہو کر) تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ ہے ٹھہر جاؤ۔ یہ لو۔ اس سے اپنے دل کو ٹھنڈا کرو۔ (تھیلی میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اشرفیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ہجوم کے سامنے بکھیر دیتا ہے)

ہجوم۔ (ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اشرفیاں اٹھانے لگ جاتے ہیں) اشرفیاں! سونا!

نسیس۔ (آتانیل اور تامیس سے) جاؤ! خدا حافظ! تامیس تم مجھے بھلا دو گی! لیکن اس سے کیا حاصل! تمہاری یاد سے میری روح ہمیشہ خوشبو میں بسی رہے گی۔

(نسیس اور بھی سونا بکھیرتا ہے۔ ہجوم پھر شور مچاتا ہے۔ آتانیل اور تامیس بھاگ جاتے ہیں ـــ
محل جل رہا ہے)

باب سوئم

پہلا منظر

(خیابان ـــ
کھجور کے درختوں کے سائے میں ایک کنواں۔
دور درختوں میں راہگیروں کے آرام کے لیے ایک جھونپڑی ہے اس سے بھی پرے ریگستان کے کنارے ابین کا سفید گھر دھوپ میں چمک رہا ہے۔
سورج بہت بلند ہے۔ کھجور کے درختوں کے نیچے بہت سی عورتیں چپ چاپ کنوئیں تک جاتی ہیں۔ اور پھر اوپر آ کر واپس چلی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آتانیل اور تامیس داخل ہوتے ہیں۔ تامیس تکان کے مارے کھڑی بھی مشکل سے ہو سکتی ہے)

تامیس۔ میں گرمی کی شدت سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ آہ میں سختیوں سے مری جاتی ہوں۔ ذرا دم لینے کو ٹھہر جائیں۔

اتانیل۔ شاید تم آگے بڑھو۔ پہلے صبر کر لو تھوڑا [illegible] دعا کرو۔
تائیس۔ (پڑھ کے) تم مقدس باپ [illegible] لیتے ہیں [illegible] شفقت [illegible] کرتی ہوں۔
اتانیل۔ مرد کی سے کتنا ڈرتے ہیں [illegible] ہے پڑھی ہیں [illegible] ہے اور [illegible] موت سے انہیں کے حوالے
کیا تھا۔ وہ یہ چیز کی صاف ظاہر ہے فرشتے سے پہلے مقدس باپ کی عبادت گاہ [illegible] حقیقت کی [illegible]
دکھا دی گئی ہے [illegible] موت سے موت [illegible] مر جائے گا

تائیس۔ مقدس باپ تم سچ کہتے ہو۔
اتانیل۔ آگے پڑھو [illegible]

تائیس۔ (لوٹ کر) کیا یہ ابھی حالت ہے [illegible]
اتانیل۔ (دلدشتی سے) یہ پڑھنا بے سود ہے آگے بڑھو!
تائیس۔ (روانی سے) میں [illegible] ہو سکتی [illegible] محترم باپ مجھے معاف کرنا۔

(غش کھا کر گرنے کو ہے۔ اتانیل اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیتا ہے اور سلیبہ میں بٹھا
دیتا ہے۔ کچھ دیر چپ چاپ اس کو دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت اس کے چہرے سے رحم
ٹپکنے لگتا ہے)

اتانیل۔ تمہارے سفید سفید تلووں سے خون کے قطرے نکل رہے ہیں۔ میرا دل تڑپ گیا ہے۔ بدنصیب لڑکی [illegible] مقدس تائیس
اے میری بہن! میں نے اس آزمائش کو حد سے زیادہ سخت بنا دیا۔ مجھے معاف کرو۔ (بے حد متاثر ہوتا ہے اور احترام کے جذبات کے ساتھ
تائیس کے خون آلودہ پاؤں چومتا ہے) مقدس تائیس، محترم تائیس۔

تائیس۔ (دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے) تمہارے الفاظ میں صبح کی سی تازگی ہے۔ چلو اب آگے چلیں۔
اتانیل۔ (نرمی کے ساتھ روک کر) ابھی نہیں! تازہ پانی اور پھلوں سے تمہارے جسم میں طاقت آجائے گی۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس مسافر خانے کے پاس کنوئیں
تک جا کر پانی لے آؤں۔ وہ پرے جو سفید جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ راہبوں کا راہب خانہ ہے۔ منزل قریب ہے۔ ہمت نہ ہارو اور
خدا سے دعا کرو۔

(آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ درختوں کے پاس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتا ہے۔ وہاں سے
ٹوکری میں کچھ پھل لے کر باہر آتا ہے اور پھر مٹی کا ایک پیالہ لئے کنوئیں کی طرف جاتا ہے)

تائیس۔ (تنہا) اے خدا کے پیغامبر! جس کی سختی بھی نیکی ہے۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو کہ تو نے آسمان کے دروازے مجھ پر کھول دئے۔ میرے جسم سے خون
بہہ رہا ہے اور میری روح مسرت سے بھر رہی ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے تپتے ہوئے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ تمہارا
شیریں اور قوت افزا تصور چشمے کے پانی سے بھی تازہ اور شہد سے بھی میٹھا ہے۔ میری روح علائق سفلی سے آزاد ہو کر ایک لامتناہی
فضا میں پرواز کر رہی ہے۔ محترم باپ! تم پر خدا کی رحمت ہو!

(اتانیل پانی اور پھل لے کر واپس آتا ہے)

اناتیل۔ اپنے ہاتھ دھو لو۔ اپنے ہونٹ تر کر لو، یہ پھل کھا لو، وہ اس تپش کو ٹھنڈا کر دے جس سے تمہاری آنکھیں چمک رہی ہیں۔ تمہاری زندگی اب میری بے بہا دولت ہے۔ یہ میری ہے، خدا نے اسے میرے سپرد کیا ہے۔

(تائیس کے ہاتھ پر پانی ڈالتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے پانی پلاتا ہے تائیس خود پی کر مسکراتی ہوئی پیالہ اس کی طرف بڑھاتی ہے۔)

تائیس۔ اب تم پیو!

اناتیل۔ نہیں! تمہیں تازہ دم دیکھ کر میری پیاس بجھ گئی ہے۔ تمہارے دکھ کو دور کرنا ہی میری سب سے بڑی خوشی ہے۔ تائیس! اے جان کی راحت۔

تائیس۔ اے نیکی کے فرشتے۔

(اسے پھل کھانے کو دیتا ہے اور خود پھر کنویں سے پانی بھر لاتا ہے اس کے بعد مکمل خاموشی چھا جاتی ہے

دور سے حمد کے گیتوں کی آواز مدہم سی سنائی دیتی ہے اور آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے اور البین اور راہب لڑکیوں کا گروہ داخل ہوتا ہے۔)

آوازیں۔ (دور سے) اے باپ جو آسمان پر حکومت کر رہا ہے — ہمیں آج کے دن رزق عطا فرما!

تائیس۔ کون آ رہا ہے؟

اناتیل۔ محترم البین اور اس کی بہنیں راہب خانے کی کالی وردی ڈالے ہیں۔ وہ ہماری طرف آ رہی ہیں اور خدا کی حمد گا رہی ہیں۔

آوازیں۔ (بہت ہی قریب) خداوند ہمیں آزمائش میں نہ ڈال اور ہمیں بدی سے بچائے رکھ!

(البین اور دوسری عورتیں داخل ہوتی ہیں)

اناتیل۔ آمین!

(اناتیل کو دیکھ کر البین اور دیگر راہب عورتیں ٹھہر جاتی ہیں اور بہت ادب اور احترام کے انداز میں کھڑی ہو جاتی ہیں تائیس بھی اٹھ کر اناتیل کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے)

اناتیل۔ (البین سے) محترم البین! تم پر خدا کی برکت نازل ہو۔ میں تمہارے آسمانی چھتے میں ایک ایسی شہد کی مکھی لایا ہوں۔ جسے میں نے فضل خداوندی کی مدد سے ایک بے برگ و گل رستے پر بھٹکتا پایا۔ میں نے اس کمزور و کثیف جان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنے سانس سے اس میں جان ڈالی اور اب میں اسے خدا کی نذر کرنے کے لئے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

البین۔ میری بیٹی میرے قریب آؤ۔

(تائیس کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گلے لگا لیتی ہے)

اناتیل۔ میں اس سے آگے نہ جاؤں گا۔ میرا فرض پورا ہو چکا۔ پیاری تائیس! خدا حافظ! اب تم تنگ کوٹھری میں تنہا زندگی بسر کرو اپنے گناہوں سے توبہ کرو، اور ہر وقت میرے لئے دعا مانگتی رہو!

تا۔ (اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) میں تمہارے مقدس ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں۔ تم نے مجھے خدا کے دروازے تک پہنچایا۔ تم سے جدا ہوتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے۔

پل۔ رقت انگیز الفاظ قابل پرستش! اسوا وہ خاص خوش قسمت ہے جسے [illegible] بنایا جا رہا ہے [illegible] ساتھ اس کا چہرہ کس قدر دلفریب ہے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا نور چمک رہا ہے۔

ل۔ خدا حافظ محترم باپ خدا حافظ ... ہمیشہ کے لئے!

نیل۔ (مجھے اس پر کیا گزری) ہمیشہ کے لئے!

بس۔ دوبارہ ملاقات آسمان پر ہوگی

پ۔ اور راہب عورتیں۔ آمین!

(محترمہ تائیس کو سہارا دیتے ہوئے [illegible] ہو جاتی ہیں۔ آتا نیل
ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے خواب کے عالم میں ہو)

نیل۔ (تنہا) اس کے قدم آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ درخت اپنی شاخیں جھکا دیتے ہیں گویا اس کے راستے کو غلط پہنچانا چاہتے ہوں۔ مدتیں [illegible] پھر کئی سال گزر جائیں گے اور مجھے اس کا چہرہ کبھی نظر نہ آئے گا۔

(عصا کا سہارا لئے مبہوت کھڑا اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(صحرائے تھیبس ـــ
دریائے نیل کے کنارے سیزیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔ مغرب کی طرف آسمان کا رنگ
سرخ ہے اور معلوم ہوتا ہے آندھی آنے والی ہے۔
راہب اپنا شام کا کھانا کھا چکے ہیں اور آسمان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
اور باد سموم چلنے لگتی ہے۔
صحرا کی گہرائیوں میں سے گیدڑوں کی آوازیں اور شیروں کی دہاڑ سنائی دیتی ہے۔)

راہب۔ آسمان تاریک ہو رہا ہے۔ جاندار اور بے جان اشیا پر بے ہوشی سی طاری ہو رہی ہے۔ دور سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں
تھوڑی دیر میں ہوائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ قہر کے دروازے کھول دیں گی۔

پالیمون۔ اپنی اپنی جھونپڑیوں کو واپس چلے جاؤ! اور اپنا غلہ اور پھل سنبھال لو ورنہ آندھی ان کو صحرا میں دور تک بکھیر دے گی۔ (راہب اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں)

ایک راہب۔ (چلتے ہوئے) آتا نیل! ـــ کیا کسی نے اس کو دیکھا؟

پالیمون۔ اسے واپس لوٹے بیس دن ہو چکے ہیں لیکن اے بھائیو! جس دن سے وہ واپس آیا ہے نہ اس نے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ اسے جہنم پر جو

صبح نصیب ہوتی ہے۔ ... نے اس کے جسم و روح کو چور چور کر دیا ہے۔

(آتانیل جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ جسم خمیدہ ہے چہرہ ستا ہوا ہے نظریں بہکتی ہیں۔)

راہب۔ (سب کے ساتھ) وہ آگیا!

(آتانیل ان کے بیچ میں سے ان کو دیکھے بغیر گزر جاتا ہے۔)

چند راہب۔ اس کا دھیان کہیں اور لگا ہے —

چند اور راہب۔ وہ صاحب حال ہے۔

راہب۔ (چپکے ہوئے) اس کی خاموشی کا احترام کرو، اور اسے مت چھیڑو۔

آتانیل۔ (پالیمون سے عاجزی کے ساتھ) محترم بابا! مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے تم سے اپنے درد و کرب کا اعتراف کرنا ہے۔ اے پالیمون! زمانہ ہوا کہ میں نے سیہ کار تائیس کی روح پر فتح پائی۔ اس فتح پر مجھے فخر تھا اور میں شاداں تھا اور پھر میں اس پرسکون صحرا میں واپس آیا۔ لیکن اب طمانیت قلب مجھ سے کوسوں دور ہے۔ میں نے اپنے نفس کو بے رحمی سے کچلا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اپنے جسم کو زخموں سے چور چور کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا میں کسی شیطانی جذبے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس عورت کے حسن کا تصور مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ مجھے سوائے تائیس کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ اس ایک ہستی میں مجھے جسم کی ہر لذت اور دنیا کے حسن کا ہر جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

(شرم کے مارے پانی پانی ہو کر پالیمون کے قدموں میں گر پڑتا ہے)

پالیمون۔ (نرمی کے ساتھ) میں نے تم سے نہ کہا تھا "میرے بیٹے ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو؟" تو پھر تم کیوں جا کے پھنسے ہوئے تھے؟ آسمانی باپ تمہارا حامی و ناصر ہو — خدا حافظ!

(آتانیل کھڑا ہو جاتا ہے پالیمون سے گلے لگا کر چلا جاتا ہے۔ آتانیل تنہا گھٹنوں کے بل چٹائی پر گر کر اپنے بازو پھیلا دیتا ہے۔ اور خاموشی کے ساتھ خدا سے دعا مانگتا ہے۔ پھر ہاتھ باندھے لیٹ کر سو جاتا ہے)

(تھوڑی دیر کے بعد اندھیرے میں تائیس کا تصور چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

تائیس۔ (آتانیل سے دلفریب اور ہوشکن انداز میں) تم کس لئے اس قدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟

آتانیل۔ (عالم خواب میں) تائیس .....

تائیس۔ وہ کون سی منحوس طاقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے۔ انسان عشق کے لئے بنا ہے اور تم دھوکا کھا رہے ہو!

آتانیل۔ (گھبرا کر جاگ اٹھتا ہے) ملعون شیطان! میرے سامنے سے ہٹ جا.... آہ! میرا جسم پھنک رہا ہے۔

تائیس۔ (غصہ دلا کر) نفس سے سرکشی کرنے والے، ہمت ہو تو آ جانا!

آتانیل۔ (سراسیمہ) میرا دم نکل رہا ہے! تائیس میرے پاس آؤ!

(راہب [illegible]
[illegible]
[illegible]
راہب عورتیں [illegible])

آتانیل۔ (اس طرف دیکھ کر [illegible])

آوازیں۔ ایک مقدس ہستی [illegible]

آتانیل۔ (دیوانہ وار) [illegible]
[illegible]

(بجلی [illegible] ہو جاتی ہے۔

اندھیرا [illegible] موسیقی [illegible])

تیسرا منظر

(البین کے گھر کا باغیچہ —
ایک درخت کے سائے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے گویا مردہ ہے۔
راہب عورتیں اور البین اس کے گرد جمع ہیں)

راہب عورتیں۔ (ہاتھ باندھے گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہیں اور زیر لب دعا مانگ رہی ہیں) اے خداوند! مجھ پر رحم کر، اے خداوند! اپنی محبت کے صدقے اپنی عنایت کے طفیل میرے گناہوں کو دھو ڈال۔

البین۔ (تائیس کو دیکھ کر) خدا بلا رہا ہے اور آج رات یہ پاکیزہ چہرہ کفن کی سفیدی میں چھپ جائے گا۔ تین ہفتے تک یہ راتوں کو جاگ کر ماتم کرتی رہی ہے اور آنسو بہاتی رہی ہے اس کا جسم نحیف و نزار ہے لیکن اس کے گناہ سب دھل چکے ہیں۔

راہب عورتیں۔ اے خدا مجھ پر رحم کر۔ اے خدا اپنی محبت کے صدقے

(آتانیل زرد رو اور اداس مغموم باغ میں داخل ہوتا ہے البین کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے اور عاجزی کے انداز میں ٹھہر جاتا ہے البین آگے بڑھتی ہے اور راہب عورتیں آتانیل اور تائیس کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں)

البین۔ (آتانیل سے) محترم باپ! تمہارا آنا مبارک ہو، یقیناً تم اس مقدس ہستی کو برکت دینے کے لئے آئے ہو!

اتانیل۔ (اپنی بدحواسی پر مشکل سے قابو پا کر) ہاں . . . تائیس !

البین۔ تمہارے احکام کی پوری تعمیل کرنے کے بعد اب وہ خدا کے دیدار سے مشرف ہونے والی ہے۔

(راہب عورتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور اتانیل کی نظر تائیس پر پڑتی ہے)

اتانیل۔ (جیسے درد سے بے قرار ہو) تائیس ! تائیس !

(بے تاب ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ البین اور راہب عورتیں پرے ہٹ جاتی ہیں اور دعا۔ میں مشغول ہو جاتی ہیں اتانیل بمشکل گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اپنے بازو تائیس کی طرف پھیلاتا ہے)

اتانیل۔ (بہت ہی ہلکی آواز میں) تائیس !ـــــ

تائیس۔ (آنکھیں کھول دیتی ہے اور حیرت زدہ نظروں سے اتانیل کے چہرے کو دیکھتی ہے) محترم باپ! تم ہو! (اتانیل کا جواب اسے بالکل سنائی نہیں دیتا) تمہیں وہ شاندار سفر یاد ہے جب تم مجھے یہاں لے کر آئے تھے ؟

اتانیل۔ میں تمہارے نسوانی حسن کے سوا باقی سب کچھ بھلا چکا ہوں۔

تائیس۔ تمہیں وہ راحت اور آرام کی گھڑیاں یاد ہیں، اس خیابان کی ٹھنڈی ہوائیں ؟

اتانیل۔ (والہانہ) مجھے صرف وہ پیاس یاد ہے جو تمہارے سوا اور کوئی نہیں بجھا سکتا۔

تائیس۔ اور پھر تمہیں وہ مقدس الفاظ یاد ہیں وہ جب تمہاری زبان سے میں نے سچے عشق کی حقیقت کو پہچانا۔

اتانیل۔ (بے قرار ہو کر) میں تمہیں دھوکہ دے رہا تھا!

تائیس۔ اور وہ دیکھو صبح ہونے والی ہے۔ مشرق کے شہابی رنگ کو دیکھو !

اتانیل۔ نہیں نہیں۔ آسمان بے حقیقت ہے سب کچھ ہیچ ہے زندگی اور انسانی محبت کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ میں تم پر مر چکا ہوں۔

تائیس۔ جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ وہ دیکھو خدا کے فرشتے اور رسول آ پہنچے، وہ مسکراتے ہوئے ہاتھوں میں پھول اٹھائے آ رہے ہیں۔

اتانیل۔ میری راحت، میری زندگی، میری بات سنو !

تائیس۔ (اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کانپ رہی ہے) وہ سفید سفید پروں والے فرشتے آسمان سے اتر رہے ہیں اور جیسا کہ تم نے کہا تھا۔ شفیع خداوندی اپنی نور کی انگلیوں سے میرے آنسو ہمیشہ کے لئے پونچھ رہا ہے۔

اتانیل۔ کہو میں زندہ رہوں گی، کہو میں ابھی نہ مروں گی !

تائیس۔ سنہری ساز کا ترنم مجھے مسرور کر رہا ہے، معطر ہوائیں مجھے مست کر رہی ہیں۔ میری مصیبتوں پر آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے۔ آہ۔ خداوندا آہ۔ مجھے خدا نظر آ رہا ہے۔ (مر جاتی ہے)

(اتانیل چیخ کر گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے)

ترجمہ: پطرس

سیب کا درخت

جان گالزوردی

اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹورکی کے مقام پر گزاریں۔ جہاں ان دونوں کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز سٹیلا ایشرسٹ کی تھی۔ اس کی فطرت میں جذباتیت کی ایک جھلک سی پائی جاتی تھی۔ سٹیلا میں اب وہ پہلے کا سا حسن نہ رہا تھا۔ نہ وہ نیلی آنکھیں، نہ وہ پھول کی سی لطافت، نہ وہ چہرے اور اعضا کی نازک پاکیزگی جسے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے شگوفے کی سی رنگت جس نے آج سے چھبیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو یک بیک جھلک میں موہ لیا تھا۔ لیکن تینتالیس برس کی عمر ہونے پر بھی اپنے شوہر کی وفادار رفیق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں ایک سبزی سی آ گئی تھی۔

سٹیلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی اونچی چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ سا خطہ جس میں زیادہ تر ترنج اور لارچ اور کہیں کہیں چیڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اس وادی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ جو سڑک سے لے کر ہرے جنگل کی نیلی اونچی پہاڑی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں دونوں بیٹھ کر لنچ کھائیں۔ (ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش نہ تھی)۔ ادھر ادھر چاروں طرف فرز کے سنہری پھول اگ رہے تھے۔ لارچ کے ہرے بھرے ہلکے پھلکے پتوں پر اواخر اپریل کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے فیروز کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے گہری وادی کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سٹیلا کو آبی رنگوں سے تصویر کھینچنے کا شوق تھا۔ اور یہ ایمان انگیز منظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایسی کہ جھٹ ہر بات کا فیصلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزوں معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈبہ ہاتھ میں لے اور موٹر سے نیچے اتری۔

"کیوں فرینک؟ یہ جگہ ٹھیک ہے؟"

ایشرسٹ کی شکل کچھ کچھ شیلے سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے داڑھی تھی۔ شیلے کے داڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے بال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں جو پُر معنی ہوتیں تو چہرہ پر ایک حسن سا آجاتا ناک ذرا ایک طرف کو۔ داڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں ہونٹ ذرا کھلے ہوئے۔ اڑتالیس برس کی عمر چپ چاپ کھانے کی ٹوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اترا۔

"دیکھو فرینک! قبر"

مرغزار کی اونچان سے ایک پگڈنڈی نیچے کو اترتی تھی۔ جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی۔ جہاں یہ پگڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے مٹی کی ایک ڈھیری سی تھی جو فٹ لمبی فٹ بھر چوڑی۔ اس پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ مغرب کو ایک پتھر کھڑا تھا۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بلیک تھارن کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پھول ڈال گیا تھا۔ ایلسیرسٹ نے قبر کو دیکھا تو شاعرانہ دل امڈ آیا۔ سوچا چوراہے پر تو اس شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خودکشی کی ہو۔ اللہ اللہ فانی انسان بھی کیسے کیسے توہمات پر تکیہ کرتا ہے! لیکن جو بھی یہاں دفن ہے سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ قبر کے سرہانے ایک ناہموار سا پتھر ہے۔ سر پر کھلے آسمان کا سائبان ہے۔ اور راہ چلتے لوگ فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ طبعی موت مرتا تو کسی قبرستان میں سیلا ہوا مقبرہ ہوتا۔ اور چاروں طرف بدوضع قبریں۔ جن پر طرح طرح کے لاحاصل کلمات کندہ ہوتے۔ منہ سے کچھ بولا جاتا تھا گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھارنا بے سود ہے۔ چپ چاپ مرغزار کی جانب چل دیا۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی۔ بیوی کے بیٹھنے کو کمبل بچھایا۔ (کیونکہ جب اسے بھوک لگے گی تو تصویر کشی چھوڑ کر یہیں آ جائے گی) اور جیب سے مرے کا ہپالٹس کا ترجمہ نکالا تھوڑی دیر میں سپریٹن اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر بگلا سے بادلوں کو دیکھ کر ایلسیرسٹ کا دل آج اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لئے تڑپنے لگا۔ سچ ہے۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں! انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور ارفع ہو۔ پھر بھی اندر ہی اندر ایک ہوس ایک جستجو لگی رہتی ہے اور زندگی خالی خالی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے؟ یہ کون جانے؟ انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے حسن کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور متضاد اور نت نئے جھگڑوں میں پڑنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کی تسکین ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی وہاں اب ایک سیری آ جاتی ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں۔ انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے کہ حسن کو فن کے کسی نمونہ میں قید کر کے ہمیشہ کے لئے ایک جگہ جکڑ رکھے۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے ہمیشہ اسی قابل قدر حظ اور اسی تسکین بخش نشے کا احساس ہو۔ لیکن اسے یہ قدرت نہیں کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے جس میں بقول اس خوش گفتار یونانی کے اس کے سیب کا درخت ہو۔ موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں۔ جس انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے۔ بعض بعض لمحے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے ضرور معمور ہوتے ہیں جن میں ایک سریع بے خودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سورج کے سامنے سے گزر جاتا ہے اتنی دیر میں یہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں جس طرح فن حسن کو قید کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں۔ یہ ان لمحوں کی طرح گریز پا ہیں جن میں انسان کو اس وسیع فطرت کے درخشاں یا جھلملاتے ہوئے جلوے کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے جو انسانوں سے دور اپنی سوچ میں مستغرق بیٹھی ہے۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جبکہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے تھارن کے درخت پر کوکو بول رہا ہے گھاس کی خوشبو سے ہوا میں شہد کی سی چاشنی ہے۔ چاروں طرف بلیک تھارن اور نوخاستہ فرن کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہریاول ہے۔ اور سفید بھاری بادل پہاڑیوں اور پرکیف وادیوں کے اوپر آسمان پر ہلکے ہلکے اڑ رہے ہیں۔ ایلسیرسٹ کی آنکھوں کے سامنے قدرت کا جلوہ

پہلے بے نقاب ہے۔ لیکن چشم زدن پر یہ جلوہ غائب ہو جائے گا جیسے شب کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونہ پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان کی نگہ سے خوفزدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے ـــ ایلبرسٹ یکلخت، غم جیسے ـــ سے کلفت، اس بات کا احساس ہوا کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یہ تنگ سی سڑک، پیچھے یہ پرانی دیوار، یہ سب منظر کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موٹر میں سوار تھے تو اس نے حسب عادت اس طرف توجہ نہ کی تھی لیکن اب تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس واقع تھا۔ جہاں سے وہ چھبیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں لڑکی لانے آیا تھا اور یوں سمجھئے کہ وہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ گزشتہ زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آگیا۔ جس کی دلفریبی اور بے خودی ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھر پھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعتہً ایک ایسے زمانہ کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شیریں اور شباب سے لبریز تھا۔ لیکن یکلخت منقطع ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور سبزہ زار پر لیٹ گیا اور خوشنما سبزے کو جس کے بیچ میں ملک درٹ کے ننھے ننھے پھول اُگ رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے تکتا رہا ۔۔۔ اور جو کچھ اسے یاد آیا وہ یہ تھا۔

(۱)

زینک ایلبرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانہ تعلیم کا آخری سال گذار چکنے کے بعد گرمی کو دونوں سب راحت کی غرض سے پاپیادہ سفر کر رہے تھے۔ بڑسٹ سے پیدل چلے تھے اور ارادہ تھا کہ چگ فورڈ پہنچ کر دم لیں گے لیکن ایلبرسٹ کے گھٹنے میں ایک دفعہ فٹ بال کھیلنے میں چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشہ کو دیکھا تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں ایک پگڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کاٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے سستا رہے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا قاعدہ ہے کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا اور جسم چھریرا۔ ایلبرسٹ کا رنگ زرد پیلا تھا۔ تخیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہتا تھا۔ گارٹن نے نرالی طبیعت پائی تھی جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ ٹیڑھا جیسے جیسے زمانہ قدیم کا کوئی حیوان ہو۔ دونوں کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں سر سے ننگے تھے۔ ایلبرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے۔ ملائم اور مروڑوں والے تھے۔ اور کنپٹیوں پر سے یوں اوپر کو اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انہیں پیچھے کو جھٹکتا رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے اور از حد بے ترتیب۔ دونوں دوست چلتے چلتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن راستے میں اپنے سوا کوئی اور رہرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہہ رہا تھا۔ تم میری بات مانو۔ رحم صرف شعور نفس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا۔ جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے۔

ایلبرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تماشا دیکھ رہا تھا جواب دیا۔ بہرحال میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں رحم کا وہی رتبہ ہے جو صدف کے اندر موتی کا ہے۔

گارٹن بولا۔ برخوردار موجودہ زمانہ کی تمام بے اطمینانی رحم ہی کا نتیجہ ہے۔ جانوروں کو دیکھو امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انہیں صرف اپنے اپنے دکھ کا احساس ہے اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن ہمیں دیکھو کہ کسی دوسرے کی ڈاڑھ میں بھی درد ہو تو ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ آخر اوروں پر ترس کھانے سے کیا حاصل؟ میں تو کہتا ہوں کہ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات

• عمل کرو اور اطمینان سے رہو۔

ایشرسٹ نے ہنکارتی شروع سنا نہیں کہ تم اس پر کبھی عمل نہ کرو گے

گارٹن غور و فکر کے انداز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

• رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشو و نما نہیں پاسکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر تمام کرلینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہے کیونکہ اس سے زندگی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔"

"اور اگر کوئی جذبہ تو قیر نسواں کے اصول کے منافی ہو۔ تو پھر؟"

"تم نے بالکل انگریزوں کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبہ کا ذکر رو تو وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد جسمانی لذت ہے۔ اور وہ جذبہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک ننھے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے درخت پر کوئل نے بولنا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے جہاں پھول اُگ رہے ہوں اور پرندے چہچہا رہے ہوں رابرٹ کی باتیں کتنی بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔

ایشرسٹ بولا۔

"چلو اب چلیں۔ کسی فارم میں جگہ مل جائے تو رات وہیں گزاریں۔"

جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے ایک لڑکی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی اونچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمقابل (جو ایشرسٹ کو لڑکی کے خمیدہ بازوؤں سے دکھائی دے رہا تھا) اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آرہا تھا۔ ایشرسٹ نے جو حسن کا اندازہ کیا کرتا تھا بغیر یہ سوچے کہ اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ دل میں کہا "بہت خوب!" لڑکی نے گہرے رنگ کے موٹے کپڑے کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہا تھا اور اس کی پھٹی پرانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی اور براؤن رنگ کے بھورے رنگ کا بلاؤز پرانا اور گھسا ہوا تھا۔ جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سرخ اور کھردرے تھے۔ گردن کا رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ اس کے پریشان بال اس کے فراخ ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ لمبا سا تھا۔ اوپر کا ہونٹ چھوٹا سا تھا اور دانت چمک رہے تھے۔ بھویں کالی اور سیدھی تھیں۔ پلکیں سیاہ اور لمبی لمبی۔ ناک ستواں اور اس کی بھوری آنکھیں تو غضب ڈھا رہی تھیں۔ ان میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ گویا ابھی ابھی نہا ہوئی ہیں۔ اس نے ایشرسٹ کی طرف دیکھا۔ شاید لنگڑاتا ہوا آدمی (سر سے ننگا بال پیچھے کو جھٹکے ہوئے) جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ عجیب معلوم ہوا۔ ایشرسٹ نے سر پر ٹوپی تو تھی نہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا۔

"یہاں پاس ہی کوئی ایسا فارم نہیں جہاں ہم رات گزار سکیں میں چل نہیں سکتا۔ میری ٹانگ دکھتی ہے۔"

لڑکی بغیر شرمائے نرم نازک اور پیاری آواز میں بولی۔

"جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے۔"

"کہاں؟"

"اس طرف پیچھے کو۔"

"ہم وہاں رات گزار سکتے ہیں؟"

"میرا خیال تو ہے۔"

"تو ہمیں راستہ بتا دو۔"

"آئیے۔"

ایلہرسٹ لنگڑاتا لنگڑاتا ساتھ چل پڑا جب وہ جیپ پر آ تو گارنر نے جرح شروع کر دی۔

"تم ڈیون شائر کی رہنے والی ہو؟"

"نہیں جناب!"

"تو پھر؟"

"میرا وطن ویلز میں ہے"

"ٹھیک۔ میں بھی کہتا تھا کہ شکل سے تو تم کیلٹ معلوم ہوتی ہو — تو یہ فارم تمہارا نہیں؟"

"نہیں۔ میری خالہ کا ہے۔"

"اور تمہارا خالو؟"

"وہ زندہ نہیں۔"

"تو فارم کا کام کون چلاتا ہے؟"

"میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے"

"تمہارا خالو تو ڈیون شائر کا رہنے والا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہے؟"

"سات سال۔"

"ویلز کے بعد یہ جگہ تمہیں کچھ پسند بھی آئی؟"

"معلوم نہیں جناب"

"شاید تمہیں ویلز اب یاد نہ رہا ہو۔"

"اچھی طرح یاد ہے وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی۔"

"مجھے بھی تم سے اتفاق ہے۔"

ایلہرسٹ یکلخت بولا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"جناب سترہ سال"
"اور تمہارا نام کیا ہے؟"
"میگن ڈیوڈ۔"
"ان کا نام رابرٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرینک ایشرسٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا کہ چیگ فورڈ پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں۔ لیکن ——"
"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ دکھ رہی ہے۔"
ایشرسٹ مسکرا دیا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔
اونچان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی اینٹ عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی کھڑکیوں میں پیڑ لگے تھے۔ ارد گرد ایک احاطہ تھا جس میں سؤر اور مرغیاں اور ایک بڑھی گھوڑی ادھر ادھر پھر رہی تھی پرے کو گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی تھی۔ جس پر اسکاچ فر کے چند درخت اُگ رہے تھے۔ سامنے سیب کے درختوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ جن کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ باغ کے کنارے کنارے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اور ندی کے پار ایک لمبا مرغزار پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور ترچھی آنکھوں والا ایک چھوٹا سا لڑکا ایک سؤر کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔ جو انہیں دیکھ کر آگے بڑھی۔ لڑکی نے کہا۔
"یہ میری خالہ مسز نیرد کومب ہیں۔"
خالہ مسز نیرد کومب کی آنکھیں وائی جنگل بطخ کی مانند سیاہ اور تیز تھی۔ گردن میں بھی وہی سانپ کی سی اٹھان تھی۔
ایشرسٹ نے کہا: "ہمیں آپ کی بھانجی رستے میں مل گئی۔ یہ کہتی ہے یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائے گا؟"
"ہو تو جائے گا لیکن آپ دونوں کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑے گا۔ میگن بیٹی جاؤ وہ خالی کمرہ ان کے لئے صاف کردو۔ کریم کا ایک پیالہ بھی لیتی آنا۔ چائے تو آپ پئیں گے۔"
اُن کے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی اس میں سے گزر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ گلابی رنگ کے پھولوں اور اُن کے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹوپی کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔
"آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہو گی۔ چل کر پارلر کے اندر آرام کیجئے ۔۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"
"پڑھتے تھے اب تو فارغ ہو چکے۔"
مسز نیرد کومب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔
پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی ہوئی صاف کرسیاں اور صوفا پڑا ہوا تھا۔ جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ کمرہ اس قدر صاف تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال ہی نہیں ہوا ایشرسٹ فوراً صوفے پر جا بیٹھا۔ اور دکھتے ہوئے گھٹنے کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ مسز نیرد کومب اسے بغور دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس لڑکے میں ایسا نہ تکبر نظر آتا تھا گو ایشرسٹ کا اپنی

ملاقاتیوں کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

"یہاں کوئی ندی ہے جہاں ہم نہا سکیں؟"

"باغیچے کے ساتھ ایک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بمشکل کمر تک پانی نہیں پہنچتا۔"

"کتنی گہری ہے؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ فٹ۔"

"اوہ تو بہت ٹھیک ہے۔ یہ کس طرف کو؟"

"آپ ڈنڈی کے ساتھ چلے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا پھاٹک آئے گا اس میں سے گزر کر سامنے ایک بڑھا سیب کا درخت ہے۔ سب سے الگ۔ اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں بھی ہیں۔"

مسز نرد کومب مسکرا دی اور بولی۔ "جب آپ واپس آئیں گے تو چائے تیار ہوگی۔"

ندی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بند سا لگا ہوا تھا جس سے پانی رک گیا تھا اور ایک تالاب سا بن گیا تھا جس کی تہہ ریتلی تھی۔ وہ بڑا سا سیب کا درخت سب درختوں سے نیچا تھا۔ اتنا نیچا۔ کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر جھکی پڑتی تھیں کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ شگوفے کھلنے کو تھے اور قرمزی کلیاں چٹک۔ رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی نہا سکتا تھا۔ چنانچہ ایشرسٹ کنارے پر منتظر کھڑا اپنے گھٹنے کو ملتا رہا۔ اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا جس میں چٹانوں کے درمیان تھارن کے درخت اور جنگلی پھول اگ رہے تھے۔ پرے ایک اونچے گڑھوار ٹیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ہر سمت ہوا میں جھوم رہی تھی۔ بہار کا ہر پرندہ چہچہا رہا تھا۔ اور سورج کی ترچھی شعاعوں سے گھاس پر دھوپ چھاؤں کی شطرنج سی بچھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں۔ تھیوکرٹس اور دریائے چرول۔ چاندنی اور دوشیزہ۔ جس کی آنکھوں میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ اتنی باتیں یاد آئیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی بات کا خیال نہیں۔ اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

(۳)

چائے دیر سے چنی گئی۔ لیکن تھی پر تکلف۔ کھانے کو ساتھ انڈے۔ کریم۔ مربّہ اور چپٹے چپٹے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے چھینٹے دیئے ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گارٹن کیلٹ قوم کے متعلق ایک طویل تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیلٹوں کا چرچا تھا۔ گارٹن خود بھی کیلٹ تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس گھرانے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے تو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر دراز تھا جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے تھے۔ ہاتھ کا بنایا ہوا سگریٹ اس کے خم دار ہونٹوں کے کنج میں جیسے لٹک رہا تھا۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی سرد مہر آنکھوں کو ایشرسٹ کی آنکھوں میں ڈالے اہل ویلز کی شائستگی کو سراہتا رہا۔ ویلز کو چھوڑ کر انگلستان میں آ جانا ایسا ہی ہے جیسے انسان چینی کے برتنوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے۔ ——— فرینک آخر پھر انگریز ہے۔ اسے کیا معلوم اس ویلز کی رہنے والی لڑکی میں کس درجہ شائستگی اور اس کی فطرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے گیلے سیاہ بالوں کو ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور بالوضاحت یہ ثابت کیا کہ یہ لڑکی عین ان نظموں کے مطابق ہے۔ جو ویلز کے کسی داستان گو شاعر نے بارھویں صدی میں لکھی تھیں۔

ایشرسٹ چت لیٹا گہرے رنگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا فدا اور اس لئے ٹانگیں صوفے سے باہر لٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے
• گارٹن کی باتوں کو توجہ سے نہ سنا جب لڑکی دوبارہ کیک لے کر اندر آئی تھی۔ اس وقت سے اس کی شکل دیکھ لینا پھول یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دید سے کم نہ تھا۔ آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ لڑکی نے عجیب انداز کے ساتھ ایک جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں نیچے ڈال لی تھیں۔ اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گارٹن نے کہا۔ چلو باورچی خانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں۔

باورچی خانہ کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ چھت میں بڑے بڑے شہتیر لگے تھے جن میں بھنی ہوئی سؤر کی رانیں لٹک رہی تھیں۔ کھڑکی میں پھولوں کے گملے پڑے تھے۔ دیوار پر بندوقیں۔ چینی اور جست کے عجیب و غریب آبخورے اور ملکہ وکٹوریا کی تصویریں کیلوں سے آویزاں تھیں۔ بیچ میں معمولی لکڑی کی ایک لمبی تنگ سی میز بچھی تھی۔ جس پر پیالے اور چمچے رکھے ہوئے تھے۔ اور چھت سے پیاز کی گٹھڑیوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی۔ آتشدان خاصا گہرا تھا۔ جس کے ایک طرف دو چھوٹے لڑکے بڑی تیز کے ساتھ بچھلے بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف ایک بھوری آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھا سن کے پھوسڑوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان پھوسڑوں جیسی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے دیگچے میں اسٹو پک رہا تھا۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سامنے مسز نیرو کو سب کسی سوچ میں میٹھی چھچے رہی تھی۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچھی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چھوٹے لڑکوں کی طرح عیار معلوم ہوتے تھے دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پست قد ادھیڑ عمر کا آدمی۔ ڈاڑھی مونچھ منڈھی ہوئی کارڈ رائی کی برجیس پہنے کھڑکی میں بیٹھا ایک پرانا سا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صرف میگن ہی کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور پیپوں سے سیب کی شراب کے جگ بھر بھر کر میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھنے والے ہیں۔ چنانچہ گارٹن بولا۔

• اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آجائیں۔

اور جواب کا انتظار کئے بغیر دونوں پھر پارلر میں آ بیٹھے۔ لیکن باورچی خانہ کی اس رونق۔ اس گرماہٹ ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چمک دار کمرہ پہلے سے بھی کچھ اجاڑ معلوم ہونے لگا۔ دونوں دوست پژمردہ ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

• لڑکے شکل سے بالکل جپسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک لڑکا سیکسن تھا۔ وہ جو بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ اور وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دقیق مطالعہ کی چیز ہے۔

ایشرسٹ کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔ گارٹن اسے اس وقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا۔ دقیق مطالعہ کی چیز! کیا بکواس ہے۔ وہ لڑکی تو جنگل کا ایک پھول ہے۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے۔ مطالعہ!

گارٹن بولا۔

• جذباتی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ صرف اس کے بیدار ہونے کی کسر ہے۔

• تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا؟!

گارتھ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا غم دار تبسم کہہ رہا تھا۔ "کیا بد مذاقی کی بات ہے! بالکل انگریزوں کی سی!"

ایلشرسٹ پائپ کے کش لگا کر بولا۔ "بیدار ہونے کی کسر ہے۔ ہم بے وقوف گارتھ کو تو دیکھو۔ اپنے آپ کو کیا کچھ سمجھتا ہے۔"

ایلشرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ گاڑی خانہ اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی اور سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا جہاں ان لڑکیوں کے دروازوں کی بتی جو باورچی خانے میں جل رہی تھیں۔ ایک پرندہ جو ابھی جاگ رہا تھا بے دلی سے چہچہایا۔ گویا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اصطبل سے ایک گھوڑے کی ہوکر اور لڑکھڑانے اور گھاس چبانے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں دور دور تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کے پرے مجوب ستارے تھے جو ابھی پوری طرح عریاں نہ ہوئے تھے۔ اور جن کی سفید شعاعوں نے گہرے نیلے آسمان کو چھلنی کر دیا تھا۔

ایک الو کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایلشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ایسی رات میں باہر آزاد پھرنا کتنا پر لطف ہو گا! تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور تین ٹٹو اس اندھیرے میں دھندلے سے سامنے سے گذرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جن کی کالی ایال دار گردنیں پھاٹک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے پائپ کو ٹھونک کر خالی کیا تو اس میں سے شراروں کی ایک پھلجھڑی سی نکلی۔ ٹٹو چونک کر بھاگ نکلے۔ ایک چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چیپ چیپ کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ ایلشرسٹ نے اپنا بازو پھیلایا۔ ہتھیلی پر اوس پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یک لخت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے کھٹ کھٹ فرش پر گرے۔ اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی ——— لڑکی کی آواز ——— جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی ——— تو الفاظ صاف اور واضح طور پر کان میں پڑے! "نہیں پک میں بلی ساتھ سلانے دوں گی" پھر ننھے بچوں کے قہقہوں کی آواز آئی۔ کسی نے جلتے سامان کے ایک تھپڑ مارا۔ اور پھر کوئی ہلکی آواز میں ایسی پیاری ہنسی جس کو ایلشرسٹ کانپ سا گیا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک ماری ہو۔ موم بتی جس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی بجھ گئی اور خاموشی چھا گئی۔ ایلشرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا اور اس کی روح ملول تھی۔

گارتھ نے کہا۔ "تمہیں باورچی خانہ میں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تو سونے چلا ہوں۔"

(۳)

ایلشرسٹ ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا تھا۔ لیکن جب گارتھ سونے کے کمرے میں آیا تو گو ایلشرسٹ بظاہر گہری نیند میں تھا لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا۔ کمرے کی چھت نیچی تھی۔ گارتھ بستر پر چت لیٹا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ لیکن ایلشرسٹ کو الوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی۔ دنیا کے تفکرات رات کے وقت ایلشرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز نہ ہوتے تھے اور سچ پوچھو تو اسے زندگی میں کوئی فکر ہی نہ تھا۔ بیرسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ دنیا اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد گھر کے علائق سے بھی پاک ہو چکا تھا۔ ذاتی آمدنی چار سو پونڈ سالانہ تھی۔ اب اس کی آزادی میں بھلا کیا حائل تھا؟ جہاں چاہے جائے۔ جو چاہے کرے جب چاہے کرے۔ اس کا بستر مختصر تھا۔ اس لئے اسے سخاوت ہونے یا پلنگ سرہانے کے پاس ایک کھڑکی کھلی تھی

جس میں سے عطر کی خوشبو کر دیں پھیل رہی تھی۔ اور الیشرسٹ بستر میں پڑا اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا۔ لڑکی سے کچھ کام تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تین دن تک پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کچھ جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تصورات سے تو اس کے دل میں ہرکیں اٹھ رہی تھیں۔ بعض سے طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچی خانہ میں بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ جب دونوں دوست باورچی خانہ میں داخل ہوئے تھے تو اس نے یکلخت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا جگ اٹھائے جا رہی تھی ٹکٹکی باندھ کر دیکھا تھا۔ اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بےدلی تاہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دوغلا چونک اٹھا ہو۔ اس وقت الیشرسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا جس طرح اس لڑکی کا تر و تازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سرخ چہرہ۔ نیلی آنکھیں ہلکے رنگ کی پلکیں اور سن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے سامنے پردہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوتی اور ایک نیم خوابیدہ کوے کی منمنی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بلیک برڈ نے جس کی آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی نہ تھیں۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو برہم کر دیا۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں بڑھتی ہوئی روشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے الیشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سوجا ہوا تھا۔ اس لئے پیدل سفر کا ارادہ ترک کر نا پڑا۔ گارٹن کو اگلے دن لندن پہنچنا تھا وہ دوپہر کے وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر طنز آمیز تبسم دیکھ کر الیشرسٹ بہت چڑا لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہونچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا تو الیشرسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ ٹیڑھے درختوں کی محراب کے پاس گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ الیشرسٹ دن بھر ایک سبز رنگ کی چوکی پر بیٹھا رہا۔ سورج کی شعاعیں خوشبودار پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ اور پھولدار جھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ الیشرسٹ ایک سرور کے عالم میں بیٹھا کبھی کبھی پائپ سلگا لیتا۔ کبھی منظر کا لطف اٹھاتا۔ اور کبھی کسی سوچ میں مصروف ہو جاتا۔

ایک فارم کے اندر بہار کے موسم میں بےشمار ہستیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں انڈوں اور کلیوں سے جنم لیتی ہیں فارم کے لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور نوزائیدہ ہستیوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ الیشرسٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا کہ ایک مادہ ہنس اپنے چھ بچوں کو جن کی گردنیں زرد اور پیٹھ بھورے رنگ کی تھی۔ ساتھ لئے مٹکتی مٹکاتی قریب آ پہنچی اور بچے الیشرسٹ کے پیروں کے پاس گھاس کے پتوں پر اپنی ننھی ننھی چونچیں تیز کرنے لگے۔ کبھی کبھی مسز نریکومب یا میگن آن کر پوچھ جاتی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ الیشرسٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں تھینک یو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ چائے کے وقت وہ دونوں سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلٹس ایک پیالے میں ڈال اپنے ساتھ لے آئیں۔ سوجے ہوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں۔ اور پلٹس اس پر باندھ گئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو الیشرسٹ کو لڑکی کا وہ نیچی آواز میں ”اوئی“ کہنا۔ وہ ہمدردی کی نظروں سے دیکھنا وہ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا کہ گارٹن اس لڑکی کے متعلق کتنی فضول باتیں کر رہا تھا تو ایک بار پھر گارٹن سے چڑ ہو گئی۔ اس نے یہ ذرا سوچا کہ اخوامں میں پڑنے کی کیا بات ہے۔ جب لڑکی چائے لائی۔ تو

ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ یہ بتاؤ۔ میرا دوست تمھیں پسند آیا؟"

میگن نے منہ سکیڑ لیا۔ گویا فیصلہ کر رہی تھی کہ کہیں مسکرا دوں تو بدتمیزی نہ سمجھی جائے۔ پھر بولی۔

"بڑے مسخرے تھے وہ۔ ہم سب کو ہنساتے رہے۔ وہ بہت لائق معلوم ہوتے تھے۔"

"کیا ایسی بات کہی انھوں نے جو تم سب کو ہنسا دیا؟"

"وہ مجھ سے کہتے تھے تم بارڈوں کی بیٹی ہو۔ بارڈ کیا ہوتے ہیں؟"

"بارڈ ان شاعروں کو کہتے ہیں جو آج سے کئی سو سال پہلے ویلز میں رہتے تھے۔"

"تو بھلا میں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی؟"

"میرے دوست کا مطلب یہ تھا کہ وہ تم جیسی ہی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا کرتے تھے۔"

میگن نے اپنی بھنویں سکیڑ کر کہا۔ "انھیں مذاق سوجھا ہو گا کیا میں ویسی لڑکی ہوں؟"

"میری بات پر یقین کرو گی؟"

"کیوں نہیں؟"

"میرے خیال میں وہ سچ کہتا تھا۔"

لڑکی مسکرا دی۔

ایشرسٹ نے دل میں کہا۔ "واقعی تم خوبصورت ہو۔"

"وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو شکل و صورت سے سیکسن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

"جو کون ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے؟"

"ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجا ہے۔"

"اچھا! تمھاری خالہ کا لڑکا نہیں؟"

"نہ۔"

"ان کا مطلب یہ تھا کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی جلتی ہے جو تقریباً چودہ سو سال پہلے انگلستان پر آ کر قابض ہو گئے تھے۔"

"اچھا ان کا حال تو میں جانتی ہوں۔ کیا جو واقعی سیکسن ہے؟"

"گارٹن کو ایسی باتوں کا جنون ہے لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسنوں سے کچھ کچھ ملتا ضرور ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

میگن کے اس آخری جملے سے ایشرسٹ کے دل میں گدگدی ہوئی۔ مختصر سا جملہ تھا۔ لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش مطلبی پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی اس نے کس سلیقے اور شائستگی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

"وہ کہتے تھے کہ تو لڑکے تو سب ہنوز بچے ہی ہیں۔ یہ بھلا کیوں کر؟ خاموش تو رہے لیکن یہ بات انھیں ناگوار گزری اور میری خالہ کے بیٹوں کو تو بہت غصہ آیا۔ خالو تو کسان تھے۔ کہیں کسان بھی جیسی ہوتے ہیں۔ یوں لوگوں کا دل دکھانا بری بات ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں آیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھینچے۔ لیکن منہ سے صرف اتنا کہا۔ "میگن تم سچ کہتی ہو۔ اچھا کل رات تم ہی بچوں کو بستر میں سلا رہی تھیں نا؟ مجھے نچلی منزل میں آواز آ رہی تھی۔"

میگن کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "آپ چائے پیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کہیں تو میں اچھا کیک لا دوں؟"

"تمہیں کبھی اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے؟"

"واہ ملتی کیوں نہیں؟"

"آخر میرے بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو تمہیں فارغ کبھی نہیں دیکھا۔"

میگن نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات ہے جسے سلجھا نہیں سکتی۔ چہرہ اور بھی لال ہو گیا۔ جب چلی گئی تو ایشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ سمجھتی تھی کہ میں اس سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایشرسٹ کی وہ عمر تھی جس میں بعض لوگ حسن کو ایک پھول سمجھتے ہیں۔ اور اس نظارے سے ان کے دل میں عورت کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایشرسٹ اپنے گرد و پیش سے اکثر غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یہ احساس دیر کے بعد ہوا کہ وہ نوجوان جس کے متعلق گارٹن نے کہا تھا کہ شکل سے سیکسن معلوم ہوتا ہے اصطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ بادامی رنگ کی میلی سی برجیس کیچڑ سے بھرے ہوئے گیٹر اور نیلے رنگ کی قمیض میں وہ ایک رونق کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر ذہانت کے آثار۔ کسی اڑیل جانور کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سرخ تھے۔ سر پر دھوپ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اون کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ ایشرسٹ میری طرف دیکھ رہا ہے تو احاطہ میں سے گزر کر باورچی خانہ کے دروازہ کی طرف چل دیا۔ اور مکان کے کونے پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی ہے۔ دہقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بھاری قدم نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ ایشرسٹ پر اداسی سی پڑ گئی۔ اکھڑ لوگ! طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالئے۔ ایسے لوگوں سے نباہ بھلا کیسے ممکن ہے! لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ جوتے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے! شاید گارٹن ہی کا کہنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت ممکن ہے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہے۔ لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے۔ اسے تو قدرت ہی نے عجیب و اصیل پیدا کیا ہے۔

وہ داڑھی مونچھ منڈا ادھیڑ آدمی جسے کل رات باورچی خانہ میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لے کر احاطے میں داخل ہوا گایوں کو دودھ دوہنے لے جا رہا تھا۔ ایشرسٹ کو اب معلوم ہوا کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔

"اچھے اچھے جانور لئے جا رہے ہو۔"

لنگڑے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی نظریں اوپر کو اٹھی رہتی تھیں۔ مدتوں دکھ سہنے سے آنکھوں میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

"ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں۔"

"اس کا شکل سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔"

"آپ کی ٹانگ تو پہلے سے بہتر ہے؟"

"تھینک یو۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے۔"

معذور آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا "اس دکھ کو میں خوب جانتا ہوں صاحب، گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے خراب ہے۔"

ایشرسٹ نے آواز سے ہمدردی کا اظہار کیا (ایسی ہمدردانہ آواز نکالنا مرفہ الحال لوگوں کے لئے بہت سہل بات ہے) لنگڑا ہوا پھر مسکرا دیا۔

"پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگے تھے۔"

"اچھا!"

"جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی برا حال تھا۔ میں تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں۔"

"میرے گھٹنے پر تو دوا باندھ گئی ہیں۔ جس سے بہت فائدہ ہے۔"

"ایک بوٹی تھی جو لڑکی کہیں سے توڑ لائی تھی (پھولوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے یہ لڑکی) بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خاصیتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔ گڈ آفٹر نون۔"

ایشرسٹ مسکرا دیا۔ "پھولوں سے واقف ہے اور وہ خود پھول سے کیا کم ہے؟"

شام کے کھانے پر برہ کا ٹھنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سیب کی شراب تھی۔ کھانا کھا چکا تو لڑکی کمرے میں آئی۔

"خالہ پوچھتی ہیں آپ ہمارے نئے ڈبے کیک کا ایک ٹکڑا کھائیں گے؟"

"ہاں مگر باورچی خانہ میں بیٹھ کر۔"

"شوق سے ـــ آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل تو گھبراتا ہوگا۔"؟

"ارے نہیں ـــ لیکن یہ کہو میرا باورچی خانہ میں آنا کسی کو برا تو نہ لگے گا؟"

"واہ برا کیوں لگتا۔ ہمیں تو بلکہ بہت خوشی ہوگی۔"

ایشرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ یکلخت جو اٹھا تو لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ایک سسکی بھری اور اپنے بازو سامنے پھیلا دیئے۔ ایشرسٹ ان چھوٹے چھوٹے کھردرے، سانولے ہاتھوں کو پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگالے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آ کر کندھا آگے کر دیا۔ ایشرسٹ اس کے سہارے چل کر دروازہ تک پہنچا۔ اس شانے پر ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا۔ عمر بھر کسی چیز کے مس سے نصیب نہ ہوا تھا۔ اتنی عقلمندی ضرور کی کہ چلتے چلتے اسٹینڈ میں سے اپنی چھڑی نکال لی۔ اور باورچی خانے میں پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ صبح اٹھ کر گھٹنے کا ورم بہت حد تک جاتا رہا تھا۔ وہ پلنگ کنارے پر بیٹھا مشروب نوش کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام نک اور رک تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہفتے کا دن تھا اس لئے دونوں اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا شریر گل گوتھنے۔ رنگ بہت گورا تھا اور بالوں کی رنگت بھی سنہری۔ مسٹر ایلشرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انھیں یاد تھے چار بجے تک ایک ایک کر کے ایلشرسٹ کو سکھا دیئے۔ پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں بیٹھ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انھیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ ایلشرسٹ بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انھیں دیکھتا رہا۔ آخر کار نک جو ان دونوں میں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"جپسی بڑا اس پتھر پر بیٹھتا ہے"

"وہ کیا بلا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر میگن کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڑے جم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا جس دن بابا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت ہوا یہاں بیٹھا ہوا تھا وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے"

"کون سا راگ بجاتا ہے وہ؟"

"معلوم نہیں"

"اس کی شکل کیسی ہے؟"

"کالے رنگ کا بڈھا جم کہتا ہے اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آ جاتا ہے" پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا میگن اس سے بہت ڈرتی ہے"

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی"

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی؟"

"وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے"

"چل بدمعاش۔ بھلا تجھے کیسے معلوم ہے؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایلشرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود اسے سنا ہے"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو"

لڑکا چپکا ہو گیا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی کچھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا جناب کو یہ اچھا لگتا ہے! جن کہیں کا!"

"جن کیا ہوتا ہے؟"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہوتا ہو۔"

پھولے ذرا سے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ "جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔"

لیکن ایشرسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "خدایا ہم سب پر فضل کر اور ایشرسٹ پر بھی۔" بیک نے دیکھا کہ ابھی تو ابھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا پھر ندی پر جا پہنچا۔ جہاں پھر دونوں نے مل کر مچھلی اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی تو ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ جپسی ہو تو کیا چیز ہے؟"

میگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے۔"

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو۔؟"

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔"

"نظر کیونکر آنے لگا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڈھے جم نے یونہی کسی ٹٹو کو دیکھ لیا ہو گا۔"

"نہیں ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔"

"تو بہرحال جپسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جپسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔"

میگن نے صرف اتنا کہا۔ "وہ سب منحوس ہیں۔"

"مگر کیوں! اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح اپنا جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل میں جو پھول اگتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں۔ یہ ستارے یہ درخت بھی تو سب خود رو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤں گا۔"

"ارے نہیں، نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھوں گا جہاں بھوت بیٹھتا ہے۔"

لڑکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے!"

"مگر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ الیسٹرسٹ پیار کے انداز میں بولا۔
"خیر میں چلا ہوں رہا، ہی بہتر ہے۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"
"جلد؟"
"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟"
"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرایہ پر دیتے ہیں۔"
ایشرسٹ نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔
"تم چاہتی ہو میں ٹھہر جاؤں؟"
"ہاں"
"تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چیں بجبیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ تم نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ کارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی۔ کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی پیچ کے سرخ و سفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکاچ فر کے تنوں اور ٹہنیوں کو جو تیز روشنی میں نیلے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشے کے عالم میں بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ یا پھر جنگل میں لارچ کے درختوں کا نظارہ کرتا۔ جو ہوا کے زور سے سیاہ ہو گئے تھے۔ نچلے پتے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں تو درخت میں ایک زندگی سی آ جاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا اور بنفشے کے پھولوں۔ گچھوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے سبز کمین میں کھڑا ٹیڈبری کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آر پار دکھائی دیتا تھا۔ انگلیوں سے چھیڑتا رہتا کبھی گلو چھپانے لگتے۔ کبھی سبزہ پر بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبزہ و گل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں ہوتی یا اسے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی اس لئے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگا لیتا لنگڑے جم یا مسز نرید کو سب سے باتیں کرتا تھا۔ لڑکی سینا پرونے بیٹھتی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی چمکتی ہوئی بھوری بھوری آنکھوں سے

جھلملاتے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب سکوت آمیز مسرت ہوئی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ یونہی گزر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت ایشرسٹ باغیچے میں بیٹھا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک عشقیہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ راستے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال گالوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ ایشرسٹ سے بیس گز کے فاصلے پر آ کر لڑکی ٹھہر گئی جونہی آ پہنچا دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹا ہوا تھا اس پر کسی کی نظر نہ پڑی وہ آگے بڑھا گیا لڑکی سے پیچھے ہٹتی رہی لڑکی کے چہرے پر طیش اور پریشانی تھی۔ اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور جھپٹ کر ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ ایشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دبائے بالکل بت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "میں معافی مانگتا ہوں"

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں بڑھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایشرسٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔

ایشرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر ایشرسٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو"

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں جو سے معافی مانگ لیتا ہوں"

"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تم پر عاشق ہوگا اور کیا؟"

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر پٹکا۔

ایشرسٹ ہنس دیا۔ "کہو تو میں اسے ڈانٹ دوں"

لڑکی یکلخت جذبہ سے بے قابو ہو کر رونے لگی۔

"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں"

ایشرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ حتیٰ کہ اس کا تمتمایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ ایشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا دل میں سوچا کہ

یہ عورت کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ وہ اقرار جو میرے منہ پر ہے کتنا حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس لڑکی نے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ لیکن اس وقت تک اپنا آپ چرائے کھڑی تھی لیکن اب یکلخت تھرتھر کانپتی ہوئی ایلبرسٹ کی طرف بڑھی۔ میٹھی میٹھی سی حرارت ایلبرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے مس سے خوشی ہوئی ہے۔ بلاشت بے تاب ہو کر بانہیں اس کے گرد ڈال دیں۔ اور سینے سے لپٹا کر اس کا منہ چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ لیکن کا رنگ سفید تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔ بے جان بازو پہلو کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے ایلبرسٹ کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا "میں تمہارے ہی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا۔ پھر لڑکی نے ایلبرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔

ایلبرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں جم گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور حواس پریشان تھے۔ ان گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی۔ ان شگوفوں کو مجنوں سے بیگم کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا جن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی یا شاید جانے بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہرحال دل مسرت اور احساس فتحمندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو پھڑک رہے تھے۔ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے۔ مگر کاہے کا آغاز؟ جھینگے اسے کاٹ رہے تھے۔ مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ککو اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے۔ جیفل ہنس رہے تھے۔ سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آ گئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی۔ جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کرے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑیوں میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو ہاتھوں میں تھامے رہنا جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس پھول کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا؟ لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبے کے ساتھ اس نے میرا ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انھیں خراجِ عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک کرختگی آ جاتی ہے۔ لیکن ایلبرسٹ ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا

سمجھتا ہے۔ وہ عشق کو ایک مجرہ سمجھتے ہیں جس سے ان کی فطرت میں ایک خلو پیدا ہو جاتا ہے۔

ایلبرٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کا ہی فقط تھا۔ لیکن ڈر تاہی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ چیز ہے لیکن ڈر تا مزدہ تھا دل سے کہتا ایسی خوبصورت لڑکی بھولا بھالا چہرہ جھلکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا یہ کیا کچھ کم فخر کی بات ہے اب خدشہ کا ہے کا ہے۔ لیکن پھر ایک معنوی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا ہے سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف ہو۔ سمجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شاہی وضع کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی آواز نے کہا یہ تمہارے لئے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چاند کے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند پرند اسے گھور کر دیکھتے ہیں۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

دو گھنٹے وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بید کی جھاڑیوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا سڑک پر پہنچا سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے پار ہوتا ہوا پیچھے کی طرف داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ چھ گھنٹے بیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور پھر اس نے یکلخت اپنے عشق رومانی کو بیرونی لحاظ نظر سے دیکھا تصور میں اس گھاگ عورت یعنی مسز نیرد کو سب کی ترش روئی اس کی سانپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیتی وضع لڑکوں کے شبہات اور ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دیئے۔ اکھڑ جو کا چہرہ غصہ سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا جم ہی ایسا تھا جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا گاؤں کے شراب خانہ میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سیر کے وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا۔

لمحہ بھر کو اسے اس اسفل حسنہ زن دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گذارنے پر مجبور ہے جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی اور ایک زرد سی جھلک اس کے پاس سے گذر کر نیلی نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا ایلبرٹ نے مڑ کر دیکھا عجیب نظارہ تھا چاند مٹی کے پشتہ پر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سرخ اور تقریباً گول ایلبرٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ پگڈنڈی پر بات اور گوبر اور نوخاستہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے قوس دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان سے ہلالی نوکوں کے بل آ گرے ہوں گھر میں کہیں روشنی نظر نہ آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک بڑے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ نہ معلوم میگن سو رہی ہے یا اس کی جدائی میں پریشان اور بے آرام کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تکتے تکتے ایک الو بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ الو کی آواز جیسے تاریکی میں گونج اٹھی۔ دن کو کوکوؤں کا چہچہانا۔ رات کو الوؤں کا بولنا۔ ایلبرٹ کے دل بھرے ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے دفعتاً میگن نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ ایلبرٹ درختوں سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ "میگن، میگن پیچھے ہٹی۔

غائب ہوگئی۔ پھر آنی باہر کو جھکی۔ ایلشرسٹ اس گھاس کے قطعہ پر پنجوں کے بل آگے بڑھا۔ سبزہ کی سطح سے ٹھوکر لگی۔ دھندلکا ہٹا۔ میگن کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازوؤں میں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایلشرسٹ نے اس کا سر جھکا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازہ کی ایک بڑی سی چابی تھی ایلشرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے۔ اور بال پریشان تھے کپڑے اس نے ابھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری ایلشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن!" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایلشرسٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں۔ بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اس کے چہرہ تک ہاتھ پہنچ جانا بھی کتنی خوش نصیبی ہے! اُلّو پھر بولا۔ سویٹ برائر کی خوشبو ایلشرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن!"

"گڈ نائٹ جناب!" وہ چلی گئی۔ ایلشرسٹ آہ بھر کر نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سوا اب کیا ہو سکتا ہے کہ چپ چاپ جا کر سو رہے لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازو اوس میں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نیم متبسم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں۔ اسے یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور ایلشرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

(۵)

رات کو بھر کا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا تو طبیعت میں گرانی تھی۔ جیسے رات کو کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب سی دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج پورے جوبن پر تھا۔ ساتوں رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے۔ اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس بچھا دیا ہو۔ جب ایلشرسٹ نیچے اترا تو دل ڈر سا رہا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مسز نیرد کو مبیلے کر آئی تو ایلشرسٹ کو ناگوار گزرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز نیرد کو مبیلے کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنا تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا۔؟

"اچھا مسٹر ایلشرسٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟"

ایلشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا۔"

کیا وہ اپنے دیلز کے لہجے میں (جس پر کیم کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو ــــ! ایلشرسٹ نے اس وقت دل سے کہا: "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

لیکن ناشتہ ہو چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لحظہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈرتا تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہی ہو جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دل میں کچھ کھٹکا لگا ہوا ہے جو صبح سے اس نے شکل تک نہیں دکھائی وہ عشقیہ نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ مسودہ پھاڑ ڈالا اس کی بتیاں بنا بنا کر اس نے پائپ سلگایا اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزوں سے بے خبر تھا۔ اور اب کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی۔ ایشرسٹ دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیے کو عین اس جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے پچک گیا تھا چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں یک لخت مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی تو اور بھی برا ہوگا۔ میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھ دیا۔ اور دروازہ کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لیے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے آرپار دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان چھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز دعا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رک رک کر بولا۔

"رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں یہ کتاب لینے اوپر آیا تھا"

میگن کا وہ تکیہ کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا "اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو محض اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا لیکن اب؟ اب کس منہ سے مکر گے کہ ....." لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کھسکتے گئے اور آخر کار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساس عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسہ عشق جس میں کیف اور نشہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سیب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو"

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں"

میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھ کچھ اس سارے واقعہ پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں آ گیا۔ جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا۔ اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس پتھر کی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے اور پیچھے فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن

ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ ابر ابھی برہا تھا۔ پکھا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر جو دیکھا تو دائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے۔ جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈال دیتا کبھی اس ٹانگ پر۔ چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور رنگ پکے ہوئے آڑوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

"کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!"

ایشرسٹ پہلے ہی کون سا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کر بولا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ لیکن ہمیں خدائی کو صدر بننے کو کس نے کہا؟"

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوانوں کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گذری۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

میری مرضی؟

"چندیا کی استری ہو گئی تو مرضی درضی سب بھول جائے گی؟"

"تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟"

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور بھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی غصہ کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

"میگن تمہیں نہیں چاہتی"

اکھڑ۔ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصہ اور حسد سے جگ بگولا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ یکلخت اٹھ کر کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری"

یہ الفاظ منہ سے نکلے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی اور بولی۔

"دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں"

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ پچ پچ قرمزی ہو رہا تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔ کتنا بڑے مزے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ بیٹھا ہے

گود میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں۔"

"جو آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگی کو تمہاری ضرورت نہیں۔"

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک بکارن کی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کا نپ اٹھا گویا اس نے کسی پروانے کے پر جلتے دیکھ لیے ہوں۔

"نہیں!" سر جھکا کر کتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ ڈھانپے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا

"ہم بڑا اچھا موسم ہے۔"

"گھاس کے لیے بہت اچھا ہے۔ اس لیے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہوں گے۔ مثل ہے اوک کے درخت ایش سے پہلے ــــ"

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ "جم جب تمہیں جپسی نظر آیا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے۔؟"

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے۔"

"کیا واقعی بھی کچھ تھا یا یونہی؟"

"اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے۔"

"یہ ہوتا کیوں ہے؟"

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن کہتے ہیں کہ مسٹر نیرد کو سب نسل کا جپسی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جپسی لوگ اپنے آدمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح خبر ہو گئی ہوگی کہ مسٹر نیرد کو مرنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو بھید بتا کر کہا جاؤ تم پاس رہو ــــ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں بھوت پریت سب ڈھکوسلا ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوتے تو آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ خود چاہے کچھ بھی مورت نظر نہ آیا ہو۔"

"چاند نکلا ہوا تھا؟"

"کوئی بارھویں تیرھویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور ان درختوں کے پیچھے سنہری دکھائی دے

رہا تھا۔"

"ہمارا خیال ہے بھوت منحوس ہوتے ہیں"

ڈنگڑے اوی نے اپنی ٹوپی پیچھے کر لی اور اکھڑی ہوئی نظروں سے ایشرسٹ کو ادھر ہی غور سے دیکھنے لگا۔

"صاحب یہ تو خدا جانتا ہے لیکن آخر بھوت ہیں مارے مارے کیوں پھرتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ خواہ مخواہ ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے بعض کو نہیں آتا۔ اب ہماری میگی کو یا ہمارے لڑکوں کو لیجیے۔ سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی لیکن میگن کی نظر کی مجال جو کبھی چوک جائے۔ جو ہوگا دکھائی دے گا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا"

"وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے"

"یہ سچ ہے۔ میگی کا دل بڑا نرم ہے"

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "لو پائپ بھرلو"

"ٹھیک کہا حضور۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی"

ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

"اس کا دل نرم ہے" بجا لیکن میں بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹر کپ کے پھول اگ رہے تھے اور لال رنگ کے بچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے بھورے جوبن پر تھا کوکو اور ہزاروں پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے..... باغ جنت میں...... ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اگیں گے۔ وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہو گا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا۔ ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن سانڈ نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلبلیں اس کثرت سے اگ رہے تھے کہ ذہن پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی۔ اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بٹر کپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں ٹیالے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں گویا جیسے آسمان کا حسن زمین پر اتر آیا تھا۔ ایشرسٹ اس زمین کو دیکھ کر محو حیرت تھا کوکو کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ دلیسے ہی سنائی دے رہا تھا بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھیوں کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا اور سیب کے درختوں کے سائے بلبلوں کے پھولوں پر پہنچنے

گیا جہاں ہمیشہ کی طرح ایک ہاتھ کی رات سیب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوئی۔ چاندنیاں ایسی کہ وہ درختوں پر رحم کرتی ہیں اور سوکھے ہوئے برگچوں کی رنگت کے نیلے کالاؤں والے دہقانوں کے ستارے ہیں بٹے ہوئے ہیں ہوش میں آیا اگر چہ ابھی تھے اور تھے پہاڑی اور ستارے ابھی دستے رہی تھی لیکن سورج پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آگئی تھی اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا "آج رات" جس طرح بھرتے زمین سے ابھری آرہی تھی۔ اور ایک خوبرو ہاتھ کی نرم اور پراسرار شاخیں ہے اس کا حسن برملا آشکار تھا۔ ترچھا ہاتھ اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی کچھ جیسے انہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا سیب کے درخت کی کچھ ایک ٹہنی توڑی شگوفوں میں وہی مشک کا حسن سمایا۔ وہی سبی سب شبابی رنگ سے وہی تازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں مگن کی سی سفید رنگت۔ وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی۔ بٹن کر کوٹ میں لگایا۔ دل کے اندر جو بہار کھل رہی تھی اس کا تمام زور فتح مندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا لیکن خرگوش بدک کر بھاگ گئے۔

(۶)

اوڈیسے کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ لات کے گیا رہ بجنے والے تھے کتاب رکھ دی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک اشیں کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی پرجلال محافظ فرشتہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پیڑوں کے نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے نا ہموار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سؤر ذرا چونکے اور پل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور جھینگے دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ (نہ معلوم کون سا) لگاتار چپ۔ چپ۔ چپ کر رہا تھا اور کہیں دور کسی جانور کے اڑنے اور ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر کے ارد گرد ایک دھندلی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر بے شمار کلیاں اور شگوفے جن کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ برستی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے سفید رستے کہیں سے اتر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک زمین کے درمیان آکر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوش ربا لمحے کے حسن سے مسحور ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچے میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسن پرستان جس کا یہ زمین دن بھر لباس پہنے رہی تھی۔ چاندنی اسے تحلیل نہ کر سکی صرف اس کی وضع بدل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ زندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور بڑے سیب کے درخت تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں زیادہ گنا کھلے میدان اور ندی کی طرف

جہاں تک سامنے پہنچتا جاتا تھا گھنی شاخوں کے نیچے بہرہ پا کر وہ رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ دبی دبی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سفید بطیں آواز میں ڈکرا رہی تھیں۔ اس کے پاس سے ندی کی گمبھیر آواز اور دو نالیوں سے آتی شبنم کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئے گی؟ کیا سچ مچ؟ تھرتھراتے ہوئے مہتاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بے تابی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے نہیں ہے۔ ایشرسٹ احساس دیہاتی لڑکی کے لئے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ نہ آئی تو کیا طبیعت کو ایک اطمینان ایک ہلکی سی احساس نہ ہو گا؟ لیکن پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ بے معلوم پرند بدستور پپ پپ کر رہا تھا۔ ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اور درخت کی شاخوں میں چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ بکھرے ابر جو شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا ہر لحظہ زندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پُراسرار نقرئی حسن بھی ایشرسٹ کی بے تابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر چند شگوفے کھل رہے تھے، توڑ لی۔ پھل دار درختوں کے شگوفوں کو نرم، پاکیزہ، مقدس، ذی حیات شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہ عظیم نہیں؟ یکلخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سور پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔ میگن کو دیکھ کر حیرت سے دم رک لیا۔ اس کی خاموش رفتاری ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دبی آواز میں کہا میگن! اور ہاتھ بڑھا دیئے۔ وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توقیر نسواں اور وفور عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ ہمہ تن حسن اور رسیلی تھی۔ اور زندہ شگوفوں کی طرح ساری رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول نہ کرے۔ اور اس کے دل کی بہار اور اپنے دل کی بہار دونوں کی تکمیل نہ کرے؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگایا اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ کتنی دیر دونوں یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ الو بولتے رہے چاند چپکے چپکے بلند اور سفید ہو گیا۔ ان کے اردگرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے۔ اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں۔ ندیوں کی مہک پائی۔ ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر نہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پُراسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی بانہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے پھر اس دنیا کے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے ایشرسٹ کے دل کو تکمیل مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ شکست بس یہی لگتا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے عشق کا ایک اور

سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے۔ تو دلی ورا حائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ مونہہ زور تھا۔ ایلشرسٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"او میگن۔ تم کیوں آئیں؟"

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی، کچھ مجروح

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا۔"

"میری جان مجھے جناب نہ کہو۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"فرینک۔"

"میں نہیں کر سکتی۔ ہرگز نہیں۔"

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"بس۔"

دھیمی آواز میں جو بمشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا

"آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔"

ایلشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آؤ۔"

"اوہ"

اس "اوہ" میں جو فدا اور مسرت تھی۔ اس سے ایلشرسٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤں گا۔ اور میگن میں تم کو کہتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا۔"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے۔"

ایلشرسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا

"کل میں ٹورکی جاؤں گا۔ اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے خرید دوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ نہ کریں گے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائیں گے۔ اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کر لیں گے۔"

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی دیوانگی سے خود ہی مسحور ہو کر ایلشرسٹ نے کہا

"نہیں بلکہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میگن! تمہیں مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟"

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ آپ مجھے چاہیں گے۔"

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر اشرسٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

اشرسٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اسکو اٹھا لیا۔ اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ میگن نے کہا۔ "آپ مجھے چومنے کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔"

میگن کی مسکراہٹ سے اشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چاند کی روشنی میں اشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ ان میں سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یکلخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھ ہوئے انداز میں سامنے دیکھا کسمسا کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑایا اور بولی۔

"وہ دیکھو!"

اشرسٹ کو روشن ندی۔ ہلکے سنہری رنگ کے چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جپسی ہوّا!"

"کہاں؟"

"وہ درختوں کے پیچھے۔ پتھر کے پاس۔"

اشرسٹ نے برافروختہ ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! اچانک اور تھام کر درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور لعنتیں بھیجتا ادھر ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات! فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ سوروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی بانہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سخت تنا! کھردری کائی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردرا پن۔ کہاں اس کا نرم رخسار! صرف خوشبو۔ جنگل کی خوشبو کم و بیش ویسی تھی۔ اور اس کے اوپر اور اس کے اندر گرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن۔ دمکتے اور سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹورکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر اشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ رک رک کر ٹہلتا رہا۔ کیونکہ وہ

الفتاد کے ساحلی منطقت کی اس لا دینی ڈرگی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اپنے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لیے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ، گرد آلود بوٹ اور کھچڑی بالوں والی ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے مطلق بے خبر کہ لوگ اس بات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک منطقت ہی میں تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو وہیں سے روپیہ نکلوا لے۔ جب تک وہ پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو بہا دھچکا لگا۔ انھوں نے پوچھا آپ لڑکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ لندن تار بھیج دیجیے۔ وہاں سے جواب آنے پر تو ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کر دیں گے۔ نخوس کاروباری دنیا کے مشتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا

نا کھانے کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبہ دہقان کے لیے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دکان کے اندر گیا ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاصے عجب کے آثار تھے۔ الفرسٹ بغیر کچھ بولے اسے تکتا رہا۔

"کہیے جناب؟"

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لیے لباس خریدنا ہے۔"

نوجوان عورت مسکرا دی۔ ایلفرسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی۔ یکلخت اور بڑے شدید سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا

"کس قسم کا لباس چاہیے آپ کو؟ بہت وضعدار؟"

"نہیں سیدھا سادا۔"

"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہوں گی؟"

"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

میگن کی کمر!

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے!"

"بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو ایلفرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور یکلخت اسے خیال پیدا ہوا کہ میگن ـــ اس کی میگن۔ سوائے کھردری پٹی کے سایہ۔ کھردرے جاڑ اور دہقانی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے بارہا دیکھا تھا کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرحدار جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا نخاشی رنگ ایلفرسٹ کو بہت پسند آیا

لیکن بیگم کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی لیکن ایلشرسٹ کا انتخاب ہو چکا تھا۔ کیا جُتے اور کیا کپڑے! ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت ہو گی اور غرض کہ سب کچھ خرید کر اسے بنا دیا اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا۔ جیسے اکثر کپڑے اکثر دیہاتیوں کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہو گا؟ سفر میں بھی، پنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟ ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہو گی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ خود فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ ناز گی ہو اور مجھے ایک بدمعاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا۔ یہ فاختئی رنگ کا لباس علیحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے بعد آؤں گا۔“

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

”بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے عمدہ لباس نہیں مل سکتا۔“

ایلشرسٹ نے کہا ”غالباً نہیں۔“ اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہو گیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں۔ اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے جس میں سوار ہو کر وہ اپنے نئی دلہن کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور پھر لندن نے انہیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں۔

”فرینک ایلشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے۔“

ایلشرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کا آفتابِ دل آفتابِ فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

”ارے فل ہیلی ڈے!“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔“

”لنچ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں، انہیں تم سے ملا دوں گا۔“ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا۔ تو آوازیں بھی بہجت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام میں تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک ہلالی قطار کے سامنے آ کر بیٹھ گئے جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

میرے کمرے میں آکر منہ ہاتھ دھولو۔ چائے ابھی تیار ہوا چاہتی ہے۔"

الیشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ــــ کا ہے کا احساس؟ یہ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں پہنچ گیا تو تین بچی چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورا، آنکھیں نیلی ہیلی ڈے نے کہا۔ "یہ فرینک الیشرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔" تینوں کے چہرے یکلخت دمک اٹھے۔

دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی۔ ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا، بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھنویں سنہرے تھیں۔ دائیں بائیں ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور بتاشی تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا الیشرسٹ پر ایک مجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں ہٹا لیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ٹینس اور بوتی دوا اس کی داستانیں معلوم ہوتی تھیں فارم کی زندگی کے بعد تو کی شوخ، پرجوش بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون مجھا ہوا بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو دیکھا اور پھر اس قدر رنوس معلوم ہوا کہ فارم ہاؤس کا ماحول یکلخت کسی دور دراز دنیا کا حاصل معلوم ہونے لگا۔ چھوٹی بہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی کا نام اسٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے؟ بڑا لطف رہے گا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر الیشرسٹ نے کہا۔

"مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟"

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ الیشرسٹ اس کی طرف مڑا اور مسکرا کر سر ہلا دیا کیا حسن تھا۔ سبینا نے افسوس کے لہجے میں کہا ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔" اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں؟"

"قریباً دو میل۔"

"سچ مچ؟"

"خوب"

"واقعی؟"

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایلبرٹ کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار لہجہ میں۔ میگ ڈے نے کہا۔

"ایلبرٹ تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟

"میں تو کہتا ہوں آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

"ہاں ضرور۔"

لیکن ایلبرٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر یکلخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا اور ایک میل کی دوڑ میں اوّل بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے۔ جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتی وہ ایلبرٹ کو ساتھ لے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سٹیلا اور اس کا بھائی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔ سیتیا اور فریڈا نے جن کی سندل سالولی پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایلبرٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایلبرٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساسِ حسن ہو اسے وقت گذرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھی۔ اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔ ایلبرٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہو گا اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"آہا ـــ اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہو گا۔"

ایلبرٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ناشتہ کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ "میری جان میں سامان خریدنے ٹورکی جا رہا ہوں آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہوا تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔" اسے یاد آیا کہ میگن تھر تھرا اٹھی تھی اور اس کے الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کہے گی! پھر یکلخت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا سا حسن۔ تالاب پر کھڑی تیز نیلی آنکھوں سے بغور اسے دیکھ رہی ہے انھیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے؟ انھیں کیا معلوم کہ آج رات کے لئے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا! اگر انھیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یکلخت بولا۔

"آہا ـــ اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔؟"

"یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ بیلی فسے کہہ رہا تھا۔" لطف آ گیا بس رات کے کپڑے

میں تمہیں دیدوں گا۔" اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی پشیمانی اور تمنا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا۔
اداسی کے لہجے میں بولا۔
"مجھے ایک تار بھیجنا ہے۔"
تالاب کے کھیل سے لوٹ گئے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ الیبرٹ نے مسز نیزدکومب کے پتہ پر اس مضمون کا تار بھیجا۔
"افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آؤں گا۔" اس سے دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پرسکون اور نیلا نیلا تھا اور الیبرٹ تیراکی کا شوقین اور خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا اور بیلی ڈے کے بشاش چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا بیگن کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ بیلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور اکٹھے روانہ ہوئے۔ بیلی ڈے اور الیبرٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے الیبرٹ پانی میں داخل ہوا اور اپنی زبانی اپنی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو بیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی میں اچھل رہی تھیں اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ الیبرٹ عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا میں ایک اجنبی ہوں۔ میری شمولیت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سٹیلا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرنا سکھائیے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ سٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے۔ یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔
یکلخت سٹیلا چونک کر پکاری۔ الیبرٹ نے دیکھا تو سٹیلا مرمریں اور نازک بازو پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر تک پانی میں کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چُنٹیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔
"فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو!"
الیبرٹ تاڑ گیا کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ الیبرٹ سے سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یکلخت اس نے چیخ ماری۔ بازو اوپر کئے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن الیبرٹ نے "واپس جاؤ سٹیلا" کہہ کر اسے روک دیا اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ بیلی ڈے دو سے زیادہ غوطے نہ کھانے پایا تھا کہ الیبرٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ سے تشنج اعضا تھی۔ لیکن اسے بچانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ اس نے مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں الیبرٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آ گئی۔ فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ الیبرٹ اور سٹیلا اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے۔ چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں بیلی ڈے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ الیبرٹ سے بولا۔ "ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں۔" الیبرٹ سہارا دینے لگا تو سٹیلا نے تر۔ خشک اور سرخ چہرے پر سکون

برہم ہو چکا تھا۔ نظر بچی تو سوچنے لگا میں نے اسے سٹیلا کہہ کر بلایا تھا۔ اس نے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو ہیلی ڈے نے نیچی آواز میں کہا

"ایشرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو!"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پی کر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو لٹا دیا۔ مربّہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو سبینا بولی۔

"آپ نے تو بہت بہادری دکھائی۔"

اور فریڈا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں۔"

ایشرسٹ نے دیکھا کہ سٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سبینا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ انکھیوں سے دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب یوں نہ بنئے یہاں آئیے۔" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں میز پر وہ کاغذ پڑا تھا جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے سٹیلا ہیلی ڈے۔ سبینا ہیلی ڈے فریڈا ہیلی ڈے۔ کاغذ پر بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں سبینا بولی

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چومیں گی۔"

اور فریڈا بولی۔ "ارے ہاں واقعی!"

ایشرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آ لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور فریڈا بولی۔

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے۔"

ایشرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا میز کے اس طرف سٹیلا کا بھی یہی حال تھا سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا اور فریڈا پکاری۔

"اب چلو بھی نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

ایشرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب مجوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"کمبخت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم۔"

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سٹیلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک ہے بھی اس طرف اٹھی ہوئی۔"

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگا لیا۔ چھوٹی لڑکیاں تالی بجانے لگیں۔ فریڈا بولی۔

"بس اب جب موقع آیا ہیں آپ کی جان بچائی ہوگی میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی ٹھنڈی پانی سی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی؟"

چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خربوزے پر، نارنگیوں پر، چمچے سے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی سرخ سفید رنگت پھر عود کر آئی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بشاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایشرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں نہ ہٹا سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشرسٹ کھڑکی کے قریب جو نشست تھی اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ پھر میگن کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو بچوں کے خون سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں تیز تیز، قدرے خشک اور محجوب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سٹیلا کے انداز میں ایک شگفتہ دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محجوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ ہیلی ڈے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔

"میں تو آپ کو فرینک بلایا کروں گی۔"

اور فریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔"

ایشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشرسٹ کہہ کر بلائے گی اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر ایشرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے۔"

ایشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم۔"

ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"دیکھو لڑکو سٹیلا کو مت چھیڑو ورنہ میں تم دونوں کو باندھ دوں گا۔"

ریڈ الہی۔ "تم بہت وحشی ہو!"

اور سٹیلا نے محتاط بن کر کہا۔ "تم جو سے سٹیلا بلاتے ہو۔"

"تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔"

الیشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیئے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ سمجھا تھا کہ کس نام سے پکارے گی! لیکن اس نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا تو الیشرسٹ نے عموماً کہا۔

"گڈ نائٹ سٹیلا!"

"گڈ نائٹ مسٹر گڈ نائٹ زبک! آج تم نے بہت ہی بہادری دکھائی۔"

"اس کا ذکر مت کرو۔"

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لحہ بھر کو اس نے الیشرسٹ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور پھر یکلخت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

الیشرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں کے نیچے کھڑا اسگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ اس کے ساتھ رہے۔ اور یہ سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ ـــــ اس نے اپنی گرہ دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیرباد کہنے والا تھا! لیکن پھر سوچا میرا ارادہ اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گزرا ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔

"تم ہو! الیشرسٹ! اندر آجاؤ۔"

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ مونہہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

الیشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکلخت بول اٹھا۔ "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو گذشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے لیکن میرے حافظے میں ابھی کا بیشتر حصہ جوں کا توں محفوظ تھا۔ میں موت سے ابھی بہت دور تھا۔"

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟"

بجھنے سے پہلے ذرا بھڑکے۔ ہاں اور پھر بجھے گا۔

"عجیب بات ہے مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ ——— قریباً ——— اب یہ نہیں کہ بتاؤں تم سمجھ رہے ہو میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہرحال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تک گہرے سمندر میں تو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ نیچے کرنا نہ اٹھانا، پینے کو نہ ملتا۔ کبھی بھی نہ ملتا۔ الشرسٹ صاحب ہم مرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟"

الشرسٹ بولا۔

"ہم بوڑھوں شمعوں کی طرح بجھ جاتے ہیں۔"

"واللہ!"

"شاید بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹماتے ہوں۔"

"یہ تو بہت غم انگیز خیال ہے۔ بہرحال ——— میری بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں۔"

"بہت اچھی طرح۔"

بیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے ایک دوسرے پر رکھ لئے۔ اور کھڑکی کی طرف سر کر کے بولا۔

"بیچاری بڑی بہنیں۔"

بیلی ڈے بستر پر دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ الشرسٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر زندہ نہ ہوتا تو سمندر کی تہہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔ اور یہ بشاشت ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی۔ شاید لیٹا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دفن ہو گیا ہوتا اور حشر کے لئے دونوں دن کا ہم منتظر رہتا۔ دفعتاً الشرسٹ کی مسکراہٹ عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے۔ یہی سب کچھ ہے۔ اٹھ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا۔

میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہئے۔ شمع بجھا دوں؟"

بیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ موت بہت بڑی چیز ہے گڈ نائٹ الشرسٹ۔"

الشرسٹ کا دل بھر آیا۔ بیلی ڈے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آگیا۔ اس کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکانوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا۔ وہاں جا بیٹھا۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لائلک کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پراسرار دکھائی دیتی تھی جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے۔ اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ الشرسٹ نے اپنا رخسار لائلک کی ٹہنی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں تو میگی کے تکئے کے نیچے کے سینے سے چمٹ سامنے کھڑی دکھائی دی۔ مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے ایک دفعہ ——— قریباً ——— میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ یکلخت سر کو لائلک کی شاخ سے ہٹا لیا۔ اور گھاس پر ٹہلنے لگا۔ دونوں سروں پر دو لیمپ روشن تھے۔ ان کی روشنی میں شعلہ لو ہو کر پھر زندہ ہو گیا۔ الشرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی سیدھی کے نیچے کھڑا تھا۔ زندگی بلتی کھیلتی جا رہی تھی چاندنی کی نیلاہٹ تالاب کے پانی پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ۔ اس پر معصومیت اور عشق نیازمندی کی جھلک۔ وہ آگ

نگاہ بیضا اسے بوسے اس کو زبان کا وہ حسن ، دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آگیا۔ فلک کے سامنے میں کھڑا ہوگیا۔ یہاں وہ وقت ندی کی آواز نہ تھی یہاں سمندر کا شور تھا وہ سمندر سر اٹھا رہا تھا۔ اور آہیں بھر رہا تھا کوئی نغمہ پیدہ۔ کوئی گیت کوئی نالہ بولتا نالتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور فلک کی جگہ معمور تھی۔ کسی اونچی منزل میں ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ دل میں عجیب و غریب حساسات نے شورش بپا کر دی جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ بلایا جا رہا ہو۔ جیسے بیمار اور وحشی پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ راستہ ڈھونڈ رہے ہوں انھیں راستہ مل رہا ہو۔ یہ لڑکی جس نے زنگ لگ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً کھینچ لیا تھا یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے سرکش اور خود سر عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف منہ موڑے گم تم بت کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت آلتی پالتی مارا بیٹھ گیا۔ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور ـــ شاید ـــ پھر اسے پھینک دے ؟ میری لڑکی بھی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو ؟ دونوں ہتھیلیاں دائیں بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی آ گئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا " میں کیا کروں ؟ " شاید میگن پاس کھڑی ستاروں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے بیچاری میگن ! پھر خیال آیا " کیا یہ سچ ہے ؟ میں چاہتا ہوں ! لیکن ـــ لیکن۔ کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے ؟ یا صرف اس کو اس لئے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور محبت کرتی ہے ! میں کیا کروں ؟ " پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کانپ رہا تھا۔ آخر اٹھا۔ اعضا جیسے جڑ گئے تھے۔ اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کوئی کرخت آواز میں پکارا

" اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے "

ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ـــ ہاں ہاں یاد آگیا !

باقی لوگ مربہ کھا رہے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ سبینا اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی۔

" ذرا جلدی کیجئے ساڑھے نو بجے یہاں سے چلنا ہے "

" ایشرسٹ ہم بیری ہیڈ کوارٹر جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی چلنا ہوگا "

ایشرسٹ نے سوچا " میں ان کے ساتھ جاؤں نا ممکن ! مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے "۔ اس نے سٹیلا کو دیکھا سٹیلا نے بعجلت کہا

" ضرور چلئے "

سبینا بولی۔

"آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟"

زینا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"آپ چلے نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی۔"

الیشرسٹ نے سوچا۔ "ایک دن وہ سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا۔ ایک دن اور!" اور پھر بولا۔

"اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میری ایال کھینچنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہُرّا!"

اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک تار اور بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انھیں کیا بتائے کہ کیوں نہیں آ سکتا۔ پھر سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ الیشرسٹ سبینا اور زینا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے جا لگتے تھے۔ باتیں ہیں۔ آپ جینگو کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا یہ تھا کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کر دوں گا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگے پھرے (نہانے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے۔ اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں الیشرسٹ کے کندھے سے سر رکھ کر سو گئیں۔ الیشرسٹ کے گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ سٹیلا نے الیشرسٹ کو اور الیشرسٹ نے سٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ یکلخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"فل کہتا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بری بات ہے زینگ!"

الیشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"

لڑکی نے جلدی سے کہا

"میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا؟"

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے الیشرسٹ نے جواب دیا۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے آئے۔"

"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟"

یہ کہا اور نظر بھر کر الیشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

الیشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن برتری کی خواہش غالب آ گئی۔ بولا۔

"جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک وہ اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزو مند رہتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

جو ہے مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟"

ایشرسٹ نے سوچا "یہ ضرور اسے صدمہ ہوگا۔" بولا۔

"یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بہت دلکش ہے۔ اصولی لحاظ سے وہ ہمیشہ سچے رہیں گے۔"

"لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جز نہیں سمجھتے؟"

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایشرسٹ کو یکلخت میگن کی دعا یاد آئی۔ "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی!" اور کون ایسا ہوگا جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لئے دعا مانگے اس لڑکی کی طرح جو اس وقت خود منتظر ہوگی اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ دل نے کہا۔ "تم کس قدر ذلیل ہو!"

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی (اکثر یہی ہوتا ہے) حتیٰ کہ ذلیل بننا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور نہ تعجب کی بات ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا۔ ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے اور جب بچوں کے سونے کا وقت آ پہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی۔ ایشرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (سنہرے بال ہلکے رنگ کے الٹے اور پیچھے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی!)

سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی، لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش مورت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے اردگرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھلملاتا تھا گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا کس کی جرأت ہے کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گذر بھی ہونے دے۔ وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام "وارم" تھا! اس کے بعد بلی ڈے نے اپنی بانسری نکالی۔ اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انھوں نے ایشرسٹ کا گانا سنا۔ اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی "ایخ گرول نخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤن پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی اور بقول سٹیلا کے "بڑا مزہ آیا!"

اس رات ایشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر ربط پیدا ہو گیا تھا ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر اس قدر احاطہ کر لیا تھا کہ فارم اور میگن ـــــ خود میگن! خواب و خیال ہو گئی کیا سچ مچ اس سے اظہار عشق کیا تھا کیا سچ مچ

[illegible] جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ جیسی جیسی وہ مسرور ہو گیا تھا، اس پر جادو چل گیا۔ بہلا کا۔ بات کا عجب [illegible] کا! اس کو۔ اس کمسن بچہ کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ بہی داشتہ بنا لے اس خیال کے آتے ہی ایلبرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا۔ "میں نے بُت بنا لیا میں نے بہت برا کیا؛" طوفان کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی اسے تصور میں سٹیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ موری بھلے رنگ کے بال۔ چہرہ گردن اور گرد فرشتوں کا سا ہالہ۔ اس نے سوچا میرے حواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا! بدنصیب سیگن: "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایلبرسٹ پر بھی! میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں؛" اور اس نے چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت!

جوان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بے چینی مٹ جاتی ہے۔ ایلبرسٹ کی آنکھ لگ گئی جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ "آخر کیا ہوا ــ چند لمحے ــ مہینے بھر میں بھول جائیں گے۔"

اگلے دن صبح کے وقت اس نے چک کے روپے وصول کئے لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا اس فاختئی رنگ کے لباس کے بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خرید لیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دو دن سے دل میں امنگیں امڈ رہی تھیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سٹیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی۔

"فرینک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

فیروکی "سوانح یسوع"۔ ایلبرسٹ مسکرا دیا۔ سٹیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اس پر کچھ ہنسی آئی کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوتی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ بولے۔ شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور بلی کے بچے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ ایلبرسٹ سٹیلا سے مخاطب ہوا۔

"مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ پھل ملے گا۔ گویا انعام کے لئے ہیں نیکی سمجھ سکتا ہے یہ رجا در حقیقت بیم سے پیدا ہوتا ہے۔"

وہ موڑ پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ دوڑائی۔

"نہیں۔ اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے۔"

ایلبرسٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے اور اس کی تہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

سٹیلا نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔

"میں نہیں سمجھی۔"

الیشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

"ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔"

"تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں"؟

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! الیشرسٹ نے شانوں میں سر چھپا اور بولا۔

"اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو"۔

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اسے راحت ملی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا اس کے درخشاں، پرسکون، خواہرانہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا جیسے اس جلوس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ اگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر ٹوٹنس جانا چاہتے ہیں۔ اور بیری پومرائے کا سل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا اس نے اسے مضبوط کیا اور گھوڑوں کی طرف بیٹھ کر کے ہیلی ڈے کے ساتھ لینڈو میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے کنارے ساتھ چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ الیشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔ میگن ـــــ خود میگن! ـــــ پیدل پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر الیشرسٹ نے یکلخت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ نہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے۔ یا واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آ گئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی گاڑی کے پہیے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چیخیں مار مار کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن کی طرف مڑی تو الیشرسٹ صدر ہو گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔ "میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔ اور تمہیں کاسل میں آ ملوں گا۔" یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ سے اسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ الیشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا! کیا فرق پڑ گیا! اس سے جو ملاقات ہو گی اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ میگن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیف پہنچے گا۔ پچھتانے لگا اور پھر اکتا جائے گا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لئے کہ وہ

سادہ لوح ہے۔ معمولی ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جذب ہو کر خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی، ہجوم میں نظر آ رہی تھی جس سے میگن کی مسلسل حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر کھڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی۔ کیا کیمبرج کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لطف نصیب ہوا ہوگا! جا راؤ کرتا تھا دل ہی دل میں اسی پر لعنت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا مدد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جیسے مسٹر ایک راہ گیر طرز مرد کر اس کا منہ تکنے لگی۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی اس کے ساتھ سہارا لیے کھڑی ہو گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکی۔ ایشرسٹ نے سوچا اس بے چاری نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر میں اس کی زندگی کے چیتھڑے اڑا دوں؟ یکلخت تصور میں سٹیلا کی پر سکون آنکھوں نے آنکھیں لیں۔ اس کے ملائم بال ہیں سے اس کے ساتھ ہاتھ لگانے سے یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف پلٹا۔ وہ ٹوپی سب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ دھبہ سیر بینوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی سینے میں خلا محسوس ہوا جیسا [illegible] کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ اسٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے آس پاس بے پروا بچے بیلچوں اور بالٹیوں سے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگرداں لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا لیکن یہ رحم بھی کم و بیش خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے عنان جذبہ باقی رہ گیا تھا تو قیر نسواں کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں، اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لیے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے۔ اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لیے یوں مضطرب تھا جیسے کوئی جنگل کا دیہاتی کسی پہاڑی ندی کے لیے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پر کیف شور، سبز گھاس کے پھولوں کی دمک۔ وہ پرانی تاریکی چٹانیں۔ ککو اور سیٹل کی کوک۔ الوؤں کا بولنا۔ سرخ چاند کا مخملی تاریکی میں سے شگوفوں کی زرد سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرے کا نظر آنا اور ہاتھ وہاں تک پہنچ کر رہ جاتا تھا) اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دو دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملاپ۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو مسحور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ اور جس نے اسے مفلوج بنا کر گرم گرم ریت پر لٹا رکھا ہے؟ تین ملائم بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے لیکن

جذبہ تک باقی ہو اس کے ہاتھ کو کھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے میں کا نام پکار کر کہتی ہے " تو آپ نیکی کے قائل ہو گئے ہیں؟" یہ کچھ عرصہ اس کے علاوہ ایک عجیب فضا جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا جس میں سرخ گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلاور اور گلاب کے پھول اور لونڈر اور لائلک کی خوشبو ہو، خنک اور دلفریب۔ انسانی لمس سے غیر ملوث مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا نچوڑ جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا۔ یکلخت اسے خیال آیا۔ " ممکن ہے وہ ابھری ہوئی آنکھیں اور بچے دیکھ پائے؟" اٹھ کھڑا ہوا۔ ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا۔ سمندر کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں میں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی روستائی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا، قطعاً ناممکن ہے۔ اسے کسی بڑے شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی حقیقی مناظر کا ایک جزو ہے۔ اسے شہر میں لا کر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دنوں ہی میں غائب بھی ہو جائے گا۔ شہر میں اس کی سادگی اور اس کا گنوار پن اس قدر نمایاں ہوگا کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا ان خیالات میں محو تھا اور یہ سب باتیں اس پر روشن ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میگن کا بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے سرکا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے۔ میگن کا چہرہ اوپر تک رہا ہے۔ اس کی گول گول نظروں میں ایک التجا ہے۔ اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں چٹکی کاٹ دی۔ ہر چند اسے دل سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے دق کرتا رہا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخار اتر جائے۔ کپڑے اتار دیئے اور تیر کر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سن ہو جائیں۔ اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعۃً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا کہ شاید وہ واپس ساحل تک نہ جا سکے اور سمندر کی ندا اسے ہڑپ کر لے۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھ گئے تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائے گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا۔ فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے۔ فل ہیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آئے۔ " کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید ——— بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے!" مجنونانہ خوف کے اس لمحہ میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا جسم خنک اور تر و تازہ ہو گیا تھا۔

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا اور چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا جو اب اتر چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی۔ چائے۔ توس اور چیزیں لگا ہوا مربہ۔ غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تمباکو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی

تھی۔ خالی کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا۔ پھر سیلا کے سینے پر رہنے کی ڈوری اٹھالی۔ تاگے کی گلابی اور خوش رنگ۔ ریشم کی ایک گچھی کو مس کرتا رہا۔ ڈوری میں ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھا۔ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُر بجاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ بجائے گی۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جو کتاب سیلا نے اس کے پاس لاکر رکھی تھی وہ میز پر کھلی تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میگن کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باغیچے میں جو تیتریاں اُڑ رہی تھیں ان کو دیکھتا رہا۔ اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا جو درختوں کے پیچھے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا۔ ایک خادمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہواؤں کا لطف اٹھاتا رہا۔ اس کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایتھلبرٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کرکے ڈرتا تھا۔ لیکن ان کی پُرسکون معصومیت اور سیلا کی دید سے مسرت اندوز ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سیلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ کھوئی سی جیسے کوئی بھولی ہوئی ہو۔ پھر ایتھلبرٹ پر نظر پڑی۔ مسکرا دی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایتھلبرٹ کو مسرت بھی ہوئی اور گھبرا بھی گیا۔

"فرینک تم نہ گئے نا؟"

"ہاں آنا ہی نہ ہو سکا۔"

"دیکھو ہم کیسے جنگلی کے پھول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔" سیلا نے پھول آگے بڑھا دیئے۔ ایتھلبرٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یکلخت مر بھی گئیں۔ میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ دیر تک رہی تھی۔ راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "بہت خوبصورت ہیں" اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچیاں سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر پر جا گرا اور دونوں بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ پھینک چکنے کے بعد۔ میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انہیں یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا دلفریب محبوب حسن اسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو مذموم ثابت کرکے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بے چاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہو گی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہو گی کہ ایتھلبرٹ پہلے سے پہنچ گیا ہو گا۔ تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر ایتھلبرٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چپ چپ تھا۔ اس کی

ھالی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت یہ کئی بار ایلشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پرلے درجہ کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایلشرسٹ تھا اس لئے بس یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا ساحل سمندر کی تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ خود احمق سمجھتا ہے کہ سٹیلا کو بہت ہی جلد دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا! نیک رہا! سٹیلا کو اس کا علم ہو! وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ مجھے شیطان کو نیچا دکھایا۔ یہ خیال آیا تو نیکی کرنے کی لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کو لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا۔

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی۔ پیچھے سے اس کے پیچھے جا کر ادا قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ موقلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی تھی۔ بڑے ملائم لہجے میں بولا

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حسب عادت جلد جلد بولی

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہو گی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے نا؟"

ایلشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں ــــ تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سریع اور درخشاں تبسم کے چمکتے دانت پھر دکھائی دیئے۔

تین دن کے بعد ایلشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی . . . .

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب ایلشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے دن گورز بچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لنچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہو گا جہاں میگی اسے آسمان کے بلند تاریک کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس

بلکہ اور بھی بہت سے مرغزار کو پھر جا کر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

چنانچہ وہ چڑھائی کے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان، اسے اچھی طرح یاد تھی۔ فارم کے دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ وہ پتھر کی بنی عمارت۔ بوڑھے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل پھولوں کے گولے سے تھے وہ ہلکے سبز رنگ کی پھولی ہوئی بیل وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لی تھی پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سور بھی ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ کیا سچ مچ چھبیس سال گزر چکے ہیں یا محض کسی خواب سے بیدار ہو رہا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آ گیا پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اس جگہ تک جا پہنچا جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا، ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے۔ جب میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ ایک دفعہ کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا۔ اور اس کی خوشبو نے جو جس سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ ایک ککڑی کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا۔ وہاں کے پاس وہی پتھر جہاں بیٹھے تھے جیسی ہیئت آن کر بیٹھا ہے۔ گم کردہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیرینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر موت حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جانے ہی نہ دے۔ جس طرح یہ زمین یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پہنچ کر اس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا شباب اور بیلو کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے پھر یکلخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موڑ کے پاس ایک گوری بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے ایک گھڑ سوار سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟" بولا۔ "یہ ایک قبر ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں؟"
بڈھا مسکرا دیا۔ "یہی داستان ہے جو میں سے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے۔ ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "پائپ بھرو۔" بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جھریوں اور بالوں میں سے اوپر کو تک رہی تھیں ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دکھ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا جھمیلا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گزرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اور بات تھی۔ اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بے چاری نے خودکشی کر لی تھی۔"

ایشرسٹ نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ جبھی تو چوراہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا اب یہ دستور نہیں رہا۔"

"مگر یہ تو بڑے عرصے کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کا پادری بڑا خدا ترس شخص تھا۔ اگلے مکیلمس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے۔ اور جب یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسز نیرکومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا اب وہ فارم نک نیرکومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کر لیتا ہوں۔"

ایشرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ دیاسلائی بجھ گئی۔ لیکن ایشرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا "اچھا!" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گزرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی گو انھوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا۔ جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڈھا ذرا دیر ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا لاغر ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیو بل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے کہا۔ "بعض یوں کہتے ہیں کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا۔"

قبر پر ہاتھ پھیرا۔ "مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔" اس نے نظر اوپر اٹھائی اور ایشرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی داڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھڑک رہے تھے کہا۔

"اچھا؟"

یہ موسم بہار کا واقعہ ہے۔ بس یہی موسم تھا جیسے اب ہے۔ یا ذرا چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ مدرسے میں ایک لڑکا تھا۔ البیلا سا تھا۔ اپنے ذرا کھنچ کر رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے اس نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔"

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوکا۔ پھر بولا۔

"بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکا اچانک یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک یہیں ہیں۔ ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے اپنی چیزیں منگوا کیوں نہیں۔ ایشر یا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔"

ایشر سٹ نے پھر کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے اس لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ نہ جانے کیا ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ مدرسے میں ایک دوسرا لڑکا تھا۔ جو تھی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت پھر وہ لڑکی باغیچے میں بیٹھے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا تھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشر سٹ نے کہا۔ "اچھا؟"

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی ممیری کو سب دو تین لڑکے آتی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ ہے اور ضرور ہے کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا اچھا تم ملتی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا۔ پگلوں کی سی باتیں منہ سے نہیں میں پگلوں کی سی باتیں نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا لڑکیوں کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی اس بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ لیکن دو دن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لے کر آ رہا تھا کہ میں نے سیب کے درخت کے پاس کالی سی ایک چیز پڑی دیکھی۔ میں سمجھا سؤر ہے۔ پھر خیال آیا یہ بھی کوئی سؤر کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کیا ہے؟"

بڈھا رک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظروں میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔

"ندی کنارے ایک چٹان ہے۔ اس میں رک کر پانی کا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے شگاف

میں سنہری پھولوں کا ایک پودا اگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خوبصورت تھا۔ جب ناکرٹے سے دیکھا تو وہ پودا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھو تو اس کے چہرے سے کچھ یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار و قطار رو دیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ جون کا مہینہ تھا لیکن اسے سیب کے شگوفے کی ایک ادھ کھلی کہیں سے مل گئی تھی۔ اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسے شادی مرگ ہوئی تھی۔ ورنہ اس نالے سے کیوں مرتی۔ اور پھر پانی بھی تو فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ میں آپ سے کیسے کہہ دوں کہ یہ جنگل بھدی کا ہے۔ پہلے بھی معلوم ہے اسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے کہ بھاری نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سنکر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہوگی چنانچہ انھوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔"

بڈھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر رک رک کر بولا۔

"لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

داد دینے کے لئے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ٹورسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں لنچ چن رکھا تھا اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا؟ یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام؟ اس کی پرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اور اس نے دل سے پوچھا۔

"میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟" لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز گل ریز مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونوں کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا؟ تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور "ہپالیٹس" کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔
وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آب جو میں
شباب اور خودسری سے مست ہے
ہر وہ شے جو سینۂ زمین سے پھوٹتی ہے
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے۔

الغرض سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر اسے سائپرین۔ اسے سائپرین تو حکومت کرتی ہے
صرف تو۔
یہاں یہ سچ کہتا ہے۔ میگن حسرت زدہ سی۔ پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی، میگن پرانے سیب کے درخت کے نیچے راہ تکتی ہوئی، بے جان۔ مردہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے:
ایک آواز کانوں میں پڑی۔
"وہاں ہم تم۔ آؤ دیکھو!"
ایشرسٹ اٹھا بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی۔ اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
"فرینک اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟"
"ہاں"
"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ہے نا؟"
ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کمی؟ سیب کا درخت موسیقی اور سنہری پھول!"

ترجمہ: پطرس

(کاروان)

نوعِ انسان کی کہانی

دنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندہ ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ ظہور انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جاندار اشیاء کا وجود کتنے عرصہ سے ممکن ہے، اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان یا انسان کے طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصہ سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی سی تہہ نمودار ہوئی۔ ان بنجر چٹانوں پر موسلا دھار مینہ برسا سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے۔ اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی

چھاتیوں کے درمیان ہڈی جوڑ نہیں

آخر ایک ایسا زمانہ آیا جب سورج نے بادلوں میں سے جھانکا اور زمین کی سطح پر پانی کے چھوٹے تالاب سے بن گئے۔ یہی تالاب بعد میں مشرقی اور مغربی نصف کرّوں کے عظیم الشان سمندر بن گئے۔

پھر ایک حیرت انگیز معجزہ ظہور میں آیا۔ جس میں جان نہ تھی اس نے جاندار چیز کو جنم دیا۔

پہلا جاندار زندہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا۔

کئی سال تک یہ زندہ جاندار پانی کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے لڑتے لڑتے اس نے ترقی کی اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پایا۔ بعض تو ایسے ہی رہے جیسے کہ پہلے تھے۔ وہ جو پانی کے تالاب اور گڑھوں ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت سی مٹی اور کیچڑ بھرے پانی کی چٹانوں سے ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اس میں جڑیں پکڑ لیں اور پودے بن گئے۔ بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا پسند نہ کیا۔ یہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان کے جسم میں سے مچھلیوں کی سی ہڈیوں کی طرح جوڑ اور ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ اور وہ سمندر کی تہہ میں پودوں اور ان کی شاخوں کے درمیان جو بھی مچھلیاں تھیں ان سے مشابہ ہوتے گئے۔ بعض مچھلیاں ایسی تھیں جیسے کہ ان کو خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر تیرنا پڑتا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ گوناگوں مچھلیوں سے آباد ہو گیا۔

اسی عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں سمندر نے نئی نئی جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ بعض ذرا ہٹ کر دلدلوں اور پہاڑوں کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کر لی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھاٹے کی وجہ سے نمکین سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتے لیکن باقی تمام وقت زمین پر پڑے سوکھتے اور تیز ہوائیں جو زمین کی سطح کو لپیٹ میں لیتی تھیں۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہو سکے کہ جس طرح پہلے پانی میں رہتے تھے۔ اسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں رہنے لگے۔ جب موسم نے توجہ دلائی، درخت سے اور خوبصورت پھول پیدا کرنا سیکھا۔ جب پھول آئے تو بھونرے آ کر رس چوسنے لگے۔ پھر سے نئے رنگ بیج اڑا کر لے گئے۔ یہاں تک کہ سبز گھاس اور سبزے نے اپنی چادر پھیلا دی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دیے۔

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو ڈاکا بلی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ ڈاکا بلی جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو رہے۔ بعض نے رینگنا سیکھا اور سنسان جنگلوں میں کیڑے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے جانوروں سے آباد ہو گئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں اکتیا سورس (ICHTHYOSAURUS) میگا سورس (MEGALOSAURUS) اور برانٹو سورس (BRONTOSAURUS) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور ہاتھیوں سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے۔ درخت ان دنوں سو فٹ سے زیادہ اونچے تھے۔ چلنا پھرنا موقوف ہو گیا اور ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھرتی سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلی

کے بالوں اور مسخ کی پنجوں کی انگلیوں کے درمیان اس ہاتھ سے اس ہاتھ تک پتنگ کی طرح پھیلا ہوا پھر اس جھلی پر پڑ گئے ۔ ہم سے ملتے جلتے کام لینا ڈالا ۔ اڑ سکتے اور چمگادڑ بنتے بن گئے ۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔ بڑے عظیم الجثہ رینگنے والے جانور سب کے سب مر گئے ۔ اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا شاید آب و ہوا یک لخت تبدیل ہو گئی ۔ یا شاید بھوک سے مر گئے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ پیٹ بھرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ بیٹھنے کے ۔ اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے رکھے رہے ہوں لیکن وہاں تک پہنچ نہ سکتے ہوں بہرحال بڑے بڑے رینگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے ۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لی ۔ یہ اولاد تو انہی رینگنے والے جانوروں کی تھی لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں ۔ مچھلیوں کے سے پر ان کے جھڑ چکے تھے ۔ پرندوں کے سے پر اُگنے بند ہو گئے ۔ ان کی بجائے بال اُگ آئے ۔ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل ہو گئی ۔ جیسے بچے پیدا ہوتے تو مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے اٹھائے پھرتی ۔ باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جاتے ان کی حفاظت کرتے ۔ اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ۔ کسی بلی کو دیکھو کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے ۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں ۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے اردگرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں ۔ بانہ میں اور گھر پرند تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جو اتنے عام نہیں انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو ۔

ان بے شمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے آگے بڑھنے کے لئے ایک رستہ نکالا ۔ عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کشمکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی ۔ یہ جانور "انسان" کہلایا ۔

تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک مہیا کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار ۔ تھا پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی ۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی ۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں ۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ از سر نو سیکھنا پڑتا ہے)

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندر ، گوریلا ، بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا ۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا ۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا ۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا ۔ کئی لاکھ سال بعد انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا ۔

تمہیں یقین تو مشکل سے آئے گا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں لیکن حقیقت یہی ہے ۔



وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے کہ جس طرح قدیم عہد کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے کلیسا اور خانقاہوں کا دامن پکڑتے تھے اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے

طنز اور رحم سے بڑھ کر اور کوئی چیز ہماری مشکل کشا نہیں ہو سکتی۔ طنز سے زندگی کے ہر پہلو پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا۔ وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو ان سے نفرت مت کرو۔ کیونکہ یہ کمزوری کی نشانی ہے:

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں خدا حافظ

ماخوذ از کتاب "نوعِ انسان کی کہانی" مصنفہ ہنڈرک وان لون

مترجم پطرس

بچے کا پہلا سال

پہلے زمانہ میں یہ خیال تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ جب تک بچہ کچھ نہ کچھ بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا۔ اور فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ خود بخود بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ رخصت ہو جاتے اور جو زندہ رہتے۔ ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت ابھی حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی ممتا اور بچے کے لاڈ پیار کا جو دلآویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اندھا دھند محبت اور لاڈ پیار اور چیزیں ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو دوسروں کی مانند اپنے بچوں کو بھی تیمم چٹانے کے موقعے ڈھونڈتے رہتے ہیں اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے۔ علاوہ بر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں عارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پر بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موضوع پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے۔ اور بعض بچے تو مر ہی اسی لئے جاتے ہیں کہ تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش جو فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور

کہ جو مشکل کا باعث ہے جب تک کہ اس عمل میں مصروف رہے بہت خوش رہتا ہے۔ اپنا تمام وقت وہ ایک تجربہ کے عالم میں گزارتا ہے جس سے نئی نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ دن احساسات کا بیشتر حصہ نیند میں گزر جاتا ہے۔ پندرہ دن کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے۔ دو تین باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے سوا ان باتوں کا منتظر رہتا ہے جن پر کہ اب وہ جن چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہو جائے ان میں گرفتہ رہتا ہے کیا عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کچھ بچے ایسا کرتے ہیں کہ عمر بھر ایسا نہیں رہتا ہر نئی چیز سے ناپسند ہوتی ہے اگرچہ اس عمر میں سیکھنے کے قابل ہوتا ہے بڑوں کی طرح اپنی پسند کی کا اظہار الفاظ میں نہ کر سکے اس عمر میں سب سے زیادہ نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ عام طور پر شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بعد میں وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اطوال یا اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے عادات پسندیدہ ہوں اور جو اپنے گردوپیش سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو سکے۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تنومند تو ہو لیکن اس کے اخلاق برے ہوں۔ یا نیک سیرت تو ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ ماں جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہیے اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور روتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رونی صورت بنا کر لوگوں سے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چمکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں لوگوں کا یہ سلوک اسے ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبے سے معرا سمجھتا ہے۔ اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اسے جا بجا ملامات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لوگوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو ضدی اور حریص ہو جاتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی مفروضہ بے توجہی سے گلہ مند رہتا ہے اس لئے اخلاقی تعلیم روز اول ہی سے شروع کر دینی چاہیے۔ تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں انہیں مجروح ہونا پڑے اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غصے اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے۔ کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چوچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی برتی جائے تاکہ جو باتیں صحت کے لئے ضروری ہیں ان میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہیے۔ تاکہ کہیں سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہیے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کرنا فضول بلکہ مضر ہے جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہیے اور

ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہئے۔ بچوں کی پرورش چاہے ماں کی ہو یا کسی اور کی انہیں ملاقات اور سیر کرانی چاہئے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادت کے رستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ مثلاً یہ کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں سخت مایوسی کا سامنا ہوگا اور یوں دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو غفلت اور لاڈ کے بین بین رہنا پڑتا ہے بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ محبت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔ ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور جب بڑے ہو کر لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد اور آؤ بھگت نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں۔ اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا ان کے اعضا کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ان کے سامنے گانے گاتے پھرتے تھے۔ اور انہیں چومنے چاٹنے کا تختہ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ نہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہئے۔ خدمت کرنے کا پتا اسے نہ چلنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے۔ اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہئے، بازوؤں میں تھام کر "سو جا سو جا" نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہئے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصے میں بچہ کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اوڑھا لپٹا کر بستر میں سلا دینا چاہئے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہئے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بخود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی۔ دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ اپنے ساتھ کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی حرکات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیاء کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیاء کو پہچانے اور اشیاء کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء بار بار تجربے میں آئیں۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس، ماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا انا کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ

وہ اشیاء کی شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اکٹھا ہونے سے بچے کے ذہن میں عادات واضح ہو جاتی ہیں تو حس اور ادراک تیز ہو جاتی ہیں تو ذہن میں اشیاء کے تصورات مستقل طور پر بننے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات بچے کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا کرنے لگتے ہیں۔ (وہ دودھ کی بوتل دیکھ کر چھاتی یا بوتل سے مس کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور جب ماں آتی ہے تو اس کی شکل دیکھ کر وہ تشفی محسوس کرتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک شناسا اور ناشناسا اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جس بچے کو بھی بوتل کا دودھ ملتا ہو وہ ہر چیز کو منہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس عمر کے دوران میں جو محض جسمانی ہوتا ہے بچے کی تمام مسرتیں (جو زیادہ تر گرماہٹ اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں) اور اس کے تمام دکھ محض جسمانی ہوتے ہیں۔ اس عمل اور اس کی عادات یوں تشکیل پذیر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک مدت تک ایک اضطراری حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک حد تک ایک ارادی عمل ہے جو کچھ مسرت حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس کو اٹھا لیا جائے (پیار کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گا کہ رونے کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بچے کی یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرنے کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی عادت بن جاتی ہے لیکن بے اعتنائی کے سبب تک رونے کا نتیجہ باوجود ویسا نہیں رہتا پیار دکھانے کے وقت روتا ہے۔ ہوشیار ماں اس قسم کے رونے اور اس قسم کے رونے میں کوئی تمیز کر سکتی ہے عقلمندی یہی ہے کہ جب بچہ رونا دکھاتا ہو تو اس پر خاص توجہ نہ دی جائے بچے کو اٹھانے کے بجائے اس سے پیچھے رہنا یا اس کے سامنے گیند کا آسان کھیل سے اور تکلف بھی۔ لیکن بہت زیادہ بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ تیسرا ماہ بچے کا بیشتر وقت (سوائے دودھ پینے کے اوقات کے) نیند میں گزرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہئے۔ لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کرے ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہئے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے اور اپنے اعصاب کو کام میں لا سکے۔ پرانے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے ان کی نگہداشت زیادہ کرنا پڑتی ہے حیرت ہے کہ ان لوگوں کی ممتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آ سکی تھی۔ جب بچے کی نظر تیز ہو جاتی ہے تو وہ متحرک چیزوں کو خصوصاً جو جھولتی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیا کو پکڑنا سیکھے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھ لے۔ تو یہ دائرہ یک لخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اسی میں مشغول رہتا ہے۔ کھینچنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ کھینچنے کے زمانے سے قدرے پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں بچہ یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں، بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اس سے دل بہلاوے کا بہتر سامان مہیا ہو جاتا ہے بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے جو تعلیم کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں۔ البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سوئی سے لگنے سے اسے بچانا ضروری ہے۔

چاہتی ہیں۔ بچپنے کے عرصے میں بچہ زود حس رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ تربیت قبول کرتا ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اتنی ذکی ہوتی ہے جب وہ عرصے میں چلا جاتا ہے جو جاگ رہا ہو آوارگی دکھائے جیسی سے مزور رہتی ہے۔ انسان کی خوشی اعضاء اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے کی عمر کے بچے کا اس کی چیز کا اول تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ والدین کے بچے کو جیسا بھی زندگی سے مختلف ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں غذائی ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں کا دائرہ بہت تنگ رہتا ہے۔ بچہ اسی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتا جاتا ہے اس کو لئے رہنے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے ذہنی ارتقا کی علامت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہوتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ اور نہ صرف جانوروں کی مانند بلکہ دوسری طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور بجا کر بجایا اور فخریہ مسکرا کر سب کی طرف باری باری دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ جو تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو از حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہئے بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخدلی سے کرنی چاہئے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے محض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ محدود طور پر ہم اسے سکھاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ باقاعدہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی متعین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کم کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں۔ ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہئے کہ ایک دفعہ بچے کو کر کے دکھا دیں۔ مثلاً اس کے سامنے ایک دفعہ جھنجھنا بجا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ محض شوق پیدا کرنے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے۔ اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں۔ نیند، خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہئے۔ گردوپیش کے حالات و واقعات کا انس ہونا ذہنی نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک ہی بات باقاعدگی سے پیش آتی رہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں

بچہ اس سے بھی بچتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات بالغ لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے اور کوئی کی بات یکلخت اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا بڑی عمر ہوتی ہے تو بچے کو نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچہ کو خطرہ محسوس ہوتا ہے جس سے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہیے

اگر بچہ بیمار ہو اور آپ متفکر ہوں تو اپنا فکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جس کی بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو اگر بچے کو ٹھیک نیند نہ آئے یا اس کا پیٹ خراب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیے کہ اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی توجہ اور ترغیب کا خواہش مند ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف بچے کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہیے۔ بچہ جتنا بڑا ہو تو اس اصول پر پیش از پیش کار بند ہونا چاہیے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا چلنا وغیرہ اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متمنی رہتا ہے علاوہ ازیں ایسی باتیں خود کو بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں

یہ کبھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے۔ بچے سیکھنے کے قواعد کے دوران میں اور اس کا علم ہو۔ لیکن جہاں یہ کوتاہیاں اس کے رستے میں حائل نہ ہوں وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر پالو کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لئے محبت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے

ماخوذ از کتاب "تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں"

مصنف برٹرنڈرسل ۔ مترجم پیرزادہ

دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تھے کہ جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی، ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گیا۔ اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں جہاں بڈھے میاں مسکرا کر بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا۔ "نہ کسی کے کانوں میں مرکیاں دیکھیں۔ نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے، نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں، یہ کیا؟ اس بچے کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ کیسے افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور یہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے، نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں، نہ کپڑے میلے ہیں۔ سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لیے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا: "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا: "سلام اے لڑکو! ہاں میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر عزیزو میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا: "واہ وا۔ لو اب سقراط میاں ہمیں ایک کہانی سنائیں گے۔"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا: "کہئے آپ کا کون سا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول دیکھ رہا ہوں۔ جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم جلدی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی اس

کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کچھ کاغذ تھے۔ سب نے دیکھا کہ سب لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہوتے اور شخص بدمست تھے۔ تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف بیٹھ گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ اس عورت نے لڑکیوں کو سلائی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے چل جانا چاہا۔ مگر لڑکے اکیلے بیٹھنے والے تھے۔ سب نے سب چلا اٹھے ہیں، ہیں بڑے میاں کہاں چل دئیے۔ ٹھہرو تم بھی یہیں جا بیٹھو۔ یہ جواب جیسے بڑی عمر کے لوگوں سے باتیں کرتے رہتے ہو کیا ہم نے کچھ قصور کیا ہے؟

سقراط نے کہا" یہاں میری ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں تمہارا تمہارے استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا جہاں میری ضرورت ہو۔"

استاد نے کہا" نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریے اور علم کی بات بتائیے۔"

سقراط نے کہا: میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔"

ایک شوخ لڑکے نے پھر کہا" اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو۔" کہانی کا نام سنا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے: "ٹھیک ہے کہانی کہانی کہانی۔"

سقراط نے کہا: میں کہانیاں وانیاں نہیں سنایا کرتا۔"

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے: "ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں کے دادا ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہو گے۔"

سقراط نے کہا" یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو تمہیں کھلانے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

اس پر کئی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا: ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر یہ الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے:

سقراط نے کہا" خوب خوب، مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے:"

"معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا گھوڑا بہت ہی بڑا۔۔۔"

"رہنے دو، ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کسی کام کی کہانی سناؤ۔"

"دیکھو میاں سقراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں اچھی کہانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں، شہزادے اور شہزادیوں کا ذکر ہو۔ اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔"

"اچھا تو سنو۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔"

لڑکوں نے کہا: اب آئے نا راہ پر۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟

"اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ جس پر ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جما لوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا نہ تھا ہاں ایک بہت خوب صورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے

سے انکار کیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا۔ "اس چھوٹے بادشاہ نے ہماری ہتک کی ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہئے۔" چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو وہ اپنے دل میں بہت گھبرایا کیونکہ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا: "اگر ہم لڑے تو یہ بادشاہ ساری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ اور اگر ہم اپنی ہار مان کے بیٹھے رہے تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ ہم کریں تو کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا: "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔"

اب سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں یہاں تک کہ حیوانوں اور درندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے۔ "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

بھیڑیے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے۔ "ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلا اسے کھا جائیں گے۔"

کوؤں نے کہا: "ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا: "یوں کام نہ چلے گا۔"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آ کر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آ کر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا۔ "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے؟ میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔"

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ چونک اٹھا اور کہا: "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا: "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی: "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود کھڑے ہو گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"میں کھیلوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔ "جاؤ اپنا فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو۔"

"نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اور اگر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔"

"میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا۔ "جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ میرے دشمن اب حملہ کرنے ہی والے ہیں۔ اپنا سامان درست کر رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

اس پاس جو لوگ بیٹھے تھے جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ مکھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ مکھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف دہائی دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا۔ "بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے معزز اور عالی ہمسائے کو بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "چپ رہو بڈھے، کیا بکتا ہے؟" اور سب چاہتے تھے کہ زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ مگر اس عرصے میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔"

ایک لڑکے نے کہا۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔"

سقراط نے کہا۔ "اگر تم یوں میری بات کاٹو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔"

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا۔ "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟"

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں ادھر ادھر اوپر نیچے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا۔ "احاطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟"

سقراط نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

ایک لڑکے نے کہا۔ "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟"

"میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی۔"

کئی لڑکوں نے زچ ہو کر پوچھا: "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیر تک لے اور ہر جگہ ہر کاش بھی کرتے رہے اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی۔ یہ تو عجیب سی پہیلی ہے۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی سمجھتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "مجھے معلوم ہے آپ کس چیز کی تلاش میں تھے۔ آپ کوڑا کرکٹ کی تلاش کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا: "بجا فرمایا آپ نے اور اس کے بدلے میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھ کو ایک تنکا بھی تو احاطے کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول کے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے۔ یقین جانو مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا: "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑ دو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا: "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہئے۔ اب صفائی ان کی فطرت کا جزو بن گئی ہے اور غلاظت سے انہیں دلی نفرت ہے۔ اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے اٹی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا: "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا: "وہ بھی سنائے دیتا ہوں۔" "اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آ گیا۔ خوبصورت شہزادی باغ میں بیٹھی جا رہی تھی۔"

"نہیں یہاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

"تو پھر یہاں چھوڑی ہو گی کہ بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔"

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو خیر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چیونٹی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ تو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ وہاں پہنچا تو وہ بڑا بادشاہ چڑھائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہئے جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسایے کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آ کر اس میں شامل ہوئے جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا۔ بادشاہ کے خزانے سے کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری پھیل گئی اور ہزاروں موتیں ہونے لگیں۔ بہتیرے جتن

ملک کے ہسپتالوں میں مریضوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ناچار بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے افسر تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے بہادروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کریں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڈھوں، امیروں، وزیروں کو بلایا۔ انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں۔ ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو کوشش کی تھی اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی۔"

بادشاہ نے کہا: "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے۔" اور سب بڈھے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال جب بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقتور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر بہت حیران ہوئے۔ عین اسی وقت جب بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترئی بجا کر اتنی اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جائے چلا کر کہنے لگا: "بادشاہ سلامت لائیے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے: "اے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سر انجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں۔ اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغاباز ہے۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ہرگز دغاباز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "ثابت کر۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ثابت کرتا ہوں سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی بیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے گٹھڑوں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیئے اور بڑی بے احتیاطی سے رہنے سہنے لگے وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے۔ اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا ہم سب مکھیں اور میرا لشکر پہلے گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے۔ ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد نہ اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ ہوتے اکھڑتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضے کے جراثیم بھی لایا ہے تو ہم نے ہیضے کو بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترئی بجائی۔ اور چلا کر کہا: "اے عادل اور انصاف پسند بادشاہ بتائیے میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرا اٹھے اور بادشاہ نے کہا "بے شک تم انعام کے حقدار ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا۔ اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہو گی۔"

اب وہی بڈھا حبشی نے بادشاہ کے مکھی کی شرطیں ان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا: "بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھئے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "بڑے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڈھا جو بلاشبہ سقراط ہی تھا اور اس وقت ترقی پاؤں نے تحقیق بڑھ گیا تھا کہنے لگا: "جب آپ نے مکھیوں کے بادشاہ

کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جتنی قسم کی خطرناک
کی بیماریاں پھیلی رہتی ہیں ان میں سے زیادہ یہی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا "تب میں کیا کروں؟"

سقراط بولا: "حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا: "ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سقراط بولا: "تو اپنے قول کو نبھائیے، لیکن خبردار رہیے کہ مکھیوں کا بادشاہ کہیں آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ نہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لئے گندگی بھی مہیا کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا "نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے علاوہ کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو وہاں کھڑا تھا، بول اٹھا "بادشاہ سلامت! خدا کے لئے اس طاقتور دشمن کو ناراض نہ کیجئے۔" لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ وہ مکھیاں نے جس طرح ہمارے پہلے بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا "تو بادشاہ! مجھے انعام کب ملے گا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے زیادہ بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھیں اور جہاں چاہتی اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لئے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں سے ڈھک کر یا الماریوں، برتنوں اور صندوقوں میں بند کر کے رکھتے۔ اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا اور وہ وبا نہ پھیلا سکیں۔ اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لئے الگ گڑھے کھدوا لئے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے اس رسم کو بالکل بند کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ کوئی شخص بھی سوائے گڑھوں اور گھروں کے پاخانوں کے جو انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لئے بنوائے تھے۔ اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کر پائے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے اور لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں۔ اور ان میں خمیر اٹھتا رہے۔ اور مکھیاں [illegible] بھی انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت عمدہ کھاد بن جاتی۔ تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے۔ اب انہیں مکھیوں کا کچھ اندیشہ نہ تھا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور مکھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا۔ بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں۔ اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی۔ اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم بجائے ایک دوسرے سے لڑنے کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی، مکھی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔ اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی

شہزادے سے شادی کرلی اور وہ اس ملک کی ملکہ بنی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگی۔"
اسے غصہ والی نے کہا: "کیوں بھئی اب تو تم خوش ہو؟ اب تو تمہاری شہزادی پھر خوش رہنے لگی ہے۔"
بڑی ہونے والی لڑکی نے جواب دیا: "[illegible] جب سے [illegible] تم اس کہانی کو جو میں نے تمہیں سنائی ہے ناٹک تیار کرکے
دکھاؤ اور [illegible] کے [illegible] سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پر [illegible] جب [illegible]
ناٹک کر دیکھیں کہ [illegible] گی۔ اگر تم [illegible] اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے
دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے؟"

(دیہات میں بسنے سکاؤٹ کا کام)
از ایف ایل برین: ایم سی، آئی سی ایس

ترجمہ: پطرس

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہاروں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لیے شروع ہی میں بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچان نہ پاتے۔

یہ اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض تو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی ہو گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتہ دس دن سے زیادہ نہ ٹکنے پایا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا۔ مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات پر پانی پھرا تو تعلقات کشیدہ ہوئے تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ تھوڑی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چلتے بنے اور اپنے کام کا بل ادا کیے بغیر چلے گئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کیے جس پر ہمارے ایڈیٹر نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر ایڈیٹر ہی کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے۔ اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پیپر الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لیے سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ وہ کام جو رہتا ہو ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بگڑ کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لیے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں، حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے ایک تیسرے صاحب نے ہمارے اخبار کی اور ہمارے صرف و نحو کی پر تنقید کی، اس لیے ہم واضح کیے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لیے تنخواہ کی دھمکی دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً سامنے کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف۔ اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔

یہ مجھے اتنا سے لگے معاف [illegible] بزرگ [illegible] قانون [illegible] تو زیادہ ہیں جیسے خیال [illegible] ان کو معاف کر دیا جائے۔
ترجم اور صاحب ایڈیٹر کے دست سے تو [illegible] لیکن یہ خیال [illegible] سے معنے شاید [illegible] وہ مجھے [illegible] تحریر ہی جائے [illegible] طرح کے
والے اور مجاہدین [illegible] کر پچھ یہ بھی خیال کہ آج عورتیں یوں آتی گی [illegible] ہو گیا حقیقت ہے لیکن ایک دن
میں [illegible] عورت سے تو [illegible] لیکن [illegible] نہیں [illegible] زبیدہ
[illegible] فضل [illegible] باہر [illegible] آج کل لوگ [illegible] بھی
دیتے ہیں غلام [illegible] مولانا [illegible] آپ پیدا ہو گئے ہیں [illegible] جیسے [illegible] بتا چکا ہے اب تو
[illegible] نام [illegible] گا۔ [illegible]
[illegible] دیکھنے [illegible] کے اندر [illegible] جواب [illegible]
نہیں سکتے انہوں نے [illegible] کہنے لگیں [illegible] ہوتی ہیں [illegible] آپ بھی عورت کے پیٹ
سے [illegible] دولت [illegible] اپنا [illegible] کام بنایا۔ بہترا
[illegible] سے کیا تعلق [illegible] آپ [illegible] کر رہی ہیں [illegible] آپ
[illegible] دولت کے متعلق [illegible] بیان کریں کہ آپ [illegible] جائیں۔ خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا

[illegible] اخبار میں [illegible] سب سے مقدم ہے [illegible] ایک معزز [illegible] اخبار [illegible] خدمت خلق اور رفاہ عام
[illegible] پبلک [illegible] حیثیت اور [illegible] وقت [illegible] چنانچہ [illegible]
[illegible] کامیابی [illegible] حیرت [illegible] پاس ہو گئے [illegible]
[illegible] جہاں [illegible] انتظام بھی [illegible] اپنے [illegible] بچوں [illegible]
[illegible] پانچ سال [illegible] شریک [illegible] شامل ہو گئے [illegible] کی اجازت نہ
[illegible] حالات [illegible] کشمیر کے [illegible] توجہ [illegible] ہندوستانیوں کی [illegible]
[illegible] کی طبیعت سنبھل۔

[illegible] اخبار کا نام آسمان [illegible] پیشانی [illegible] آسمان [illegible] اس [illegible] سب ایڈیٹر
[illegible] خود [illegible] صاحب [illegible] شروع [illegible] ان سے [illegible] صاحب اس [illegible] اخبار سے نیا
[illegible] اخبار کا نام آسمان [illegible] اور اس [illegible] آسمان [illegible] لیکن [illegible] اس [illegible] کیا خوب [illegible] علامہ اقبال
[illegible] علامہ اقبال سے [illegible] اس [illegible] پیشانی [illegible] اخبار [illegible] تجویز کیا ہوا ہے
[illegible] کوشش نہ کی جائے کیونکہ [illegible] عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ [illegible]

[illegible] سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال [illegible] آپ کے اخبار کی
[illegible] کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیلئے ہماری پالیسی میں چند باتیں [illegible] مستقل [illegible] ہیں اور [illegible] ہرگز نہیں [illegible]
[illegible] ہم نے پریذیڈنٹ [illegible] اخبار [illegible] شائع [illegible] لیکن [illegible] پالیسی میں [illegible] کے قائل ہیں اسی لئے [illegible]

کوئٹہ ۔ ہم سے بیانات ملنے پر پتہ لگا ہے کہ سرحد کے علاقے میں جو باری ہوئی ہے اس کے بعد ڈپٹی کمشنر کو ہم نے سب سے پہلے پہلی بار ان کی جدائیاں کا تبادلہ کیا جائے اور ان کے لڑکے کی شادی کی جائے ۔ پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے ۔

حلقے کے متعلق ہمارا خاص طرز عمل ہے ۔ ہر سب ایڈیٹر اور ہر پروف ریڈر کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی ۔ مثلاً پاکستان ٹائمز میں خبر آئی ہے : ہوائی جہاز [illegible] گر پڑا ۔ ہم خبروں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا ۔ ایک مترجم نے لکھا کہ [illegible] کی خرابی سے تین آدمی مر گئے ۔ حالانکہ انہیں لکھنا چاہئے تھا کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہو جانے کے بعد چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہو گئے ۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کا ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا ۔ ایک مترجم نے یہ ترجمہ کیا کہ ہر کتے کے گلے میں جو ہونا چاہئے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے ۔

سینما کے نرخ ہیں سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں ۔ ہر پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے ۔ خطا کار یہ پروپرائٹر اور ان کے اہل خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا ۔ علیٰ ہذا جو اشیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل ، عطریات ، صابن ، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا ۔

مکرر یہ کہ ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا ۔ ہمارے پروپرائٹر صاحب کئی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اشاعت بہت بڑھ رہی ہے بہت بڑھ رہی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً اشاعت بڑھانے کے خلاف ہیں دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ اشاعت زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات ؟ کون سی بات ؟ اپنے ذاتی پرچے وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتلاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے ۔

دوست کے نام

لاہور

میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنون لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی۔ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے رکن کون کون اہل حضرات ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق صحیح رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی عادت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن اس کا سلیقہ نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کہ چلو ایسے بے فکروں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویت قلب نصیب ہوگی۔ وہ ذوق جو کتابوں اور تصویروں سے دنیا کی تلخیاں کم کرنے کے لئے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر انسانی کی وحشت اور تمنی غالب آنے لگتی ہے۔ انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ تو ایسی حالت پر چسپاں کیا جا سکتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں"۔

لیکن میرے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر اسلام کا نام آیا چاہتا ہے۔ اور آپ جیسے روشن فکروں کو عقیدتی اور فحاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی دستور چشم بدور ہیں آپ دیکھے کہ نئے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر لعنت نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتویٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی محکمۂ مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

ہیں کلک چپکے مجھ سے کب تک ترا است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا منافقت کے موقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہم عصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوےٰ دار ہے آپ کی آزاد منشی کا مذاق نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پتے ہوئے فقرے کسے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزاری اور بددلی کی پ رہی ہوگی اور آپ کو ایک مکمل پاکستانی سوسائٹی نہیں ملی اور جس خوش مذاق پر آپ کو فخر ہے وہ آج کل ایک صاحب ذوق کی طرح ... کے کرنے میں سرگرداں ہو جاتا

۔ ہمارا سایہ پرچھائیں پچیس برس رہا ہے، اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائداعظم یہاں تشریف لائے تھے ——— اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ "روز گارڈن" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستان کا عہد کا پہلا جشن کا دن تھا "روز گارڈن" کا نام "گلستان فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک لوہے پر کھدوا کر باغ میں جو چھوٹی سی رش ستونوں کی محراب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت بے کار سیاہ مشقد تھی۔ کہ مدرسے کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لکھنا ہوتا تو شرماتے۔ "گلستان فاطمہ" کی بے ذوق ترتیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت نہ وہ غریب پیاس بجھا سکے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سایہ میں آ جا گرد آلود ہوتا سر کے نیچے رکھ کر اس بات پر سوچتے ہیں۔ نہ وہ چمن کے پوشیدہ گوشوں میں گھڑی بھر کے لئے بیٹھ کے جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں تفریح کے لئے آتے ہیں۔ لیکن جب ان جوسے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے سے یوں ایک نمایاں جگہ پر نقوش دیکھا اور نظر ہوا دل روشن ہو کر کہا کہ ایک ایسے شاندار موقع سے میں اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار رہی ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ آج قدرت نے بھی ان کو آنکھ بھر کے سراہا ہو گا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ ہے جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے، اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر اس شہر میں مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھے پڑے ہیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہیں اور نشست بے ڈھنگی ہے۔ آپ دیکھئے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا۔ اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں۔ اور اگر آپ کو پہلے کچھ اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن کہیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگاتا اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے جلسے میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم بیٹھے ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیونکر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤ اجداد اور خطاط اور علم اور ادب کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغرے، نستعلیق اور نسخ، کس کس نہج سے انہوں نے بوٹے نقش کئے ہیں۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مخطوطے اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور مقابر، ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سلطنت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و کاغذ اور سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے گھر کے حیاء اور تحفظ کے لئے سب توفیق تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں تمہیں کیا ہو گیا اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کرو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سراموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ کے خط لکھیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے

یہ سمجھنے سے آپ کیوں قاصر ہیں کہ کیا انہیں گے، لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہی ایسے لوگ؟ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے۔

اس کے پروگرام سے لوگ واقف رہے ہیں لیکن کیا اس سے بھی بڑھ کر تصویروں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ پوچھنے کو لکھا ہے دوست دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع رکھتے رہتے ہیں، کیونکہ کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بھی اشتباہات سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چیزیں بھر بھونک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ سنے کے احوال ایک پرچہ تحریر میں ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ لمبی ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی صورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام جا گزا سر کسی مرد کے سپرد ہوا تو آزاد کہے نہ کجائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا علیہ بھی سرعت سے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو ترک کر دی گئی ہے کیونکہ ہوا تو بھلا کس کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک سے لے کر دو دن سوئے تک ایک کا کچھ نہ کہو۔ عجیب ہے کہ ہماری لڑکیاں جاندار وں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑ یا جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی ترکیبوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو ایسے فن کار ہوتے ہیں جو اب طاق پابندی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر دو روپے لے کر تصویر کھینچتا ہے یہ عمل نوجوان طلبا شیاد کا سہارا ہے جنگل ہی پہاڑ، دیا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کو آل حق بین مصوروں کے "جھوٹ" کو گردن سے جا دبوچے گا۔ اور آپ چیخنے لگ جائیں گے کہ یہ تو دین کا کام ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے سمجھے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات "سچ" بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ مدت تک آدمیوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم سینہ چاک اور بعض اوقات مرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں کسے ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ آیا یہ تکیہ یا ڈوری بیلا کے لباس کا حصہ ہے یا تاق کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت مزید نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً ختم ہو جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیا یہاں کوئی ایسا جرم ہے اور ان سے کم شدہ یا کم ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کے منصفی کوئی فرد یہاں تک
دیکھ پہنچا سکی ۔ آپ کو تحریر اور تحقیق کی سوجھ رہی ہے لیکن یہاں آ کر یہ کام رہ جاتا ہے ۔ اکثر سے لڑکیوں کو ان کا حال کا علم اور ہر طرح کچھ کر
دیتے ہیں ۔ آپ کوئی سا بیان پیدا کیجئے ۔ آپ نے دیکھے دیکھتے وہ تو یہ کی راہ اختیار کر لیتا ہے ۔ رنگ جب چیز کا نمونہ ہوا تو یہ سب سے پہلے اس چیز
کا خون کر لیتے ہیں ۔ آپ کہتے کہ رمضان کا احترام ، جب بے توڑ کی ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں ۔ جب اسلام
کی وحدت بیچارہ تو کسی سے بھی نہ ہو سکی جو بات ہے اس کے ورثے لے آئیں ، یہ کہ سنگسار کریں ؟ آپ خیال تعین کیجئے کہ کون سرمایہ دار طوطوں سے منہ پر تھوکتے
ہیں اور بچوں پر اپنا سیاہ نام ان آتے ہیں ۔

براہ راست گھر اسی سے اور تنگ سے زندگی
اس دور کے لوگ میں کیوں تنگ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپ سکا ہے ؟ آرٹ کے لیے توازن اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں
یا پھر کوئی دلدار کوئی امنگ کوئی عشق جو ان کے دل دماغ میں حوصلہ دے اور ان میں سے شعر و سخن ، نقش و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں ۔ کیا
کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپ سکتا ہے ؟ کہ ہر شخص کو دولت اور اقتصادی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر جگہ اپنی بے اطمینانی کا بدلہ ہر جہاں سے ہر
راہگیر سے لینے پر تلا ہو ۔ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے خوف سے نجات پا کر
قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو نہ مسرت کا کوئی ایسا
موقع ملے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ کو آپ نغمے پیدا ہوں ۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا لاشا
منحنی ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لیے تصویریں بناتا ہے ۔ نہ اس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر کو رکھ سکتا پھر سے اور لوگ اسے
دیوانہ سمجھ کر اسے بکنے دیں ۔ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب
اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جائیں جو
ان کے ہنر کو کمزوری سے کم درجہ کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعویٰ تھا اس کا حساب لگ گیا ۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت جنیں سمجھتے سے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصویر
پاسدار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو ۔ جس کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے ۔ فرق یہ ہے کہ زندہ ہے اور امیر و غریب اچھے
برے ، ادنیٰ اعلیٰ سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرماتے ۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا ۔ آپ تو اس
مہجوری کو واپس لانا چاہتے ہوں گے ۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں ، کسان کے چھپروں میں ، دیہاتی عورت کے ہاتھ کی چوڑیوں میں ، پنہاری کے مٹی کے
گھڑوں میں بھی ، غرض زندگی کے ہر گوشے میں جلوہ پاش ہو لیکن یہ ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں منتشر ہیں جن کو بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں
جہاں تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی ؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے ؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ
آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لئے انہیں اس بے ڈھنگے ماحول میں کئی شعر اچھالنے پڑیں گے ۔

فرصتے نیست کہ دو پہلوئے غم سے آویخت
سد مرد و جہاں گم شد و تا در نیست

مگر یہ محض میرا وہم ہے ورنہ دوست پوری طرح سے ملک تقسیم ہونے پر بھی کوئی تبصرا دوست ہم سب کو وہاں جا لیجئے یا کراچی کا انتظار کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور محبت ماننے والے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ بڑے بڑے ارباب حل و عقد تک رسائی ہے، ان سے کہئے کہ

منزل راہبر ماں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے

(نقوش جشن آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ۔ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے، جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگھوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پاؤں نے اس کام کرنے لگے بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر یک لخت الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں یہ میں نے اہل علم کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔

سنتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کیے ہیں، لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچا آتا ہو۔ خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا لمحہ گزرتا ہو جب اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجیے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دیجیے۔ یہ جھنجھنا بھی کمبخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں۔ یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجیے لڑھکتا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے ماشاءاللہ بابا کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لیے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو لاولد کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک

[illegible] کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ [illegible] تیسرے [illegible] آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی دس بجے [illegible] ہیں۔ [illegible] دیکھیے۔ آپ

[illegible] کانوں میں روئی دے کر [illegible] رہیے [illegible] آپ [illegible] کے [illegible] تو میرا منہ

جی مرزا صاحب کے گھر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک [illegible] آپ کی [illegible] کئی دفعہ دل میں آیا [illegible]

حضرت! آپ کی ان [illegible] نے میری زندگی [illegible] کر سکتا ہوں [illegible] میں لکھتے ہی رہتا ہوں کہ ان کا

ایک [illegible] میں آیا ہے اور مرزا صاحب [illegible] کہتے ہیں [illegible] صاحب [illegible] اچھا بیٹا ہے۔

کبھی منہ [illegible] کبھی [illegible] میں [illegible] گلا پھاڑ پھاڑ کے [illegible] ہونا

صاحب قبلہ [illegible] کے [illegible] بیٹا [illegible] پڑھا اس کا سر بھی چومتا ہوں۔

نہ جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں [illegible] اور کبھی [illegible] آ نکلا۔

تو [illegible] تھوڑی سی مدد کر لی۔ کیونکہ ایسے موقعہ پر [illegible] لکھنے [illegible] ایسی مشق ہم لے کبھی [illegible] نہ

پہنچائی گئی۔

―――――

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام سرگرمیاں محدود ہو کر بس چند ایک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی پر
میز پر جو اخبار کا خوش رکھا ہے اس کے چند ورق پڑھ لئے مہینے کے بعد کبھی غسل کر لیا یا کبھی ناخن ترشوا لئے۔
یہ کالج کا عارضہ لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا زمانہ طالب علمی کا زمانہ تھا وہ بات گئے گذرے ہوئے۔ اب سن رسیدگی کے جو دو چار
باقی ہیں وہ مراعات مرتب کرنے گذر رہے ہیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا ابتدائی تھا لیکن تھا اس کے بعد مرض نہ رہے گا یا بہتر رہ گئے ہیں
بستر رسانی ہے اور ہم ——— ہر چند کہیں کہ ہیں ——— نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا، نرم نرم گدیلوں پر گویا ہمیشہ پرواز تھا
صاحب فراش ہوں۔ اب ہمیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ اخبار کھا لیا غسل کر لیا ناخن ترشوا لئے۔
تمام ہنگامہ دروازہ لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم
ہوتا ہے ———
کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا
کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔ ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ عالم ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے
کالج کے جلسوں میں اپنی ادبیہ وہنی سے بہت ہنگامے آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کہ عمل کریں۔ ذہن سنگ بے نقرہ وقفہ
والا معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے جانتا ہوں کہ کرسی صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور
مجھ ایسی کرانا الحق کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔
قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھے یہ بدگمانی آتی ہے کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر
اور میری ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے اردگرد محفل گرم تھی اور میں اس میں چمگادڑ کی طرح اپنی بلندی پر جا بیٹھا تھا۔
جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی بڑی اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ بجے
تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ سگنے چوس چوس کر جا بجا مونگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ ہر رفتہ رفتہ آثار رنگ اختیار کر لیں گے۔ ہم
کسی کو ایک کرسی اور سٹول میسر آ گیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پر کووں اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام رہتا
اب یہ حالی ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اس چھٹی کے دن بال دکھوا لئے تو پھر بات گھر کی تھا

[illegible]

وہی میں نے کہا تھا کہ [illegible]

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی ۔۔۔ اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

"پطرس"
(راوی ۱۹۲۹ء)

مضحک اشیأ کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگساں کا فلسفہ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ جوکر کی کسی بے تکے منہ چڑانے پر، کسی مسخرے پر بلا اختیار ہم اور کبھی کسی شخص کی بہت گندی بات پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک بات کون سی ہے؟ ہم کس چیز سے ظرافت کی اس پری کو شیشے میں اتار سکتے ہیں جو ایک روح کی طرح مختلف جسموں میں آکر مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور سامان تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کر دیتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر مفکر اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن یہ ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر پھر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جان خندہ یا روح ظرافت یا عنصر مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں۔ اس تمام کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بندھن میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روح خندہ ایک زندہ چیز ہے اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہئے۔ اور ایک آدھ فقرے میں اس کی تمام ہستی کو بند کر دینا اس کی توہین کرنا ہے۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور کس طرح نشو و نما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں۔ اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے کہ کوئی ایک فقرے کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کر دے۔ اور ممکن ہے یہ آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو۔ کیونکہ روح خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریق عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی آوارہ و وارفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ احسان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دہرا ہوا جاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روح خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے۔ تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پر بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دئے جائیں ان اصولوں کا خود مضحک اشیأ سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میدان تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دوران بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے یہ ہے کہ کوئی سامان تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے کہ خوب صورت ہو ممکن ہے کہ دلفریب و دلکش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بدنما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے۔ کہ ہماری نگاہ کو اس جانور

لیکن یہ ہم کسی حیوان پر ہنستے ہیں تو اس لئے کہ اس میں ہمیں انسانوں کی سی کوئی حرکت محسوس ہو جاتی ہے جو باعث تضحیک بن جاتی ہے۔ ممکن ہے بعض اوقات ہم ایک ٹوپی کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔ لیکن ہمیں جو چیز مضحکہ ہے وہ اس ٹوپی کا کپڑا نہیں۔ دراصل وہ اس ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو یوں ہوش مندی سے یا بوجہ کسی انسانی ہاتھ نے دیا ہے یعنی مضحک ٹوپی کی قطع وضع ہے جو اس وجہ سے مضحک ہے کہ وہ کسی انسانی دماغ کے ایک عجیب و مضحک خیال کی ترجمان ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور ایسا عین مختصر سا ... کی تفتیش سے اس قدر ... ہے۔ اکثر لوگ انسان کو حیوان ناطق کے نام سے پکارتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ... نہ صرف "حیوان ضاحک" بلکہ "حیوان مضحک" بھی ہے۔ اگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز ہنسی کا باعث ہوتی ہے تو ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ وہ مضحک یا کوئی انسانی مشابہت ہے یا کچھ صفت انسانی کا کوئی نقش اس پر مضحکہ کا نام ہوتا ہے جو کوئی انسان اس چیز سے لے آیا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اکثر ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی جب تک روح انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ایک ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں۔ یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقعے پر ہم کچھ دیر کے لئے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ چند ایسے اشخاص کی جماعت میں جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل (ان معنوں میں کہ وہ جذبات کا خزینہ ہوتا ہے) معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت ... کی حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہل دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے (جو ہمیشہ کمال کو پہنچی رہتی ہے۔) ایسے اشخاص وہ ہنسی سے آشنا ہی نہ ہو سکتے ہیں۔ جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ دلی تعلق پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں ان لوگوں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبہ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو حقیر سے حقیر چیز آپ کی نظروں میں اس قدر وقیع اور اہم بن جائے گی۔ گویا کسی طلسم نے اشیا کی حقیقت کو یک لخت بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی چھا جائے گی۔ جو آپ کو ہنسی سے محروم کر دے گی۔ اب اگر آپ کشمکش حیات سے الگ ہٹ کر اور اپنے آپ کو بالکل لاتعلق بنا کر اس کا نظارہ کریں تو کئی باتیں آپ کے لئے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں موسیقی کے ساتھ باقاعدہ تال پر ناچ ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو نظارۂ رقص مضحک ہو جاتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی فعل انسانی ایسا ہو۔ جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اترے اگر ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگ موسیقی سے علیحدہ کر کے ان پر نظر ڈالیں تو ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فوراً سنجیدگی سے گرے ہوئے نظر آئیں گے۔ ثابت ہوا کہ کسی مضحک چیز کے پورے طور پر اثر پذیر ہونے کے لئے ایک عارضی انعدام جذبات ضروری ہے۔ تضحیک کا تعلق عقل و فہم اور صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے دماغوں سے علاقہ نہ توڑ دے۔ اور یہ تیسرا نکتہ ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور ... محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے لئے ہمیشہ ایک گونج، ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنئے۔ یہ صاف واضح اور ... آواز نہیں۔ خود ایسی آواز

کی آواز ہی لیجئے جسے کوئی ہنسی سنو معلوم ہوتی ہے کہ ایک دھماکے کی طرح چلتی ہے، زور سے پیدا ہو کر صدا ہوتی ہے اور مسلسل گرج ا ل
کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ جیسے پہاڑوں میں بادل گرجتے ہیں۔ لیکن یہ گونج ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی۔ یہ حلقہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اس کے حلقے کا
محیط کتنا ہی وسیع ہو محدود ضرور ہے اور اسی لئے محدود ہے یعنی ہماری ہنسی ہمیشہ ایک جماعت یا ایک حلقے کی ہنسی ہوتی ہے۔ آپ کو ریل گاڑی کے سفر میں
کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ آپ کے بعض ہمراہی مسافر آپس میں ایسی باتیں کر رہے ہیں جو ان کے لئے یقیناً ظرافت آمیز ہیں کیونکہ وہ کھل کھلا
کر ہنستے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اگر آپ بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ بھی یقیناً ہنستے لیکن چونکہ آپ ان سے علیحدہ ہیں آپ کو ہنسی نہیں آتی۔
ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے بڑے مولوی وعظ فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر مؤثر تھی کہ سب سامعین زار زار رو رہے تھے سوا
سوائے ایک کے جو بالکل ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب میں کہا "میں
اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں۔" رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ ہنسی بھی
بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ ایک ہنسنے والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ (خواہ وہ حقیقت میں
موجود ہوں یا محض تصور میں) سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی ملاپ سے ہنستا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ تھیٹر میں تماشہ
دیکھنے والوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر عوام کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی ظرافت
کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو وہ ظرافت سے خالی رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت ایک خاص
قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے تعلق رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس نکتے کو نظر انداز کیا ہے وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک ظرافت ایک نہایت ہی حقیر
مشغلے سے زیادہ قابلِ غور حقیقت نہیں رکھتی۔ اور جو ہنسی کو حیاتِ انسانی کی باقی تمام دوسری باتوں سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ظرافت
کی یوں توضیح کرتے ہیں کہ "ظرافت ایک تقابلِ ذہنی کا نام ہے" یا "ظرافت ایک محسوس بے جوڑ کا نام ہے"۔ ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن
یہ اس سوال کا جواب دینے سے قطعی قاصر ہیں کہ آخر بعض چیزوں پر ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات ایسے ہیں کہ ان کو دیکھئے یا
سنئے تو ہنسی سے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں حالانکہ اور ہزاروں اشیاء بھی دنیا میں موجود ہیں جن کا مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت سمجھنے کے
لئے ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں اٹھ کر دیکھنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:—

(۱) سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

(۲) ہنستے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

(۳) ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسانوں
کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی
ہے۔

فصل۔ ایک شخص بازار میں دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ لوگ ہنس دیتے ہیں۔ اب اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ گرا
نہیں بلکہ جان بوجھ کر یونہی زمین پر بیٹھ گیا ہے۔ تو وہ اس پر نہ ہنستے۔ لوگ ہنستے اس لئے ہیں کہ اس شخص کا زمین پر یوں بیٹھ جانا خود اس کے ارادے کے خلاف
تھا۔ یعنی باعثِ خندہ اس شخص کے انداز میں یکایک تغیر ہوتا نہیں بلکہ اس تغیر میں عدم ارادہ کے عنصر کا پایا جانا ہے۔ اس [illegible]

تھا کہ پیچھے سے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یا اپنی رفتار بدل دیتا یا اس نے ایسا نہیں کیا اور تو [illegible] سے ذہن میں یک لخت رک جانے کی قابلیت رکھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں غرق تھا یعنی اس کا خیال غیر حاضر تھا، یعنی اس کے جسم میں اتنی لچک اور فہمیدگی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے یوں حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑتے ہوئے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس لئے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی تن کر چلنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے حالانکہ نئے حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور منظم ہے اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ طریقے اور ترتیب سے رکھی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے کوئی شریر لڑکا ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے۔ اب وہ شخص [illegible] سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آ جاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ [illegible] کا ناول نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو دھم سے زمین پر جا گرتا ہے غرضیکہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے۔ اب اگر خلاف معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا یا موقوف کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بے خطا مستقیم چلتا رہا۔ گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے جو رستے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامان تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ہم ایک انسان سے اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں مڑ جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحک کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو گرنے کا سامان سوئے اتفاق نے مہیا کیا تھا۔ اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے۔ ان دو وجوہات سے ان دو شخصیتوں میں [illegible] قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحک نتیجہ رونما ہوا اس کی علت خارجی تھی یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے ظہور کے لئے کوئی موقع نکال لے تو سامان تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا دماغ اپنے گزشتہ افعال سے متعلق مصروف رہتا ہے۔ اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو صبح اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر ٹھہر جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ یعنی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور فہمیدگی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے۔ کہ وہ زمانۂ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بلند ہوئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقت حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامان تضحیک (اور اس کی علت ظہور) تو اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی کی کئی ایسی باتیں یاد آ جائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس کا مفہوم بعض اوقات دیگر وجوہ سے اور بھی زیادہ وقت طلب ہو جاتا ہے مثلاً اگر آپ کو کسی
شخص کے خیالات کے یوں غیر حاضر رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی دلچسپی گویا آپ کی نظروں کے سامنے پیدا ہو، وہ آپ اس بات سے
بھی واقف ہوں کہ وہ جیسے بڑھتی گئی ہے اور کن وجوہ سے ترقی کرتی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجیے ایک شخص رات دن مجنوں
اور فرہاد کے قصے پڑھتا رہتا ہے اور چوبیس گھنٹے اس کا دل و دماغ عشق کی وحشت، صحرا نوردی، خود فراموشی، بے خودی اور دیگر کیفیات میں مبتلا
رہتا ہے۔ مجنوں یا کوئی ہیرو اسے اتنا جاذب و دلکش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو بالکل قیس تصور کرتا
ہے۔ اور اس کے خیالات اور ارادے اسی کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگر چند روز اس کی یہی حالت رہی تو آپ دیکھیں
گے کہ وہ اگر اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوگا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے۔ وہ اسی خواب میں ادھر ادھر چل پھر رہا ہے اس کی باتیں
اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں ایسے شخص میں سامان تضحیک کس قدر موجود
ہو جاتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ پڑھنے لگ جاتا ہے
ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات نہیں ہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات سے
بے خبر ہے۔ وہاں متخیلات سے باخبر بھی ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گردوپیش ہی سے بے کار ہے۔ بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔ ایسی ہستی
اس شخص سے زیادہ مضحک ہے۔ جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ غائب ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ غائب ہو کر وہ ہے کہاں؟ مگر جب آپ
کو اس بات کا علم ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو عرف عام
میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر
لرزاں ہوتے تھے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی
طرف دوڑ رہے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت درخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے
ہوئے ہیں کہ ان کی بے خبری باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے۔ اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے سوانح اور ان کے حادثات علت
و معلول کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں لچک کی ایک ایسی کمی ہے
جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں دے سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر نہیں نکلتا۔ اس سے خیالات اس کے دماغ
میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے اب ذرا اس سے آگے چلیے اور غور کیجیے کہ جو تعلق ایک خاص
خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بداخلاقیاں دو قسم کی ہیں۔ بعض
برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لے کر ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی حیات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے
ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں درد انگیز اور ملال آمیز ہوتی ہیں۔ برخلاف
اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے۔ جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر سوار ہو جاتی
ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ تنوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈرامے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے
ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسماء سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس طرح سے کیریکٹر کا جزو بدن بن

جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان کے خواص کو دل میں محسوس کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان برائیوں کا خیال تک نہیں کرتے۔ بجائے اس کے ہمارے پیش نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم ہوتا ہے۔ مثلاً اتھیلو، ہملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ ایک شخص سے نہایت ہی بے پروائی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت و ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ وہ بذات خود ایک کیریکٹر ہو جاتی ہے جس کے اردگرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا ہے اتنا ہی وہ مضحک بھی ہوتا ہے۔ ایک مضحک کیریکٹر کو اگر اس بات کا علم ہو جانے کہ دوسرے اس میں کونسی برائیاں پاتے ہیں۔ اور ان برائیوں کو کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے وہ اپنے آپ میں کوئی اصلاح یا تغیر پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب تماشہ مضحکہ کرنے والے سے [illegible] ہو جاتا ہے۔ وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی۔ کچھ نہ کچھ تغیر ہوئی ہے۔ ہنسی کی منشاء مصلح اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوئے گر پڑتا ہے۔ اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور یہی سامان تضحیک کی رونمائی کا باعث ہوتی ہے۔ کشمکش حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیدار رہے اور ہم اسی کے ساتھ واقعات موجودہ کو پیش نظر رکھے۔ ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے رہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی دماغی [illegible] اور ہر قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی سے جدا سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ اور طرح طرح کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک نگہبان ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے اس کا تعلق محض لطافت طبعی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں مانتا کہ ہم ہنستے صرف اس وقت ہیں جب ہم تھوڑا نفس کے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

یہ مضمون آج سے چھتیس سال قبل لکھا ہے۔ اس وقت فرانس کے مشہور فلسفی برگساں کا فلسفہ بہت مقبول تھا۔ "عالم خواب"، "دماغ و قوت" اور "خندہ" کے متعلق اس کے نظریات دنیائے مغرب سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ پطرس نے اس کے فلسفۂ خندہ سے اردو کو پہلی مرتبہ روشناس کرایا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ قابل مضمون نگار نے اس کے فلسفہ میں ادب کی انگریزی مثالوں کو اپنی معاشرت کے حسب حال بنانے میں مجتہدانہ قدرت سے کام لیا ہے۔

(ادارہ)

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر یقیناً قابلِ مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیمی کانفرنس تھی جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب سرحد پار سے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر نزاکت پکڑتا جا رہا تھا کہ ہر شخص کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کی جا سکتی تھی اور پھر دیگر اہم ترین سیاسی مسائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گذر چکا اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کثیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا نہ ہمارے نظامِ تعلیم اور طریقِ امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا اور نہ رضاکاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے میدانِ عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ تاہم اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائیگاں کھو دیا تو وہ بر خود غلط ہے اس لئے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گرما گرم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور سنجیدگی و متانت سے غور و خوض بھی ہوا اور حال ہی میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرینِ تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سامنے لا کر ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اگر مجھے ایک فرسودہ سا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہمارے لئے پونجی ہے جس کی ملکیت احساسِ فخر و اعتماد پیدا کر دیتی ہے لیکن جلدی یا دیر میں ہمیں اس پونجی کو ضرور استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دھات سے زیادہ نہ رہے گی۔ استعمال کی کئی صورتیں ہیں۔ پونجی فضول خرچ کر کے ہم دوبارہ مفلس بن سکتے ہیں پونجی کو ایسی مد میں لگایا جا سکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ سمجھ کر پونجی کو کسی سودمند کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے تعلیمی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں۔ تعلیمی آزادی کا مطلب یہ ہے نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم لڑکیوں کے لئے مکمل نصابِ تعلیم میں حسبِ ضرورت مناسب ردوبدل کرنے کی آزادی۔ سات کروڑ بندگانِ خدا کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے لئے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے ماہرینِ تعلیم خواہ وزارتوں میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں میں کئی ماہ سے غیر معمولی خلوص اور محنت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تاحال برآمد نہ ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا نصب العین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں غیر حقیقی اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ طریقِ تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے بالاتفاق آمرانہ مذموم قرار دیا جاتا رہا ہے موجودہ نظامِ تعلیم سے بے اطمینانی و بیزاری کے احساسات ہر جگہ موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب و علل مختلف جگہوں میں مختلف تھے یہی وجہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی لوگوں نے فوراً اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظامِ تعلیم کے

خامیوں سے آزاد ہونے کی مساعی شروع کر دیں۔ موجودہ نظام کے نقائص و عیوب کی مفصل و مکمل فہرست تیار کرنا و تفصیلی بحث مقصود نہیں۔ ان باتوں پر تو غالباً سب
متفق ہوں گے

اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت ـــــــ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں انگریزی نہ صرف ذریعہ تعلیم و لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے
جو اہمیت حاصل ہے [illegible] علمی نقطۂ نگاہ سے بھی بے حد قابل اعتراض ہے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ
طالب علم کی ذہنی نشوونما [illegible] یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے اس [illegible]
سے نظام کے بانی کی مصلحت خاص اور غلامانہ ذہنیت کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی ناقومیت ـــــــ غیر قومیت کے مختلف مظاہر میں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی
زبانیں کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے نفع بخش ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے
بھی ناکارہ اور لایعنی ہے۔

تیسری خصوصیت ہے ہماری تعلیم کی محدودیت ـــــــ پڑھنے لکھنے والوں اور مردوں کی تعداد پندرہ فی صد سے بھی کم
ہے اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب تو اس سے بھی کہیں گرا ہوا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کیا طریقہ ہے گو کہ ہم کسی آخری فیصلے یا قطعی نتیجے پر تو ابھی نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و
تمحیص کے دوران میں بعض چیزیں واضح ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بعض بیانات منظر عام پر آ چکے ہیں ان کا جائزہ لے لینا ضروری ہوگا مثلاً زبانوں کے مسئلے پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت
کچھ کہا گیا لیکن پھر بھی بہت کچھ نہیں کہا گیا۔ صدر نے خطبہ صدارت میں کہا تھا کہ:-

> پاکستان میں صوبائی زبانوں کو نشوونما کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے ہوں گے چنانچہ ہمیں ان صوبائی
> زبانوں کو مختلف صوبوں میں نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوگا بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے ہوں گے جن
> سے وہ تہذیب و تمدن جو کسی خاص صوبائی زبان سے مختص ہے اس زبان کے توسط سے ترویج و ترقی پا سکے
> لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ ہماری (پاکستانی) کلچر کی وحدانیت و یگانگت کو صدمہ
> نہ پہنچنے پائے ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ مراسلت و مکاتیب و
> اظہار خیالات کا کام دینے کے لیے ایک خاص زبان کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں اردو زبان کے
> حقوق خاص طور پر قابل غور ہیں اردو نہایت آسانی اور عمدگی سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمونے
> اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اردو کا تعلق فارسی عربی سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی ہے اردو
> میں گراں بہا ادبی سرمایہ موجود ہے ان سب وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی زبان
> بننے کی مستحق ہے، جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں ہے
> لیکن پھر بھی آئندہ کئی سال تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں اور بین الاقوامی مراسلت و مکاتبت
> کے ذریعے کی حیثیت سے صف اوّل میں جگہ دینا پڑے گی گزشتہ تیس چالیس برس سے فرانسیسی کی جگہ
> انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان ہوتی جا رہی ہے علاوہ ازیں محض ذاتی منفعت کے نقطۂ نگاہ سے قطع نظر

ہمیں کس قدر طلباء ایک زبان ہاتھ سے نہیں کھو دینی چاہئے جو نہایت آسانی سے ہمیں مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس کراتی ہے۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہٰذا ان زبانوں کے مطالعہ کو بھی ۲ سے نظامِ تعلیم میں اہم حیثیت حاصل ہوگی۔

(خطبہ صدارت پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دوسری مرتبہ پڑھنے کی زحمت سے پہلی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس میں بھاری قیادت کا کافی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں کیسے پیچیدہ مسئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا سوال باقی ہے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو ان سب زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے اردو کو خاص اہمیت دی جائے گی کیونکہ یہ یکجہتی و روحانیت کی علامت ہے صوبائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما کا موقع دیا جائے گا علوم کی خاطر انگریزی کو صفِ اول میں جگہ دی جائے گی منفعت کی خاطر فارسی اور عربی کو ممتاز جگہ دی جائے گی ثقافتی اثاثہ کی حفاظت کے لئے اب سوال یہ ہے کہ آیا تکمیلِ حیاتِ ملی کے خاطر ہمارے لئے ان تمام زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے یا ان میں حقِ انتخاب یا کم از کم حقِ ترجیح بھی ہو سکتا ہے مختلف صوبوں میں مختلف حلقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہو رہا ہے لیکن ابھی تک کسی ایسے نصِ قطعی کے صدور کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

بایں ہمہ کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) بننے کا مستحق قرار دیا گیا ہے لیکن بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور بعد کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا مثلاً جب مسئلہ زیر بحث کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارش کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے بتدریج زیادہ سے زیادہ حد تک ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے دوسرے لفظوں میں مشرقی پاکستان والے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعہ تعلیم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں، یہ تجویز کمیٹی کی سفارشیں جن میں پنجابی ماہرِ تعلیم کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال نے اس کی زبردست مخالفت کی اور آخری جو سمجھوتہ ہوا اس کی حیثیت کچھ نیچے درجے کی تھی کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارش کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو صدارتی خطبے میں دی گئی تھی۔ کانفرنس نے یہ بھی سفارش کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے اس کی تعیین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعۂ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گو اردو کو آخر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جاتا ہے لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے ممکن ہے سیاسی رہنماؤں کی زیرِ قیادت مشرقی بنگال اردو زبان سے قطعی بے تعلقی کا اعلان کر دے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لئے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبے کے لئے اردو کا قومی زبان (لنگوا فرانکا) ہونا بھی زیادہ وقعت نہیں رکھتا سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ کہیں کل کو اگر سندھی نہیں تو پشتو یہ دعوےٰ نہ کر دے کہ قومی یکجہتی کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہئے۔

مغربی پنجاب تو بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے مغربی پنجاب میں پنجابی کی حمایت کرنا ملک سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابی کو سکھوں نے اپنی محبوب زبان قرار دیا ہے ممکن ہے جب سکھوں کی یاد محو ہو جائے تو پنجابی کا گناہ بھی معاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں لہٰذا یہاں مغربی پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا مقام طے کر رہی ہے عہدِ ماضی میں تقسیم سے پہلے اردو کی ترویج و ترقی میں جن لوگوں

[illegible] دو نیم صلاحیتیں علم و تعلقات [illegible] قدامت پرست [illegible] تھے جن کے [illegible] سے [illegible] علاوہ چند بزرگوں کے
ذہنوں میں بھی خیال عام [illegible] جدید [illegible] نسخہ [illegible] دشمن کی چالیں
[illegible] جالی [illegible] نام بنا [illegible] بنا ڈالیں [illegible] یارٹ کا [illegible] پنجاب سول
[illegible] فیصلہ [illegible] سال [illegible] اردو [illegible] میں [illegible]
[illegible] انتخابی مضامین کے [illegible] حیثیت [illegible]

[illegible] حقیقی ترقی [illegible] علم [illegible] طلبہ [illegible] اردو [illegible] ادر میں
ان مضامین پر کس قدر جلد [illegible] نصاب [illegible] نقش [illegible] اساتذہ [illegible] کے ذہنی
آفاق کے وسعت [illegible] مسلمان [illegible] حکومت [illegible]
[illegible] اختلافات [illegible] تعلیم [illegible]

[illegible] تعلیم [illegible] سے [illegible] طالب علم [illegible] کوششیں [illegible]
اس سلسلے میں کراچی کانفرنس نے مندرجہ ذیل تجاویز منظور کیں ۔

پاکستان کے نظام تعلیم [illegible] اسلامی طرز فکر پر [illegible] کا اسلامی [illegible] وحدت [illegible]

[illegible] دیا جائے

[illegible] عام [illegible] کرسے "آزادانہ" [illegible] اعلان [illegible] مطلب [illegible] اتفاق [illegible] منظور کر لیا گیا تھا در حقیقت اس
[illegible] نصابِ تعلیم میں [illegible] باقی رہے [illegible] گیا ہے [illegible] کے متعلق [illegible] مذہب [illegible]
[illegible] دعوے [illegible] نظریہ [illegible] عقائد [illegible] استعمال [illegible] آخرت [illegible] کی
[illegible] توحید رسالت و آخرت [illegible] اسلام [illegible]
سے [illegible] فکر ہماری تعلیم [illegible] اور [illegible] قومیت [illegible]

یہ [illegible] ہماری تعلیم اسلامی رنگ میں [illegible] طلبا [illegible] مستقبل مصطفین [illegible] اکثریت مسلمانوں کی ہوگی لیکن
سوال محض تشکیل [illegible] اور وسعت کا ہے اگر اس مسئلہ پر آزادانہ بحث کا پورا موقع دیا جائے تو ہماری قوم کی ذہنی کشمکش مختلف مظاہر میں عیاں ہو
جانے گی اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ہر کمیٹی [illegible] بورڈ جو موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے [illegible]
کشمکش کا [illegible] ہو جاتا ہے چلیے یہ مان لیا کہ ہماری تعلیم میں قومی رنگ ہونا چاہیے لیکن "قومیت" کے مفہوم میں اختلافات [illegible] اختلافات جگہ
جگہ اپنا سر اٹھا دیتے ہیں مثلاً ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن عربی بھی ہے کیونکہ "قومی" کا مطلب "پاکستانی" بھی ہو سکتا ہے "مسلم" بھی ہو سکتا ہے لیکن
بعض ماہرین تعلیم نے تو نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عربی کو مدرسوں کے ابتدائی مدارج میں ہی لازمی قرار دے دیا جائے پنجاب کی ایک کمیٹی
میں یہ [illegible] تھا کہ مڈل سکول میں عربی اور فارسی کو لازمی مضامین ہونا چاہیے (غالباً اردو اور انگریزی بھی) لیکن اس سے چشم پوشی اختیار کی
گئی تھی ۔ ایک تجویز یہ بھی [illegible] عربی اور فارسی میں سے ایک کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے لیکن اس تجویز کو اس قدر [illegible] کی بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ اگر طلباء کو
حق انتخاب دیا گیا تو وہ زیادہ تر عربی کی بجائے فارسی ہی لیں گے اس سے کم از کم والدین اور نصاب مرتب کرنے والوں کی آراء کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے

دوسری کش مکش دینی اور دنیاوی مضامین کے بارے میں ہے۔ افادیت کے حامی دینی مطالعہ کو محض تعیش ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ جہاں تک اس سے بچ پڑتا ہے وہ اقبال کے قومی شاعر ہونے کی توجیہہ کو پیش کرتے ہیں ان دو گروہوں کے علاوہ دو اور بڑی بڑی الجھنیں ہیں۔ وہ موجودہ بر مقابلہ بیاستاد ــــ فارسی صرف گلستان کے ذریعے پڑھائی جاسکتی ہے قدیم "کیمیائے سعادت" پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ وہ ذہنی طرز فکر بر مقابلہ عقلی طرز فکر ــــ : تاریخ فلسفہ کو انسانی فکر و ذہن کے ارتقا کے سلسلے کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا محض کلمات کفر کے مجموعے کی حیثیت سے۔

یہ الجھنیں ہمیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک طرف نا جائز حذف کا پیش کیا ہوا اسلام اور دوسری طرف قرآن اور فکر کا حقیقی یا غیر حقیقی تصادم نظر آتا ہے۔ یہ زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام بغیر اپنی مخصوص اساس کھوئے افکار جدید کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ کیا "ہمارے لئے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے؟ سوال ہمیشہ یہ کیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے:

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح ان سب کو ایک کل میں پیدا ہونا ہوگا ورنہ ہمارا نظام تعلیم ہماری احتیاجات کا بار اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا۔ سر سید کے زمانے میں بھی اس قسم کے سوالات کئے گئے تھے اور اس قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھر آئی تھیں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سر سید پر ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دھرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں روحانی اور ذہنی سکون حاصل نہیں۔

اس مسئلے کا حل یا تو وقت کے ہاتھوں ہو سکتا ہے، جس میں دیر لگے گی۔ یا زبردست جنگ کے ذریعے اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ کچھ تسلی بخش نہیں ہے بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا رہے گا۔ اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں اگر ہم مختلف زاویہ نگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نصابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلبا اور بلکہ صرف ہماری تعلیم بجائے خود اس بار گراں کی شاید متحمل نہ ہو سکے۔ ہر تجویز کو اس شدومد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دیئے جانے پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کامیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع طریق کے مطابق چلا ہو۔ اب تک انگریزی، اردو، فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس، ان سب کو لازمی مضامین قرار دیئے جانے کی تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دے دیا جائے ہمارے سامنے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا مواد بہت کم ہوگا بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہوگا۔ اس قدر بھاری کہ یا تو تعلیم بالکل ناممکن ہوگی یا بالکل فضول ہوگی۔

تعلیمی حلقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا سنا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ابھی جاری رہے گی۔ لیکن انگریزی کی پرجوش حمایت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو احساس ہے لیکن اس کی معاشرتی اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے اور اس کی کلچری وقعت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پسند نہیں کرتے ان حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا یا یہ کہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو معاندانہ جذبہ پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مضمون کی تعلیم کا معیار گر جائے گا ایسے ماہرین تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو خالی از خطرہ تصور نہیں کرتے ان کا کہنا ہے ہمیں منصوبہ و باہر دو ماہرین کے تعداد کے مقابلے کا تعداد علمی ازسر نو تیار کرنا پڑے گا لہٰذا ہمیں زمانۂ حال کو زمانۂ تاحال بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت

پچھلے بیس برس سے مغربی سائنس اور کلچر کے تمام راز ہم پر ... اور اگرچہ ہم ان ہی خیالات سے [illegible] ہم اپنے کچھ اہل زبان کے
کے جو حق [illegible] روش میں اس انگریزی زبان سے بھی اپنے تعلق [illegible] گے تو ... سخت نقصان ہو سکتا ہے

ان حالات، مشکلات اور مجبوریوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک اتفاقی [illegible] سے مختلف [illegible]
تربیت کی خواہش پاکستان میں اس وقت سب سے بڑی [illegible] آبادی جنگ کی
ہے حتیٰ کہ اس [illegible] و ملت کو بھی اپنے معاملات کو مستقل اور صحیح نقطۂ نظر سے دیکھنا پڑتا ہے [illegible] سائنس کی
بنے اور ایک [illegible] سائنس کو محض چند ظاہری
بنیاد بنا کر منظور کرنے [illegible] سائنس داں [illegible] ٹیکنیکل ماہرین اور تجربہ کاروں کے خاص ٹیکنیکل ساز و سامان کی [illegible] ترقی ور
جاتی ہے اور تعلیمی مباحث میں [illegible] فلسفیانہ نقطۂ نظر [illegible] جاتی ہے [illegible] اتفاق ہے جو
[illegible] اختلافات کو دور کرنے کا باعث [illegible] سائنس کی زیادہ ترقی کا [illegible] یہ بھی معلوم ہے کہ سائنس کا نقطۂ نظر حقیقت و صداقت
[illegible] تنگ ہے یہ بھی احساس ہے کہ [illegible] لطافت [illegible] صلاحیت سے بے بہرہ ہے اور [illegible] غیر اخلاقی
[illegible] بے نیاز) نقطۂ نظر کا بھی [illegible] لیکن ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود [illegible] اپنی الجھنوں اور [illegible] سے نکلنے میں
کچھ ہے تو اسی کی راہ چلنا [illegible] بہتر ہے۔

اختتام سے قبل تعلیم عامہ و تعلیم بالغاں کے بارے میں بھی دو چار کلمے مناسب ہیں [illegible] اگر تعلیم کی موجودہ رفتار جاری
رہی تو خواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال درکار ہوں گے [illegible] کوشش کا اظہار کریں اور اپنے
[illegible] کے بارے [illegible] پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنا دیں [illegible] اسکول [illegible] تو ڈیڑھ سو سال کا کام [illegible] صدی میں
[illegible] ہے کہ اس [illegible] کوئی بات قابل ذکر نہیں برطانوی [illegible] سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ [illegible] ہمارے فائدے کے لئے نہیں بلکہ
[illegible] کے لئے پڑھایا

کس قدر افسوس کا مقام ہوگا اگر ہمارے ارباب اختیار بھی برطانوی روایت کو برقرار رکھیں اور اسے نہایت احتیاط سے پروان چڑھاتے

ایڈیٹنگ کافن

از روئے قسمتی سے اب ان حضرات میں بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھ کر اصرار کریں کہ ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور (غالباً) نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر لیتے ہیں لیکن اسے قابلِ جرم نہیں کرنا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمایا کرتے ہیں:۔

"شام کو کوئی شغل نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی رونلڈ کالمین کے فلموں کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ ہم بھی چلے چلیں چنانچہ ہم ....."

لیکن اس جگہ تو میں ان صاحب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے نہ دوسرے گروہ کو جسے بیوی کے سر الزام تھوپنے میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلانے کے قابل ہے اور اس کے کمالات کا کوئی جداگانہ منظر اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص وسیلۂ اظہار ہے تو وہ کیا ہے؟ مصور کے کمالات کا منظر خطوط اور رنگ ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے، اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہمیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر وسعت ہے آپ جانتے ہیں کہ فلم متحرک کیمرے کی تصاویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے۔ جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں تو انہیں فلم کہا جاتا ہے۔ شاٹ فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمرہ میں بیک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ٹوٹا، شاٹ ختم ہو جاتا ہے جب کیمرہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ (یا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو) کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم بنانے کا مرتب کرنا ہے میں یہ تو بہ تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم کتنے مرحلوں سے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فلم بنانے میں قصے یا موضوع فلم کی تمام روئداد کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے "شاٹوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شاٹ کا حال پورے تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ قلم بند کئے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پردے پر دکھانا منظور ہے۔ ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع

سا ہوگا۔

زیادہ گہرائی تک فوکس ہوگا۔ دوسرا شاٹ ہوتا ہے یا سینما کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ کیمرہ اندر کی طرف رفتار پکڑ جاتا ہے یا یوں! ابتدا میں جو شے تنگ فوکس ہوگی رفتہ رفتہ بتدریج قریب ہوتی جائے گی۔ اور یا تصویر کے موضوع سے دور ہٹ جائے گا یہ آہستہ آہستہ ہوگا۔ حرکت ان دونوں صورتوں میں نہیں تو زیادہ پیچیدہ شاٹ میں سے رفتہ رفتہ کیمرہ آگے بڑھے گا تاکہ شاٹ کی تکمیل ہو جائے۔ اسے عملی طور پر مکمل کہتے ہیں اور یا مکمل آہستہ آہستہ ہوگا یا تیزی سے۔ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمرہ کس طرح ہے یا آیا کہ وہ "زوم" کے قریب ہو جائے گا یا پیچھے ہٹ جائے گا یا اس کے متوازی حرکت کرے گا اور گھوم کر پورے منظر کی تصویر لے گا۔

"فلم نامہ" میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ کس چیز کا شاٹ لیا جائے۔ کیمرہ دیکھنے والے کے سامنے کی سطح پر ہوگا یعنی جیسے کہ انسان کی آنکھ ہوتی ہے یا کسی اور نقطۂ نظر سے شاٹ لیا جائے گا کیمرہ کس سے کس قدر فاصلے پر ہوگا شاٹ قریبی ہوگا یا اوسطی یا بعیدی۔ غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر شاٹ سے متعلق تفصیل باتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فلم نامہ میں شاٹ اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں جس ترتیب سے انہیں پردے پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب سے لئے جاتے ہیں جس میں زیادہ سہولت ہو۔

فرض کیجئے کہ ایک کہانی کا آغاز ایک جگہ سے ہوتا ہے اور خاتمہ بھی وہیں۔ اگر صورت یہ ہے تو آپ شروع کے تمام سین پہلے لیں گے اور بعد میں اختتامی سین اور پھر انہیں فلم نامے کے مطابق مرتب کر لیں گے۔ دوسری صورت یہ ہو کہ کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا اسٹوڈیو میں مصنوعی طور پر تیار کردہ سے متعلق ہے تمام اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے مقام سے ہو۔ دونوں کے مقامات متواتر اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ فلموں میں ہوا کرتا ہے تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے۔ اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا عکس لے لیا جائے گا۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے جو سین پہلے ہے اسے پہلے لیا جائے۔ دراصل یہ ہے کہ فلم نامہ لیا جائے۔ اس کے بعد آپ گویا تمام عنوانات کے فولڈر بنا لیں گے۔ جب تمام واقعات اور عنوانات کا عکس لے لیا جائے گا تو مسودے کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک ایک شاٹ الگ کر لیا جائے گا پھر ہر شاٹ میں کسی قدر کانٹ چھانٹ ہوگی اور ہر شاٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر زائد حصہ لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اسے کاٹ کر تناسب پیدا کر دیا جائے) اور آخر میں یہ شاٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں گے۔ اور فلم کی تکمیل ہو جائے گی۔ فلم کی تنقیح و برید اور از سر نو شیرازہ بندی جسے تدوین یا ایڈیٹنگ کہتے ہیں فلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو حقیقت میں فن اسی کو سمجھتے ہیں۔

سینما ایک صوری "فن" ہے۔ تمام صوری فنون سے کم عمر لیکن اس کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوری فنون "حرکت" کے اظہار سے قاصر ہیں۔ بہت ہوا کہ ذرا حرکت کا مفہوم ادا کر دیا۔ لیکن فلم کو یہ دشواری نہیں۔ وہ "حرکت" کو بعینہٖ اور صحیح طور پر ظاہر کر سکتی ہے۔ عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فلم میں تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے اور وہ فلم ہی کیا ہے جس میں حرکت اور اس کا اتار چڑھاؤ اسکا توڑ یا روک دیا جانا اور یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جا سکتا ہے گویا فلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے درمیانی فاصلہ میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور

یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ نے بہتیرے تصویری پوسٹ کارڈوں کے البم تو دیکھے ہوں گے جن پر تحریک کا احساس اور صحت
حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر ایک خاص تسلسل کی بنا پر ایک دوسرے سے منسلک تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری
تصویر میں ڈھل جائے۔ اس متواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا ہوتا ہے یعنی (فلم سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتلائے کہ کیوں کر ہوا؟) اس
کے اظہار پر صرف فلم ہی قادر ہے۔ جب تک واقعہ کی پوری ترتیب اور پوری صحت اور کیفیت اس کی [illegible] میں نہ آ جائے لطف نہیں آتا۔

ناول نگار اپنی منظری تصویر کھینچتا ہے۔ ڈرامہ نگار مکالمے سے یہ کام لیتا ہے۔ فلم نگار کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ فلم لکھنے کے لئے
قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی مرئی اشکال موجود ہوں جو یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر ڈھلتی چلی جائیں۔

ایک کہانی جو فلم کے لئے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے:-

"زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا" یہ جملہ بحیثیت فقرے کے معنی اور اظہارِ مطلب پر پوری طرح قادر ہے۔ لیکن اسے ہو بہو فلم کی
صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے۔ ناول نگار کے قلم سے جب یہ جملہ نکلا تھا تو اس کے ذہن میں اشکال و صور نہیں بلکہ الفاظ تھے یعنی اسی صورت میں فلم
کے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں۔ "اکثر" ایک غیر معین عدد ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں۔ اگر فلم میں زید
کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آتا دکھایا جائے تو کہیں جا کر "اکثر" کا مفہوم پورا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ "اکثر" کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد بھدا ہے ایک
فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی۔ کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب لپکتا
ہے۔ اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ زید اس مکان میں نو وارد نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

"اے وومن آف پیرس" نامی فلم میں جس کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقے پر ادا کیا گیا ہے۔ مکان میں نہ تو بچے دکھائے گئے
ہیں اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا گویا ان کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا۔ زید ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھتا ہے کچھ دیر سیکسوفون بجاتا رہتا ہے۔
پھر اسے خیال آتا ہے کہ میرے پاس رومال نہیں۔ وہ بغیر کسی پس و پیش کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر اور نہایت بے تکلفی سے ایک دراز کھول
کر ایک رومال نکال لیتا ہے

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی۔ بعد میں اسے فلم کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر یہ ہے کہ تصاویر سے کہانی مرتب کی
جائے۔ گویا تصویر بمنزلہ بیج کے ہے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے اس کے برعکس کہانی کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے۔ میں یہاں بعض
اچھے فلموں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں۔ جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست
بطور دلیل پیش کی ہے۔

دی کروزر پوٹمکن۔ دی کیبنٹ آف ڈاکٹر کیلیگاری۔ اے وومن آف پیرس۔ وارننگ شیڈوز۔ دی سالویشن ہنٹرز۔ ورائٹی۔ دی پلگرم۔ برلن
اور دی میزیکل سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے سے ماخوذ یا مستعار نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی
ہے کہ جب کسی ناول کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "ٹیس" کو لیجئے۔ فلم میں خیر ایک قریباً جاہلانہ تصرف کیا گیا
ہے کہ کہانی کو مسرت انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی فلم اکثر حیثیتوں سے کامیاب نظر نہ آئے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ
ٹامس ہارڈی نے جو مطالب الفاظ میں ادا کئے ہیں۔ انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لئے ہارڈی جیسے نکتہ رس دماغ کی ضرورت ہے وہی اتنا تعزیدی پر

تم بار تصویر کے فن میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہو جتنی صورت پرور ناول نگار کے فن میں یہی تھیں تب ہی سے دوسرے چارلس میں مہارت مقابلیت سے موجود تھا۔ اس فلم نے بہترین حصے جن میں فلمکار نے بڑی خوبی سے امکانات صرف کیا ہے، دیکھئے تو [illegible] سے یہ وہ آپ سے [illegible] کی کتاب کا جدید سامنے ایڈیشن کر دیجئے گا۔ اب اس کا مقابلہ ایک اور فلم "سٹرٹ" سے کیجئے یہ ان ناول سے ہی ماخوذ ہے لیکن جو شخص میں پیش کر رہا ہوں اس کے اعتبار سے یہ کامیاب اور مختلف حیثیت سے جانا ثابت ہوا ہے یہ میں کوئی شک نہیں کہ [illegible] ڈائریکٹر وہی ہے جس کا استعمال [illegible] میں کیا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں فلم کی کامیابی کا راز خود ناول میں پنہاں ہے۔ یہ ناول سے اسی قسم کا تقاضا پیش کرتا ہوں۔

"یہ ایک فوجی [illegible] کھڑا ہو گیا اور اس کا ایک ہاتھ سلام کے لئے ٹوپی پر جا پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجسمے نے حس و حرکت کی صورت کر لی ہے۔ زار کے پیش خدمت کا دوپٹہ کے نیچے [illegible] ہوا تھا۔ اور سر کے اوپر [illegible] ہو گیا تھا۔ اس کے بازوؤں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے ساتھ جوڑ دیئے گئے اس کے کندھے زاویوں کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں [illegible] چمکیلی [illegible] اس کے سامنے [illegible] تھا۔

زار دروازے میں کھڑا تھا آنکھوں کے پپوٹے بھرے ہوئے تھے [illegible] نیند سے [illegible] اور [illegible] سے گذر کر بلند ہوئے وہ پیروں تک جا پہنچی تھیں۔ اور اس کیفیت میں غرق [illegible] قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے [illegible] کی مورت چوڑی سی تھی۔ اس کا دہانہ اتنا بائیں کنارے پر [illegible] معلوم ہوتا تھا [illegible] ٹکراتا تھا [illegible] سیدھا شانت کپتان کے پاس سے گذرا [illegible] اور سامنے کے [illegible] سے ٹھوکر ماری۔ اپنی غلطی محسوس کر کے اپنی قاعدے کے مطابق سیدھا کھڑا ہو گیا۔ زار [illegible] اور کپتان کے چہرے پر مرجھی کی طرح زرد چہرہ دکھا۔ نظریں گاڑیں۔ اور بلند آواز میں پکارا۔

"مرادیف"

ایڈجوٹنٹ تین قدم آگے بڑھ کر زار کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ زار نے شانت کپتان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اسے دوبارہ پیدل فوج کی رجمنٹ متعینہ مولیث میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

مرادیف نے حکم کی یادداشت رکھ لی۔ زار کی مطالعہ گاہ کے دروازے پر کوٹ پہنے کا مضبوط جسم اور خشونت آمیز چہرہ نظر آتا تھا۔ آپ نے نیم باز آنکھوں سے معتوب کپتان پر نظر ڈالی جس کی نگاہوں میں غصہ کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور اس کے ابرو کسی قدر اوپر چڑھ گئے۔"

کیا اس سے زیادہ واضح اور سینما کے مقاصد سے اس قدر مطابقت رکھنے والا کوئی ناول لکھا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ بجائے خود ایک تصویر ہے جس میں حسینی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر جب فلم نگار کا قلم ان تصویروں میں رنگ بھرتا ہے تو اور کیفیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً زار ایک جگہ کہتا ہے "سنو میں تمہیں ایک راز بتاتا ہوں۔ میرا باپ بھی قتل کیا گیا تھا اور غالباً میرا بیٹا بھی کسی دن میری طرح قتل کر دیا جائے گا۔"

اب فلم کار کی جدت طرازی دیکھئے کہ زار کے منہ سے یہ الفاظ کہلوانے کی بجائے اس کے باپ والی تصویر دکھائی جاتی ہے جو نہایت موزوں طریق پر ہماری نظروں سے گذرتی ہے زار آخری تصویر کے سامنے جو اس کی اپنی شبیہ ہے ٹھہر جاتا ہے یہ عجیب پر حسرت منظر ہے زار کی آنکھوں میں التجا اور استفہام کی ملی جلی کیفیت نظر آتی ہے گویا یہ کچھ مانگ بھی رہی ہیں کچھ پوچھ بھی رہی ہیں۔

ایک جگہ ناولسٹ لکھتا ہے کہ "زار نے گھونسا تان کر کہا۔ میں زار ہوں اور زار رہوں گا۔" فلم نگار نے یہاں بھی اپنی سحر آفریں قلم کے عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ زار بھاگ کر اپنے دربار کے کمرے میں پہنچتا ہے قاتل پیچھے پیچھے ہیں زار بھاگ کر جبوترے پر چڑھ جاتا ہے اور تخت کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اپنا ہاتھ بلند کر کے کہتا ہے۔

* میں زندہ ہوں، زندہ رہوں گا۔

فلم ساز نے تھوڑی سی جنبش سے اس منظر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جب ناول سے متعلقہ اجزاء کو تصاویر سے ہم نے بہت واضح کر دیا ہے تو ایسی فلموں کی کامیابی پر کیسے تعجب ہو سکتا ہے۔

فلم میں مرئی شکل سے نمٹتے ہیں وہ بآسانی دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ ایک تصویر پردے پر جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لے لیتی ہے، یہ رنگ بدلتے اور نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی شکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں۔ ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے جن کی شرح بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہر خیال کو سینکڑوں طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پورے غور و فکر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے اور ان تصاویر کو مرتب کیا جائے جو سب سے زیادہ واضح ہوں، اور ہمارے مفہوم و معنی کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ کیمرہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے گویا وہ انسان کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پروا تماشائی کی سی آنکھ نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا مطالعہ غائر نگاہ سے کرتا ہے اور فلم کار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت اسے مدد دینے کے لئے موجود ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے۔ تماشائی اگر اس منظر کا پوری طرح مشاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ بالا خانے پر چلا جائے گا تاکہ وہاں سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر بھی اس کی خواہش یہ ہوگی کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل کر ایک ایک چیز پر نظر ڈالے لہٰذا تماشائی کی توجہ پر پوری طرح تصرف کر لیتا ہے۔ تماشائی انہیں چیزوں کو دیکھتا رہتا ہے جنہیں فلم ڈائریکٹر انہیں دکھانا چاہتا ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی مقام پر فلم کار کے جوہر کھلتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں۔

فلم کی قدرت کا دائرہ اس اعتبار سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہلیت رکھتا ہے۔ فلم کار کیمرے کی مدد سے ہر چیز کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ

کیمرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچتا اور انہیں بے نقاب کر دینا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے جو چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سلولائڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کر کے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے محاسن کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن فلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لئے کسی کوشش کرنا ضروری ہے۔

فلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں اہم ہے۔ فلم اپنے لئے الگ زمان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زمان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی حد تک یہ بات ہے کہ امتداد زمانہ کو واضح کرنے کے لئے پردہ گرایا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن فلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا اور کسی ایکٹر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس بعد مکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان حائل ہے دور کر سکے یا اس وقت کو جو فاصلہ طے کرنے میں صرف ہوتا ہے مٹا ڈالے اور تماشائی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر سکے۔

اب دوسری بات ملاحظہ کیجئے۔ سرعت سے وہ مکانی کرنا بھی ساتھ سے شامل ہے۔ ایک شاٹ اس وقت لیتا ہے جب کیمرہ ایک نقطہ پر ہوتا ہے اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ تک پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دیے جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے لیے آپ کی ساری توجہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وقت کو ایک دھارا سمجھئے۔ جس نے سمجھ لیا ہم جیتے ہیں اور جیتے مرتے ہیں۔ فلم کار کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ انتظار کرتے بجائے اس کے ایک نیا زمان پیدا کر دیتی ہے جس میں محض اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ جب چاہے تو لمحہ کو وقت کا مٹا جائے اور دوسری جگہ بہت دکھائی دے اور دو مختلف مقامات میں ایک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور نیز یہ بھی کہ سلسلے کو وقت کا سیاق دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ وہ دو حالات پہلو بہ پہلو بہتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلم میں جب کوئی ایسا منظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے ہیں دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلم کار اپنے فن کے ایسے ہی عجائب دکھا رہا ہے۔

جس طرح آپ فلم میں نیا زمان پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح نیا مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر فلم بند کر لیتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بعد مکانی حائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزا کو ملا کر ایک نیا "فلمی مکان" بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی کولیشوف نامی نے جو فلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کیے تھے۔

۱۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے دہنی جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔
۲۔ دوسری جانب سے ایک عورت آتی ہے۔
۳۔ وہ دونوں ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔
۴۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیڑھیاں بہت دراز ہیں۔ وہ سیڑھیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لیے گئے تھے۔ اور پھر انہیں متذکرہ صدر ترتیب سے فلم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتب واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتے ہیں۔ مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کرکے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً وہ نوجوان ماسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ مصافحہ انہوں نے ایک تھیٹر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے۔ سفید رنگ کی عمارت کا شاٹ کسی امریکن فلم سے لیا گیا تھا (درحقیقت یہ سفید رنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سفید تھا۔ اور سیڑھیاں جن سے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں) اب دیکھئے کہ سلولائڈ کے مختلف ٹکڑے ملانے سے ایک نیا "فلمی مکان" پیدا ہو گیا جو محض نمائش سراب ہے اور درحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی چیز ہے جسے "تخلیقی جغرافیہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوکن سب سے پہلا فلم کار ہے جس نے فلمی مکان و زمان کا تخیل وضاحت سے پیش کیا۔ گو اب دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائریکٹر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ اس سے کیمرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال جو برف پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جا سکتا ہے۔ ایکٹر دیکھئے قطب مینار سے کودتا ہے اور دریائے راوی میں آ گرتا ہے۔ آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھئے۔ اپنے آپ کو شالامار باغ میں پائیے گا۔ خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کئی سال پہلے یا کئی سال بعد شالامار باغ میں قدم رکھا ہوگا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ انسان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ فلم کا فنکار ایک ایسی ہستی ہے جس کے ذریعے سے چپے چپے دنیا پر نظر ڈالے جس نقطہ سے چاہے مشاہدہ کرے۔ اور ساری جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے اس میں یہی قدرت ہے کہ نیا زمان و زمانات پیدا کرے۔ احساس پر مستزاد یہ کہ وہ ڈائریکٹر کی طرح ہش کے سا کسی کا پابند نہیں۔ فلم کے سامنے ساری کائنات اور سارے کا سارا سلسلہ پڑا ہے اسے اختیار ہے کہ زماں و مکاں کے ماضی میں جتنے رنگا رنگ جلوے ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے اور ایک فلم پر کیا موقوف ہے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "اے ومن آف پیرس" کے ایک شاٹ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا۔ اور یہ پہلا فلم تھا جو چارلی کی نگرانی میں تیار ہوا۔ لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں کیا بجز ایک نہایت ہی معمولی مختصر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی وہ آپ کو یاد ہوگی اور میں آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہوگا جس نے دراز سے رومال نکالا۔ تو ایک مردانہ کالر بھی گر پڑا۔ اس نے کالر اٹھایا اور پھر دراز میں رکھ دیا۔ عورت کے مکان میں مردانہ کالر کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہار تعجب نہ کرنا۔ غور کیجئے ایک کتنا بلیغ انداز بیان ہے جس اختصار کی بدولت جزئی باتوں میں کیا کیا نزاکتیں بھری جا سکتی ہیں اور کیا کیا معنی پنہاں کئے جا سکتے ہیں۔ "ان ٹالرنس" میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گریفتھ تھا ایک عورت دکھائی گئی جس کا خاوند کسی عدالت میں ماخوذ تھا۔ وہ بیچاری اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ دیکھیں جج مقدمے کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ یہیں عورت کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ بلکہ ہاتھ جنہیں وہ بار بار مروڑتی ہے لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ تشویش و فکر کے جتنے مظاہرے ہو سکتے تھے ان میں سے ڈائریکٹر نے صرف وہی منتخب کئے ہیں جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں۔

ایک اور مثال سنیئے۔ کچھ عرصہ ہوئے "لاسٹ پرفارمینس" نام ایک فلم لاہور میں دکھایا گیا تھا۔ پال فیجوس ڈائریکٹر تھا اور کونریڈ ویڈٹ ہیرو کا پارٹ ادا کرتا تھا۔ کہانی کا موضوع اگرچہ ایسا شاندار نہ تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جو کرشمے دکھائے تھے ان کے لحاظ سے بہت قابل تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبدہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے۔ صندوق کے پہلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بچ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے تلواریں نکال لی جاتی ہیں لیکن اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں اور صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح و سالم نکل آتا ہے۔ ایک دن مداری کی نیت بدل جاتی ہے اور وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے کھیل ہی کھیل میں سچ مچ قتل کر ڈالے۔ اب غور کیجئے۔ کھیل دیکھنے والوں کو اس ارادہ قتل سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ تماشائی اس کے لئے بے تاب بیٹھے ہیں اور بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھتا ہے مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔ صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سٹیج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے دستے اوپر کی جانب ہیں۔ اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی کہ کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و بے تابی اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا شاٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب حیص بیص اور گومگو میں مبتلا کر دیا۔

مداری سٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک کٹہرا سا بن گیا ہے کیمرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تا کہ مداری کا سر تلواروں کے دستوں کے عین اوپر نظر آئے تلواروں کے دستے بوجھل ہیں اس لئے ان میں ایک لرزش سی پیدا ہو رہی ہے اور پھل جھک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہولناک چہرہ دکھائی دیتا ہے اس شاٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی۔ جو آرکسٹرا کے گمبھیر زناٹے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

ایک منظر جب پرقلمی بن رہی تھی [illegible] ... جب سامنے [illegible] ... اس
سے کئی چھ شاٹ میں آپ کو دکھائی دیا گیا ہے [illegible] ... سے قریبی
شاٹ لیا گیا ہے اس کے بعد تین شاٹ [illegible] ... دکھا دیا گیا ہے [illegible] ... شاٹ میں [illegible] ... ہوتی ہے
تیسرے میں [illegible] ... ہے تیس شاٹ [illegible] ... کی
[illegible] ... پورے منظر
کی تصویریں [illegible] ... کی ایک دو مثال ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ [illegible] ... شاٹ لیا گیا ہے
[illegible] ... ہندوستان میں [illegible] ...
[illegible] ... تماشائیوں کو [illegible] ...
اور تماشائی [illegible] ... مختلف مناظر کے بعد
[illegible] ... تھا۔

ان مثالوں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ تصویروں کے انتخاب میں [illegible] ... ہیں مناظر کے
فلم کار کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ کیمرے کی کارفرمائیاں نہیں بلکہ فلم کار [illegible] ... سکتا ہے
لیکن یہ فیصلہ تو فلم کار ہی کا کام ہے کہ وہ کیا دیکھے اور کیا دکھائے۔

فلم کے مناظر جیسے فن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے فلم کار ایسے نئے نئے طریقے دریافت کرتے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ فلم کی جزئیات کو نمایاں کرکے پیش کرسکتا ہے۔ ان نئے نئے طریقوں کے طفیل ڈائریکٹر کو یہ قدرت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ غیر اہم واقعات پر کم اکتفا نہیں کرتا، اہم واقعات کو زیادہ نمایاں اور واضح کرکے پیش کرتا ہے، ان میں رنگ بھرتا ہے اور جو واقعات زیادہ توجہ کے محتاج ہیں انھیں ہمارے ذہن پر نقش کردیتا ہے۔

تصویر کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کرنے کا ایک طریقہ "کلوز اپ" یا قریبی شاٹ ہے۔ کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے تو قریبی شاٹ سے وسطی شاٹ تک پہنچتا ہے اور وسطی شاٹ سے ہٹتا ہے تو بعیدی پر آ ٹھہرتا ہے گویا جوں جوں جزوی حرکات کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے جب تصویر مدھم ہوتے ہوتے غائب ہوجاتی ہے تو تماشائی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ماحول سے رفتہ رفتہ جدا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ابھرتی ہے تو جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اوقات کیمرہ گھومتا ہے اور پورے منظر کو قلم بند کرلیتا ہے بعض اوقات سارا وسیع منظر سامنے ہوتا ہے۔ تمام جزئیات دکھائی دیتی ہیں۔ اور پھر کسی ایک جگہ پر تماشائی کی توجہ مرکوز بھی کردی جاتی ہے یعنی کوئی چیز جسے نمایاں کرنا مقصود ہو ایک چھوٹے سے حلقے میں اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ وہ ساری توجہ جذب کرلیتی ہے پھر کبھی ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ان مختلف طریقوں کی فلم سازی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ چنداں محتاج بیان نہیں۔

اب تدوین یعنی "ایڈیٹنگ" کو لیجئے جسے فلم سازی کا آخری مرحلہ سمجھنا چاہئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سارے مناظر کو فلم بند کرلیا جاتا ہے، تو سلولائڈ کو کاٹ کر شاٹ الگ الگ کرلئے جاتے ہیں پھر ہر شاٹ میں کسی قدر قطع و برید ہوتی ہے اور آخر کار سب شاٹ مناسب ترتیب و تسلسل سے جوڑ دئے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں آج کل ایڈیٹر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ فلم کے بگڑنے [illegible] بننے کا دار و مدار [illegible] ہوجاتا ہے تو کہیں ایڈیٹر کی بابت

جتنی تیسری اور ڈکس کے کام کو فلم سازی کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں کم جانتے آئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو نیا وہ دماغی محنت صرف نہیں کرنا پڑتا وہ مشین کی طرح ایک ڈھرے پر بندھے ہوئے قاعدے پر چلتا ہے یعنی مختلف شاٹ جمع ہو جاتے ہیں تو انہیں کاٹ کر جوڑ دیا جاتا ہے لیکن روسی اور جرمن ڈائریکٹر تدوین کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تدوین کی بجائے تعمیر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تدوین ہی حقیقت کی اپج اور تخلیقی قوت کا سلسلہ ہے … ضرورت ہے۔ … مضمون کے اختتام سے پہلے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تدوین کو صاف طور پر سمجھا جائے اور اس سلسلے میں یہ بھی … [illegible] بعض باتوں کے لئے مجھے الگ عنوان قائم کرنے پڑیں گے۔ ایک تو تعلیمات نے کہا تھا کہ تمام فنون لطیفہ میں دو چیزیں ضروری ہیں ایک تو مواد اور اس کی ترتیب کا اسلوب۔ یہ ضروری ہے کہ مواد کو اس فن سے خاص مناسبت ہو یعنی کا مواد مختلف شکلیں ہیں جنہیں وہ کینوس کی سطح پر ترتیب دیتا ہے مغنی کے نزدیک آوازیں مواد ہیں جنہیں وہ لے کے مطابق مرتب کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فلم ساز کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس کی ترتیب کا طریقہ کیا ہے۔ پڈوفکن کے نزدیک فلم کا مواد اس کے اجزا یعنی مختلف شاٹ ہیں اور ان کی ترتیب کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ایک خاص تسلسل سے جسے ذہن کی تخلیقی قوت معلوم کر سکتی ہے جوڑ دیا جائے۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے نزدیک فلم سازی کا فن ایکٹروں کی حرکات و سکنات سے شروع ہوتا ہے اور شاٹ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ سب فلم کی تیاری کے مراحل ہیں۔ فلم ساز کا اصل کام تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ڈائریکٹر فلم کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے لگتا ہے کیونکہ انہیں جیسے جوڑا جائے ویسے ویسے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

فلم ایڈیٹر کے ذمہ دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو اس امر کا فیصلہ کہ شاٹ کتنا لمبا ہے دوسرے یہ بات کہ شاٹ کس ترتیب سے جوڑے جائیں ان دونوں باتوں میں سے ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ فلم کے معنی کا انحصار اجزا کے سیاق و سباق اور ان کے باہمی ربط پر ہے جس طرح ایک جملے کے معنی کا انحصار الفاظ کی ترتیب پر ہے اسی طرح فلم کے معنی بھی اجزا کی ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو جملے لیجئے: "کتے نے آدمی کو مار ڈالا"، "آدمی نے کتے کو مار ڈالا"۔ دیکھئے لفظوں کی ترتیب میں تھوڑے سے الٹ پھیر نے سارے جملے کے معنی بدل ڈالے۔ یہ مثال فلم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ ایک متبسم چہرے کا شاٹ لیجئے۔ دوسرا شاٹ ایک پستول کا ہو جو نشانے پر تنا ہوا ہو اور تیسرا شاٹ اسی چہرے کا لیکن اب تبسم کی بجائے چہرے پر بل پڑے ہوئے ہوں۔ اگر یہ تینوں شاٹ اسی ترتیب سے دکھائے جائیں تو آپ ان کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص … دیکھ کر خوش نہیں ہوا اب ساری ترتیب الٹ دیجئے یعنی آخری شاٹ پہلے آ جائے اس کے بعد پستول نظر آئے پھر متبسم چہرہ دکھائی دے تو اس کے معنی بالکل بدل جائیں گے۔ اسی مثال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو شخص فلم کے اجزا کو ترتیب دیتا ہے (اسے ڈائریکٹر کہیے یا ایڈیٹر کے نام سے پکاریے) بہر حال وہی فلم کا معمار ہے۔ فلم کی کامیابی میں ایکٹر کی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں۔

بعض روسی ڈائریکٹر تو تدوین کی قدرت کے اس حد تک قائل ہیں کہ ان میں سے ایک نے تدوین کی رنگا رنگیوں کو واضح کرنے کے لئے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے اس نے کسی فلم سے مشہور روسی ایکٹر موس یوخین کے کئی "کلوز اپ" یعنی قریبی شاٹ لئے۔ اس نے کلوز اپ بھی ایسے منتخب کئے جن میں ایکٹر کے چہرے پر کسی جذبے کے اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔ پھر اس نے اپنی فلم کے دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ تین مختلف طریقوں پر شاٹ جوڑ دیا۔ ایک کلوز اپ کے ساتھ ایک شاٹ جوڑا جس میں میز پر شوربے کی ایک پلیٹ پڑی دکھائی گئی تھی۔ ان دونوں کے ملنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موس یوخین شوربے کی جانب دیکھ رہا ہے دوسری مرتبہ اس نے اسی کلوز اپ کے ساتھ ایک اور شاٹ جوڑا جس میں ایک مردہ عورت کا تابوت دکھایا گیا تھا۔ تیسری مرتبہ اس نے ایک لڑکی کا شاٹ لیا جو کھلونوں سے کھیل رہی ہے۔ اور اسے موس یوخین کے کلوز اپ سے جوڑ دیا۔ اس ڈائریکٹر نے …

کی علم سوسائٹی نے سلسلے میں کے نتائج کی دلچسپ داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں ایسے لوگوں کو دکھائی گئیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ ایکٹر کے کمال فن کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ انہیں پہلی تصویر میں ایکٹر کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے۔ ان کو یا معلوم ہوا کہ وہ سوپ کی پلیٹ کو بھول بیٹھا ہے اور اس کی طرف اب کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دوسری تصویر پر انہیں ایکٹر کے چہرے پر غم و ملال کی کیفیات نظر آئیں گویا مردہ عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے۔ تیسری تصویر میں انہیں ایکٹر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم دکھائی دیا گویا وہ بچی کو کھیلتے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلاً کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سب سے زیادہ ایڈیٹر کو اہمیت حاصل ہے۔ بڑا ایکٹر یا ڈائریکٹر ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایڈیٹر کو اتنا حقیقت نہیں سمجھتے تاہم انہیں ماننا پڑے گا کہ شاٹ کے اثر کا انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزا کی ترتیب میں ایڈیٹر کو مطلق کلی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزا کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹر میں یہ سمجھ بوجھ بھی ہونی چاہیے کہ اجزا کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف سروں کا اتار چڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی بھی اثر پیدا کرتی ہے اسی طرح فلم میں بھی شاٹوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ یہ آہنگ و تناسب کا سوال ذرا پیچیدہ سا ہے اور اس قابل ہے کہ جنہیں شغف رکھنے والے لوگ اس کا مطالعہ مجھ سے زیادہ تفصیل سے اس جانب اور ... میں صرف چند ضروری باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں پڈوکن نے یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ مختلف مقاصد کے لیے آہنگ میں کیا تبدیلی ہوتی ہے یعنی شاٹ کس رفتار سے آتے ہیں۔ رفتار کس طرح بدلتی رہنی چاہیے۔ اس سے شاید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو فلم بند کرنے میں موضوع و عمل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

عنوان

• مزدوروں کی بغاوت فرو کر دی گئی:

۱۔ تصویر آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ زمین پر خالی کارتوس اور بندوقیں پڑی نظر آتی ہیں۔

۲۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک لمبا پشتہ گزرتا ہے۔ جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں۔

۳۔ ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے کھمبے کے ساتھ ایک پھٹا ہوا جھنڈا لٹکا ہوا ہے۔ یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے۔ یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۵۔ پھٹا ہوا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکوت اور غم پایا جاتا ہے۔ ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں اس لیے تحلیل ہو جاتا ہے تاکہ ناظر کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ

آہستہ آہستہ نمودار ہونے اور غائب ہونے سے بھی یہی واضح کرنا مقصود ہے کہ فلم کا یہ مختصر سا حصہ بذات خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے اب ایک پُرشور اور ہنگامہ خیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ ایک گوشے سے مزدوروں کا ہجوم نمودار ہوتا نظر آتا ہے وہ لینز کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں سب کے سب یکے بعد دیگرے لینز کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔

۲۔ ایک مزدور ایک اونچی سلاخ پر سے گرتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر یک بیک ٹھہر جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

عنوان :-

"سب سے پہلی دکان کو بچاؤ"

۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۴۔ دھواں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے۔

۵۔ مزدور جو کرین پر چڑھا ہے جھک کر نیچے دیکھتا ہے۔

۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے۔)

۷۔ مزدور جو کرین پر ہے پوری قوت سے چلاتا ہے

"پہلی دکان کو بچاؤ"

۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے بھاگتے ہوئے مزدور ٹھہر جاتے ہیں تھوڑی دیر توقف کرتے ہیں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں۔

۹۔ ایک عورت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۰۔ فوراً ہی دکھایا جاتا ہے عورت گر کر پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔

۱۱۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پردہ پر اپنے اصل وقت سے آدھ سیکنڈ زیادہ دکھایا جائے تو سارا تناسب خاک میں مل جائے گا اور جو اثر پیدا کرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے یہ مثال بھی پڈوکن نے ہی پیش کی ہے اور کسی بازار کے حادثے کے متعلق ہے حادثہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔

۱۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک راہگیر بازار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے پاس سے ایک موٹر کار گذرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔

۳۔ جو بدنصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھول دیا ہے۔

۴۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔

گھسٹتے ہوئے پہیئے کے قریب ٹانگیں نظر آتی ہیں۔

وہ مڑ کے پیچھے گھورتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ کلاک ٹاور گری ہے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔

اس واقعہ میں گھر سے روانہ ہونے والے لمحے کو دو سیکنڈ کے بجائے ایک منٹ تک ملا کر دکھایا جاتا تو سارا اثر زائل ہو جاتا۔

یہ آخری تدوین کی مثالیں ہیں۔ یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے۔ جسے اصطلاح میں "تخلیقی تدوین" کہتے ہیں۔ جس میں ایڈیٹر کے ذہن رسا کے عجیب عجیب کرشمے نظر آتے ہیں۔

میں گذشتہ اسباق میں "دی لاسٹ پرفارمنس" نامی ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ چند اشخاص تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر مسمریزم ان پر عمل کر رہا ہے اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لئے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے۔ صحیح عمل پیدا کرنے کے لئے پہلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اور وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں ملی ہوئی نظر آتی تھیں اس دوسری تصویر میں بڑے بڑے اونچے مکانات جیسے نقشے میں ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے جب عامل کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور دھندلے سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور پھر کیمرہ قریب آ جاتا ہے یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے یکے بعد دیگرے دکھائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں اس طرح پردے پر رنگ برنگی شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی جھوم رہی ہے چنانچہ اس کا نتیجہ حیرت انگیز ہوا ـــــ ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے اس کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کمال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڈوکن نے اپنی فلم "دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ" سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جنگ کے مناظر کا کام میں میں ایک ہولناک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہ یہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے۔ میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کر دیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ لیا۔ اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ فلم کے کسی کام کا نہ تھا پردے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی بہتیرے تجربات کے بعد آخر کار میں فلم کے پردے پر دھماکہ پیدا کرنے اور اس کے تمام اثرات دکھانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جو شاٹ لیا اس کا کوئی ٹکڑا استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی میں نے ایک شعلہ سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شور و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لئے "میگنیزیم فلیش" سے کام لیا اس شاٹ کے درمیان میں نے ایک دریا کا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانہ میں لیا تھا اس طرح پردے پر وہ مرئی شکل جسے میں پیدا کرنا چاہتا تھا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن اس غرض کے لئے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی تھی جو در حقیقت دھماکہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہو۔

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ماہر تدوین ہی فلم کو جنم دیتی ہے حقیقت محض خام مواد مہیا کرتی ہے جس سے ایڈیٹر اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے حقیقت اور فلم میں یہی تعلق ہے ـــــ فلم کے مضمون کو انہی الفاظ پر ختم کر دینا چاہئے میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے تعلق رکھتا ہے ہندوستان میں وہ لوگ جو سینما کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین فلم دکھائے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی انگلستان کے بڑے بڑے شہروں کیلئے بھی قابل رشک ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ سینما کے قدر پرست اشخاص اور قدامت پسند سنسر کے نزدیک کبھی کبھی ایک اکثر ایسے فلم مردود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل کی عظیم ترین کامیابی کہنا چاہئے اور پبلک کو ان کے دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

امید ہے جب آپ اس طرح کی تبدیلیوں کو میری دوسری کاوشوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ مضمون مفید معلوم ہو گا۔ (نیرنگ خیال)

انگلستان کا جدید تھیٹر

پطرس

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دلچسپی ہے اس لئے سفر یورپ کے دوران میں، میں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اسی کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصود صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آکر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا۔ یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلۂ مضامین شروع کروں گا۔ میرے احباب میں سے سید امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گورودت سوندھی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پورا کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر کبھی کبھی امتیاز صاحب کو خط لکھتا رہا۔ اور واپسی پر بھی انہیں سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سوندھی، سو میرا انہیں کچھ بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ایسے حالات میں ہرگز اس بات کے لئے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ رائے نہ ہوتی کہ میرے بعض بعض مشاہدات قارئین نیرنگ خیال کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں تو یہ مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا بے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کماحقہ بیان کرنا بے حد مشکل ہے دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی مستفید یا محظوظ نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامل کے شاہد تو ضرور رہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا۔ جس کا نام فیسٹی ول تھیٹر (FESTIVAL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے۔ خوش قسمتی سے اس تھیٹر کا افتتاح عین اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا لیکن اس کے لئے ایک مدت سے تیاریاں ہو رہی تھیں اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر نہ ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں ٹائمز کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی کے کھلتے ہی پہلا کھیل دکھایا گیا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں وہاں فیسٹی ول تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے گئے تھے۔—

> "فیسٹی ول تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ صرف اور صرف اعلیٰ پائے کے ڈرامے سٹیج پر پیش کرے۔ اس بات کا مطلق خیال نہ رکھے کہ لوگوں کو کس چیز کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو محض آرام کے لئے تھیٹر میں آتے ہیں یا جو ناموں کی کثرت تماشے کے مطالعہ کرتے ہیں، وہ ناٹک کے فن کے تقاضوں پر غور نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ... کا تصور کرتے ہیں۔ دنیا کے سب سے دلچسپ آرٹ کا یہاں مذاق اڑایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جو تھیٹر محض تجارتی اصول پر چلائے جاتے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی اس کو تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا انتظام ایسے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی نہیں رکھتا۔ لہٰذا وہ لوگ جو اس فن کے دلدادہ ہیں اور اس کی ترقی، اس فن کے لئے اعلیٰ نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں میں عمارت کی ساخت اور سٹیج کا سامان پچھلی صدی سے چلا آتا ہے اور جدید ترین طرز کا ڈرامہ ممکن نہیں ہو سکتا۔"

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اعلیٰ فن سے محض بے خبر ہے اور صرف عامۃ الناس کی اسفل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کیونکہ روپیہ کمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے۔ دوسری بات یہ کہ تھیٹروں کا طرز تعمیر اور سٹیج کی مشینری وغیرہ خود انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ اور بے کار ہے۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مضمون کو اس قدر طول دینا کہ ہر تفصیل سمو جائے میری طاقت اور وسعت خیال کی ضخامت سے افزوں ہے۔

انگلستان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک میں ایک ہی کھیل ہر رات مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے۔ دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کھیل بہت ہی مقبول ہو تو سال ڈیڑھ سال دو سال تک آمدنی کا ذریعہ بنا رہتا ہے اور کوئی برا کھیل فیل ہونے پائے تو دوسرے ہی دن فیل ہو جائے۔ جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح اپنی مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے فیسٹی ول تھیٹر میں ہر ایک کھیل صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ تھیٹر یونیورسٹی ہی کے سر پر قائم ہے۔ کیونکہ یہاں کھیلوں کا جو معیار ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہونے چاہئیں۔ جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اسی لئے اس تھیٹر کا قیام لندن یا کسی بڑے شہر کی بجائے کیمبرج ہی میں مناسب سمجھا گیا۔

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعت نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو جدید سے جدید کھیل جو عام تھیٹروں کے مالک اس ڈر کے مارے قبول نہیں کرتے کہ کہیں ان کی جدت عامۃ الناس کے ناپسند نہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے پیش کئے جاتے ہیں (بشرطیکہ ان میں فن کے اعتبار سے کوئی خاص خوبی ہو) اور دوسری طرف قدیم سے قدیم یونانی کھیلوں کے دکھانے میں ماہرین تھیٹر کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک نہ ایک نمونہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ملک و قوم کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ یہاں میں نے جرمن اور فرانسیسی اور امریکن اور ہسپانوی آسٹرین اور نارویجن سبھی مصنفوں کے کھیل دیکھے ہیں البتہ ہوتے سب انگریزی زبان میں ہیں۔ اور پھر اس کے علاوہ ٹریجڈی کامیڈی فارس وغیرہ سب اصناف ڈرامہ شامل کئے جاتے ہیں۔

سال کی سٹیج کا حال خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ یہی چیز ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس کہ میرے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس سے خالی سٹیج کا منظر پیش کرسکوں۔ یہ کام تصویر نمبر ۱ سے نکالنا پڑے گا (اس تصویر میں جو سٹیج پر جو سین لگا ہوا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے۔ سٹیج کا بہت سا حصہ سیزیوں کی وجہ سے رُک گیا ہے۔ ہم جو حصہ نظر آتا ہے وہ بعض حالات بیان کرنے کو کافی ہے)

پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان کوئی بڑی سیڑھیاں ہیں جو تصویر میں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں (سٹیج کے اوپر جو سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں۔ لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں وہ تھیٹر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں) گویا اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوں۔ تو سٹیج آپ کے پاس سے بتدریج اٹھنی شروع ہوتی ہے حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے بڑی سطح پر پہنچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ سٹیج کی سیڑھیوں اور سین کی سیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے۔ اس حصے پر آپ غور سے دیکھیں تو حلقے کی شکل میں ایک خط سا کھنچا ہوا ہے۔ یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ بھی سیڑھیوں کے نیچے آکر چھپ گیا ہے۔ اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ سٹیج کا ہے وہ باقی سٹیج سے علیحدہ ہے اور بوقت ضرورت اس حصے کو گھمایا جا سکتا ہے۔

سٹیج ساری کی ساری ایک ہی ہموار سطح نہیں بلکہ اس کا پچھلا نصف حصہ اور بھی ایک درجہ اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔

اس تصویر میں سب سے پیچھے جو ایک سفید سا پردہ نظر آتا ہے وہ دراصل ایک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے جلتی ہوئی شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچانے کے لئے ہاتھ کو خم کر کے شمع کے پیچھے رکھ دیتے ہیں۔ یہ دیوار کھوکھلی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکٹروں کی آواز اس سے کوئی منعکس ہو سکے اور اس پر بہت ہی پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی ٹکر سے خراش وغیرہ آنا بہت محال ہے اس دیوار کو اصطلاح میں سائیکلوراما (Cyclorama) کہتے ہیں اور یورپ کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا لازمی ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ تصویر نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایکٹر کو سٹیج پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکٹروں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا۔ ورنہ تقریر کی وہ تمام خوبیاں جو آواز کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہیں ضائع ہو جائیں۔ تھیٹر کے اس حصے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے۔ وہ دو سیٹیں اوپر کی منزلوں میں ہیں اور فرش کی نشستیں بتدریج اوپر کو اٹھتی جاتی ہیں۔ گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی پر کرسیوں کی ایک قطار رکھی ہے صرف دو رستے آمدورفت کے لئے خالی چھوڑ دئے ہیں۔

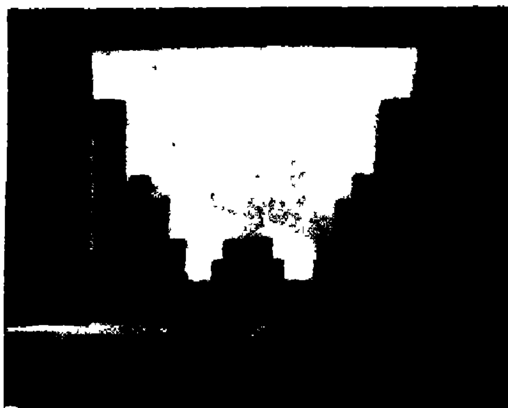
یہ تو عمارت کا حال ہوا لیکن اس تھیٹر کا سب سے ضروری جزو جس کی وجہ سے اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹروں پر تفوق حاصل ہے اور جو اس کے لئے خاص طور پر باعث ناز ہے وہ یہاں کی روشنی کا انتظام ہے۔ فٹ لائٹس یعنی وہ لیمپ جو سٹیج کے کنارے پر ایکٹروں کے قدموں میں لگے ہوتے ہیں اور جن کا رخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ قطعاً مفقود ہیں سامنے سے روشنی ڈالنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لیمپ لگے ہیں (تصویر نمبر ۲) جن کا رخ سٹیج کی طرف ہے اور جو ٹھیک حساب کے ساتھ ایسے زاویے پر لگائے گئے ہیں کہ ان کی روشنی سٹیج یا ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوراما پر نہیں پڑتی۔ ورنہ ایکٹروں کے سائے سائیکلوراما پر پڑا کریں۔

سٹیج کے اوپر ایک چھت سا بنا ہے (اس کے محل وقوع کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو سٹیج کے عین وسط میں آگرتی ہے) اس پر لیمپوں کی قطاریں لگی ہیں بعض کا رخ تو بالکل نیچے کی طرف ہے لیکن چند لیمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوراما پر پڑتی ہے اور بس۔ سات سات لیمپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لیمپوں کے سامنے قوس قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔

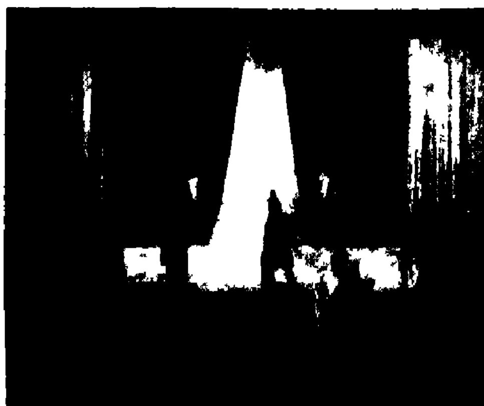
١



٢



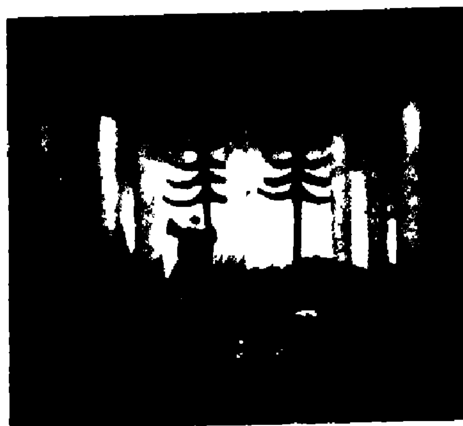
٣



٤



٥



٦



٧



٨



اور جو صرف انہی سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کر کے ان کو مختلف تناسب میں ملا کر نیا ایک رنگ بنایا جا سکتا ہے اس سے سائیکلوراما پر جس قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو ڈالی جا سکتی ہے۔

ان لیمپوں کے علاوہ اور بھی لیمپ ہیں جو مختلف موقعوں پر لگتے ہیں لیکن ان کا بیان ضروری نہیں۔

سائیکلوراما کے لیمپوں کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اگر ان کے سامنے عام قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرارت کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ مدھم پڑ جاتا ہے اس لئے ان میں ایک [illegible] قسم کا شیشہ استعمال کیا جاتا ہے جو جرمنی میں بنتا ہے اور جو بہت مہنگا ہوتا ہے۔

صرف ایک اور بات کا ذکر باقی ہے اس کے بعد اس سٹیج کے گرد [illegible] کر دوں گا۔ [illegible] لیمپ کے جلانے کا سوئچ علیحدہ ہے نہ صرف یہ بلکہ اس سوئچ کے ساتھ ایسا انتظام بھی ہے کہ لیمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل بے معلوم طور پر مدھم یا تیز کی جا سکتی ہے تمام لیمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں۔ جہاں لیمپوں کی قطاروں کی قطاریں لگی ہیں اور جہاں سے تھیئٹر کا ماہر روشنی اپنا کام کرتا ہے۔ اس ماہر کو اپنی نشست پر سے سٹیج بالکل نظر نہیں آتی۔ لیکن مسٹر رچ جو آج کل وہاں یہ کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف لیمپوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائیکلوراما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہوگی۔ ان کو کسی رنگ کا کپڑا دکھا دیجئے وہ بجلی کے لیمپوں کو اوپر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلوراما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں سر مو تفاوت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ریہرسل کے دوران میں جب ڈائریکٹر مختلف رنگ آزماتا رہتا ہے تو ہال اور بجلی کے کمرے کے درمیان ٹیلیفون لگا دیتے ہیں ڈائریکٹر تو تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر ہدایات دیتا رہتا ہے کہ مثلاً سرخی مائل کہربائی رنگ مطلوب ہے۔ ماہر روشنی اپنی آنکھ سے محض بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر اس کی تعمیل کرتا ہے حالانکہ سائیکلوراما خود اسے نظر نہیں آتا ـــــ

تصویر نمبر ۱ میں سائیکلوراما کو دیکھئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دور تک پھیلی جا رہی ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے فداوند [illegible] تین ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات الگ ہیں پردے پر پینٹ کی ہوئی سینری تو غیر ذہین سے ذہین تھیئٹر بھی وہاں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ فیسٹی وال تھیئٹر کا رجحان زیادہ تر ایسی سینری کی طرف ہے جس میں انتہا درجے کی سادگی سے بڑے سے بڑا کام نکل سکے۔ تصویر نمبر ۱ کا سین محض لکڑی کے کندوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن سیڑھیوں اور ستونوں کے تناسب سے پاکیزگی اور رفعت ٹپکتی ہے سائیکلوراما کا رنگ اس سین میں آسمانی ہے۔

تصویر نمبر ۲ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سے سائیکلوراما دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک ڈرامے کا آخری سین ہے کھیل اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ سٹیج پر آ گئے کو بڑھتا بڑھتا سیڑھیوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیئٹر سے باہر نکل گیا۔ فیسٹی وال کی یہ خاص جدت ہے کہ اکثر اوقات ایکٹر تماشائیوں میں سے ہو کر سٹیج پر آتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں البتہ یہ صرف وہیں کیا جاتا ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر نمبر ۴ ان کی سینری کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما) کا رنگ شہابی ہے جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کئے گئے ہیں۔

تصویر نمبر ۵ دوسرے منظر میں بہت ہی گھنا جنگل دکھانا مقصود تھا (اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک تو سائیکلوراما روشن ہے اس کے علاوہ دائیں بائیں دو چھپے ہوئے لیمپوں سے روشنی کی شعاعیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں) بے شمار ستونوں میں دو تین درختوں کو کھڑا کر دیا۔ یہ ستون اور بھی کئی ڈراموں میں استعمال ہوں گے۔ اس لئے درخت گو صرف تین ہیں لیکن جو اثر پیدا کرنا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک خوابی فیکٹری دکھانے کے لئے جو جو انتظامات کرنے پڑے ان کو سوچتے ہوئے دماغ گھبراتا ہے لیکن اس تھیٹر والے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ سٹیج کے اوپر کے پل پر جو لیمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لیمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لیمپ روشن کر دیا نتیجہ تصویر نمبر ۶ سے ظاہر ہے۔

تصویر نمبر ۷ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے۔ ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ دو لاشوں کی ممیاں بنائے جا رہے ہیں۔ صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن چونکہ آخری سین ہے اور کیریکٹروں سے لوگ کب کے آشنا ہو چکے ہیں اس لئے اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

سائیکلوراما پر روشنی کی بجائے سائے ڈالنے کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجئے جو میرے خیال میں بہ اعتبار فن کامیاب تر ہے۔ (تصویر نمبر ۸) شیکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سویا ہوا ہے۔ اور طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی ہیں سٹیج پر ایک لیمپ کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے سائیکلوراما پر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر میرا کچھ بیان کرنا بے معنی ہوگا اس لئے اس قصہ کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں اس امید پر کہ ان چند مثالوں سے قارئین کو اس تھیٹر کے طرز و نہج کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا۔

صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ایک تو تصنیف ہی بالکل نرالے طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا وہ بھی سٹیج کے فن کی بعض جدت طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے اس کھیل کا نام (THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے اس کھیل میں جو پیغام مضمر ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس سے کم درجے پر انگلستان اور یورپ کے بعض اور ممالک میں حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزارہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور احساس کی تمام لطافتیں مر چکی ہیں۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں۔ برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک بے رونق سی مصروفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر اٹھنا۔ اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی پر بیٹھنا۔ وہیں سر نیچے جمع لگاتے رہنا۔ ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح نہیں۔ کوئی انوکھے خیالات نہیں کوئی ترقی کی امید نہیں اس کاروباری دنیا میں نیرنگی بالکل مفقود ہے۔ بے رنگ یکسانیت چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک اور دوسرے کلرک یا ایک مزدور یا دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ سب ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کولہو کے بیل کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح نمبر ہے

سے ہوئے ہیں۔ سینی کسی میں کوئی انفرادیت نہیں کسی کی کوئی خاص شخصیت نہیں گویا یہ ذی روح اشخاص نہیں، جاندار مشین ہے۔ ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کا کام کرنے کو اس سلسلہ وار ایک پر ایک ایک لیبل لگا دیا جائے اور کوئی طریقہ نہیں۔ اسی لئے افراد کو نمبروں سے تعبیر کیا گیا ہے صرف چونکہ کھیل کے ہیرو یعنی مجبور انسان تماشیوں میں ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے میز کرتا ہے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ، دراصل کسی پلاٹ کا ڈھنگ دو لوں سا تو سب تو بیان کرتا ہوں گا۔ میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ تفصیلات میں کمی بیشی ممکن ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے) پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے۔ میاں بیوی دو بستروں پر ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ بیوی بدمزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ڈانٹتی رہتی ہے۔ گلہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر میں بے حقیقتی ہے بلکہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں۔ ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں طبعاً روانی کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا۔ چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ صرف کبھی کبھی جب لمحہ بھر کے لئے بیوی آرام لینے کے لئے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفے میں مسٹر صفر کے دماغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجتے رہتے ہیں۔ اس کو یوں ادا کیا گیا کہ جہاں بیوی چپ ہوئی تب پردے کے پیچھے پانچ ایکٹر بھاری اور نازک اور نہایت کی مدہم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سا سلسلہ دہرانے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بیوی پھر بولنے لگ جاتی۔ اس دوران میں مسٹر صفر لب تک نہ ہلاتا تھا۔ صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ جو ایکٹر پردے کے پیچھے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک بجلی کے آلے کے ذریعے سے تمام ہال میں گونجتی تھیں۔ گویا پانچ چھ آوازوں والا عجیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفر کی روح روزمرہ کی بے رنگ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے اتنی مردہ ہو چکی ہے اور نئے خیالات کے پیدا ہونے کی طاقت اس حد تک سلب ہو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ دل و دماغ پر اس مشین کی طرح طرز زندگی نے اس قدر قابو پا لیا ہے۔

دوسرا سین دفتر کا ہے۔ پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا ڈبل فلاڈیسک ہے دونوں طرف دو اونچے سٹول ہیں۔ جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں ایک طرف مسٹر صفر بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے ڈیسک کے عین اوپر ایک لیمپ لٹک رہا ہے۔ لیمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جو پیلی پیلی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سا نیچے ڈیسک پر پڑ رہا ہے وہ ارد گرد کی تاریک فضا میں نمایاں نظر آتا ہے یہ سب سامان سٹیج کے اس حصے پر ہے جو گھمایا جا سکتا ہے مسٹر صفر اور لڑکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھجے لگا رکھے ہیں لڑکی کے سامنے بل فارموں کا ایک ڈھیر ہے ایک بل کو اٹھاتی ہے رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھاتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے غرضیکہ متواتر یہی کئے جاتی ہے۔ مسٹر صفر ہر رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے یہ رقمیں جس لہجے میں بولی اور دہرائی جاتی ہیں اس سے تھکن اور بے رونقی ٹپکتی ہے بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھائے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مردہ ہوسوں اور شکست خوردہ امنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفر کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو یہاں شاید برسوں سے اسی لڑکی کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے لیکن کبھی جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دل میں یہ امید ہے کہ آج زہے نصیب میری ترقی ہو گی آخر اتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں مالک کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفعہ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ "نوازش" لیکن کیا معلوم کبھی تو اس کو خیال آئے گا کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

اسٹیج پر منظر کی سیٹی بجتی ہے دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ شعلوں پر سے اترتے ہیں۔ دونوں کی حرکات میں، اس حد تک مماثلت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں۔ لڑکی باہر چلی جاتی ہے مسٹر صفر جانے ہی کو ہے کہ مالک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے۔ بڑے تحکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہوئے کتنے سال ہو گئے تم کیا کام کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں مسٹر صفر سے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے ہو یعنی رقمیں جمع کرنے کا اس کے لئے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں نے منگالی ہے اس لئے تم کل سے برخاست کئے جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بہت تیز تیز بولتا ہے مسٹر صفر کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں سنتا۔ اس بحث کے درمیان میں دونوں کی آوازیں بلند تر ہو جاتی ہیں سٹیج گھومنے لگتی ہے لیکن مسٹر صفر اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ سٹیج گھومتی رہتی ہے لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں گفتگو اور بھی تیز ہو رہی ہے سٹیج پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کبھی جلتی کبھی بجھتی ہے پردے کے پیچھے سے ایکسٹرا ڈراؤنی سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں، جو رفتہ رفتہ مہیب تر ہوتی جاتی ہیں۔ الفاظ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ کہیں ایک گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے قسم قسم کے شور سنائی دیتے ہیں مسٹر صفر پر سے قابل اعتبار اس کے ٹک مار رہے ہیں مالک پر حملہ کرنے کو بڑھتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سٹیج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشائیوں کے دل دہلنے لگتے ہیں مسٹر صفر دفعتاً اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے یک لخت ایک دھماکا سا سنائی دیتا ہے (یہ آواز پہیے کے ایک تھال کو زور سے زمین پر مار کر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں مکمل خاموشی اور تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر جو دوبارہ لیمپ روشن ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو زور سے داد دیتے ہیں۔

یہ اس حیرت خانے کی ایک جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت اور فرصت کہاں!

(نیرنگ خیال)

یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندانِ لاہور

[illegible] اور جیسے زندگی اور یہ سب تماشے [illegible]
[illegible] سے پنجاب [illegible] [illegible] ہے۔

"کاروان" کا یہ دوسرا پرچہ [illegible] ہے۔ یہ [illegible] پنجاب کے جدید [illegible] کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جس سے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر اہتمام اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ [illegible] سلیقہ کے [illegible] ہندوستان کے [illegible] [illegible] کوشش کیا جائے [illegible] فہرست مضامین سے ظاہر ہوگا کہ اس مبارک اور پرزور کوشش کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے [illegible] پھیلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض [illegible] نام [illegible] دستے میں نظر نہ آئیں تو اس کو رسالے کے استغنا پر نہیں اس کی نامرادی پر محمول کیجیے

ادب و انشا کے جواہر پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے [illegible] صرف یہی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوان [illegible] کی علمی و ادبی تہذیب و تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو کو اپنے لئے بہترین ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ سب پر یہ پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یوپی، حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل بینش کبھی یہ بات کاہے کو بھول جاتے ہیں کہ یوپی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والیِ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشو و نما محض خوش مذاقی کی مرہون منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خود رو ہے وہاں خود بیں بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھنچ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو جوش تجسس مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے یعنی یہ کسی سرچشمۂ گرمیٔ حیات کے، اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں لیکن قوت نامیہ خود ہی رستہ ڈھونڈتی ہے جو بخط مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسب فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یوپی کی روایات سے یکسر قطع تعلق کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کذب اور مبالغہ ہوگا۔ یوپی کے اساتذۂ قدیم میں سے کون سا ایسا ہوگا جسے پنجاب نے ایک بار، سو بار، ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے جس کی ورق گردانی نہیں کی۔ وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حرز جان بنا کر نہیں رکھا۔ لیکن یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب

پنجاب کی رہبری بجز اس کے کہ اپنی قوت نامیہ کے کوئی مزید نہیں کر سکتی۔ یو پی میں اب اردو کا ایک مستقل ماحول پیدا ہو چکا ہے جو کبھی کبھی ایک حیرت سی پیدا کر دیتا ہے اور یہی اب یو پی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہیں جانتا کہ اس کا چرچا کیوں ہو۔ اس کا مربیانہ انداز، اس کی غلط تنقید، بے جا اعتراضات کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خود بینی سی پیدا ہو گئی ہے اس کے انحطاط کی فہرست نامکمل ہے لیکن یہ ایک ایسی منتشر تنقید کی بے رحمی ہے۔ ہم یہی معمولی کی اور دوسری کا اعادہ کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے تحت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھیے جو کسی یو پی کے مرتب کیے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید دراصل ہے تو زبان کے محاوروں سے کچھ بحث نہیں۔ مسائل کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں۔ سخن کی معنویت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیات سے کوئی واقفیت نہیں۔ اس کے جذبات پر غور نہیں۔ اس کی ذہنی سرگرمی پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے تو توازن کا احساس نہیں۔ فضا کا احساس نہیں۔ مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر اعتراض نہیں اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اعتماد کر کے پرکھنے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے الفاظ و محاورات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطہ پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ صبر نہیں کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل معاملے کے متعلق پہلے سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ قافلہ اردو کی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یو پی ابھی "تمک" اور "تلک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو شوق کا ایک معبد سمجھتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گزشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کیے تھے لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یو پی کے حضرات کو اس مشغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں اب یو پی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے کہ جو چھوٹے پن کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا مزاج یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نقص کو بڑی سے بڑی خوردبین کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی جرأت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گویا بات مار دیں۔ مطالب یا فن یا حسن بیان کی طرف نظر کے سامنے صرف لکیروں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائیگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے چند سطروں سے اپنی تھوڑی بہت ستر پوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشۂ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یو پی کے سب رسالے اسی جہل سے مرتب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوشگوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم، اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یو پی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ گھلنے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات

آخری صفحہ پر کتبہ بیکن بھی مارلو بھی ہیں ہی سب [illegible] پر ہیں تنقیدی [illegible] ... مصنف [illegible] کی مو [illegible] ... رسالوں پر پہنچ سطروں کا ایک پیراگراف لکھا ہے وہ بھی ایسا ہی ہے [illegible] متانت لوٹش بھی [illegible] تھے [illegible] سال سب کچھ اور ولادیر ہیں ۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن [illegible] ... بڑے دو [illegible] " موج " مؤنث ہے مذکر نہیں اسس کا جواب [illegible] ... صاحب مو جود ہیں [illegible] ... کی رعت کھاؤ بڑے گی کہ یہاں " سوار تھا " لکھا ہے [illegible] ... مضمون پڑھئے اگر لطف آئے لکھیے اچھا ہے ورنہ اس پر خاک ڈالئے ۔ نقیا [illegible] ... کرنے سے کیا حاصل ؟ اس غلطی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے تو [illegible] آپ کی تنقید کا معیار [illegible] ... عقیدت [illegible] ... کیا خوب ہے ؎

کسی مس تک رسائی ہو سکے آداب سے یہ بھی
ابھی دل میں نہیں صحت [illegible] فرش عظم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں ۔

گویا یہ ہالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے علاوہ ... روز نامہ ستارئہ صبح ... ہے " آغاز داستان " کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں ۔ فرماتے ہیں :۔

" رسالہ کی خصوصیات اس کی دل چسپیاں اور دلفریبیاں ہم سے پوچھیے " ـــــــــ

(دلفریبیاں کا استعمال خاص ایڈیٹر صاحب کا حق ہے ، خصوصیات کیوں ؟ تو ایسا محاورہ ہے کہ کیا کہیے ۔)

" چھوٹے بڑوں سے ملتا " (جناب اس مطلب کو یوں ادا کرتا تو آپ کی مر بیانہ تبسم سے فرماتے کہ یہاں " بھڑے جوڑوں " چاہیے ۔

سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل یونی ورسٹی کا قیام ہے " (جناب والا ، بال صاحب ! کابل یونی ورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی ۔ جب قائم ہو جائے گی تو جو آپ کا دل چاہے لکھ دیجیے گا ۔ فی الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے وہ قیام کی تجویز ہے)

" پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے ۔ . . . " (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی ۔ مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

" تمام ضروری خبریں اور اہم اقتباسوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے " (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سوجھنی چاہییں)

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی ۔ لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لئے باعث فخر نہ جانے ۔ ہم ہیں کہ مہینے کے مہینے خود نیرنگ کے رسالوں میں سے زبان ، صرف و نحو اور انشاکی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کے لئے مرتب کر سکتے ہیں ۔ لیکن ہم نے اب تک یہ پیشہ اختیار نہیں کیا ۔ اور سچ پوچھیے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں ۔ یہ شغل آپ ہی کو مبارک ہو ۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم نشت و خواند کو وجہ مسرت اور ذریعۂ اتحاد سمجھتے ہیں ۔ آپ ہمارے نقائص کریدتے رہتے ہیں ۔ آپ نے زبان کو اپنے لئے مرو تسمہ پا بنا لیا ہے جو محنت سے گرمی سے آپ کا گلا دبا رکھا ہے ۔

" جامعہ " کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ " جامعہ " کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی

تو بہ بہ کر جا بجا مدحت سرائی سے ان کا جوش عمل اور ان کا تبحر علمی محض پیرزادوں کی تعریف و توصیف سے بڑھا ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ یہ زبان کا جنون ان کو علامت صحیح کرنے میں ممد ہوتا ہے۔ اردو کی تنقیص کے نشے سے بے خود ہو کر تفکر و تعمق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان دانی کا ثبوت یہی صرف اس سے ملتا کہ جامعہ نے فہرست اغلاط میں "منزل گاہ" جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا اور کہہ دیا کہ یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔ یہی وہ ادعا اور تعمق ہے جس کی ایک مثال اسی تراوش کے آخری حاشیوں پر بھی ہوتی ہے۔ کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اچھی طرح بھی تنقید سامنے رکھ لیتے مگر معاملہ تاثر پر رکھ دیتے۔ کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس نمی دانست کہ منزل گہ مقصود کجاست　　　این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وحشت یہی کہیں گے کہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔

جامعہ کے جس نمبر میں کارواں پر تنقید چھپی ہے اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ ہم ادب جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے۔ "ورزش جسم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح" در خطبہ اور "ہمیں خوشی ہے اور ہمیں امید ہے" اور اسی قسم کی آیات سے فال مشورہ من ... پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے، اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لیے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا وزن محسوس نہیں، بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں اس احساس سے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل درد مند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہاں میں امت مرحومہ کے لیے "بھلائی" کا موجب ہو گا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابل بحث ہیں جن کی طرف مخزن اور جامعہ دونوں نے اشارہ کیا ہے اور کیا خوب بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے خیمۂ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا" بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا لیا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابدی ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی۔ اس کے ثبوت در جو مندوں کے لیے کسی زبان کی تاریخ ارتقاء کا مطالعہ کیجیے اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشو و نما نصیب ہوئی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ ان ہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کریں، نہ یہ کہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چلی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ یا "مجھے جانا ہے" کہتا ہے، پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چیر فقیاتوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا "پنجابی ڈھنگوں" کی طرح باتیں کرو، یہ مت بولو۔ کارواں کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرع ہے ؎

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے

ان سے کہا گیا کہ "تو نے . . . . کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے" رکھ دیجیے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ 'تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے' میں ترنم زیادہ ہے۔" میں مصرع کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرع پڑھنے کے ترنم کے مطابق جہاں

پنجابی محاورے کے مفید مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اہل زبان کے اسے استعمال کرنا جائز سمجھتا ہوں۔ یوپی والے صرف اس حق سے محروم تھے۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔"

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علمبردار اور آئینہ دار ہیں۔ جس فضا میں یہ رسالے ترتیب پاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک واجب الاحترام ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور جن کو وہ جانتے ہیں ان کا حسن اخلاق اور ان کی وسعت نظر کی … ہم … ان کی صحبت کی یاد … چونکہ وہ صحبت بہت مختصر تھی، باعث … کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں … رہنمائی کریں گے ادب و انشا کے مقتدر ہیں … جو … کے لیے مستقل ہدایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور علاقائی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور ایسے رویے سے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ تصنیف سے ہوتی ہے۔ … جن کی بدولت خود فرہنگ تصنیف رفتہ رفتہ … ہو کر رہ جائے گی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھول رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچ رہا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ … ہمارا خون رائیگاں … ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار … کو سراہا جائے … ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں رہزنی کو آپ کی شان کے شایان نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ … بزم اردو کی زینت کو بڑھائیں گے نہ یہ کہ … کے کھنڈروں پر … چلے جائیں گے۔

پطرس

ہمارے زمانے کا اُردو ادب

ترجمہ
مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ جلسے منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے جدید دور، یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں اس پر رائے زنی کی تھی۔ اس مضمون کی اصل خوبی تو اُن کی انگریزی انشا پردازی ہے جس کا اُردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیرِ نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں، اُن کے اندازِ نظر، جدید اُردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ نگاہ سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دو گونہ تھا۔ نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس معاملے کی معروضیت اور ان کا معاملہ شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پہ چڑھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک بزرگوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور ان پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے، جب اقبالؔ اپنے اسلاف سے عالمِ بالا میں جا کر ملے تو دور دور دیکھ کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غالبؔ اور میرؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور گرامیؔ، حتیٰ کہ نظیریؔ، رومیؔ اور حافظؔ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گرما گرمی کی حالت میں بھی گزرے، مثلاً جب خودی کے مسئلے پہ ایک عالمانہ بحث رومیؔ اور اقبالؔ کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور 'رقتِ برائم' پہ اقبالؔ کی تمام کلامی کے دوران میں تو غالبؔ کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بے حد سازگار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات، کتابوں سے یا حافظے سے بآوازِ بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے زماں لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور اُن میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود

کی بعیدیت کے تازہ اور فرحت بخش ماحول میں نظارہ و ریاضت ہوسکے۔ اقبال تمدن میں ہے۔ تبھی لوگ تماشا لے لئے آسودہ تھے۔ بس
ذرا سے نئے طور پر ہو رہے سکتے تھے۔

آج کا نوجوان اُردو ادیب، اگر سن کو اس سفر پر وقت سے پہلے روانہ ہونا پڑے، اس محفل میں شامل ہونے کا ہے کچھ عجیب
سے کہ ان کا استقبال عزت اور شفقت سے کیا جائے تاکہ یہ خود بھی جنے کہ وہ راستہ کھویا ہوا سا تھا۔ قدما سے اطمینان
حاصل ہونے کے لئے سامان ہے، نہ کہ سامنے فرد اپنے اور اُن پیشروؤں سے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے جسے پاٹنے
کے لئے اس کو کتب سامنے دوس میں، لولی لسٹ سے ستون کو موزوں ہم سنانا پڑے گا۔ وہ عادت کی مجبوری سے اپنے اجداد کا سا طور ونہ
وضع اپنا نہیں کر سکا۔ الا ماشاء اللہ۔ یا شاید تقلید ذہنی اور فرض ہے تو کیا۔ جو ماضی اور حال کے درمیان ربط رکھ سکے تو اچھے ہیں اگرچہ
مضمون سے اُن کا فنّ بہت فرق ہے ساتھ اپنے آپ کو حال یا تجربے کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ بارہا پھر کر ہوتی ہوئی تہذیب
سے تعلق رکھتے ہیں اور سلف کی ان یادگاروں تک جانے جواب پیدا ہو گیا ہے لکھنے والوں کی اکثریت نے آپ روایت سے
دور ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ادبی نکار تھے، اپنا کے ادبا کو احترام کے ساتھ اور شعرا و
سے اقوال کو کراہت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ کراہت اور شعراء کو لذت کے ساتھ نقل کرتا تھا، مگر بات
یہ ہے کہ دونوں کا کردار اس کے کردار سے دونوں میں حوالہ دینے کی اجازت تھی۔ دونوں نے ادب کی مشترک دولت ورثے میں پائی
تھی جو اس دور کے ذہن اور تہذیب کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے ناول نگار ہیں اور ان کے ہیرو میں کوئی بات مشترک
ہے تو یہ جبکہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ہر قسم کا قاری ہے مگر دلاویز ناشروں کی چھاپی
ہوئی بے مایہ کتابوں کی مدد سے اور مستند یا سکے سے مسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ کھینچنا اور چھاپنے
کی صنف معانی ہے نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی۔ کہانی کا قصہ ہی الجھا ہوا ہے اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کی تحریک ہی
پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اُردو ادب کا مستقبل جو کچھ ہو، ماضی کوئی نہیں۔

اس قطع تعلق کی وجوہات گوناگوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب جس نظام
تعلیم کے تحت نشوونما پاتے ہیں یہ سب اسی کا قصور ہے۔ رسمی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں اشرافیت اور تقدس کے اس
قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور اُس دنیا کے لئے انبیاء اور شعراء کی مناسب مقدار کی مدد سے
تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلمات غائب ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاء و شعراء بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم
نے سرانجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پرانے تصور کی جگہ لے سکے، تجربوں یا
تاک ٹوٹیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ تاک ٹوٹیاں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اور
لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے بند اور پشتے ٹوٹ پھوٹ
گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب تک معاشرے کا تاک نقشہ درست تھا۔
تاک نقشہ پھیل کر یوں منتشر ہو گیا ہے۔ جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریے۔ قدیم معاشرے نے ماس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم

معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے، رسم و رواج کے خلاف۔ قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف۔ وہ قدیم انبیا اور شعرا دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے جو اسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش قلم الفاظ، تلمیحات اور حکایات و اعلام کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو نازک اور کار آمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی وارداتیں۔ اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، انسانی تجربے کے طبقے میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طبقے کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں۔ اسے ان چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اس نے اپنی تخلیقی شخصیت پر ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دوچند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گومگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ نقادوں سے اس نے پہلو تہی برتی تھی۔ اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈینی سن روس نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیر عنوان انہوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شکسپیئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور "انگریزی روایت" کے تحت تواریخ، تہوار، معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جزو "گھسے پٹے جملوں" پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے اسی انداز سے اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علما اور ماہرین تعلیم تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے۔ بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بیرونی زبان دو گونہ رحمت ہے، اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے اور اس کے لئے بھی جس نے اسے اختیار کیا۔ ان کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لئے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے اظہار خیال

[illegible] کا فرض ہے اور اس سے مراد یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ذریعے ۔ جیسے بیک وقت دو زبانوں سے [illegible] ناممکن کی ہو ورنہ تو اس کے پاس ایک ہی ہے ۔ ایک [illegible] ہے تو دوسرا شروع کر دیتی ہیں [illegible] ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرے [illegible] نہیں رہ سکتے ۔ [illegible] تیسرے زمانے [illegible] لکھتے ہیں جو یا ہمیشہ کے لیے پاس ذرا زیادہ منحصر ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ [illegible] لیکن نہ تو کسی پوری طرح سمجھے اور نہ پوری طرح [illegible] ۔ یہ لطف [illegible] روشنی اس کے لیے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے اور باعث تحیر بھی ۔ مگر اس ملی جلی روشنی [illegible] میں [illegible] کوئی ناممکنا مشکل ہوگا ۔ [illegible] یہ کہنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات [illegible] نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال کرے ۔ [illegible] صورت میں بھی [illegible] ۔ اس کا ذکر کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی تہہ میں چھپے جذبے سر ابھار کر ذہنی دھاندلی کرتے ہیں ۔ اگر اس کو ایک زبان [illegible] بند کر دیا جائے اور پوری بات کہنے کی مجبوری ہو تو نتیجہ واضح اور بے ربط [illegible] قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی ۔ اس کی تحریر [illegible] آپ کو عجیب قسم کے پیچ نظر آئیں گے اور استعمال کی کئی صورتیں ملیں گی اور [illegible] سے بڑھ کر انگریزی ساخت کے جملے جو اصل اردو میں [illegible] ہیں کہ جن کو دونوں زبانوں کے ماہر ہی سمجھ سکیں گے ۔ زبان ایک نازک اور لطیف آلۂ اظہار ہے جسے فن کار بڑی مہارت سے برتتا ہے ۔ مگر یہ دوغلی زبان محض [illegible] کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور [illegible] اشاروں سے زیادہ تاثر نہیں ہوتا ۔ الفاظ اپنے معنوں کے ساتھ [illegible] چلنے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کرتے رہ جاتے ہیں ۔ جب [illegible] شکست قوی ہو جاتا ہے تو [illegible] ادیب اردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے [illegible] ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب [illegible] ایک نئے معاشرے میں ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ [illegible] اس کے فہم و فراست کی حدوں سے بڑھ کر وسیع اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے ۔ ایسا معاشرہ [illegible] انسان کے تجربے [illegible] ۔ اور اسی وسیع دائرہ میں حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو ۔ جب تک یہ موافقت پیدا نہیں ہوتی وہ بڑے پرجوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کی محفل بنا کے بیٹھ جائے ۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب کسی نہ کسی انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں ۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے ، محفلیں ، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو ۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں ، معاشرہ سازی کی جبلی اور مصنوعانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان اداروں اور ریاضتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے ۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے "کل" کو پا لے اور چونکہ بیرون خانہ سے اس کا ربط قائم نہیں ہوا ۔ اس کو درون خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے ۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے ۔ زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے ۔

پی ۔ ای ۔ این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا ۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا ۔ یہ گرم پانی کی بالٹی ، کیسلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی اور کھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی ۔ جو فن کار کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہے ۔ کیسلر نے

یہ بھی کہ تماشائی ناظرین دیکھ رہے ہیں وہ دل ہی دل میں بالکل درست محسوس کر رہے ہیں یعنی یہ کہ وہ لڑکی بھاگ کے چھڑ جائے اور اپنے علم پر اکتفا کرے۔ مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ ناظرین یہ چاہتے ہیں کہ بجائے اس کے لڑکی کو کھینچ سکتی ہے تا چارلی سے لیے پیر نکال کر لڑکا بھی پھسل جائے۔

ہمارے اردو ادیب کو بار بار ایسے واقعات دیکھنے کے مشاہدہ اور مزاح [illegible] کہ ایک شخص [illegible] کوئی [illegible] بیٹھ کر [illegible] دیکھ کر منہ چڑھا [illegible] جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے [illegible] یہ ہوتا ہے کہ وہ پیچھے چلنے [illegible] نہیں رہ سکتا۔ وہ چلتے [illegible] میں آتا اور اگر پانی پڑا ہوا تھا تو جاتا ہے [illegible] سامنے ایک [illegible] دیکھنے کے سبب شمار [illegible] اور چھانٹنے کے لئے [illegible] میں یہ غلطی پا [illegible] بے جا ہے اور یہ [illegible] ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی [illegible] رکھے [illegible] سے [illegible] نہیں ہوگا۔ مکار ساتھیوں کو اس کے بیان [illegible] دیکھئے [illegible] مستقبل [illegible] رسے کی [illegible] اس کے ساتھ [illegible] اس کی [illegible] اور سے [illegible] چلنے [illegible] اس [illegible] ہے کہ ہم [illegible] اخراج [illegible] مشکلات [illegible] مجبور [illegible] تعزیر [illegible] اس کی جدوجہد اور اس کے [illegible] کی [illegible] قدر کر سکیں۔ میں نے اس جملہ [illegible] کی کوشش

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی نے افسانے میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ: "حمیدہ موٹی تھی تو کیا، مگر وہ تو حد سے زیادہ کچی بے چاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔" جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دونوں مجموعے ختم کر لئے اور جو چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازروئے تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے بھی سب ہو چکا تو استعارے کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا: "لوگ جسم دیکھتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔"

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلا لیجئے اور اس پر تھوڑا سا نفسیاتی رنگ چڑھا لیجئے تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کو بیان کرنے کا اچھا خاصا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ دماغ ذہن کا ہے دل کی حالت کا اور معروف اور متداول میلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور کنایات مستورہ کی شکل میں قسم قسم کی شیاری ہی جیسے طرز آتے ہیں ذہنی کیفیات اور خواہشات دل کے مارے ہم اکثر مخفی میلوں ہی کو دیکھ کر صادر کر دیتے ہیں مال سے آگے نکل کر اصل چیز کو جانچنے اور پرکھنے کی ہمت بہت کم ہی نہیں پاتے۔ مثلاً درعشق پردل گدازی کا میل دست سے لگا ہوا ہے اس لئے جہاں ان کا ذکر آئے لکھنے والے ورثہ میں پیش نظر ایک پاکیزہ رقت کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ جیسی شاغل تحقیق کرنے کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہو کہ بہت یا اخلاقی قباحت ہو، لوگ برہم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا سا پیار رہنا چاہئے کہ پاک محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لہٰذا بہن بھائی کے رشتے کو اس جذبۂ عالیہ کے سوا کسی اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب سمجھی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے رسالے بھی ادھر ادھر ایسے ہی لکھے ہوتے تو اب ان کی بہترین انشا سے محروم رہ جاتا لیکن ان کی بصیرت اس سے کہیں زیادہ دور رس ہے۔ وہ میلوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کچی کیفیتیں جیسی ہیں جن سے وہ لکھنے میں دوچار ہوتے نہیں گھبراتیں۔ ایسے انشا پرداز کا بغیر حوصلہ، مشاہدہ، دقت نظر اور جرأت بیان کے گزارہ نہیں۔ اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس محرومی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرأت اور دقت نظر میں سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ اجمالاً ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے میل گوندے چپکے ہوئے نہیں، میلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیروں والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے۔ نامحرم کا ذکر ہم ستر کر چکے ہیں کہ فحش ہے۔ محرم کا ذکر معاملہ بندی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا کچھ فت کو منظور ہے تو ہو سکے، ہمارے ادب کو منظور نہیں۔ اور یہ نہایت کا مطالبہ؟ محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجی کا عذر آوارگی! یہیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کر سکا تو اب کسی کی

کیا حال ہے؟ ہم جب بھی کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے ... . ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ —

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کوئی ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے —— اور اپنوں کی شکایت ہے، بیگانوں کی سی نہیں —— . جو عصمت چغتائی کے قدردان اور مداح ہیں، ان کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک مایوسی کی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی رائے میں عصمت ہی ہیں جو سمجھ کر وہ بھی پھر کر لیبلوں کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ افسوس کہ عصمت مرد نہیں ورنہ افسوس کہ لیبلوں میں سے سب سے بڑا اور قرار کن لیبل عورت ہے۔ مردوں کے قرآن کے خرابوں اور محرومیوں سے چھپا ہوا۔ عورت وہ ہے جو ہے مکار ہے، صنف نازک ہے، ایک معمہ ہے، کمزور ہے، کم عقل ہے، مجموعۂ اضداد ہے . . . جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار گھڑے گھڑائے معنی ذہن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اسی فریب میں آ کر ایک صاحب اور ایک دیباچہ نویس فرماتے ہیں:-

"عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں میں شاعری
نہیں کر رہا اور اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو بھی بات میں
دخل ہوتا ہے مجھے یہ افسانے اس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس
کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے۔ اس کے باطن میں ہے۔"

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیبل کس قسم کی چیزوں پر لگا رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بقول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے:-

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں
آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

لیجیے۔ عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر میرے عزیز کی ناقدانہ نظر بہک گئی۔ دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کا جوہر لیکن آخر میں کر گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لیے شرم و ندامت کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا تھا۔" گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم۔ لیکن لوگ اس کا نام لے دینے سے تک ہی ملا اور پوچھوں تو کوئی کیا کرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے —— خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں، بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی۔ جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کر سکے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہرحال اس قسم کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی [illegible] گو بار [illegible] یا کسی مخصوص [illegible] کی [illegible] وہ فوراً خوشیاں [illegible] معتقدوں
رکھنے والے نقادوں نے مسرت کا نعرہ [illegible] جنس یا نفسیاتی [illegible] سے دیکھئے تو عصمت [illegible] اچھے افسانوں میں
ماحول محض اس لئے [illegible] کردار [illegible] کوئی گوشہ [illegible] ہوگا
پڑھنے سے پہلے بھی جانا نہیں [illegible] ماحول [illegible] متوسط طبقہ کا ماحول [illegible] اس کا
مطلب تو نہیں کہ یہ ماحول [illegible] سے پیدا [illegible] جاتے ہیں۔

عصمت نے بعض [illegible] میں [illegible] سماج [illegible] ایسا [illegible] سماج کو [illegible]
بنانے کی کوشش کی ہے [illegible] سماج [illegible] عصمت کا [illegible] عصمت سے [illegible]
تھی کہ [illegible] ذہن [illegible] چاہئیں [illegible]
پس منظر میں [illegible] خیال چھوڑ [illegible] عصمت [illegible] ہے۔
ان کی تلخ [illegible] کشمکش اور [illegible] غرض ان کا [illegible] ہوتی ہیں۔
تو جسم [illegible] احساس میں [illegible] ہے کہ عصمت [illegible]
کیا جائے [illegible] خاص [illegible] کشمکش [illegible]
[illegible] عصمت [illegible] اس صدی کے [illegible]
[illegible] مختلف
چیزیں ہیں۔ اس بات کا مطالعہ کرنا ہو [illegible] عصمت [illegible] سماج
کی نباضی عصمت سے [illegible] یقیناً کشش [illegible] نہیں
رکھا جا سکتا۔ [illegible] سمجھنے میں [illegible] ہوتی ہے۔

عصمت کے دو [illegible] مجموعوں میں ڈرامے [illegible] تینوں قسم کی چیزیں [illegible] ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں [illegible]
میں اول تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی [illegible] قدرت حاصل نہیں [illegible] پلاٹ کو [illegible] کرنے میں
تو ملاپ کر [illegible] یونہی [illegible] کہ [illegible] دکھائی دیتے ہیں [illegible] جب [illegible]
بغیر ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ [illegible] سے کیا حاصل [illegible]
تو کیا مضائقہ ہے۔ ڈرامے کو ڈرامہ نہ سمجھئے کہانی سمجھ کر پڑھئے اور [illegible] ڈرامے کا [illegible] کسی ضرورت سے نہیں بلکہ محض تنوع کی خاطر [illegible]
رکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ [illegible] سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ کہانی کو ڈرامے کی شکل دی جائے تو ایک جبر [illegible] کرنا پڑتا ہے [illegible]
نقطہ اول سے آخر تک مع اپنے نشیب و فراز کے تمام تر افراد قصہ ہی کے اقوال و افعال کے ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے مصنف سے یہ آزادی چھن
جاتی ہے کہ ساتھ کرداروں کے جذبات و خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا روگ نہیں۔ افسانہ
میں تو عصمت کو کسی [illegible] کے واضح کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ انہیں افسانہ [illegible] کے اس حق سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے کہ جب چاہا [illegible]

کچھ کھلوایا، جب چاہا خود پکا کر کھا لیا لیکن جب ایک ... ہو وہ سب کھیل کیریکٹروں ہی کا کھیل ہو تو عصمت کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ عصمت سہیلیوں میں گھر کر
بات کا مطلب اکثر الٹ ہوتا ہے کہ یہی جو ہنسنے ہنسانے کی بیٹھکیں ہوتی ہیں ان میں اس کے زور کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ جو ان کے افسانوں
کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ ڈرامے کے کچھ حصوں میں کسی قدر چستی اور چلبلا پن ہے۔ بعض اوقات تو مکالمہ کچھ ایسا بے جوڑ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں
نہیں آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ چند ایک کا ذکر ... انتخاب ... صفات پیش کی ہیں ان کے کردار بھی بہت کچھ وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہ نقص ان
کے افسانوں تک میں بھی آ گیا ہے۔ ڈرامہ نویس کردار ذہن نہیں کہ وہ سیدھے منہ سے بات کریں۔ باقی رہے کیریکٹر جو آپس میں ابھی بھی گفتگو
کرنے بیٹھے ہیں، ڈرامہ ... کر ... سے کچھ نہیں پڑتے دیتے۔ ڈرامہ نویس عدم تعاون پر مصر ہے اور کیریکٹروں کو تعاون کا سلیقہ نہیں۔ ان ڈراموں
میں ... ایسا ... ہوتا ہے ... کچھ ... میری سمجھ میں آئے ہیں عصمت کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ چند اشخاص نہیں چند ٹائپ
پیش کریں۔ یعنی ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ بن کر سامنے آئے۔ ... اشخاص کا ادراک نہیں کر سکے اور ... عصمت ... میں ڈرامائی
ہیں جو شخصوں میں سے کوئی بھی معلوم ہو ... انہیں ... پیش ... کی اہمیت کے لیے بیل لی!

علاوہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے
ان سے وہ طبعاً لگاؤ نہیں رکھتیں۔ یعنی موجودہ زمانے کے لوگ تو عصمت کے تعلیم یافتہ ہیں مگر ان کی ترکیب میں تعلیم کم اور فیشن زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خوش حالی
بے حسی، انحطاط اور اپنے ذہن سے دماغ کے بل بوتے پر چلنے اور اپنی لذت گیری کے لئے اپنا رنگ پیدا کر لیتے ہیں جن کی بدولت وہ سوسائٹی میں
کہلاتے ہیں۔ یہ نام نہاد لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان پر رشک کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے عصمت نے ان سے عشق تو ضرور کیا ہے جب ہی عصمت کو غصہ
آتا ہے جن کو وہ دیہاتوں میں زندہ پاتی ہیں۔ ہر کسی کی عزت بیچ کر تو سارا رنگ اس کو دو خوب پتا ہے ... لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پچھلے طبقہ
کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے۔ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا کہ اس کے خط و خال اور ذہنی کیفیت دیکھتی اور اس کے خوب و زشت اور ظاہر
و باطن کا اچھی طرح موازنہ کر سکتیں۔ چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیریکٹر یا ان کے ماحول کی تصویر کھینچتی ہیں تو ان کی نوک پلک کبھی درست نہیں ہوتی۔
چھوٹی کلفٹن ... ارغوانی ... ٹینس، ڈرامہ ... ڈریسنگ ... الغرض اس قسم کی اصلی اور جعلی چیزیں جمع کر کے ایک کارٹون سا بنا دیتی ہیں۔ مگر
ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس ساز و سامان سے ایک ... کھڑا کر دیا جائے اور پھر اس پر یقین کے ساتھ سیاہی پھیر دی جاتی ہے کہ ان کی سادگی پر رنگ آتا
ہے۔

کیریکٹروں کی گفتگو اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب عصمت ہنسانے پر زور دیتی ہیں تو روانی ... ہوتی ہے۔ ایک تصنع تو ان میں وہ
ہے جس کا مصنف کو علم ہے لیکن ایک تصنع ان میں ایسا بھی آ جاتا ہے جس سے مصنف خود بے خبر ہے اور جو دراصل اس کے اپنے تصنع کا عکس ہے یعنی
کیریکٹروں کی سطحیت کو بے نقاب کرنا ہی تھا اپنی سطحیت بھی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے۔ ایکٹروں سے پہلے کیریکٹر خود ایکٹ کرتے ہیں۔ بات بات پر
اپنی زندگی میں تبدیلی کی سچوایشن (SITUATION) پیدا کر لیتے ہیں اور پھر اس طرح بنتے ہیں کہ ان کے تو خیر خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق
پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ "سانپ" میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزعم مصنف "شکاری عورتیں" ہیں یعنی وہ رنگین تریا چلتر سے
مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ سیپ کی تو بہت سے کھیلتی ہے لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سنئے اور ان کی اکتا دینے والی حرکتوں کا تماشا
کیجئے۔ تو اس نتیجے پر پہنچئے گا کہ کسی چیز کا شعور تو یہ شاید کر لیں لیکن اس سے زیادہ کی امید بے چاریوں سے خام ہے۔ معلوم ہوتا ہے چند کم عقل چھوکریاں
ہیں جنہوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے۔ اور گھر میں اور ایک جگہ صوفے اور کرسیاں سجا کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہی

میں خیال ہے کہ [illegible] نہیں کرتا [illegible] معنف کی [illegible] دیکھا ہو [illegible] معاملہ تو اس ڈرامے میں ایسا ہے [illegible] ایک [illegible] صاحب کی [illegible] رفیعہ [illegible] غفار سے [illegible] وہ اس سے نہیں [illegible] سے شادی کرے گی۔ غفار [illegible] ہوتا ہے

رفیعہ۔ [illegible]

غفار۔ (قریب آ کے) [illegible]

رفیعہ۔ میں [illegible] تمہاری محبت [illegible]

غفار۔ [illegible] مجھے [illegible] سے میں راحت ہوتی۔

خالدہ۔ [illegible]

غفار۔ [illegible]

خالدہ۔ [illegible]

رفیعہ۔ ہاں [illegible] گی۔۔

([illegible] پریشان ہو کر مسکراتے ہے۔)

غفار۔ ([illegible]) [illegible] تمہارا یہ مطلب [illegible]

رفیعہ۔ [illegible] شادی [illegible]

غفار۔ (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور [illegible]

غفور۔ غفار [illegible] گئے۔ تم دیکھنا میری [illegible] کی [illegible]

غفار۔ کاش میں بھی [illegible] جاتی۔

خالدہ۔ مگر غفار سوچو تو ۔۔

غفار۔ ایک عرصہ ہوا ہمارے بزرگوں نے یہ بات طے کر دی تھی

خالدہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپا کی طرف تمہارا [illegible] اور رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ ایک ضدی ہے!

غفار۔ (اندوہگیں ہو کر) میں ___ جا رہا ہوں (نہایت اداسی سے) رفیعہ! خدا کرے تم خوش رہو۔

عصمت اس سین کو ایک سین سمجھ کر لکھتیں تو شاید ڈرامہ [illegible] میں ان کا نام [illegible] لیکن افسوس کہ ان کے ہونٹوں پر مجھے مسکراہٹ نظر نہیں آتی۔ اور جب مصنف ہنسانے والی باتیں لکھے اور خود اسے ہنسی کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔

کچھ ایسے ہی بے تکے پن، ڈراموں سے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید ناچیکلے ورگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ہی ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ زیر علاج کا ناک نقشہ ہی درست ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑ لئے ہیں۔ اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی رومان کا رنگ دے کر جھوٹ موٹ ایک بات بنالی ہے۔ "پنکچر" اور "شادی" پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے۔ "دو ہاتھ" میں تو برنارڈ شا کے "آرمز اینڈ دی مین" کے پہلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں

یہ سیلیا اور سیل اور دو ہفتوں" اور پاروں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ جس میں وہ صحیح معنی میں اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہترین افسانوں یعنی "جوانی"، "ڈائن"، "بیرا"، "بھول بھلیاں"، "ساس"، "بیمار" اور "تل" میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پردے کے پیچھے سے دنیا دیکھتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ جس میں نواڑی پلنگ اور پرچھائیاں رکھی ہیں۔ سہیلیوں کی طرح [illegible] کر لیا کرتی ہیں۔ لڑکیاں گڑیا [illegible] ہیں۔ وہ تکیا میں ٹپکیاں لگاتی ہیں جس میں کلکے بچے ماں کے پیٹ سے چپکلی کی طرح چپکے ہوئے چونپٹ منہ مارتے ہیں۔ جس کے گردوپیش میں وہ اس بے تکلفی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دو چار خط کھینچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں۔ عصمت کے بہترین افسانوں میں آپ کو فضا اور ماحول کے لئے پُرتکلف ڈسکرپشن (DESCRIPTION) کہیں نہیں ملے گا لیکن جو بات ہے وہ ایسے پتے کی ہے کہ اختصار سے تنگی اور خلا کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ "ساس" کے شروع کے فقرے ہیں:۔

> "سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر ہی پر روشنی سینچے پڑتے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور وہ پھر پٹیل پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم قدموں کی آواز چھت پر سے آئی۔ "خدا غارت کرے پیاری بیٹیوں کو۔" ساس نے بے حیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔ دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جئے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاؤ چڑھ گئیں کسلنے پر۔ ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آپہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔"

اتنے مختصر سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا اور رنگ بھی ایسے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ نہ ضرورت سے زیادہ مدہم۔ یہی حال "بیرا" میں کے ایک ٹکڑے کا ہے:۔

> چھوٹے تال سے گذر کر پیا پرے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیپاری شہر کی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کم بخت جاڑا آفتاب کے ایسا دانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی ہے۔ چاہو جتنا نہاؤ، پیاؤ پر سے ٹھنڈا پانی جتنا چاہو پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رضائی [illegible] کا کبھی مرہون منت نہ ہونا پڑتا تھا۔ یا وسوت کا ڈھڈا جو اس کے کچری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولہے کی ہڈیوں پر جنے

سے تنگ ہوتا تھا ضرورت سے زیادہ تقاضے سے تنگ میں ڈبکی لگائی، کناروں پر گرا اس بیٹھ گئے اور اُسکے چھپا کو ں سے سو کھ گئے۔

اور اس سے بھی مختصر یہ کہ:—

نذھری مسمان، تیں بہت تیسے کٹتے گئیں۔ بیوائی، انیاں اداں: یہ میٹھا حاصل کرنے کے لئے سارے گھر کو ان بھرتے ہیرے کھیت میں ہنستے ہنستے گذر جاتی۔ بڑا گانس چیل لاتی بھینس کو بھی دن سے اور دودھ چرانا شروع کر دیا کرں۔ بچتا ساتا کا بھی ہاؤس میں ہی ایک لمبا ہوگئی۔ دوسری بیاہنے کا نام ہی نہیں تھی۔ جیسی جب بڑی ہو جاتی ہے تو پتہ بھی نہیں چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے نہ بال چونڈی ہوں۔

ان اقتباسات میں پانچ پانچ چھ چھ فقرے ایک سا تو پائے جاتے ہیں۔ میں نے ان کو یہاں نقل بھی کر دیا ورنہ اسی قسم کے ایک ایک دو فقروں کے کنارے ترکی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مفلسوں اور اکھڑوں کی دنیا ہے۔ جہاں امیروں، نفاست پسندوں اور تماشبین لوگوں کی دنیا نہیں۔ اس میں قلعے ہیں خاطیں ہیں اور فلاظتوں کا حال عصمت کتنی بے رحم ہو کر اور بری نے ہر سے سے کے بیان کرتی ہیں، جہالتیں ہیں، بدنامیاں ہیں، بیماریاں ہیں، ڈھیروں بچے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک خلا ہے جو دبائے نہیں دبتا امنگیں ابھرتی ہیں، جوانی اپنے ٹھٹھے دکھاتی ہے، جس میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفس انسانی کا ہیجان اور آزمائی کرتا ہے جن افسانوں کو میں نے بحث کے لئے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی بلندی یا بہت پر معنی گہرائی نظر نہ آئے گی۔ عمیق امن، خاموش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہ ملے گی نہ وہ حزن۔ دل ہی نے کا جو کہ کی طرح دل پر حجم جاتا ہے اس میں ٹریجیڈی کی کوشش ہے نہ کامیڈی کی۔ لیکن انسانی حزن آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اس طرح دوڑتا ہے جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لبالب اور ابلتا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا موضوع کیا ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ آتے تو) عشقیہ افسانے یا عشقیہ فسانے ہی سمجھو کہتے۔ لیکن عشق کے معنی اس قدر پھیل چکے ہیں کہ عشقیہ سے یہاں کام نہ چلے گا۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، غزلوں کا عشق، ناولوں کا عشق، اور وطن پرستوں کا عشق۔ سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے۔ اس لئے عشق کے لفظ سے نہ معلوم کہنے والے کا مفہوم کیا ہو۔ اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ "جنسی بھوک" پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں، لیکن محض اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ کیونکہ جنسی بھوک تو دانتے کی ایڑی سے لے کر کتے کتیا تک سبھی کو لگتی ہے۔ عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد عورت کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہئے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لطافتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی۔ اس کا رومان سے کوئی تعلق نہیں۔ عصمت کے کسی افسانے میں مرد یا عورت کے حسن کا بھی ذکر نہیں آتا۔ کیونکہ جو جذبہ ان کے پیش نظر ہے اس کی تحریک کے لئے حسن کی ضرورت نہیں۔ یہ محض خون کی تاریک حرارت اور جسم کی جھلسا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اس آگ سے کوئی پیچیدہ نفسیاتی مسئلے پیدا نہیں ہوتے۔ صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ رگ رگ میں

سرایت کر جاتا ہے۔ ولفنٹ سٹینش [illegible] رنگ چڑھ لیتی ہیں۔ [illegible] یا سکین بھی نصیب ہوتی ہے جس کا منظر دل سے آنکھ بھر کی [illegible] عصمت ہی کے افسانے میں کہ [illegible] شہر کے تندرست لڑکوں کا غیر تربیت شدہ جسم [illegible] ہوتا ہے۔ اور جب تک [illegible] اور گال بیٹھے ہیں [illegible] اور کچھ نہیں۔ اور پھر دو بارہ [illegible] دل آمادہ [illegible] اس میں ہوس کا بہانہ ہے۔ وہ [illegible] لڑکوں میں [illegible] کھا گیا مگر [illegible] کوئی اس سے کچھ کہتا تو [illegible] مطلب یہ [illegible] زندگی سے [illegible] نہیں ہوتی۔ جہاں کا شعور عصمت کے ہاں اس قدر [illegible] ہے [illegible] والا جسم [illegible] عصمت کی طرح محبت [illegible] جب جوانی آئی تو [illegible] کی حدت سے اس کا چہرہ [illegible] ہو گیا۔ [illegible] سر کے [illegible] شاعروں کی طرح [illegible] ہوئے۔ ان سے ڈھک گئے۔ [illegible] اس کے ہونٹ [illegible] مونچھیں [illegible] اور پنڈلیوں [illegible] ۔ ۔ ۔ [illegible] جسم [illegible] چھوٹی سی [illegible] عورت جو ہمیشہ [illegible] ۔ [illegible] سے سر تا پیر [illegible] کھلے ہوئے [illegible] جاتا ہے۔ اور جس نے جرسی [illegible] پہنتے ہیں۔ [illegible] سب پچکے [illegible] بڑی [illegible] گئے [illegible] ڈھلے [illegible] اور [illegible] کیسے ہوئے [illegible] کی پھلیاں جیسے [illegible] اور [illegible] کی چھوٹی [illegible] مکئی جیسی [illegible] ۔ ۔ ۔ بھاری [illegible] ۔ [illegible] گھونٹے جیسی [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ غرض عورت کہیں [illegible] اور [illegible] کو دل بھلانے [illegible] جسم اپنے [illegible] سلسلے ہوتے [illegible] اور لطافت [illegible] ۔ نہیں۔ بلکہ محض جسم [illegible] گرمی سے [illegible] حرارت سے [illegible] جسم [illegible] یہ ہم پھر انہی خواہشوں کے ساتھ [illegible] جوان ہوتی [illegible] جب خواہشیں [illegible] جسم کو پکارتا ہے تو ان انسانوں [illegible] نہیں [illegible] شعر نہیں لکھتے۔ بلکہ [illegible] کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ [illegible] کی ماں چل دیتے ہیں۔ لیکن [illegible] نہیں [illegible] ہیں۔ [illegible] عموماً [illegible] ہیں۔ [illegible] مگر [illegible] کے قدم نہیں [illegible] کے الفاظ میں یوں [illegible] جوانی عزت [illegible] قوت [illegible] چل دیتی ہے [illegible] لڑکی [illegible] خواب تو کوئی روک نہ سکا۔ تیمور [illegible] نہیں [illegible] روک سکا۔ [illegible] گیا۔ [illegible] عزت [illegible] رشتوں کی جگہ [illegible] کہیں گئے۔

اور جب [illegible] جسم میں طوفان [illegible] اور [illegible] لگتے ہیں" اور دل [illegible] چاند کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ [illegible] یہ بابند [illegible] جسم [illegible] جسم [illegible] اس کشمکش کے زیر اثر علم اور گناہ اور ملامت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ [illegible] بستر میں لیٹ کر [illegible] نہیں ہو جاتے بلکہ ان میں [illegible] قسم کا [illegible] اور [illegible] قسم کی [illegible] بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پکڑتے ہیں [illegible] ہیں۔ [illegible] کھٹولیوں پر [illegible] جسم پر [illegible] ڈال دیتے ہیں۔ ہونٹوں کو چٹکیوں سے مسل دیتے ہیں۔ [illegible] ہیں۔ بال [illegible] جھٹکے دیتے ہیں۔ [illegible] کس کر [illegible] ہیں۔ [illegible] پچھاڑتے ہیں [illegible] جسم کی [illegible] کبھی ڈھیلی ہونے نہیں پاتی۔ اور یہ جذبہ شروع سے آخر تک اپنے [illegible] اور [illegible] کی شان کو نہیں چھوڑتا۔

تو پھر عصمت کے افسانوں کا موضوع جسم ہے؟ نہیں یہ کہنا تو درست نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ افسانے بلا شبہ ادب کے دائرے میں شامل ہیں۔ اور ادب (یا کسی بھی آرٹ) کا موضوع جسم نہیں ہو سکتا یعنی وہ جسم جو علم الاعضا کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ جسم نہ [illegible] آرٹ کو تو ذہنی کیفیات سے سروکار ہے کیونکہ آرٹ کا منصب ذہنی [illegible] کا بیان اور بالآخر ان کیفیات کی تربیت ہے یہ سب چیزیں تو محض محرکات

ہیں۔ ان میں سے کوئی دوسری نہیں [illegible] جیسے کہ [illegible] دیکھئے [illegible] ہے۔ [illegible] کی حیثیت کا دخل نہ ہو تو [illegible] ایک المیہ ہے۔ ادیب ادیب سے نقل نہیں [illegible] اور تجربہ کا [illegible] نہیں کر سکتا۔

جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہوں اس کا مقصد [illegible] کہ [illegible] اس سلسلہ [illegible] ظاہر کیا ہیں [illegible] احساسات کو [illegible] ان کا کیا مقام ہے ان سوالوں کا جواب میں کھلا ادبی [illegible] سے چکا ہوں [illegible] اخلاق کے سپرد کر دیا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن [illegible] ہے [illegible] جیسا کہ [illegible] سے عصمت کا ادراک ہے۔ [illegible] ادب کی [illegible] سے متوازی [illegible] احساسات [illegible] ہو سکتی ہیں [illegible] اخلاق میں شامل ہے [illegible] تو اس سے [illegible] انہوں نے [illegible] بالآخر [illegible] عسکری صاحب کی [illegible] یہ خیال [illegible] بیگم [illegible] ہوئی [illegible] پڑھنے والے چاہے [illegible] بیٹھے رہتے ہیں۔

عصمت نے کچھ تھوڑے سے اسکیچ بھی لکھے ہیں جن میں سے اب بھی دلچسپ وقت نظر اور عصمت کی [illegible] سے خالی نہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں کوئی دوزخی کے رتبے کو نہیں پہنچ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں اس اسلوب نگارش کی مثال نہیں ملتی۔ جو عصمت نے اس اسکیچ میں اختیار کیا ہے۔ ان چند صفحات میں عصمت نے اس طرح [illegible] کو پھیلا کر رکھ دیا ہیں۔ کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے جذبات کے مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔ میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں عورت بن کر ... [illegible] بیان کر سکتی ہوں [illegible] اس عدم توازن کی ضرورت بھی پیش آئی کہ [illegible] دیانت پر تو ایمان تھا پڑھنے والوں کی دیانت پر ایمان نہ تھا لیکن چند ہی لفظوں میں وہ ایسے خلوص اور اپنی جرأت سے پڑھنے والوں کی ہمت بلند کر دیتی ہیں۔ آرٹسٹ کسی کا بھائی نہیں ہوتا کسی کی بہن نہیں ہوتی۔ احساسات اور اقدار کی دنیا میں یہ رشتے تو محض اتفاقات کا نام ہیں۔ چند نسلیں جو نہ معلوم کن چیزوں پر [illegible] ہوئے ہیں۔ [illegible] ہٹا کر دیکھئے تو نیتوں اور ذہنوں کا امتحان ہوگا اور ذہن جلا پائے گا۔ عصمت نے کس خود اعتمادی کے ساتھ [illegible] کو ہٹا کر پھینک دیا ہے اور جو زندگی میں بھی لاش تھا اس کی لاش کو بھی زندہ کر دکھایا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے مغربی مذاق میں بھی ہمارے لئے ایک ہدایت ہے۔ عصمت کی انشا پر فارسی اور عربی کا اثر بہ نسبت اور ادیبوں کے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ترکیبوں، اور فقروں کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی تحریر بڑی حد تک ان عامیانہ سی نقالی کے انگریزی تراکیب اور انگریزی اسالیب خیال سے بھی پاک ہے۔ اس زمانے کے اکثر انشا پردازوں کو بوجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے اس سے مفر نہیں کہ ان کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے سُر بھی سنائی دے جائیں۔ اردو میں مغربی تلمیحات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مصنفوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھلیاں تو کثرت سے مل جاتی ہیں۔ عصمت انگریزی کے ایسے اثرات دونوں سے مبرا ہیں۔ یہ تو بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور یا کہ اسی کی وجہ سے پیدا نہ ہوا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بدولت وہ ٹھیٹھ اردو کے بہت سے ایسے الفاظ کام میں لائی ہیں جو آج تک پردے سے باہر نہ نکلے تھے۔ اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے۔ گویا ہماری انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی۔ گوشہ نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت اور روانی ہے اور جملوں کا زیر و بم روزمرہ کا سا مگر تلا زیر و بم ہے۔ اس لئے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا۔ اور ان میں ثقالت اور تکلف نہیں آنے پاتے۔ مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کو زبان کو زندگی کے قریب تر لے آئی ہیں۔ جس کے لئے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ اس نیک کام میں عصمت کے علاوہ چند اور قابل قدر اہل زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں۔ (اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام اہل زبان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کچھ ایسا آسان بھی نہیں) لیکن عصمت کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہلکا نہیں ہو جاتا۔

عصمت کوئی قد آور ادیب نہیں۔ اردو ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل ہے۔ اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ مضمون بذات خود اس امتیاز کا اعتراف ہے۔ لیکن بھول نہ جانا چاہئے کہ ہمارا افسانہ ابھی سن رشد یا سن بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جبکہ نظروں کو وسعت نصیب ہو رہی ہے۔ اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اردو ادب کے قدردانوں میں یہ حوصلہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ادب کا دنیا کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں۔ تاکہ تناسب کا احساس کند نہ ہونے پائے۔ مقامی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی رہے اور دل میں امنگ پیدا ہو۔ ہمارے ادب جدید کے پات سر دست چکنے چکنے ہیں۔ لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے پھول نہیں لگے۔ ساتھ ہی حد بندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اس کارنامے کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہئے۔

(ساقی دہلی فروری ۴۵)

ہیبت ناک افسانے

"ہیبت ناک افسانے" کا پیکٹ جب یہاں پہنچا میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند انگریز احباب نے جو کتابوں کے
اپنے خوردنی کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں۔ پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے۔ بجز چند ایسے
ے جو غصے یا رنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انھیں یاد ہو گئے ہیں اور
ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے۔ تحریر میں اخبار "انقلاب" کا نام پہچان لیتے ہیں۔ وہ بھی اگر خط طغریٰ میں لکھا گیا ہو۔ چنانچہ
پس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپڑی کی تصویر بنی ہوئی
ہے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ کتاب

یہ بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

ق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام۔ گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب
فن جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بوڑھے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے (ہندوستان کے مداریوں کا یہاں بڑا شہرہ
پ خاتون نے کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر اشتراکی شبہات قائم کر لئے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ اور ان میں سے
کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلچسپیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل
مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو۔ تحریر میں وہ سلاست اور روانی کہ طبیعت
دمجو نہ پڑے۔ اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفر نہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیبتناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں
سانے میں درد و کرب خوف و دہشت یا پھر مرگ و ابتلا کی ایسی خونیں تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری
ے۔ ایڈگر ایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو اس فن کا استاد تھا اور یہ جو اس قسم
ادب کی کثرت فرانس میں نظر آتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ پو ہی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر

مسلّم ہے ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو۔ جس پر کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ پھیر رکھا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لئے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ مرتب کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑھی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب چھت کی کڑی سے لٹک رہا ہے۔ چہرہ فق ہوا ہے اور آنکھیں باہر کو ابلی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سنگدل کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لئے جو تدابیر بھی ذہن میں آسکتی ہیں ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل و شباہت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خوف سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کر لیتے ہیں۔ پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی بلکہ چراغ گل کر کے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد، کرب یا خوف و دہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے حاصل ہو گی۔ لیکن یہ ہمارے متداول الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو جو اس فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکھ، درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہونچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں دکھ، درد وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈتے ہیں یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کریں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ بھی بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے متامل نہ ہونا چاہیئے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے لوگ جو اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے تحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اور کشت و خون کا یہ نظارہ ہزارہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری تہذیب اس تجاوز کی متحمل نہیں۔ لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کیمیا سے کشید کر کے لمحے بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کر لیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجئے۔

اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے۔ اور جس کامیابی، جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے۔ اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہل قلم کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابل وقعت ضمانت نہیں پیش کی جا سکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

"موسیو لیول بے انتہا سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں، جس کی پختگی اور روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ پایا نہیں جاتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی بے حد تمیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے ترشے ترشائے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے۔"

یہ اختصار دہشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تندی وہ تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا سکے اور پھر یہ اختصار ہر رنگ میں شامل حال رہتا ہے۔ وہ افسانے یا ڈرامے کی کامیابی پر نمایاں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو موسیو لیول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لئے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر تجویز کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام "لٹل تھیٹر" یا چھوٹا تھیٹر ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب نہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپرد قلم کر دیں تاکہ "چترا" اور "ٹائیس" اور "مذہب اور سائنس" اور "عذرا" اور "پیلے" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ایک معیار مقرر ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ میرے زیر نظر صرف "ہیبت ناک افسانے" ہے اور میرا قلم صرف اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ اس وقت تک بے معنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کر دوں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ "گدھا" کس کو کہتے ہیں کسی انگریز کے لئے اس لفظ کے معنی سیکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ "اب گدھے" سے لے کر "خر عیسے" تک جو شعر و ادب۔ فلسفہ و مذہب رسم و عادات۔ محاورہ اور روزمرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ اسکو منتقل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اور پھر اس کے لئے بصیرت، لطافت مذاق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور ہندوستان کی خوش بختی ہے کہ انھوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعہ السنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے لئے وقف کر رکھا ہے ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اسی لئے جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کے لئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض اظہار نیاز مندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

"شام پڑ رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ اور کوٹ کچھ ہو یا جو کچھ بچھ لو ایک بوریا سا اس کے پاس تھا اسی میں گھس گیا لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھری سی

دھر کر کندے پر اٹھا رکھی تھی۔ تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے جو جسم بوجھل ہو رہا تھا ابھرا کا تھا۔ بوڑھا لیٹ گیا اور نیلے آسمان پر تاروں کو ایک ایک کر کے ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ وہ بہت فاصلے پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا میرے ماں باپ کون تھے۔ ٹھاکر کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا بچہ ہی سا تھا وہاں سے نکل بھاگا۔ ادھر ادھر اس فکر میں پھرنے لگا کہیں کچھ کام مل جائے جس سے دو پیٹ کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گذر رہی تھی۔ دکھ درد کے سہہ جینے کا کوئی زمانہ دیکھا تھا جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چکیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اٹھائی تھی۔ چاہتا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا بے درد تھے۔ شقی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہر ایک اس سے متنفر ہے۔ بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

"پھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا سیدھی سادی اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔"

"یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک "اہل زبان" کے لئے باعث فخر و ناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار، داغ اور امیر، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد سے ورثے میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنھیں خود اہل زبان محض ممسکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل مل کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا سامان ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا اب ایک اور صحیفے کو پڑھیے۔ جو دہلی اور لکھنؤ دونوں سے بے نیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

"اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ آخر کار جب میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے بے تعلق نظروں سے ادھر ادھر تکتا رہا۔ دھیمی روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور بے وضع نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ روشنی تھی تو ان جگہوں پر جہاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں سبز شیشے اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست نادے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ہر چیز کو جیسے نگلے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے منڈھا گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں۔ حلقوں میں آنکھیں جڑی گئی ہیں۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔ وہ سرمئی ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسم تھا یہ کوئی اس قسم کا گریز یا تصور نہ تھا جو

تخیل پیدا کر لیا کرتے۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں لیکن یکلخت خیال ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک بجلی سی کوندنے نے مبہوت کر لیا . . . . اور پھر مجھے عام کھوپڑیوں کی طرح ایک کھوپڑی نظر

یہ اردو ہمارے ہاں پیدا ہوئی۔ گھر میں۔ اس میں شک نہیں پرورش پانی نہ تھی ہم، بلکہ یہ صوبے ملک کے بہترین دماغوں کی توجہ ہے۔ نئی تہذیب کی عمدہ باتیں ملے اسے ایجاد کیا اور مطالعے اور خوش مذاقی نے اسے دلفریب صورت بخشی۔ اس بارے میں سجاد حیدر۔ ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے۔ جنھوں نے بعض ایسے دروازے کھول دیئے کئی راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے اپنے امتیازی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ ایک ہی تصنیف میں یہ ڈھنگ ایک زندگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب والی ہو۔ محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لئے کسی دیسی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تو یقین مانئے یہ کوئی ایسا فن نہ ہوگا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لئے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہئیں۔

پطرس از کیمبرج

(مخزن مئی ۱۹۲۵ء)

وارفتگیٔ جذبات

بھائی...... تمہیں کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جسے تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب سی دلگیری پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تھکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ لَے، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح کوہستانوں کے وحشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو، غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تضرع سے بھرے فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ نیسری کی آغوش کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک محبت آگئی ہے یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے رعب حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصے میں آکر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پر رکھ لیا ہے اور ندی کے بیچ میں سے گزر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک تشنگی سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا اردگرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے۔ اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور تپتے کوہستان میں اس کے گیت کی مجبور سی صدائیں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو۔ عشق اس میدان و کوہ میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے۔ نیبرے بنجر اور ذمانے نے بہار محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو آتی تو ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب درد، تنہائی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ سیاہی کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ درد تھکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرائی دہشت۔ وہ آسمان کی پہنائی میں ایک ذرّہ ہوں۔ اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے جھلک رہا ہے اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے بر[illegible]تی ہے یا تاریک سے سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پُر اسرار اقتضا کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت سے ایک لے مدہم بے قراری پیدا کر رہی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں لیکن فقط ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابلِ بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل گھٹنے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے اور تنہائی ایک گورستان بیدار کی ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

دفعتاً رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے۔ وہ گیت پہلے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جائے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! اس بیداری کے بعد!

(مخزن جولائی ۱۹۲۱ء)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا، جس تیز رفتاری سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمح نظر اور میرا دائرۂ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے ماورا تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا، میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرنے نہیں پائے گا جب میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لیے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک — صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آئینۂ دل

بچپن کی وہ بات کیا سادہ دریا رحمٰن بھولی بھٹکی [illegible] جہاں نہانے کے لئے یا ذرا سیپوں کی تلاش میں ریت کی مدھم اور نفیس لو ایک معصوم [illegible] سے سیل [illegible] جہاں طوفان قسمتوں [illegible] سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا کہ یہ خوش نما [illegible] کہ اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا اور جو اب درخت کے سامنے بیٹھے تنہا پڑا ہے جس پر لاابالیانہ [illegible] میں بکھرا پڑا ہے سوائے [illegible] کو کبھی کبھی گدگدا دیتے ہیں اور اس میں سے ایک [illegible] آزاد ایک بے ساختہ [illegible] بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادرفتار [illegible] کے پازیب کی جھنکار۔

اٹھتی جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں سے [illegible] سطح پر سکون ہے [illegible] جس کے [illegible] لہروں میں [illegible] اٹھتی ہیں۔ اور سطح [illegible] جاتی ہیں۔ جہاں ایک [illegible] ہے [illegible]۔

جیسے رباب [illegible] کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار [illegible] سا معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] میں [illegible] کو نافہم نظروں سے دیکھ رہے ہیں

اس وقت کی حالت نہ پوچھو جب عشق [illegible] طوفان [illegible] دریا کو [illegible] کر دیتا ہے۔ جب غرقابی کی ہر کشتی اور ہر تیراک کو پستی سے اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کر لے جاتی ہے جیسے [illegible] جہاں ہر ایک [illegible] طاقت [illegible] انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے قسمت کی مجبوری۔

بربط ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل خواہشات کے بگولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور یہی سر چکرا [illegible] تیزی میں [illegible] کی طرح پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہوش و حواس [illegible] کے ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دل چیرنے والے سرد بے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ اگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوش مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں [illegible] پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے بے رحم زمین قطرہ قطرہ کر کے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان بس ہو جاتا ہے پھر اس کی روانی [illegible] جاتی ہے اور آخر کار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موجود ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب یہ نہیں رہتا تو بیابان ہو جاتا ہے اور ایک ویران [illegible] ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

محبت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بے قراری، ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب ساز کی جان سے جدا ہو کے بے محابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جانِ نازک اپنی بساط سے بڑھ کر کھینچ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں جو مشتعل نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط، بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش زمزمۂ ماتم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عشق کی نامرادی "

(مخزن۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء)

آسمان

مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں میں آئینہ کو ہاتھ میں لے کر اس میں آسمان کا عکس دیکھا کرتا تھا۔ وسعتِ فلک کا اندازہ میں صرف آسمان کو یوں اسے نگاہ میں لا سکتا تھا۔ آسمان کی بلندی سے ماورا فطرت انسانی کو اس کی عظمت کا احساس صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ میں اس بلندی کو گہرائی بنا کر دیکھتا پھر جب میں آئینے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنی نظر کو اعماقِ فلک میں پھیلتے ہوئے چلنے کی کوشش کرتا تو ہر ایک قدم ایک مہیب اتھاہ کے کنارے پر ہوتا اور ہر ایک لغزش گویا مجھے غرقابی کی گود تک لے جاتی اور پھر سلامتی تک یوں واپس پہنچاتی کہ میرا دل دھڑک رہا ہوتا اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ عقل نے تاہم ہاتھوں سے اس فریب و طلسم کو توڑ دیا۔ اب میں آسمان کی طرف نگاہیں جما کر دیکھ بھی سکتا ہوں اب اس کی حقیقت کے متعلق ہرزہ سرائی بھی کر سکتا ہوں۔ اب میں اس کو کئی دفعہ اپنے آپ سے لاتعلق بھی سمجھتا ہوں گویا اس کی ہستی ہی نہیں۔

مگر ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب ایک بے نام بے چینی مجھے نیند سے ناآشنا کر دیتی ہے دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بیداری بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام، بکھری سی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن چھن کر مجھ تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے۔ درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کے پھن کا مکی پُر اسرار گونج معلوم ہوتی ہے گویا فطرت کی تمام سرد ہے یا الہام کی سرگوشی جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندھیرے اور تاریک، منہدم کے رازوں سے مجھے غرق تحیر کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی روشنی چمکتی نظر آتی ہے کالے آسمان کی مہیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و مافیہا پر چھائی ہوئی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پر آگ کے قطروں کی طرح معلق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت میں اس دور دراز بلند اور پرہیبت فطرت کے نیچے ایک دم بخود اور ایک روح بے مایہ کی طرح گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے۔ جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور میں اپنے آپ کو اس میں گھرا ہوا پاتا ہوں جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک دہشت انگیز سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پنہائی پر ایک افق سے لے کر دوسرے افق تک ایک طویل خط آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں کہیں فنا ہو جاتا ہے تو میں آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں

اس وقت میں قدرت سے رحم کا طلب گار ہوتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی تمام زندگی میں سے آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مہر سکوت ہوتی ہے اور میری روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے اس وقت میں آسمان کی سیاہ وسعت و رفعت کو دیکھ کر بھول جاتا ہوں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے ؟

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا رنگین منظر دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعتاً ایک عجیب سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر رہ گئی ہے جب یہ آواز ایک لمحے کے لئے میرے کان تک نہیں پہنچتی تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔ اور میرا دل ایک لمحے کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اداس ماورائی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لیمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا دیتی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان کا بھیانک منظر تصور میں آکر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سناٹے کی مہیب فضا کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی۔ مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈر لگتا ہے جو جلتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کمرے کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لیمپ کی روشنی مدہم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے جلدی سے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے رحم طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں سما رہی ہے حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھجک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے دل میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے ماتھے کے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پر میرا سیاہ کمبل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ پیچھے سے اپنی خاموشی کا دھیما سا طلسم پھونک دیا ہے۔ میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سہم جاتا ہوں گویا پراسرار چپ چاپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر یک لخت مجھے اپنی وحشت دکھلائے گا۔ اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔

میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو نہ دیکھوں اور رات کی خاموشی اور میرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی چادر میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہے۔ جو میرے سینے کو دبا رہی ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جن پر میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی اب کسی اور جگہ ہیں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے بڑھتی رہی ہیں۔ کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ تنگ ہو کر مجھے بھینچنے کیلئے میری طرف آ رہی ہے۔ اور کیا خاموشی اور تاریکی نے جادو سے مجھے اس تنہا بچھونے تک مرتے دم تک کیلئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک تانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے، یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیا سلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔
میں اب سگرٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں۔

(نیرنگِ خیال)

———

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکی) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجھے اس کا خیال ایڈورڈ آر مرو (EDWARD. R. MURROW) کی ایک تالیف دِس آئی بلیو THIS I BELIEVE سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاہیر میں سے ہیں۔ کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالات حاضرہ خصوصاً خارجی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے علمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے۔ لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دئے ہوئے پروگرام بغور سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اہل انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کبھی خم نہیں کھایا۔ چنانچہ حب وطن عدل و انصاف جمہوریت، ... جب بھی ان کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے جا بجا اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی۔ اور شدید خطرے کے لمحے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی مانند ... بچ نکلا جائے اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے اور وہی کسی بحران کے زمانے میں رہبری کا کام کرتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکیوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا۔ دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں چند مضامین ان میں سے اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرینکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک ــــ ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا ــــ ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک، دوسرا ملوا

ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ دوسرے کا ابھی یورپ کی مخالفت سے ابھرنا۔ ایک یورپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس
ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر کمی ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں ثنویت سے دست بردار، دونوں اپنی
[illegible] صد کے قائل، عزم وحدت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشرتی خدمت اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان
[illegible] کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ محض مستقبل میں ہے۔ لیکن فرد مسرت کا مقام ہے
ہاں جو لوگ برسر کار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصہ لینا لازم ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت دیر تک [illegible] نمایاں
[illegible] رہے گا ان کے خیالات اولو العزمانہ ہیں۔ وہ بلندی کے خواہاں ہیں، وقت کا احساس رکھتے ہیں، معاشرتی خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔
[illegible] زندگی کا جزو عظیم سمجھتے ہیں۔ وہ منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی [illegible] زندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی
[illegible] امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو۔۔۔

[illegible] میں [illegible] لمحے کو اس نقطے سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو
مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں۔ تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم [illegible] جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھئے۔ تو [illegible] کا باعث ہوگی

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید سالک) سالک (بٹالوی) کے افسانے بہت کم ہی ہیں اور صنفِ نثر اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرۂ نثر کے جو خال اس کی قلم کاری کے ممنونِ احسان ہیں وہ ہمیشہ چشمِ حیرانی تکتے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ جب تک زمانے کی چار دیواری سالک کو اہلِ نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے دلکش دل کی دنیا یا حسن سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ گمنام گمنامی کا شیدا وہ عزلت نشین مشہور وہ انجمن خلوت، اس وقت خاست رہنے سے کار ہوتا۔ تو یقین نہیں کہ وہ اپنی گمنامی کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کی بیں اور نکتہ چیں ثابت ہوتی ___ ایک وقت اور صرف ایک وقت ___ جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادبِ لطیف کے خیابان سے نکل کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں یہی رنگ رہا تھا۔ بادیۂ دشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہلِ مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہلِ درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ عشق کی دلہن سمجھتا رہا۔ اور عورت کے دل کو حرا وہ "فلمیا پارکمس" ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا محلۂ عروسی۔ اس کی چمپا نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی عذرا کی وفا حسد اور رشک کو پامال کر گئی۔ "بیمولا" کی آہ و زاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دئیے۔ اور "موہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک رات کی ہیبت اور تاریکی میں پہاڑ کی برفانی چوٹیوں پر درخشاں نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دیوانوں کا سا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ عشق جنوں کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے۔ ہمارا پاکباز ہندی میں عکس اور معکوس۔ ہم اور ستمگی دونوں سامنے کھڑے ہیں۔ اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو محویت میں گم کر دیں اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر ساز دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے۔ جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھر تھراتا رہتا ہے۔ اور بار ہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ "بیمولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "بیمولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار عفت دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ماتھے

پرتک واشگاف نظر آتا ہے۔ "ارشاد کی کشتی" دیکھتے ہی دیکھتے افق میں غائب ہوگئی ہے لیکن اس کے پیچھے پرشوق کی دل دوز وحشت اب تک نہیں رہی ہے۔

سالک کو تپتے ہوئے جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر لاہور اور بمبئی کے خوشنما بنگلوں میں اس نے جذبات کو پابجولاں دیکھا تو انہیں "سماہیار ناپو" میں دلدلوں اور سرکنڈوں کے جھنڈوں کے بیچ میں لے جا کر ان کی عریانی، مستی اور پاکیزگی کو آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار پھول کھلے اور ادھ کھلی کلیاں مہکتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا اجڈ مرد اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے۔ "جانِ عید" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تصنعی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بار بار ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشاپردازوں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہتے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو محبت کو معنی سے زیادہ دلاویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے لئے سالک کی "چترا" کھولنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر طراز اور شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار ٹیگور کے ذوقِ سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ ہذیان تحریری سالک کی کافرانہ جسارت کے سبب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیاتِ ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے اس کی کبھی جرأت نہ ہوتی اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میرے بے نیاز مخلصانہ تبسم جو سلطان زادی کو اکثر سالک کے ہونٹوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکراتا ہے بے نیاز نہ آئیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

۱۹۲۲ء

"پطرس"

نغمہ زار

ابو الاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغز پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصے سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں، اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تماشائے دید، ہجر و فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعری کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے، جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اسے اپنے سروں میں لاتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں فن کے نقائص، بے عنوانیاں نظر آئیں گی۔ اہل ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک دل زدہ عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں، ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار، جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور ویسے بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک ترانہ ہے جو گاتا ہے، اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں۔ ایک ایسی شراب سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے، لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

"پطرس"　　　　سنہ ۱۹۲۵ء

جھولنے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہی پہلی کتاب ہے جو چھوٹے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے دیباچہ کا وجود پڑتا ہے تھا لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور اساتذہ کی پخ بھی لگا رکھی ہے صوفی تبسم کو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ والد بھی ہیں اور استاد بھی ، یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلایا جائے اور والدین اور اساتذہ کی پروا نہ کی جائے۔ اس لیے تجویز پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور ہم والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھیں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا، گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہوئے۔ بڑے کہیں گے چیچوں کے معنی تو کسی لغت میں دیکھے نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں۔ اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی وزن دار سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان بڑوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کیے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی کا مطلب بے فائدہ بات ہے اور بچوں کو مرنا چاہیے

خدا کا شکر ہے صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں اور بلیاں بیر کھاتی ہیں اور ٹرٹر موڑ، چھم چھم، ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لیے قابل رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلاتکلف اس رنگین دنیا میں جھانک رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش فکر، سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں آوارہ کا دن ہے اور یوں نظر آتا ہے میں انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ کا تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھیے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا اس لیے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور بلاغت کے شواہد اس میں جا بجا آپ کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ سہل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا اسی طرح سہل ممتنع بھی سہل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدردان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت۔ پطرس

دہلی ۵ رجولائی ۱۹۴۶ء

ایران میں اجنبی

ن م۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے۔ اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا۔ اور اسے بلا وجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہے اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف السنین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دے دیئے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق کے ساتھ لے کر ان کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ع

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ایران کو بیچ میں لا کر دزدیدہ نقابات میں آپ نے کیسی مزے مزے کی بحثیں لی، ان کے کیسے ٹیریا میں ہوئی ہیں۔ اور ہم اپنے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے مجھے جو محبت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سود نگاری پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے رنگ سننے کے قابل مزید کہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعراء پر طعن برابر ہو رہی تھی۔ اور ان کی نئی آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ سنتے کہ غزل بھی جب تک نئے شباب' نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باقیوں سے ہدایت پائی ہے ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی۔ اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے۔

جیسا کہ پہلے نظروں سے اوجھل تھے ، ممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا انداز فکر اور نئی زبان لے کر نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی ۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوخیز شاعروں کی بہت بڑی جماعت راشد کے اسلوب بیان میں آنکھ ، ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی پی گئے ۔ یہ جاذبیت جو جادو فیض میں بھی ہے لیکن فیض کی کسی ادائیں نصف نظم میں نظر آ جاتی ہیں برچھے اور ہر پھول میں نظر نہیں آتیں ۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چسکا نوجوان شاعر کو بہت جلد پڑ جاتا ہے ۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے رکھی جائے ۔ اس قسم کا سابقہ ہی جو تھا اس سے تو صرف یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے بیشتر شعراء جو اثر پذیر ہوئے قدماء کے اور آپ کے تصرف لفظ کے امین یا علاوہ تھا ۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ ترکیب ہے ۔ جس سے آپ خود بھی شکار ہوئے ۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یکجا کر دئے ہیں ان میں اس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا

وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

(داخل ایران ہونا ؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق واضح ہے تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری بال کھولتی ہے وہ ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہوگی ۔ سعدی اور حافظ اور خیام اور رومی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہوتے ؟ ایران تو ہمارے شعراء کا روحانی وطن ہے ۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ اسے ایران اور عربستان کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے ۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ یک رنگی و یگانگت کا احساس ہوا ۔ من و سلوے میں تو آپ ایران سے درپردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں اجنبی ہوں نہیں ؎

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں

ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے روحانی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ———

خدائے برتر

یہ داریوش بزرگ کی سرزمیں

یہ نوشیرواں عادل کی داد گاہیں

تصوف و حکمت و ادب کے نگار خانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک عجمی ہوں اور زبان عجم سے ملنے آیا ہوں ۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریزی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے کچھ اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے اور آپ کے سیاہ فام " جسم میں ایشیا کی روح بیدار ہوئی ۔ وہ احساس مظلومیت جس سے عجم بھی کوئی ہندی نا آشنا تھا ۔ اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور " فرنگ کے بے پناہ بپھرے ہوئے ستم " نے ایک نئے انداز سے آپ کو بہکایا ———

ایشیائی ہوں کہ آپ نے دیکھا کہ ———

قید جو ادھر سرداروں کی اک رشادہ کائل میں
اور پی چل کی راہوں پر تیز گامی سے جا رہے ہیں
تو آپ بہتر ہے آ کر ملائے ---
ان دیکھے درخشندہ شہروں کی
رنگ فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہبان چڑھا دو۔
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی شاعر بھی ہوئے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی ۔ اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشد نے سیاسیات کا رخ کیا؟ کیا آپ کی اس طرح کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہل مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار سیاسی شاعروں میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتا ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہوگی کیوں کہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے رہبان پکڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی نظر اور بلندیوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی بلا رہی ہیں۔ جو محض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا منشا واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ بہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے بات آمریت اور آمر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے ---

مگر وہ تیری حسد سے گندی ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھ
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر عقیدے کو تو
اپنے الہام کے شیشہ گر میں دیکھتا ہے

جہاں ایک چھوٹا سا مدفن بھی بنایا تھا
جس میں حق کے فنکاروں کی اک کرن کا گنبد ہو
اسی کا تو کر آپ رہے
کچھ رباعیں بہت تھیں
گر سننے والے کہیں بھی نہ تھے
اور تھے بھی تو گم ہو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کم بینائی ہے۔ یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسند ساتھیوں پر لکھا ہے جو خودی کی بے زمانی ہو جاتے ہیں۔ بس جو ل کا نقشہ جو تنہائی موت کی تنہائی سزا ہے۔

آپ کے نیاز مند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب آپ کے مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ کا مزاج شاعری کا بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے۔ لیکن الفاظ پر محمول کیجئے دوسری کو جذبات پر گر الفاظ و جذبات کی یہ تمیز محض ہوش سہولت ہے اس پر بہت بوجھ ڈالنا نہ چاہیے۔ پہلے شوکت لیجئے۔ ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو ٹکسالی زبان کے ماہر بھی تھے۔ اور شعر میں اس سے گریز بھی کر سکتے تھے۔ (بلکہ افسوس کہ بعض اوقات اسی کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء کے ہاں مسکین دو گز میں الفاظ ملتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں سجاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اکثر اپنے لغت کو ایران و عربستان کا جبہ و دستار پہنا دیتے ہیں۔ ہر کوئی بات بھی ہو تو اسے سر تکلف کم کر کے اس میں کر و فر پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں ہر شعر جھوم جھوم کے پڑھتا ہا ہے

کبھی بلند رو جو گزرا ما تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر حسن شاعر اگر اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ جو جتنا بھی تھا اس سے لغت کا طنطنہ کہیں بڑھ کر ہے الفاظ ایسے دل کش ہیں کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قناعت پسند ہیں۔ لغت میں کوئی جدت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایت ایران سے چند اور الفاظ بطور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک غالب کے قائل ہیں کہ جو شعر ہوا وہ کبھی برہمن کی برابری نہیں کر سکتا اور جب لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستان شعر تک کبھی نہ ہوگی۔ اس سے ہماری شاعری بڑی حد تک محدود ہو گئی ہے جنہیں لکھنے والا کوئی منظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کب تک ہماری شاعری کو اپنے شکنجے میں کسے رہیں گی اور وہ دن کب آئے گا جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو نہ لادیں گے۔ اور قیام پاکستان کے بعد کہ وہ ملک جن کی مادری زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں۔ اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم "ہماری اپنی زبان" آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کو کیوں بنا لوں اس معاملہ میں ہم سبھی ننگے ہیں۔ غنیمت بلا شک ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو محض الجھن میں نہیں مارتے بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں وہاں بھی قوت کو گرما ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے "دریچے" اور "ملاقات" اور "لباس کہولت" اور "ملتان" اور "ہر لحظہ" والے سب گوارا ہیں۔ بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے بڑے کرخت الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں اور آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں۔

شہد اور قہوے کے ملفوف دندان
جو بازاروں میں ہسپانی گراں سکے
اس سے بڑی بات ہے کہ نئی نئی تشبیہوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ——
منو کے اصلی ناظم سمجھتے ہوئے برہمن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لیے
ہے وزرِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بچا ڈالے گا
ہم کو بردہ فروشِ افرنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے بیٹے سے
آج بھی کو رد گرے ہیں ہم سب
جواب بھی چاہیے
آزردہ ہے ہم سے نورِ عرفاں
ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوشش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوشش اور جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جائے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے شاعر اپنی ہی کیاریوں کو روندتا ہے جیسے بچہ ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعرا جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں انہوں نے کام شروع کیا۔ اور علاوہ بریں آزادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس سلسلے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے چہلے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ تعجب ہے آپ اس شدت پر قابو نہ پا سکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجے تک جا پہنچی ہے۔ جہاں درشتی سے آپ کا قلم ناآشنا ہوا جاتا ہے۔ "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کی شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو

کہ دیکھی ہیں میں نے بارہا اِن کی چوٹیوں پر شعاعیں

یہ حسنِ معنی کی وہ تین قسمیں ہیں جنہیں شاعر نے جیسے بے ساختگی کے ساتھ ان تین مصرعوں میں پیش کر دیا ہے اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا۔ —

یہ درویش
جن کے حساب وعدہ
وہ صحرا کے دیرینہ ریت پہ
تھک کے رہنے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست، وہ خاک بسر وہیں غلطاں
جو تسلیم کر بے نیازی خاطر
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر ملتے تھے
جنہیں تھی فقر و رغِ گدائی کی خاطر
جلالِ شہی کی بقا بھی گوارا
جو لاشوں میں چلتے تھے
کہتے تھے لاشوں سے
"سوتے رہو
صبحِ فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لئے محرمیت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا حد کی کس کو خبر ہے؟

"لاشوں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بہکنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبار صنعت اور کیا بہ اعتبار وارداتِ قلب اور مزاجِ شاعری کے کامل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ "بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا اشارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں" یہ بہرکیف بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن کے آپ بانیوں میں ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعے میں جابجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے مکالمے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں

اور جہاں داستان یا افسانہ ابھی ربط سلسلے سے منزہ نہیں۔ لیکن قدما کے سلسلے الف سے لے کر ے ..... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلے جاتے تھے ـــ

یہ زوال تھا رقص تھی وہاں
وہاں لرزتی تھی عرض لیلائے جہاں

رقص ملے تھا لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ ساتھ کانشیس دماغ، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ نبھانا پڑتا ہے۔ یہ ابہام آپ کو اس مجموعے میں جابجا پیش آتی۔ اور آپ نے اسے جابجا چابک دستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعت مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرنا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے ـــ

زمستاں کے دن تھے
لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برف باری
دریچے کے باہر سپید سے انبار سے لگ گئے تھے
مگر برف کا رقص پیہم تھا جاری

. . . .

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی
خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
تخ بستہ گورے پرندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے
زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے
کفِ آور ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری ـــ

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی!

سے کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی تنظیمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو لامحالہ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی۔ اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ اُبلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر ٹھوس پتھر کو ہٹا کر دھکیلتی چلی جاتی تھی۔

نیویارک
۱۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء

"پطرس"

چھُپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض پڑھنے والے جن میں خواتین بھی شامل تھیں اس سوال سے گڑگڑا اٹھے کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو الجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدھی دنیا آدھی دنیا سے چھپی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو کچھ پہلے سے بھی زیادہ پردہ رہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر روش کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیا ہے، ایک لمبی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے تو یہ کلیہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو آزاد کر کے منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں معلوم ہوتا ہے فطرت نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دلجمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرت نسوانی نے پہنائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک، آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں، بلکہ خلوص اور دیانت داری سے لکھتی ہیں، سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا نامۂ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ ہمارے ہاں ادیب عورتوں

کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن شخصی، ازدواجی رشتوں کی رومان جس جرات، بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے موجودہ ادب کی کمی یا کاری کے گھونگھٹ اٹھے پڑتے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ ان کا ایک اور مجموعہ ہے۔ پچھلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نمایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نکھار رہی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ الجھے اور پُر اسرار ہوتا ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں، اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خاردار پشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو، ٹھٹھرنے لگتے ہیں، تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ ...." میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قرب — ایک بیر اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جالوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس بیٹھے ہوئے سایہ سے لڑکے نکھا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے بھی قدردانی ہی سمجھنا چاہیے۔

"کالعدم" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم کے ملے جلے جذبے پلتے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا ہی تو نہیں۔ اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی۔ کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمریں یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائیں گی۔

"ایک بچی" کو آپ محرومِ الفت کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں جن کا حال ناہید (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے:

"مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے.... گلی کے اس مکان میں
رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض
ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا..... میرے اندر کچھ اندر کوئی ابل کر نکلنے لگا....
میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گلی
میں کر دوں ...... گلی میں جیسے کوئی نشہ میں بہکتا ہوا گذرا، مست اور بے پروا، اور
مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری باہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے جنہیں، سینے
پر بے کار پڑے پڑے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں۔ تار تار کر کے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں اور

معلوم ہاجرہ نے بغیر سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سمجھایا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد ہے ہوں گے۔ اس حیثیت کی اصل قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے جو آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت سے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ——— "سرگوشیاں" اور "لاعلاج" ——— ایسی ہیں جن پر ہمارے جدید ادب کو ناز کرنا چاہیے۔ دونوں کا ہنر ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سرگوشیاں" ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو آپ اپنے دل میں اس کی باتیں سنا سنا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز نگاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پیراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع شروع میں کھٹکتا ہے۔ جیسے کوئی شیر آیا شیر آیا دوڑنا پکار کر ہمیں زمانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب گیتا کی گردشِ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ اتفاقات وحشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے یہ خطابت تو نا زخطرات سے پُر ہے لیکن ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لاعلاج" میں ایک راوی ہے ایک پلی ——— دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض لوگوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پوتی بھی نانی ہی کی طرح الجھی ہوئی زندگی میں ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے کر بڑھاپے تک کے لکڑے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اردو میں کوئی کہانی بہ تکمیل اصلیت اور حساسی کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا کی بین کی جامیں کھائیں گی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک استاد ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرین کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

"اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن و سال کی ایک تند و رو ندی ہے کہ بہے چلی جاتی ہے اور اس کی سطح پر چڑھے اکھڑے ہوئے درخت کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھڑ چکی اور زندگی کو نہ جانے کس وقت کوئی پھونک مار کر بجھا دے۔ کہنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں . . . . . ."

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک اثر کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں نانی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے، کھٹے پھل لگ سکتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا ہے

سے نئی جنریشن ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جمالی مظاہر سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ہاجرہ کے احساس میں بھی تو اکثر اور پیچیدگیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور گمبھیر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینی بھی زیادہ حقیقت اور تماشا دریب ہیں۔

ساری عورتیں اپنی فطرت شعاری کی وجہ سے صداقت اور معصومی اور بی زبان سے بہت کم الگ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا تو بیچ جاتے تھے۔ سوائے کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف ملتی ہے۔ اِتنا اِترا کر اپنی طرف دیکھتی نہیں رہتی اور اس الھڑپن کی وجہ سے بے تکلف وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو معنوی ادبی زبان کے نشانے کے میں ادا کرنے جاتی یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

لیکن اس کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال ان گنت ہوتی ہیں اور لفظ اکثر بار بار کر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی ثروت نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے۔ لیجئے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

• کوئی ساتھ رونے والا ہوتا تو پہلے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں رہ جاتے۔"

• لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے ؟ دامن چاہے کہیں بھی چھپا کر رکھا جائے کم بخت مشک اور دا بہت چغلی کھا دیتی ہے۔"

• آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندروں کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

• سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے قلم دوات میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو۔ درحقیقت سب پرندوں سے کرگس کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

• محبت گرمی کا ایک ایسا چھالا ہے جو اگر کروں لمحے دوں میں گھس کر جسم سے پٹ جائے تو چھالے سے ادھر کہیں نہ کہیں ذرا بہت چھالا ہی رہ جاتا ہے۔"

• تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

• تم تو ایسی ٹھنڈی لگ رہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کا چولھا۔"

• اس کے احساسات پر جیسے سڑا ہوا آم بکھر رہا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن کے سیال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فقرے کو کھجور میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا رہا تھا۔۔۔"

• یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں وہی چند روز بعد ایسی معزول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔۔۔"

• کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔"

• مگر وہ دونوں اس سے محظوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔"

• وہ اس کی نفرت سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگی۔ جیسے بیٹھ بیٹھا کر میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا۔۔۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا پھدکتے پھدکتے سب درختوں سے ہو کے پرے جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر جیسے سیئو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔"

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور عجیب ہیں۔ خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آتی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے نہیں چل سکتا ہے، اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے جبر کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی۔ ان کی طبیعت کا اصل جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکتا ہے خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا

"پطرس"

سفرِ انگلستان

(خطوں کے پیرائے میں)

[illegible] دس بجے دن

امتیاز بھائی! یہ خط آپ کو اگر میں ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ میرا اندازہ لگائیے میں اس وقت بھی [illegible] ہزار میل کے فاصلے پر ہوں جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے اور ابھی منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں۔ [illegible] کہنے کو سفر [illegible] پولینڈ کا سفر اس کے مقابلے میں پہلی قدمی سا معلوم ہوتا ہے۔

میرا جی چاہتا ہے داستان کو ابتدا سے شروع کروں۔ بمبئی پہنچے تو کمپنی والوں کی طرف سے نوٹس ملا کہ ۹ ستمبر کو جہاز پر پہنچ جائیں۔ ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ ہمارا ٹیکسی ڈرائیور آگے ہی ڈانواڈول ہو رہا تھا دس میں مانگ گیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ معائنہ ہے جو جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہونا ضروری ہے۔ اس معائنے کی کیفیت میں یونہی بیان کر سکتا ہوں کہ جس کی نبض چلتی ہے اسے تو جانے دیتے ہیں۔ جس کی نبض بند ہو اسے بمبئی میں ہی روک لیتے ہیں۔

جہاز پر سوار ہوئے تو بھانت بھانت کے جلوے دکھائی دیئے۔ ہندوستانیوں کی تعداد میری توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ بنگال، مدراس، پنجاب، یو۔پی، بمبئی سبھی صوبوں کے لوگ تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے سب سے بڑے چغدوں کو چن کر بھیجا ہے۔ [illegible] صورت کا آدمی اور ان میں سے ہر ایک اپنی وضع کی انگریزی بولتا ہے۔ بعض [illegible] ایسے ہیں کہ عزیزوں سے جدا ہوتے چلے آ رہے ہیں اور رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت [illegible] ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اس اظہار کے لئے کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر تیز تیز قدم اٹھائے نکل جاتے ہیں جیسے جہاز کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں۔

جب جہاز روانہ ہوا اور جہاز پر سے بھی اور ساحل پر سے بھی رومال ہلنے شروع ہوئے۔ کئی دیسی شرفا معلوم ہوتا تھا برسوں سے رومال ہلانے کے منتظر تھے، دل کھول کر رومال لہرائے۔ ان میں سے ان کا اضطراب دیکھئے۔ کئی تو ایسے تھے جو اپنی سب جیبوں کو ٹٹول رہے ہیں اور رومال نہیں ملتا اور جب کسی حضرت کا رومال ہاتھ سے چھوٹ کے سمندر میں گر جاتا تو ان کی خفت قابل دید ہوتی۔ جب ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو یہ عذاب بدتمیزی تھا۔ اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے اور سمندر کو دیکھ رہا ہے۔ چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کہہ رہے ہیں۔ "اچھا، تو گویا یہ سمندر ہے۔ تو گویا اب ہم سمندر میں ہیں۔ کیسی بہت اچھی!" یہ دوست ہیں وہ ساتھ ساتھ

بیٹھے ہیں اور ایک صاحب جس لندن اور ایڈنبرا کے متعلق نہایت واقفکارانہ انداز اور بے پروائی کے لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک کونے میں میں بیٹھا سمندر کو دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم ساحل سے بہت دور نکل گئے جہاز ہچکولے لینے لگا اور سمندر یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی گھٹیا سے مصور نے کوئی تصویر کھینچی ہے۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اور میں بے صبری سے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں دور افق کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ یک لخت معلوم ہوا جیسے افق کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے جیسے ترازو کی ڈنڈی ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ ٹیڑھے ہونے کے بعد آپ دوسری طرف کو جھک گئے۔ ایک دو منٹ نہ گزرے تھے کہ ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے دعا تعویذوں اور گنڈوں کے پیچ ڈھیلے کر دیئے ہوں۔ معدے میں ایک برف کا گولا بہت زور سے نیچے کو گرا۔ انتڑیوں نے اچھل کر پھیپھڑوں کے ایک گھونسلا بنا لیا اور کمر کی ہڈی کے اندر بھیجے نے آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھولنا شروع کیا۔ اور پھر قے۔

یہ ابتدائے عشق تھی۔ ہم بھاگے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور بستر پر چت لیٹ کر اس شخص کے خاندان بھر کو کوسنے لگے جس نے ہمیں ولایت آنے کا مشورہ دیا تھا۔ بس اب باز، کچھ پوچھو مت۔ دنیا میں ایسی تکلیف دہ بیماری کوئی نہ ہوگی۔ موت بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے کمرے میں پہنچے ہوئے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ یکے بعد دیگرے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے قے کی ندائیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ داغا جا رہا ہے۔ جب کمرے کی کھڑکی کھولی تو تمام جہاز چت پڑا تھا۔ "کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی"

پانچ دن رات میں بستر پر پڑا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو بلایا۔ ایک فرانسیسی لونڈا سا ہے۔ شکل ہیرلڈ لائیڈ سے بہت ملتی ہے۔ انھوں نے آتے ہی بے تحاشا فرنچ شروع کر دی اور متواتر بیس منٹ تک بکتے چلے گئے۔ اتنا سمجھ میں آیا کہ انجکشن کریں گے چنانچہ کیا۔ اس سے قے تو بند ہو گئی لیکن دماغ برابر جھولا جھول رہا تھا۔ سمندر میں بہت بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور جہاز پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہے۔ ہر لحظہ طوفان بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ چھٹے دن کچھ افاقہ ہوا تو ہم ہمت کر کے تختۂ جہاز پر پہنچے۔ اور ایک کرسی پر لیٹ گئے۔ ہماری طرح اور بھی کشتگان ناز بھاری بھاری باہر نکل رہے تھے۔ شکلیں چوہوں کی سی بنی ہوئی۔ چال ایسی جیسے ہوا میں تنکا اڑتا ہوا جا رہا ہو۔ جہاں بیٹھتے تھے بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ لیکن طوفان کے تھمتے ہی طبیعت فوراً ٹھیک ہو گئی اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس قدر زور کی بھوک لگنے لگی کہ عمر بھر نہ لگی تھی۔ جہاز پر دن میں پانچ دفعہ کھانے پر بگل ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی وقت بھی کھانے کے کمرے میں بے تابانہ داخل نہ ہوا ہوں۔

کھانے کے کمرے کی دنیا ہی نرالی ہے۔ ہندوستانی بھائیوں کے لئے اس کمرے کے اندر طرح طرح کی مایوسیاں اور بے عزتیاں اور دقتوں کے سامان موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اتنے عرصے سے ولایت آنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ چھری کانٹے کے استعمال کی مشق کیوں نہیں کر لیتے اور انگریزی کھانے کے آداب دو تین دن میں کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ ویشنو حضرات کے لئے اور بھی مصیبت ہے۔ ہر بار پوچھتے ہیں اس میں گوشت کی تو کوئی آمیزش نہیں۔ اس میں بیضہ تو نہیں ڈالتے۔ یہ چربی میں پکا ہے یا مکھن میں۔ یہ آئس کریم میں انڈے تو نہیں پڑے۔ نفس اور ذہن دونوں بارہ بارہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں لیکن ان بے چاروں کے لئے ایک دو ابلی ہوئی ترکاریوں سے زیادہ نہیں پڑتا۔ نوجوانوں کی طرح سے چھری اور کانٹے دونوں کو بائیں ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں اور دائیں ہاتھ کے ساتھ پیچھے کھاتے

جاتے ہیں۔ آئس کریم کے بیچ کو نمک کلیسا میں ڈال دیتے ہیں اور پھر نمک کے چمچے سے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں۔ پھر کھتے کھاتے ہر وقت محرم نفوس سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔ سؤر کا گوشت ہر روز کھانے پر ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں ابھی تک کسی نے کھایا نہیں۔ آگے بھی خدا حافظ و نگہبان ہو۔

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ ہم چار ادمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر ہم عدن اور عدن کے گرد و نواح ۲۵ میل گھومے۔ اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب بنا۔ وہ خوطہ لگانے والے لڑکے بہتیرا تلاش کئے کہیں نظر نہ آئے۔ خدا جانے متقدمین یوں ہی گپیں ہانکتے تھے یا اب ان کی نسل ہی ناپید ہو گئی ہے۔ عدن ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت ستھرا شہر ہے۔ لیکن بہت بے رونق سا مقام ہے۔ پارسیوں کی دکانیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عدن میں پیچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کئے تھیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر ہمارے جہاز کی تصویر تھی، امید ہے ملا ہو گا۔

یہاں سے ۶ ستمبر کو دن کے ۱۲ بجے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر میں داخل ہوئے جہاں کی گرمی توقع سے بہت ہی کم ہے البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاتا۔ دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھے رہتے ہوں اور رات کو وہیں بستر بچھا کر سو جاتا ہوں۔ طلوع اور غروب کے نظارے لب اوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ وسیع سمندر، وسیع آسمان اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولہ جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو قوس قزح جیسے پھیلنے لگ جاتی ہے۔

ایک دن رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گزرے۔ جزیرے کے ایک بہرے پر لائٹ ہوس ہے جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفہ کے بعد چمکتی ہے اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتا ہوا شاہراہ سا بچھا دیتی ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے لیمپوں کی مدھم سی قطار دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پُراسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے ہر روز رات کو سینما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے۔ کھانے پر ہی دعوتی ملبوس پہنا جاتا ہے۔ ایک پروگرام میں تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے نہ کہ بند کمرے میں۔ اور مفت ہوتا ہے۔ اچھا خاصا لطف رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا گراموفون بنزلہ بینڈ کے بجتا ہے۔ سوائے ایک فلم کے (THE BACK BITER) باقی کی سب میرے لئے نئی تھیں۔ اس پروگرام کی فلم ملک ہیرلڈ لائڈ کا ایک تھا۔ دل بہلاوے کو کافی سامان ہے۔ باقاعدہ سینما سمجھو۔

اب ہم بحیرۂ احمر میں ہیں۔ مکے اور مدینے کے عرض البلد سے اوپر گزر چکے ہیں۔ شروع شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے تھے۔ اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔ کل دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا ہوا بہت خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی ہیں اور افق تک جا بجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے تمہیں یاد ہو گا میں نے اسی کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ منگائے تھے ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی ہر کہیں بولی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بول بھی لیتے ہیں اور کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں مگر جہاز کے افسر اور ملازم بیشتر ہسپانوی ہیں۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس ان شاء اللہ پہنچوں گا تو داستانیں سناؤں گا ہزار ہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب۔ حمید علی صاحب۔ سالک صاحب۔ جگل صاحب۔ منشی صاحب۔ اختر صاحب۔ حفیظ صاحب سب کو میرا نیازمندانہ سلام، بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار

بخاری

(۲)

لندن ۲۴ ستمبر ۱۹۲۶ء

امتیاز بھائی: میں تم کو وینس یا یورپ کے کسی اور مقام سے خط لکھتا لیکن اس لیے نہ لکھا کہ یورپ کا سفر ایک ہنگامہ تھا جس میں ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا اور دوسرے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں ہندوستانی ڈاک کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ وہاں کا لکھا ہوا خط تم کو اس خط سے جلدی۔ لہٰذا پہلا خط میں نے آپ کو سوئز سے لکھا تھا اور پورٹ سعید میں پوسٹ کیا تھا۔ پورٹ سعید میں ہمارا جہاز دن کے دس بجے پہنچا۔ کشتیوں پر سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ پورٹ سعید کی عمارتیں بہت خوش وضع اور خوبصورت ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصول کے مطابق مغرب کی تقلید کی ہے لیکن اس پر بھی طرزِ تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ دکانیں خوش رنگ ہیں۔ تعجب ہمیں اس بات پر ہوا کہ قہوہ خانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے اور دن کے دس بجے بھی ان میں اس قدر بھیڑ تھی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ بالکل بے کار ہیں۔ انگریزی سوٹ، سر پر ترکی یا انگریزی وضع کی پھوس کی ٹوپیاں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے ہیں، حقے کے کش لگا رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ دکاندار بہت خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ بے نیازی کے انداز میں چل دیں تو فحش گالیاں سناتے ہیں۔ بے شمار گائیڈ بازار میں چلنا مشکل کر دیتے ہیں اور ازحد بے حیائی کے مشاغل کے متعلق نہایت بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ جس جس سے ہو کر ان سے کنارہ کریں تو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

بارہ بجے ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا اور ہم بحیرۂ روم میں داخل ہوئے۔ سب نے گرم کپڑے پہن لیے گو موسم کچھ اتنا سرد نہ تھا تاہم یورپ کی تعظیم لازم تھی۔ تین دن کے بعد ہم برنڈزی (BRINDISI) پہنچے۔ وہاں بھی ساحل پر اتر کر شہر کا ایک چکر لگایا۔ برنڈزی میں فروٹ بہت ہی سستا ہوتا ہے چنانچہ ہم نے ایک بہت بڑا ٹوکرا کوئی دس آنے میں خرید لیا اور پیٹ بھر کے کھایا۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ اطالوی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا۔ فوجی سپاہی کی وضع سابق ہنسے ملتی جلتی ہے۔ سر پر دیسی سی ٹوپی اور اس میں ایک پر جس کا انداز یہ بانکپن کی شان دکھاتا ہے۔ پولیس کے افسر نے بیچلے ڈیوک آف ولنگٹن کی سی ٹوپیاں پہنے سرخ اور نیلی وردی میں تنے کھڑے تھے جس پر پیتل کی آرائش عجب بہار دکھا رہی تھی۔ سفید دستانے اور چمکدار تلوار جب بازو میں کھٹ کھٹ کرتے گزرتے تھے آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔

ایک دن کے بعد شام کے وقت ہم وینس پہنچے اور وہاں جہاز کو الوداع کہا۔ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے ایک ایسا خواب ہے۔ اطالوی آتشیں شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ اس سمندر کی شہزادی کے متعلق آپ نے جو کچھ افسانوں میں سنا ہے سب سچ ہے۔ تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں اور دنیا بھر کا لٹریچر یہاں کی دلکشی کا سماں نہیں باندھ سکا [illegible]

نہایت حسین، خوش مذاق، خوش سلیقہ، مرو اخلاق۔ خوبصورت اور بنگے ہنگے لمبے لمبے بال گئے ہیں اور ان کو پیسے ہوئے سنوارتے ہیں۔ اکثر لوگ مرد اور عورتیں سر ننگے پھرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ ان کے بالوں کی خوبصورتی کو ٹوپیوں میں چھپانا ظلم ہے۔ خلق کا یہ حال ہے کہ سارا دن آپ کے کانوں میں پیرمیسیال، پرمسیال (PERMISSION) کی آواز آتی رہے گی۔ جو انگریزی کے EXCUSE ME کے مترادف ہے۔ لیکن جس لہجے، جس لوچ اور جس تبسم کے ساتھ کہا جاتا ہے وہ تو انگلش کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ رات تو وینس ایک دلہن ہے جس کا سنگھار کوئی ایسی زبان بیان کر سکتی ہے جس میں سے ہر لفظ VIOLIN اور BONJO اور QUITAR وینس کی نہریں خوبصورت، نازک، جھلے جھلے گنڈولے، ہر رنگ کی روشنی، حسین لوگ جن کی زندگی ہستی و کیف محبت کا ایک ہنستہ معلوم ہوتی ہے۔ امتیاز! خدا کی قسم یہیں مرنے کو دل چاہتا تھا۔ ہائے میں کیا کروں ہندوستان میں کوئی بھی تو ایسی جگہ نہیں جس کا نام لے کر میں تم سے کہوں کہ وینس اس سے دس ہزار گنا ہو اور انگیز ہے۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا، دنیا بھر میں کوئی ایسا مقام نہیں۔ میں دن بھر (Pilla San Marco) (وینس کا ایک بہت مشہور چوک ہے) میں کھڑا اپنی آنکھوں کی ساقی کری کرتا رہتا تھا۔ رات کو گرینڈ کنال (Grand Canal) کے کنارے جیسے نشے میں جھومتا جاتا تھا۔ ایک دن اپنا سینٹ مارک کا گرجا (Ducal Palace) اور اکاڈمیاں دیکھنے میں گذر۔ ان کے حالات انشاء اللہ خود حاضر ہو کر سناؤں گا ورنہ یہ خط کبھی ختم نہ ہوگا۔

وینس کا شیشہ تو آپ جانتے ہیں دنیا بھر میں مشہور ہے اس کے وہ وہ عجائبات دیکھے کہ ان کے نقش سے آنکھیں اب تک خیرہ ہیں۔ دل کڑا کر کے وینس کو خیرباد کہا اور میلان (MILAN) آیا۔ یہاں کی چند عمارتوں کے علاوہ کوئی بات قابل بیان نہیں اور ان کے ذکر سے میں اپنے خط کو خشک بنانا نہیں چاہتا۔ اور پھر اس کے بعد اٹلی کی کوہستانی دلنوازی اور سوئٹزرلینڈ کی دلفریب فضا۔ سب قصے دلی آ کر ہوٹل میں بیٹھ کے ہونے گے۔ فرانس میں داخل ہوئے تو پیرمیسیا کی جگہ پارداں میسیو (PARDON MONSIEUR) اور پارداں مادام (PARDON-MADAME) ہونے لگی۔ فرانس میں یہ قاعدہ ہے کہ جب دو آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گذرتے ہیں تو دونوں یہی فقرہ دہراتے ہیں۔

یورپ کی ٹرین (CORRIDOR TRAIN) ہوتی ہے اور سفر بہت لمبا تھا اس لئے اکثر لوگ ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ گویا شوقیہ ادھر سے ادھر تک چکر لگانا تھا۔ بس سر جھکا کے، چہرے پر مسکراہٹ، پارداں میسیو، پارداں مادام، پارداں میسیو، پارداں مادام کہتا ہوا نکل جاتا تھا۔ عجب لطف تھا۔ فرانس کے لوگ ٹرین میں ہمسفر ہوں تو گو آپ ان کی زبان سے ناواقف ہوں اور انہیں اس بات کا علم بھی ہو تاہم مرد ہو یا عورت، آپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیں گے۔ میرے ساتھ ایک مادام تھیں وہ فرانسیسی بولتی جاتی تھیں اور مسکراتی جاتی تھیں۔ میں انگریزی بولتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔ میں ان کی بات سمجھتا تھا نہ وہ میری بات سمجھی تھیں۔ تاہم ایک رشتہ سا قائم ہو گیا تھا جو ہر طرح بہت خوشگوار تھا۔

اسی ٹرین میں انگریزی آدمی دور سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ پانچ منٹ میں ٹہلتے ٹہلتے ٹرین کے ایک کمرے میں بیٹھا۔ ہاتھ پر تیوری چڑھائے اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے۔ آپ نے کسی موقع پر Excuse me کہا تو انہوں نے اپنی بھنویں ذرا اونچی کیں، آپ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس دیکھنے کے بعد انگریز کو دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ٹرین میں بیٹھا کوئی چہرے کی تربیت سے واقف نہ تھا اس لئے ایک پرمیسیاں دوسرا پارداں کہنے کی کوشش

کرتا تھا اور بعد میں معلوم ہوتا تھا وہ ذرا اثر پذیر ہیں۔ ریل میں دو نیوزی لینڈ کے باشندے (میاں بیوی) جو سوئٹزرلینڈ کی سیاحت سے واپس آرہے تھے اور اپنے Honeymoon (پر یہ دنیا کا چکر) لگا رہے تھے ان سے دوستی ہو گئی۔ وہ بھی آجکل لندن میں ہیں۔ یہاں ان کی اپنی موٹر کار ہے۔ آج شام کو انہوں نے مجھے کھانے اور سیر کی دعوت دی ہے۔ غالباً تجربے جائیں گے۔ ترکی، سیلون، چین اور امریکہ دیکھ چکے ہیں۔ ہندوستان جانا نصیب نہیں ہوا۔ فی الحال یورپ کی سیاحت کر رہے ہیں۔

خیر میں داستان کو مختصر کروں۔ ہوتے ہوتے لندن پہنچا۔ لندن کی وسعت اور عظمت کی کہانیاں تم کئی بار سن چکے ہو لیکن شہر جیسے آدمی کو موہ نہیں سکتا۔ بھلا جہاں بازاروں میں لاکھوں موٹریں اور بسیں، ولسن گاڑیاں اور جاتے کیا کیا بے تحاشا بھاگی جاتی ہوں وہاں دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ اور دل بے چارا کس شمار میں ہے دل پر جو کچھ گزرتی ہے جب تمہیں حب وطن ہو تو پردیس کی کیا بات ہے!

یہاں آتے ہی فرصت سے فارغ ہو کر تھیٹروں کے اشتہار دیکھے۔ کام کی چیز EVERY MANS THEATRE میں Old Vic میں ہو رہا ہے۔ کمبخت دور بہت ہے۔ لیکن بھلا ہم دیکھے بغیر کیوں باز رہنے لگے Arms and the man بھی ہو رہا ہے وہ بھی دیکھوں گا۔ (PHILHARMONIC) میں Light of Asia اور KING JOHN ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ آیا ہوں فلم بہت شان سے شروع ہوتی ہے اور دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ ایکٹنگ تو خیر معمولی ہے اور بیہودہ نہیں لیکن Atmosphere بہت زور سے پیدا کیا ہے۔ تم تو آپ لاہور میں ضرور دیکھو گے لیکن اللہ کرے جو موسیقی یہاں تھی وہ وہاں بھی ہو۔ گوتم کی پیدائش میں، انہوں نے یسوع مسیح کی پیدائش کا سا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس دوران میں جو موسیقی بجی تھی اس میں بیٹھے بے شمار تالیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس میں آپ ذرہ برابر بھی مبالغہ نہ سمجھیں اور یوں بھی آرکسٹرا کے سارے پروگرام میں ہندوستانی راگنی کا رنگ نمایاں تھا۔ ایک مقام پر گوتم کا باپ ایک خواب دیکھتا ہے وہاں پر باقی آرکسٹرا تو بالکل خاموش تھا صرف CELLO جو طنبورے کی مانند بہت بڑا سا وائلن VIOLA ہوتا ہے صرف اس کے تار کمان سے نہیں ہاتھ سے بجا رہے تھے جس طرح ستار بجاتے ہیں تھا کی گمبیر تھرتھراتی ہوئی سُر بہت ہی موزوں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک مقام پر کچھ بنگالہ سا تھا۔ وہاں سب آرکسٹرا بجانے والے اپنے گلے سے بھی سُر بھی نکالتے تھے۔ الفاظ نہ تھے محض الاپتے تھے۔ یہ تصویریں جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تماشے کے بعد مفت ملتی ہیں۔ ملی کیا معنی وہاں ایک طاق میں رکھی ہیں جو چاہے جتنی چاہے اٹھا کے لے جائے۔ باقی سینما، تھیٹروں وغیرہ کے متعلق جو سوالات آپ کے دل میں اٹھیں وہ یا تو مجھ سے پوچھئے یا میرے آنے تک ملتوی رکھئے۔ میں فی الحال لندن میں مقیم ہوں۔ چند دن کے بعد کیمبرج جاؤں گا۔

لندن میں ہندوستانی طلبا کی انجمن میں بھی گیا حب وطن کی خاطر: وہاں کا ممبر بھی بن گیا۔ لیکن وہاں کی فضا میرے مذاق کے ناموافق ہے۔ بھلا جہاں طرح طرح کا نیشنل اپنی جبلی بدتمیزیوں پر ایک ہلکا سا انگریزی اخلاق کا غلاف چڑھائے فرعون بے سامان بنا پھرتا ہو اور اس بیچارے کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو۔ غیر دیسی بھائیوں کا ذکر ہی جانے دیجئے ؎

مرا از روز قیامت اگر غم است اینست

کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید*

مدت اللہ پہنچ کر سعید میں بہت سا اسلامی دروازہ دیکھنے داخل ہوا تھا اور حال یہ ہوا کہ محض اپنی ظرافت کی وجہ سے ابھی تک مسلمان ہوں

وہ اسلام نعوذ باللہ تنگ معلوم ہوتا ہے (سالک صاحب کو یہ فقرہ سنائیے)

میرا یہ خط احباب کو سنا دینا۔ جگل سے کہنا کہ ظالم تو نہیں ہے بلکہ جالندھر کی سیمل ہو جاتی تو میرے پیارے مدد سالک کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا (محاورہ کیا ہے؟ پیار دینا! پیار لینا! لیکن سالک کو پیار لینا مجھے عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ سالک سے پیار لینا کچھ کاروباری سا معلوم ہوتا ہے خیر)

میرے ذمے منشی صاحب کے کچھ روپے نکلتے ہیں۔ تین پاؤنڈ یا چار۔ آپ ذرا ان کے لئے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ خرید لائیے گا اور میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ حفیظ صاحب کی نظمیں وغیرہ مجھے بہت یاد آئیں۔ مثلاً کشتی میں سوار ہو کر میں "گنگنا رہے تھی" گاتا رہا

قبلہ مولوی صاحب اور برادر مکرم حمید علی صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجئے۔ گردھاری بابو، عاشق صاحب، اختر صاحب ... اور منشی لشیمن کو نیاز۔

حکیم یوسف حسن سے کہیے نیرنگ خیال خدا کے لئے بھجواتے رہیں۔ معلوم ابھی تک تبدیل کیوں نہیں ہوا۔ حکیم احمد شجاع کو میرا سلام پہنچا دیجئے اور کہیے کہ یہاں لندن میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ کچھ اس کے متعلق بھی غور فرمائیں۔

تاثیر صاحب کو سلام۔ باقی جو تم کو خیر رہے اس سے کہیے کہ بخاری نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ آئندہ میں ایک فہرست بنا کے رکھ چھوڑتا ہوں۔ اس کی ہزار دو ہزار کاپیاں چھپوا لوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(۳)

امتیاز بھائی! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا تھا۔ بجز اس ایک کاروباری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھیجا۔ اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی کہ انگلستان میں نو وارد تھا۔ ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیر اور بدحواس سا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کئے دیتی تھیں اور بسا اوقات انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سیکھنے کا بے حد شوق تھا لیکن کوئی سکھانے والا نہ ملتا تھا۔ سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں قیام ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن ان کے رویے میں ایک تصنع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک "کھوکھلاہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں کوسوں بھاگتا ہوں۔

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے اس پر میں خود حیران ہوں۔ ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے چند ہفتے ہو جاتے ہیں۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے۔ دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پوری اترنے کے لئے وقف ہے۔

جب میں کیمبرج میں پہنچا تو تمام کالج بند تھے۔ بازار بے رونق اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس عرصے میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچا لیں اور کیمبرج کے گرد و نواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا۔ جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں اور ادھر ادھر ہر طرف ہزاروں دروازے یک لخت کھل گئے جن میں سے ہجوم کے ہجوم کالے گاؤن پہنے تمام شہر پر چھا گئے۔ لہراتے گاؤن، بھولا بھالا چہرہ، پرانے گھاگ، گاؤن کیا کالے چیتھڑے، چال میں بے پروائی۔ چہرے پر ایک تیقن، استغنا، دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دھن

اچھے ہیں۔ یونیورسٹی نے سانس کیا یا ایک چھینک سی دی جس سے کیمبرج بھر میں ایک لرزہ سا آگیا جیسے کسی گھڑی ساز کی سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس بھونچال میں میں بھی ایک طرف کو دھیمے دھیمے چلا جا رہا تھا سینے میں ایک عجب ڈکن تھی اور دل پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی یا الٰہی اب کیا ہوگا۔ یہ تو دنیا ہی نرالی ہے اور یہ بے یار و مددگار۔ نہ ہم سخن نہ ہم خیال دور۔ پھر اپنے دل کی تقویت کے کوئی سہارا نہیں۔ سننے کے بعد گھر سے خود آتا تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے

جب لیکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی۔ وہ یوں کہ بعض لیکچروں میں تو توی میں ایک حرکت دل میں پرواز محسوس ہونے لگی۔ اور بعض لیکچروں میں یہ حالت تھی کہ وہ ٹک ٹک کھڑے بیٹھا ہوں۔ پنسل ہاتھ میں ہے۔ آنکھیں لیکچرار پر جمی ہوئی ہیں۔ ماتھے پر تیوری ہے۔ ہمہ تن گوش ہوں۔ ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا ہوں اور ہر فقرے کو دل میں دہراتا ہوا گزر جاتا ہے اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ کچھ لکھنے لگتا ہوں لیکن نہیں لکھ سکتا۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ ڈال سکتا۔ ایسے لیکچر کے خاتمے پر مجھ سا دل شکستہ و حقیر انسان کیمبرج میں نہ ہوتا ہوگا۔ اپنی کم مائگی پر بے انتہا نادم، زندگی کے ہندوستان میں صائع کئے ان کا بے انتہا افسوس۔ دل میں غضبناک سے نئے ارادے، نخوت علم کو شدید صدمہ۔ غصہ اور رنج، خطا اور مرجھایا ہوا، ایک نیم مردہ، مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھائے لائبریری کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان میں انگریزی کا ماہر، ننھی عمر میں لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا، دھوکا، اعتماد سب دھوکا۔ اے میرے بچپن کے رفیق اور ہم عصر اسب مایا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تپسوی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونے میں گم کر دیا۔ میرے عزیز دوست جب تمہارا کالج میں آؤ گے جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری کی طرح یہاں کی بھی روایت ہیں جو کتاب چھپے اس کی ایک کاپی کی حقدار ہے اس کتب خانے میں یوں ہاتھ پاؤں مارے جیسے مثلاً تم دریا کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کرو۔ غرضیکہ ایک بحران چھایا ہوا تھا۔ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے ہونا ممکن تھا۔ چنانچہ دیوانگی نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے اور علوم اس سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا؟ اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑے گا۔

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے۔ ہر کالج کا انگریزی لیکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لیکچر دیتا ہے میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتے میں دو دفعہ۔

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لیکچرار ہیں اور بعض لیکچرار ایک سے زیادہ موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس طرح انگریزی لٹریچر بھر میں ایک ہفتے کے اندر تیس پینتیس لیکچر ہوتے ہیں۔ ہر کالج میں ایک لیکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائرکٹر یا اوورسیر سے پکارا جاتا ہے۔

ہم کے مسٹر نامجی بائبل کی ہر طالب علم اپنے کالج کے اندر میرے پاس جو نسبتاً بلند پایہ کی کلاس کو پڑھانے سے علم کے
بجے اور میرے کمرے کے پاس سے ہو کر پہنچے۔ ڈاکٹر نے دروازے پر دستک دی۔ ایک نہایت نرم آواز نے "کم ان" کہا اور داخل ہوئے
تو دیکھا آپ کو کتابوں کی الماریوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک معمر پروفیسر مسٹر بینٹ (BENNETT) جانتے تھے۔ مسٹر بینٹ شیکسپیئر اور چاسر کے ماہر ہیں اور
چاسر کے زمانے پر ایک قابل قدر تصنیف (THE PASTORS...) کے مالک ہیں۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے ہندوستان کے حالات پوچھنے
شروع کر دیئے۔ گفتگو بہت جلد تعلیم پر ختم ہوئی اور زیادہ تر ہندوستان، اردو شعر و ادب، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ پارٹی، مسٹر جناح، مہاتما گاندھی، جواہر لال، پنجاب
یونیورسٹی، اقبال، ٹیگور، برنارڈ شا، کپلنگ اور حیدرآباد کے متعلق تھی اور کیونکہ ہم بھی آخر بڑی سے بڑی بحثوں سے نکلتے گئے ہیں، ان کے
ہمدردی اور ہچکچاہٹ کے بعد ہم نے بھی دل کھول کر بحث شروع کی گو بسا اوقات داستان کو زینت دینے کے لئے حقیقت سے ذرا انحراف
بھی کیا محض حب وطن کی خاطر، لیکن عام لہجہ ایک راست گو، حق پرست انسان کا تھا جو اپنی قوم کی کمزوریوں سے بھی طرح
واقف ہے، جو باوجود قوم انگلش کے گوناگوں احسانات سے باخبر ہونے کے انہیں ایشیائی تہذیب کے لئے کچھ مضر سمجھتا ہے اور جو اب
تحصیل علم کی خاطر یہاں کے مشاہیر کے قدموں میں بیٹھنے کو باعث صد فخر و تعظیم تصور کرتا ہے۔

جناب کچھ مسکرائے۔ ایشیائی تہذیب اور تاریخ اسلام سے بہت دلچسپی ظاہر کی۔ میرے انگریزی تلفظ کی بہت تعریف کی اور مجھے
یہ باتیں کرتے تھکتے ہیں کہ جیسے میں الف لیلہ کا کوئی کیرکٹر ہوں لیکن افسوس کہ تھوڑی ہی دیر بعد گفتگو نے انگریزی لٹریچر کی طرف رخ کیا جہاں اپنے
عجز اور کم مائیگی کا اعتراف کیا۔ اپنی نالائقی کو کوسا۔ اپنی جہالت کے متعلق ایک بلیغ تقریر کی اور جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا علاج
کیا ہے؟

جو کچھ انہوں نے جواب میں کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم بالکل جینئس ہو۔ اگر تم یہ توقع کرتے ہو کہ تمہیں ہر لیکچر سمجھ میں آ جائے تو
تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر رچرڈس (RICHARDS) کے لیکچروں کے متعلق شکایت کی ہو وہ کیمبرج میں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتے اور کوئی بھی اس قدر گہرا
نہیں ہوتا کہ چار سال کے اندر ہی تمام انگریزی لٹریچر کی ٹیکنیک گولی بنا کر نگل جانا چاہے۔ جو مصنف تمہیں پسند ہیں ان میں جن کی تصنیفات
تمہارے دل و دماغ میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا کرتی ہیں صرف وہی پڑھو۔ صرف انہی کے متعلق لیکچروں میں جاؤ۔ باقی بالکل چھوڑ دو۔
چنانچہ پوری لیکچروں کی فہرست دی اور کہا فلاں فلاں لیکچروں میں جاؤ۔ ان کے متعلق اس ہفتہ صرف یہ دو کتابیں پڑھو۔ اگلے ہفتے اس کے بعد
ہر ہفتے مجھ سے اسی وقت ملو۔ جو وقت تمہیں پسند آئے بالکل دن اور وقت کسی وقت مجھ سے مل کر بیان کرو۔ یہ کتابیں مجھ سے مستعار لے
جاؤ۔ پرسوں اگر میرے ساتھ چائے پیو، میری بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ رہتے کہاں ہو؟ میں کسی وقت آ کر تم سے ملوں گا۔ جب لندن میں
جا کر پروفیسر جونز سے ملو تو بعد میں مجھے اس ملاقات کا مفصل حال سنانا۔ کوئی کھیل کھیلتے ہو؟ نہیں؟ کوئی اور مشغلہ؟ شاعری، موسیقی؟ خوب کبھی ہمیں بھی
سنانا۔ تمہارے سفر کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اور حیران ہوا کہ تم لوگ ہندوستان میں رہ کر اتنی انگریزی
کیونکر سیکھ لیتے ہو۔ تمہارے دوست نے کہاں ہیں؟ راستہ تو نہیں بھول جاؤ گے؟ میں تمہارے ساتھ چلوں؟ نہیں؟ اچھا خدا حافظ۔ خوش رہا کرو اور
جب تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہو تو فوراً میرے پاس آ جایا کرو۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور واپسی پر تمام راستے مسکراتا آیا۔

پھر تو ہمارے حوصلے بڑھتے گئے اور جوں جوں دن گذرتے گئے زندگی خوشگوار تر ہوتی گئی۔ آج [illegible] ہوتے [illegible]

کافی دعوت دی۔ واقفیت سے دوستی اور دوستی سے بے تکلفی کی نوبت آئی۔ آپ آج عرصے سے مجھ سے دور ہیں دیس کی حد تک بچھڑ گئے ہیں لیکن ——

لیکن وہ ہندوستان کی صحبتیں کہاں، وہ خوش گفتاری، وہ سحر بازی، وہ بیٹھکیں، وہ مدلل، وہ مذاق، وقت بے وقت گرما گرم چائے اور کھانا (حفیظ صاحب کے مکان)، وہ چولی کی محفلیں، وہ دارالاشاعت کے جلسے، اساتذہ انگریزی کی بدلیاں، اشتیاق ہے پیدرے جگا کی خوش خلقیاں، مجھے مشتی کی جیبیں، میرے سالک کی مذہبی لن ترانیاں (اللہ دودھوں نہائے اور پوتوں پھلے) وہ حفیظ کی کھری بات کی مار)

غرض ان باتوں کو دو سال کے لئے بھلانا پڑے گا۔ اب زندگی کا یہ ڈھنگ ہے کہ کالج کے ہاسٹل میں دو کمرے ملے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹھنے کو ایک سونے کو۔ دن کو جنگلوں میں صرف رات کا کھانا اکٹھا کھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاسٹل میں یہ دستور ہے کہ ہاسٹل کے رہنے والے جن کی تعداد تیس کے قریب ہے، ناشتہ اور لنچ کامن روم میں الگ کھاتے ہیں اور شام کا کھانا سب کالج کے طلبا اساتذہ کے ساتھ کالج کے ہال میں ہوتا ہے۔ چائے کا اکثر یہ حال ہے کہ یا تو کہیں مدعو ہوں یا کوئی میرے ہاں کیا جاتا ہے۔

صبح کے وقت ڈریسنگ گون، پاجامہ، سلیپر اور تولیے غسل خانے سے آتے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غسل خانے کے اندر سب ننگے ہو کر بغیر کسی شرم و حیا کے ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔ پھر کامن روم میں حاضری۔ نو بجے کے بعد سب گون پہنے ہوئے پیدل اور بائیسکلوں پر جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ ایک ٹوکری لگی ہوتی ہے جس میں کتابیں وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ نو بجے سے ایک بجے تک لکچروں کے اوقات ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کیمبرج کا نظارہ تین عناصر سے مرکب ہوتا ہے (۱) گون (۲) بوٹ کیپ (۳) جلدی۔ دس بجے ایک لکچر اس کالج میں ختم ہوا۔ اور دس بجے دوسرا لکچر دوسرے کالج میں شروع ہونے والا ہے چنانچہ اب اوقات بازاروں میں سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔ لکچرار قسم قسم کے ہیں۔ ایک مسٹر بیٹ ہیں۔ ادھیڑ عمر جوانی میں بہت ہی خوبصورت ہوں گے۔ شیکسپیر اور زمانہ وسطیٰ کے لٹریچر پر لکچر دیتے ہیں۔ اس انہماک، اس جوش، اس فصاحت، اس بلاغت کے ساتھ کہ اکثر کلاس دو منٹ تک داد دیتی رہتی ہے (جس کا طریقہ یہ ہے کہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں) ایک مسٹر ٹل یارڈ (TILL YARD) ہیں۔ ملٹن زیادہ پڑھاتے ہیں اور اس کے علاوہ تاریخ تنقید پر بھی لکچر دیتے ہیں۔ لیکن جس موضوع پر بولتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنواں ہی صرف کر دیا۔ ایک مسٹر لوکس (LUCAS) ہیں۔ اچھے اچھے فقرے، اعلیٰ درجہ کا تمسخر، غضب کی تشبیہیں، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم ہے گو مطلب کی بات بہت کم کہتے ہیں۔ اس لئے گو دکا تیز سن پر ختم دیتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے مضمون کا ذکر نہیں کیا۔ ایک ڈاکٹر رچرڈس (RICHARDS) ہیں۔ نوجوان لیکن Litt. D. کی ڈگری کے مالک۔ نقد جدید ان کا خاص مضمون ہے۔ تنقید کی بنیاد دقیق نفسیات پر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے موجودہ مصنفوں کے بخیئے ادھیڑتے ہیں (ان میں بے چارے لارنس بھی شامل ہے) لیکن اچھے موضوع ہیں۔ اس قدر ڈوبے ہوتے ہیں کہ ہنسی مذاق کی بات ان کے ہونٹوں پر آتی ہی نہیں۔ جو شخص ان کے لیکچروں کے نقرے بھی اچھی طرح سمجھ لے یقینی امر ہے کہ دو تین سال کے بعد انگلستان کے بہترین نقادوں میں شمار ہوگا۔ لیکن ہائے وہ نقرے!

میں ان کے پاس بھی بیٹھتا ہوں دو دفعہ اپنا جواب مضمون دکھانے جاتا ہوں۔ یہ چاروں میرے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں لیکن میں جتنی پڑھ اور سکتا ہوں اور جس زمین پر میں رینگتا ہوں اس میں فاصلہ اس قدر ہے کہ میرا ان کے برابر ہونا شاید کبھی ممکن ہو سکے

میں ابھی تک اتنا قطعی نا مکمل۔ لہذا اگر ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ بہت کچھ۔ لیکن ہر دفعہ اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس پیدا ہو جاتا ہے اور بہت دیر تک برہم کئے رہتا ہے۔

اور ان سب سے بڑھ کر پروفیسر کوئلر کوچ (ARTHUR QUILLER COUCH) ان کے نام سے تو تم واقف ہو گے اگر نہیں تو تمہاری جہالت کی لاش اٹھے۔ کیمبرج میں ہر کہ و مہ ان کو "کیو Q" کے نام سے پکارتا ہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے باہر کم نکلتے ہیں۔ اور باقاعدہ لیکچر بھی نہیں دیتے۔ صرف ہفتے میں ایک بار کلاس لیتے ہیں۔ بدھ کے دن شام کے ساڑھے آٹھ بجے ان کی کلاس ہوتی ہے جس میں تمام پچاس ساٹھ آدمیوں کو ارسطو کی POETICS پڑھاتے ہیں۔ کلاس کا حال سنو۔ ایک لمبا سا کمرہ ہے۔ فرش پر قالین ہو۔ بیسیوں کرسیاں ہیں۔ آتشدان میں آگ خوب جل رہی ہے۔ بیچ میں ایک بڑی میز ہے جس پر پچاس ساٹھ پرچ پیالے پڑے ہیں۔ ساڑھے آٹھ بجے لوگ آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو پہلے آتے ہیں وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی فرش پر [illegible] پالتی مار کر یا نیم دراز۔

ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلتا ہے اور آپ داخل ہوتے ہیں۔ سر اور ٹھوڑی کے بال سفید، [illegible] ہاتھ میں [illegible] لئے ہوئے، چہرے پر مسکراہٹ۔ مسکراہٹ بھی ہزاروں کی سی اور [illegible] بھی بہت ہیں۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ [illegible] پیچھوں میں کھڑے ہونے کا دستور نہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک ملازم طشت میں چائے لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ سب لوگ میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنی پیالی لے کر اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے اور سگریٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے۔ پروفیسر صاحب کسی طالب علم کو پڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ایک آدھ پیرا گراف پڑھتا ہے اور پھر Q صاحب اس پر بحث کرتے ہیں۔ جس میں دنیا جہان کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ بعض دفعہ خوب نوک جھونک کی بحث بھی ہوتی ہے۔ کلاس کیا ہے ایک مذاق اور دعوت ہے۔ علم اور ادب کی ایک ضیافت ہے جس سے دل کبھی سیر نہیں ہوتا۔ خود پروفیسر Q کی شخصیت کا میں تمہیں اس سے بہتر اندازہ نہیں دے سکتا کہ ان کی ترکیب طبیعت کا نسخہ ان الفاظ میں لکھوں کہ شبلی، غالب، حالی، آزاد اور [illegible] کو ملا کر انگریزی بنا اور اس سے ضرب دے دو۔ انگریزی پڑھانے والوں میں سے لٹریچر کے شعبے میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جو پروفیسر کے لقب سے ملقب ہیں۔ لہذا تم ان کے تبحر کا اندازہ خود ہی لگاؤ۔

دوپہر کے ایک بجے لیکچر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دو بجے تک لنچ اور دو بجے سے چار بجے تک۔ تمام طلبہ [illegible] کھیلنے جاتے ہیں۔ چار بجے شام ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ آگ جلائی جاتی ہے اور اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا جاتا ہے۔ چائے کے بعد ہال تک (یہاں کی اصطلاح میں ہال شام کے کھانے کو کہتے ہیں) چاہو تو ایک آدھ گھنٹہ مطالعہ کرو، چاہو تو کسی کا وقت ضائع کرو۔ ہال کے بعد کافی کے لئے آگ پر پانی رکھ دو اور جب تک دل چاہے پڑھتے رہو [illegible] بے تکلف [illegible] کے باہر نکال دو اور اگر بہت ہی بدتمیز دوستوں سے واسطہ پڑا ہے تو دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر [illegible] شبہات کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہذا اپنے دوستوں کو اس کے صحیح معنی سمجھنے کی عادت ڈالو۔)

یہ تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ابتدا میں یہ سب کالج راہب خانے تھے۔ چنانچہ یہاں کی زندگی میں مذہبی رنگ بہت نمایاں ہے۔ ہر کالج سے متعلق ایک گرجا ہے اور اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے گرجے ہیں جن کے گھنٹے یہاں کی فضا کو ہر وقت [illegible] میں رکھتے ہیں۔ ہر ہفتے یونیورسٹی کے کسی نہ کسی گرجے میں ایک نہ ایک مشہور پادری یا واعظ [illegible] کا لیکچر ہوتا ہے۔ کیمبرج کا شہر بہت چھوٹا سا ہے۔ اور یہاں کی آبادی خاص طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور دوسرے

کے شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں ان کو GOWN MAN کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر شہر کے اصلی باشندے ہیں وہ سب کے سب دوکاندار پیشہ یا مزدور پیشہ ہیں۔ ان کو TOWNS MAN اور طلبا کی اصطلاح میں ٹاؤنی کہا جاتا ہے یہ سب لوگ نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں کالج کی حدود کے باہر شرفا مفقود ہیں۔

انڈر گریجویٹ UNDER GRADE لڑکوں کا یہ حال ہے کہ اگر چہ جوں بالی نہیں رہتا خصوصاً ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں۔ نیلا کوٹ اور خاکی پتلون یہاں کا لباس ہے۔ پتلون پر بڑے بڑے سیاہی کے داغ۔ گون کی بے حرمتی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس میں جابجا سوراخ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ لوگ پرانے معلوم ہوں۔ ان کے مشاغل کی کثرت کا کچھ نہ پوچھو۔ ہر قسم کے جنون ہیں۔ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں جس میں جنوبی افریقہ تک ہو آتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑتے۔ گولف کھیلتے ہیں۔ کشتیاں چلاتے ہیں۔ طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گرجا دیکھتے ہیں۔ جلد کا کام سیکھتے ہیں۔ تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض رؤسا بہت اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنتے ہیں۔ بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ایک پیانو کرایہ پر لے آتے ہیں۔ بعض نے دو دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں جس کے ماتحت دنیا کی ہر بڑی سڑک پر ل جاتے ہیں۔ بعض کی زندگی گھوڑ دوڑ کے لئے وقف ہے۔ بعض صبح سے شام تک لیبارٹری میں بھاڑ جھونکتے ہیں۔ ڈرامیٹک کلبیں بے شمار ہیں۔ بعض صرف اوپیرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں۔ بعض صرف یونانی کھیل۔ بعض سیدھی سادی کامیڈی۔ سینری۔ ڈریس وغیرہ سب خود بناتے ہیں۔ یا کم از کم وضع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے جس میں جو کام ہوتا ہے انہماک کے ساتھ انہماک و انضباط۔ یہاں کے دو بڑے اصول ہیں۔ اور ان سب کی تہہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کام کر رہی ہے جس کو TRADITION کہتے ہیں۔ ہفتہ بھر پہیئے پیادنے والی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں۔ رات کو بند کمرے، روشن چراغ اور کھلی ہوئی کتابیں۔ اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی، سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ اتوار یہاں کی اتوار ایک معجزہ ہے۔ دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤ گے۔ وہ بھی سیاہ پوش سست رفتار سوائے گرجاؤں کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بازاروں کو دیکھو تو ہو کا عالم۔ آہیں بھرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ شام کے وقت دن کی کسر پوری کر دی جاتی ہے اور مرد و زن کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکثر قبل از ازدواج کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ وہ شغل ہے جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جاری ہے اور شادی کے بعد بھی۔ شادی کا ارادہ نہ ہو جب بھی۔ حق تو یہی ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمام تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔ چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں۔ لیکن یہاں کی طالبات نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں نہ کسی ڈگری کی حقدار۔ البتہ لیکچروں میں آتی ہیں اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی۔ باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم لوگ ایک نوٹ بک کھول کر نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں اور

زیادہ سے زیادہ میز کا ایک مربع فٹ استعمال کرتی ہیں۔ وہ پہلے تو گلے سے ولزی کی دم کھول کر میز پر رکھ لیتی ہیں۔ پھر دستانے اتار کر رکھتی ہیں۔ پھر کوٹ اتار کر بنچ کی پشت پر پھیلا دیتی ہیں۔ دستانوں کے پاس اپنی ٹوپی اتار کر رکھ دیتی ہیں۔ پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے پنسل اور رومال نکالتی ہیں۔ رومال سے ناک پونچھتی ہیں۔ ہینڈ بیگ کے جھروکے سے آئینہ میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتی ہیں۔ کنپٹی پر سے زلفوں کے گھنگھر سنوارتی ہیں۔ پھر کچھ جھک کر کنپٹی کو پڑوسی کی ناک میں دے کر بہت خوبصورتی اور سلیقے سے نوٹ لینا شروع کر دیتی ہیں۔ دو منٹ کے بعد ان کے قلم میں سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔ فرماؤ کر آپ اپنا قلم یا پنسل پیش کیجئے اور خود گھنٹہ بھر مکھیاں مارتے رہیئے۔ ایک ایسے تلخ تجربے کے بعد اب میں ایک فالتو پنسل ضرور رکھتا ہوں۔

یہ حضرت کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر ذرہ پتھر تاریخ انگلستان کی ایک خاموش نسل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان اوورڈ (جس نے امریکہ میں ہاورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیور کرامویل CROM WELL سٹرن STERENE کولرج، کیمونل، بیکن، ملٹن، ٹینی سن، تھیکرے، میکالے، نیوٹن، بلورلٹن، پیٹ، ورڈز ورتھ، ہروی، ولیم پٹ، گرے اور ملٹن کسب فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی شہیر اس وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا، ایک غلام قوم کا فرد، انیس اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا، فسانۂ آزاد کا دلدادہ۔ طبلے اور سارنگی کا شوقین۔ "زینہ اراد گردشتاں" کا خریدار۔ ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا۔ مغلیہ عیش و عشرت کا خواہشمند۔ اتحاد اسلامی کے خواب دیکھنے والا میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔ خدا ابد سے رکھے اور ابد سے وطن کو واپس لے جائے۔ آپ میرے لئے بس دعا کیجئے۔

دو سال کے بعد "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے" دعا کر

اس دوران میں ایک دو دفعہ لندن بھی گیا۔ گلیڈس کوپر اور جیرلڈ . . . . کو ایکٹ کرتے دیکھا۔ لیکن تھیٹروں کے متعلق پھر کسی خط میں لکھوں گا۔ ایک دن پورا ڈاکٹر کے ساتھ گذارا۔ ان کی معیت میں پروفیسر جونز اور یونیورسٹی کالج کے اساتذہ سے دن بھر اردو، پشتو اور پنجابی کی اصوات کے متعلق نہایت تپاک سے ملا۔ انھوں نے میرے حروف تہجی کو سراہا۔ میں نے ان کی قرأت کو سراہا۔ بعض اصوات کے متعلق کچھ تیز بحث ہوئی کہ حلق کے کون کون سے کونے میں سے نکلتی ہیں۔ بحث بحث میں ہاتھا پائی کی نوبت آنے لگی لیکن بعد میں صلح صفائی ہو گئی۔

ایک دن لندن سے ہاشمی کا خط آیا۔ "ارے تم!" "ارے میں!" "اُفوہ" اس قسم کے جذبات کے اظہار کے بعد جناب نے لکھا تھا کہ کسی دن شام کے سات بجے کے بعد فلاں پتہ پر ہم سے آکر ملو۔ حضرت یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ میں لندن میں ہوں۔ خط میرے بچوں کی معرفت بھیجا تھا، ہم نے انھیں جواب میں لکھا۔ "بے عقل بچارے ہم جیسے شرفاء کو لندن سے کیا واسطہ۔ ارے ہم کیمبرج میں ہیں کیمبرج میں۔ یہاں آ کے ہم سے ملو۔" چنانچہ ایک دن شام کے تین بجے کے قریب آپ وارد ہوئے۔ "ارے یار بخاری" "ارے میاں ہاشمی" قہقہہ

دولیٹس کی ڈھنگ پر پلنگ گیر ہوتے اور شام تک بغیر ایک دوسرے کی بات سننے کے دونوں ایک ساتھ بکتے چلے گئے۔ کبھی گانے لگ جاتے، کبھی شعر پڑھنے لگ جاتے۔ غرضیکہ عجب ہنگامہ رہا۔ عجب عجب قصے دہرائے گئے۔ ہندوستان کی حالت زار پر بہت افسوس کیا گیا۔ اور آپ سب لوگوں کو انگلستان آنے سے محروم رہنے پر لعنت و نفرین کے ووٹ پاس کئے گئے۔ شام کی گاڑی سے وہ لندن چلے گئے اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئے۔ تم پوچھو گے ہاشمی کا کیا حال ہے؟ بھئی بالکل وہی چیز ہے بالکل نری۔

اس ہفتے کی ڈاک میں تمہارا خط — ہر سفن کا خط، زبیدہ کا خط، بچوں کی تصویریں سب ایک ساتھ ملیں یعنی ہندوستان میں جو کچھ محبوب ترین اور عزیز ترین ہے وہ یک لخت چھت پھاڑ کر میرے سر پر آ گرا۔ جنگل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ ان کی غزل نے مجھے گھنٹوں مست رکھا۔ جنگل میرے بھائی اور حفیظ میرے بھائی اور امتیاز میرے بھائی اور سالک میرے بھائی خط ضرور لکھتے ہیں مگر تم سب لوگ باری باری بھی خط لکھو تو ہر ہفتے مجھے اپنے احباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر مل جایا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو مہینے میں ایک دفعہ خط لکھنا پڑے اور میرے بھائیو تم خود ہی سوچو کہ مجھے ہر ہفتے ایک خط والد کو، ایک خط ڈپٹی صاحب کو، ایک خط اپنی رفیق حیات کو، ایک رفعت صاحب کو لکھنا ہوتا ہے۔ اے میرے بھائیو! میں تم سے ہر ایک کو ہر ہفتے کیسے خط لکھ سکتا ہوں (میری آنکھ اس وقت بھر آئی ہوئی ہے) لہٰذا اے میرے بھائیو! اسلامی اخوت کا ثبوت دو اور خط لکھو۔

میں نے اس اپیل کو بہت رقت انگیز بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ بوقت اشاعت میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔ اور میرے جذبات کو غائبانہ مجروح کرنے کی ازحد سعی کی جائے گی۔ فلک حقہ باز کو کیا کہوں؟

سالک صاحب! استاذی دیجئے! خدا کے لئے خط لکھو۔ جنگل کے خط نے تڑپا تڑپا دیا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

خاکسار بخاری

عمانوئیل کالج کیمبرج

۵ نومبر ۱۹۲۶ء

میکسیکو کے کوچہ و بازار

پروفیسر احمد شاہ بخاری مرحوم ۱۹۵۵ء کی پین امریکن کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا:

عزیز و مشفق، سلام مسنون

ڈان کے ایک تازہ پرچے میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے بعض طور طریقے اور تجربے شاید دلچسپ ہوں۔ ان کا مختصر حال لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک مجھے نظر آیا۔ یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال سے میونسپل کمشنر ہوا، وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام منسوب ہوئے تھے اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو سب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے۔ تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکمران رہے۔ دو لوگوں کا خون چوسا۔ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزور شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریباً سوا سو سال تک خانہ جنگی رہی جس میں بڑے بڑے لیڈر اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا جو کتنے سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر ذکر مارے گئے۔ اس سو دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبان وطن اور مشاہیر قوم پیدا ہوئے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہل ہوس کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں۔ بعض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ تین نام تو بالخصوص جا بجا ملتے ہیں۔

ایدالگو (HIDALGO) موریلاس (MORELOS) جواریز۔ ان میں سے دو مشاہیر نے ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریذیڈنٹ تھا۔ اس نے نیا کانسٹی ٹیوشن ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا اور کئی اصلاحات مرتب کی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہوگا۔ اس تاریخ کو میکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ ایدالگو (HIDALGO) نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر ۱۸۱۰ء کو کیا تھا چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے۔ اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ غالباً آپ یا کوئی سیاح جب میکسیکو آتا ہے تو اکثر ایک د

ایک دن ان تاریخوں کی اہمیت دریافت کرتے ہیں۔ گویا خواہ مخواہ میکسیکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ خود قوم پر بھی اس کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صرف مشاہیر اور تاریخوں ہی پر کفایت نہیں۔ ایک بازار کا نام آرٹیکل ۱۲۳ (123 — ARTICLE) ہے۔ یہ میکسیکو کے کانسٹی ٹیوشن کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق بالوضاحت محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ اس بازار کا نام گویا اس بات کی یادگار ہے کہ میکسیکو کی کانسٹی ٹیوشن مزدوروں کی دوست اور خیرخواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے۔ آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں۔ اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور بازار، محلہ یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام "پیرس" بازار ہے۔ ایک کا نام "مارسیلز" ایک کا نام "لندن" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسے بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔ علیٰ ہذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً نیل، ڈینیوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ۔

شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہل فن اور اہل علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں مثلاً شیکسپیئر، ڈارون، ریتال، کوپرنیکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً برازیل، ارجنٹائن، کیوبا، گوئٹی مالا وغیرہ۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو اسے بدلا نہیں جاتا، خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انارکلی بازار، چوک وزیر خان تو انداز کی گئی ایسے نام نہ بدلے جائیں کیونکہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو نکلتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ، تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بریں مقامی صنعت و حرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیاح فوراً شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے اور اہل شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت و حرفت اور فن اور کاری گری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے اور عالم اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ ایسے شہر ہیں جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں تو احساس قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہذا تہذیب اسلامی اکثر مشہور حکماء اور ادیبوں کی ممنون احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومی، خواجہ معین الدین چشتی، یا شعراء میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعراء میں غالب، ذوق، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔ مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے نکلیں گے جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہیے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطۂ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے اور ان کی توجہ بالصراحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس کی تہ میں ہے اور اس غرض کے لیے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے ہے کہ یہ نیک کام پاکستان کی وزارت اطلاعات بہ احسن انجام دے سکتی ہے۔ اسی لیے یہ مشورہ آپ کے گوش گزار کرنے کی جرأت کی۔ علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے۔ مغلوں کی دلی میں ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا۔ لیکن

تتمہ ——— ۲۰۸ ——— پرچی نمبر

روزانہ ماسٹر پیس استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ بادام، چاک، چھالیا، تانبا، پیتل، کپڑا، ڈبہ وغیرہ۔ کئی انقلاب [illegible] میں پیدا ہونے لگے ہیں
سکتے ہیں جو روزانہ ماسٹر پیس وغیرہ کا کام دیں۔

ہمیشہ آپ کی خیریت اور بہبود کا طالب
گاندی

خطوط

بنام عبدالمجید سالک :۔

نیویارک۔ ۱۲ر اگست [illegible]ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ لاہور کا نقشہ واقعی بدل گیا ہوگا۔ آپ لوگ (؟) شہر آشوب پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو خط لکھنا مبارک ہوا کیونکہ اسی دوران میں ن م راشد کا خط بھی ملا جس میں حفیظ (ہوشیارپوری) کی تازہ تاریخ گوئی کا لطیفہ شگفتگی کا باعث ہوا۔ سنا ہو تو سنا دوں۔ راشد نے عبید شعرا پر ایک مضمون لکھا جس کے ضمن میں نقرے حفیظ صاحب (جالندھری) کو گراں گذرے۔ انہوں نے تاڑ کر۔۔ شعر لکھ بھیجا ؎

خبث درون دکھا دیا ہر دہن غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

ان پر حفیظ ہوشیارپوری نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔ "خبث درون" (۱۳۷۰ھ) راشد نے چند اور دلچسپ باتیں لکھ دیں جن سے شب و روز میں کچھ شگفتگی پیدا ہو گئی۔ آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا رخ (؟) ... تو سلمان صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی تو دل میں ہو گی ایک اور بلند نظر آنے لگے گی۔ بہرحال محض انہیں مخاطب کر کے ہی بہ طریق ملاقات کا مزا آ ہی گیا۔ اگلے دن ایک کتب فروش کے ہاں ملک راج آنند کی ایک تازہ تصنیف انڈین تھیٹر نظر آئی۔ کتاب مختصر ہے وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ بڑے طمطراق اور شان و شکوہ سے چھپی ہے لیکن جہل اور تعصب کا عجیب و غریب مرقع ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے لیکن ہندوستانی تھیٹر کے عنوان کے تحت میں بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے آغا حشر کے متعلق کہا ہے کہ "A HACK WRITER CALLED AGHA HASHR ....." "A THIRDRATE POETASTER" اور اسی قسم کی اور خرافات بک کر آغا حشر کو تین چار سطروں میں نمٹا دیا ہے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سالہا سال سے احباب سے التجا کرتا چلا آیا ہوں کہ آؤ ہم تم مل کر اردو تھیٹر پر ایک کتاب لکھیں اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ ہمارے انتقال کے بعد کوئی یہ کام نہ کر پائے گا۔ جو مسالہ ہمارے پاس موجود ہے اور جتنی جوانی ہم نے تھیٹر پر چھڑکی ہے کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی لیکن انہوں نے توجہ نہ کی فلم سازی انہیں ایسی چمٹی ہے کہ ان کی علم دوستی خواب اور افسانہ ہو کر رہ گئی ہے ان کے بغیر یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں۔ ذخیرہ سب ان کے پاس ہے اور وہ متعدد کھیلوں سے واقف ہیں جن کا مجھے صرف نام معلوم ہے۔ آپ کو یہ داستان درد اس لئے سنا رہا ہوں کہ اگر ان کی طبیعت میں اکساہٹ آپ سے نہ پیدا ہو سکے تو آپ اس کام کا بیڑا کیوں نہیں اٹھاتے۔ مانا کہ آپ کراچی میں ہیں اور میں نیویارک میں اور نہ معلوم یہ بعد کب تک رہے گا تاہم یہ مشکل ایسی نہیں کہ اسے پھاند نہ سکیں جب تک ہم لوگ زندہ ہیں یہ امر محال نہیں۔ موت سمجھتے ہیں حائل ہو گئی تو کوئی اسے نہ پھاند

سے کام لیکن "ماسیاگلہ" "تو بیچک" گئے ہیں۔

ہندوستان سے جو آتا ہے اس کی خبر صرف سرکاری ذرائع سے ہم تک پہونچتی ہے تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں اس لئے طبیعت منغض رہتی ہے نہ معلوم ہندو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں شاید آئندہ الیکشن کی وجہ سے عمل و فکر کی یہ راہ اختیار کی ہے اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لندن میں ظفر اللہ خاں کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ عام لوگوں کا قائل ہونا تو ایک طرف پاکستان کی محبت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے یہاں سب لوگ قائل ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے ان کے معترف بنتے چلے جاتے ہیں۔ یقین خدا کا شکر ہندوستان کے کان میں سیسہ ہے ورنہ سب اپنا کام کر سکتے ہیں۔

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہونچا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ان سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے۔ ہم یاد رہیں گے۔ صحت یابی انہیں میرا سلام شوق بھی پہونچا دیجئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

نیویارک، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

برادر محترم سلام مسنون۔ امید ہے آپ صحیح اکثر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔ انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے تاہم جب کبھی شہر جانا ہوا اور دوستوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہئے۔ "ا چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا جواب سے حسب معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہونچا دیجئے "گردش کے کاروبار میں اس سے بھی لمبا اوقات فلاں پہنچتا ہے۔ کیا صافی صاحب بدستور ہوسٹل میں نگران ہیں یا کچھ دیر کی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں؟ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی۔ اور کیا شریف صاحب کراچی ہی میں ہیں یا لاہور واپس آ گئے؟ ان سوالات سے مکمل معلومات کرنا مطلوب نہیں محض احباب کے مستقر و احوال کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظرے ہی سے بے خبر ہوں۔ اس لئے تکمیل کا فقرہ ٹھیک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے اسلامی کلچر پر یہاں کے ایک مقتدر مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا وہ عنقریب اور فلسفیان عالم کے رشحات قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہب قدیم اور حقوق انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے یہ مدعی کی کہ اسلام کی نمائندگی وہ کریں۔ آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی۔ کنیڈا کی McGill یونیورسٹی والے چاہتے ہیں کہ اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے عنقریب وہاں کے پروفیسر سمتھ انتخاب

انتخابات کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ آپ سے بھی ملیں۔ سمتھ پہلے بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں ——— "MODERN ISLAM IN INDIA" کے مصنف ہیں۔ آغا سید [illegible] انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب آج کل یہاں ہیں۔ مراجعت کشمیر کے آنے والے سیشن کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ سب انتہائی [illegible] معروف ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بہ حسن و خوبی عہدہ برآ ہوں۔ ایک امریکن یونیورسٹی [illegible] چاہتی ہے [illegible] کرنا چاہتی ہے لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر۔ بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں [illegible] پنجاب یونیورسٹی کے ارباب سے کا منتظر ہوں کہ وہ بہ ہاتھ اٹھ سکتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر [illegible] سابق پرنسپل فارمن کالج [illegible] ترغیب زور لگا رہے ہیں۔

آپ کے لاہور میں کچھ باحسان ہونے کا خیال آتے تو کیا [illegible] جب تک آپ کراچی میں تھے آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے اک اطمینان تھا۔ سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں لاہور کا [illegible] اب [illegible] گا؟

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انشا اب بھی [illegible] کر کے العباد [illegible] جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے انہیں بھی میرا سلام کہئے گا۔

آج اتوار کا دن ہے۔ [illegible] ہوں۔ [illegible] ہر ملک اور ہر جلسے میں [illegible] چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس کے سفر کے لئے بیٹھے لگا۔ شروع کر دوں گا۔ پہلے [illegible] سب [illegible] بیٹھتے ہیں۔ کل شام ٹیلی ویژن پر میری [illegible] ہوگی۔ کچھ شعر کچھ حبابانی عہد نامہ کچھ کر دیا۔ وقس علیٰ ہذا ——— غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے الخ

خاکسار

بخاری

---

(۲)

12 E 65th STREET NEWYORK

۲۲ مارچ سنہ ۵۲ء

برادر محترم سلام مسنون۔ نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ یہ آپ کا شیوہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دن سے بیماری کی بیماری سننے میں آئی ہے۔ سمعان بے چارے کو نمونیا ہو گیا انور کا خط آیا تھا کہ اب بہتر ہیں۔ اسے بھی ایک دو ہفتے گزر گئے نہ معلوم اب ان کا کیا حال ہے۔ میں پیرس سے یہاں [illegible] کو پہنچا بالکل چور۔ پہلے انفلوئنزا ہو گیا اس سے صحت یابی آخر خون کا دباؤ یک لخت گر گیا۔ سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فراش ہونا پڑا۔ اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو عرصے سے [illegible] کی شکایت ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں امید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی بشرطیکہ آپ کراچی نہ اٹھ گئے ہوں۔ آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل اور ڈس آرمینٹ کمیشن میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے کئی لوگ آئے ہیں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی لوہا ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ اسد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہوئے تھے۔ جنوری کی بجائے مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ

انہیں اپنے ساتھ بلادِ اسلامیہ کے دورے پر لے گئے تھے۔ جب کراچی واپس پہنچے تو انہیں ریڈیو پر رہنے پڑے۔ دو بیٹیاں ہیں اور ان کے تنخواہ اور تنخواہ معمولی۔ غرضیکہ بوجوہ پریشان رہا۔ اب زندگی کا نقشہ پھر کچھ بدلنے لگا ہے۔

لاہور کی خبر صرف اتنی ملی کہ ہاشمی صاحب بھی رخصت ہو گئے۔ یہ خبر وہ مسلمان نے سنایا۔ اسے کسی کی بیٹے جیسے لگتے۔ مزید اطلاع آئی۔ صوفی تبسم کا ایک نادر رسالہ حمید الدین (بن مولوی صدر الدین مرحوم) کی وساطت سے پہنچا۔ حمید یہاں یونیورسٹی میں نفسیات پڑھ رہے ہیں عنقریب واپس جائیں گے۔ عابد حسن یہاں کسی سے یونیورسٹی بلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ آجائیں تو بہت ہی خوب ہو۔ یوسف عبد الحکیم یہاں اپنی لیکچر بازی ختم کر چکے ہیں اب واشنگٹن میں سستا رہے ہیں۔ اگلے ہفتے نیویارک آئیں گے اور دو چار دن کے بعد کراچی کا عزم کریں گے۔

اخبار و اطلاعات تو ختم ہو لیں اب سنو تو ہوں کا ذکر رہ گیا تھا۔ پرسوں یہاں برف پڑی تھی۔ یہ مارچ کا آخر ہی سنبھالا تھا یوں خزاں کے ساتھ سے بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ عنقریب مکان کی دیواروں پر جو بیلیں مرجھائی ہوئی ہیں ہری ہو جائیں گی۔ وہ ہری بھری بیل کی ٹہنی یاد آتی ہے۔ دل بیٹھ گئے تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے رعشہ طاری تھا معلوم ہوتے ہوئے کہ مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا۔ بہار کی ہوائیں یوں ہی چلتی تھیں جی۔ اور کاروبارِ عشق بہ نوع جاری رہتا تھا۔ کیا اب بھی راوی کے اس پار مقبرہ جہانگیر کے باغ میں کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے؟ کیا اب بھی قالوں کا موسم قریب آ رہا ہے؟ جب بیماری کے دنوں میں بالکل خالی الذہن تھا تو رسالہ باب لاہور اور لاہور شب کے کئی موقعے تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھتے تھے۔ ... کی بزمِ عشاق دلی مسلم ہوٹل میں ... افغان کا ہجوم ... مرحوم۔ فرزند علی (جو ہر وقت پان کی وجہ سے رطب اللسان رہتے تھے) منشی نعمت علی کی ... پرانی انار کلی میں حکیم احمد شجاع کا مکان ... کا گناہ۔ تاثیر کی ... چراغ حسن حسرت (وحدت کی قسم وہ یہیں ہیں) ڈیگ پر جلی کا شور ... پر اسرار معشوق۔ پھر گورنمنٹ کالج لاج کا دور۔ صوفی کی پنجابی غزلیں۔ تب ریک کی تقریریں۔

اے کاش کوئی از سرِ نو ان اوراقِ پریشاں کا شیرازہ باندھ دے۔

دوش بر یادِ حریفاں بخرابات شدم — خمِ مے دیدم خوں در دل و پا در گل بود
پس بجستم کہ بپرسم سببِ دردِ فراق — مفتیِ عقل دریں مسئلہ لا یعقل بود

آپ کی خیریت کا طالب ہوں اور آپ کے خط کا منتظر

ہر آنکہ جانبِ اہلِ وفا نگہ دارد — خداش در ہمہ حال از بلا نگہ دارد

خاکسار
بخاری

---

(۴)

نیویارک، ۲۰ اپریل [illegible]ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ بے تاریخ لیکن غالباً اوائل اپریل شرفِ صدور لایا۔ آپ خط لکھیں نہیں پر پولیس میں ایک ہی مکتوب سے آپ خبروں کا ایسا چھڑکاؤ کر دیتے ہیں کہ مہینوں کی تشنگی مٹ جاتی ہے۔ جب سے پیرس آیا۔ مسئلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس

باعث میں نے ایسا سرفراز کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی پہلو باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے جو کچھ [illegible] ۔ قابلیت میری کیا بیان کی [illegible] ابھی تک
تو معنی خیال کا تانا بانا ہوتا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں [illegible] ایک بہت نامی اخبار نے (نام ابھی نہ لوں گا) ہفتہ
میں ایک آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کر لیا ہے اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے [illegible] ایک نامہ نگار میرے ساتھ متعین کر دیا ہے جو رات دن
میرے ساتھ پھرتا ہے اور بے شمار [illegible] پر مجھ سے گفتگو کر کے نوٹ لیتا جاتا ہے۔ چند دن یہی شغل رہے گا اس کے بعد وہ [illegible] صفحے کا آرٹیکل لکھے گا۔ یہاں
کے صحافت باز لوگ بھی عجیب وعاجزانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں پر ایسے آرٹیکل لکھنے کی [illegible] ان کے ساتھ [illegible] کو تحقیق کر دیتے ہیں
شائع ہونے والے آرٹیکل پر [illegible] اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور
پاکستان کی طفیل مجھ پر بھی اپنی رحمت برسائی۔ قصہ مختصر [illegible] میں لا کھڑا کیا [illegible] ۔ یہ
داستان ایک زمانے تک [illegible] ملاقات ہوئی انشاء اللہ کبھی عرض کروں گا۔ آپ جانتے ہیں [illegible] تقریر [illegible] مرتبہ تقریر کے [illegible]
تقریروں کے دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تھی۔ مجلس [illegible] ریڈیو وغیرہ [illegible] کروڑوں [illegible] نہیں ہوتے اور پھر
دائیں بائیں بھی [illegible] اور جغادری قسم کے لوگ [illegible] کیا عرض کروں

پاکستان آنے کے لئے بے قرار ہوں مگر [illegible] جنوری تک جنرل اسمبلی کی وجہ سے نیویارک میں [illegible] آیا تو یا
تو اکتوبر سے پہلے یا جنوری فروری میں۔ تاریخ کے تعین میں توقف اس لئے ہے کہ [illegible] میاں چاہتے ہیں میں ان کی شادی کے موقع پر کراچی ضرور
موجود ہوں۔ شادی کی تاریخ ابھی ان لوگوں نے مقرر نہیں کی۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز مرحوم کی صاحبزادی کے لئے پیغام بھیجا ہے۔ خاتون کا نام
روشن ہے۔ اور ہر شخص سے اس بچی کی تعریف سنی ہے۔ زبیدہ یقیناً آپ سے بات کریں گی [illegible] آپ اپنے [illegible] مجھے
اور ہارون کو [illegible] رکھیں گے۔ کبھی فرصت سے تو ازراہ لطف عام معاملات پر بھی [illegible] خیالات لکھیئے [illegible] یہ کچھ عزیزوں کا سا ہے
میں تو متوکل انسان ہوں البتہ زبیدہ [illegible] ایک [illegible] کی عادی ہے [illegible] ہو گیا ہے۔ [illegible] صبر شکر سے کام لیتی ہے [illegible]
ہے اس بد مزگی سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ تاہم عجب نہیں [illegible] میں آپ کا کلام [illegible] کے دل میں [illegible]
جائے۔ اور اس کی [illegible] واللہ اعلم کیا کیا [illegible] ہو جائیں

آپ بھی اب کراچی ہو گئے۔ خدا کرے آپ کو مکان خاطر خواہ مل جائے۔ مسٹر [illegible] کی کوٹھی کے بعد [illegible] جاری [illegible] میں زندگی
کا کیا لطف آئے گا۔ آپ کے کراچی آنے سے میں خوش ہوں۔ کراچی میں لاہور کا سا رس نہیں لیکن جب حلقہ احباب کے باقیات [illegible] سب کراچی میں ہیں
تو لاہور سے بہتر ہے۔ کم از کم آشنا صورتیں تو نظر آئیں گی۔ شریف (محکمہ تعلیم) آج کل امریکہ میں ہے ڈاکٹر [illegible] کے سلسلے میں
یہاں ہیں۔ خلیفہ حکیم اس وقت [illegible] اسلامیہ میں [illegible] مولانا روم پر [illegible] پڑھ رہے ہوں گے۔ [illegible] عنقریب کراچی پہنچیں
گے مجید ملک اور [illegible] کی کبھی کوئی خبر نہیں آتی۔ فلیمنگ روڈ کے ایام کے [illegible] ایران جنگ
[illegible] میں) سلمان یقیناً صحت مند ہوں گے کیونکہ [illegible] سے ان کا خط نہیں آیا سنا ہے [illegible] کراچی آئے تھے چند محفلیں روشن کر کے پھر لاہور چلے
گئے۔ ان کی جانب سے تو کبھی خط آتا ہی نہیں۔ ہمارے دوست ماشاء اللہ اہل قلم سے بڑھ کر اہل القلم ہیں

خط لکھتے رہا کیجئے اور "چہ باجیب [illegible]" ..... الخ   خاکسار

بخاری

(۵)

نیویارک ۱۳ اگست ۱۹۵۲ء

برادر محترم، سلام مسنون۔ یہ بھی میری بے کار ایام زندگی کی ایک مثال ہے کہ جب آپ کا خط ملا میں ایک کانفرنس میں تھا۔ سوچا کہ فرصت سے لکھوں گا۔ میں نے جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں پڑھوں گا۔ اب نہ معلوم وہ کون سی جیب کس کوٹ کی تھی۔ تین دن سے تلاش کر رہا ہوں۔ آخر ارادہ کیا کہ منہ زبانی ہی جواب لکھ دوں۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ آپ میری خاموشی سے شاکی ہیں اور خط کا خاتمہ کسی پرمعنی فقرے یا جملے پر ہوا تھا کہ آپ "ٹیڈ ریڈیشن" سنتے ہیں۔ عجب پریشانی تھی!

جولائی اگست کے مہینے یہاں مشکل سے کٹتے ہیں۔ گرمی اور رطوبت یعنی بالکل کلکتہ ورگا بے کلے معاش۔ اس دوران میں چار بار جاری رہا۔ کشمیر سے نکلے تو یہاں سے جنیوا روانہ کیا تو ان کی آرمینڈ ٹیکنیکل اسسٹنٹ/ ایسوسی ایشن کے جلاس ترا تر جمع ہونے لگے۔ ۱۴ اکتوبر کو جنرل اسمبلی ہے اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہوئی ہیں۔ معاونین سے جو توقع تھی کہ ستمبر کی تعطیلات ماریں گے وہ توقع موہوم ہوئی۔ ہم سب سمجھتے تھے کہ [illegible] مبارک۔

اسد محمد خواجہ جان ورد مند کا یا نیشن انہیں فرصت کشاکش تھی یہاں آئے۔ دلی نئی دہلی ترتیب تھانہ سے واپس ہو گیا اور ہفتہ بھر وقت لیٹر میں لیٹے کتابیں پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ پر کیا کریں کہ دل ہی دل میں خوش ہے فرض کا۔ بہر حال اب ستمبر تک تو یہی باربرداری کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد چھٹی لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چھٹی ایک سے دو مہینے تک کی ہے۔ گھر سنبھالنے کو بھی دل چاہتا ہے لیکن تو دو سری رسے تبدیل ہو کر پاکستان رہوں۔ تاہم ساتھ فاران بھی ساتھ ہیں۔ جو کچھ بعد کی باتیں ہیں۔ نئے احوال آزادی پہنچنے کے نقشے دماغ میں ڈھل رہے ہیں۔

اس دوران میں مختصر مہمان آئے۔ سنا تھا کہ بادشاہ کے مہمان تھے چنانچہ ان خاطر سے رہے کہ ہماری میزبانی کے متوقع بھی رہے اور اس سے بے نیاز بھی۔ جب گئے تو پھر بہت خوش کچھ شاکی گئے۔ غلام محمد چند دن سے یہاں ہیں۔ ایک دو مرتبہ ماحضر تناول فرمایا۔ وطن کے حالات سے آگاہ بھی کرتے رہے۔ وطن کے حالات سے یہاں بیٹھے بے خبر رہتا ہوں۔ بہ استثنا ان علم میں آتے ہیں جو سرکاری اطلاعات کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ ڈان پڑھنے کی کبھی فرصت ملتی ہے کبھی نہیں ملتی۔ جو یار یہاں آتا ہے وہ کسی نہ کسی افسر کی بیماری کا حال سناتا ہے۔ غلام محمد رکھتے، کہ محمد علی بیمار ہوئے اب سنا ہے عبدالقادر صاحب [illegible] ہیں۔ کراچی کی آب و ہوا بھی بدلنے کا تہیہ کر لینا چاہیے۔ سلمان سے تو ان سے کہیے کہ ان کی جانب سے ایک مسودہ موصول ہوا ہے جس میں نیاز صاحب یا ادبی کسی اور مسلم کی آپس میں تو تو میں میں کا حال مفصل مندرج تھا کہ ایک اور مسودہ شریف صدور لایا جو خود ان کی ایک ریڈیو ٹاک کا مسودہ تھا۔ حاشیہ پر چند کیڑے مکوڑے بنے تھے۔ نقوش سے اسی روز ان کا گرامی نامہ سمجھ کر خوش ہو لیا۔ لیکن اس سے اتنی اکتاہٹ پیدا ہوئی کہ پیپر ویٹ لے لیا۔ بہر حال انہیں عنقریب سامنے سا ماں کے ساتھ خط لکھوں گا۔

ہارون کی شادی دسمبر کے آخر میں ہوگا۔ میں وسط دسمبر سے کسی صورت پہلے نہ پہنچ سکوں گا۔ نہ معلوم ایسی تقریبوں پر کیا کیا انتظامات پیش از وقت کرنے پڑتے ہیں۔ امید ہے آپ زبیدہ کی اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اور دیگر احباب اگر اس کام میں بقدر فرصت حصہ لیں تو تقاضائے نیازمندی ہے حد ممنون ہوں گا۔ ہارون منصور ماشاء اللہ جوان ہیں لیکن ناتجربہ کار ہیں۔ آپ کی ہدایت کی انہیں بے حد ضرورت ہوگی۔ سلمان کی خدمت میں بھی میری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے۔ ذوالفقار کو بھی خط لکھوں گا۔ لیکن نہ معلوم وہ کس حد تک توجہ کریں

آپ اور سلمان کو پیار پہنچے۔ خدا آپ کو خوش رکھے
امریکہ سے کچھ منگوانا ہو تو مجھے لکھ بھیجئے۔ یہاں کا شاپنگ از حد صبر آزما ہوتا ہے۔

خاکسار
بخاری

---

(۶)

[illegible]۔ ۱۹ فروری ۵۸ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اترا۔ بے آرامی میں ایک قیمتی اوورکوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں) سخت نزلہ اور بخار۔ سیدھا ہسپتال لے گئے۔ اب افاقہ ہے۔ لندن میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا جو مضافات میں واقع تھا۔ بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ اردگرد وسیع باغ۔ دن بھر ہوٹل ہی کے آفتاب خانے میں بیٹھا رہا۔ کسی دوست آشنا سے جو لندن میں رہتے ہیں ملاقات یا ٹیلیفون کی کوشش نہ کی۔ موسم سرد تھا۔ خیال تھا کہ نزلے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کسی کو لندن سے گزرنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ البتہ روم کے ایرپورٹ پر اسلم ملک اور اس کی بیوی ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ان کی معیت میں گزرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس نیویارک جا رہے تھے۔ قاہرہ کے ایرپورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مرزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں ملنے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے۔ ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی ہمت نہیں کی۔ چودھری ظفر اللہ خان یہاں سے جنیوا پہنچے ہیں۔ آج پہلی دفعہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً اور کچھ دل بہلانے کے لیے۔ مصروفیت رافع تفکرات ہوتی ہے۔ آج ہارون کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اسے میں نے لکھا ہے کہ زبیدہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے خرچ کا تخمینہ لکھ بھیجے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ اسے میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی بجائے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہو گی۔ خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ فی الحال تو تجوری خالی کر رکھی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت سب منتشر ہوں گے اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خیریت دریافت کرتے رہیے گا۔ جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا تو اسے بھی بخار اور زکام تھا۔ شادی کی بھاگ دوڑ نے کافی تھکا دیا۔ منصور اور زرینہ غالباً تعطیل منانے دلی چلے گئے ہوں گے۔ ہارون لاہور میں ہے۔ غلام آج کل دورے پر ہے۔ وہ ۲۲ فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے اوقات جیسے مصروف ہیں وہ آپ جانتے ہیں

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا جس کی امید تھی۔ لوگ پژمردہ اور ان کی گفتگو اکثر متفکر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات ہمیشہ دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور تو گیا لیکن لاہور سے محظوظ ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب سے (بجز ایک عابد علی کے جو برات میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات تو ہو گئی۔ اب دیکھئے اگلے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قہقہے نصیب ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے اور شادی کے انتظام میں بھی آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل ہی بوکھلا گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت اور شاداں رکھے۔ مجید لاہوری کی صحبت بھی حاصل رہی تھی۔ ان سے میری

جانب سے معذرت کر دیجئے گا کہ وہ خط نہ لکھ سکا۔ تیسرے ترس گھر پر موجود نہ تھا۔ ان کی صاحبزادی بھی اور سب سے بڑھ کر ان کے اخلاق اور ان کی ذہانت کی یاد سے طبیعت بار بار اب تک ہے۔ خدا ان کے دماغ کو اور جلا دے۔ ان پر سلام ہو۔ نیز ندوی صاحب پر بھی جن کی کتاب پڑھی (جو آپ کو انہوں نے تحفۃً دی تھی) وہ دو میرے گھر پر ہے آپ وہاں سے وصول کر لیجئے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی میں ان کا منصب آرٹ لیکچرار کا ہے۔ ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں یہاں کے سب سے بڑے عجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائریکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے کھانے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے شاہد کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں بہت سے ہم سخن اور ہم زبان ملیں گے۔ سلیمہ ان پر انحطاط آ گیا ہے اور ان کا دل پژمردہ ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاش معاش میں وطن سے اس قدر دور۔ ان پر ترس آتا ہے۔ طبیعت کی ان کی حساس ہے خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوش دلی ان میں نہیں ورنہ وہ زندگی اس گاؤں کی زیر سپہر! یہ محض نیویارک پہنچنے کا خط ہے اس لئے اختصار منظور ہے باقی آئندہ!

ترجمے کے لئے اردو کے مختصر افسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاد دہانی کراتے رہئے گا۔ حسرت کو سلام۔ پڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی مکتب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار

بخاری

---

(۷)

یو۔ این

۱۹ فروری ۵۳ء

برادر محترم! بعد مدت آپ نے بھیجا تھا اسی کے مطابق آپ کا ۱۲ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹ فروری کو نہیں بلکہ ۱۸ کو یہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں بلکہ خود بخود خط ہے۔ اور ایک ضرورت سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ "بھنگیوں کی توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں۔ کس نے بنائی؟ کہاں بنائی؟ کیا توپ ساز کا نام اور کوائف معلوم ہیں؟ توپ کا اصل مالک کون تھا؟ توپ کی عمر کتنی ہے؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے سامنے کیسے پہنچ گئی؟

اس ریسرچ کا محتاج لیڈی میاں ایک جرنیل کی استعانت کرنی ہے۔ ان حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کوئی علم نہیں، بجز بھنگیوں کی توپ کے اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک۔ کپلنگ کی کتاب "کم" KIM میں اس کا حال انہوں نے پڑھ رکھا ہے (اسے کہتے بھی "کم کی توپ" ہیں) اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا تو وہ پھولے نہ سمائیں گے بلکہ شاید انہیں مطلّا و مجلّا کاغذ پر لکھوا کر اپنی لائبریری میں محفوظ کروا دیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب کو لکھوں۔ پھر اور جواب جلد دینا انہیں گوارا ہوگا یا میرا خط محکمانہ مسلوں ہی میں کہیں چکر کھاتا رہے گا۔

اول تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے (آپ کا دماغ اور آپ کا انڈکس عیاری کی زنبیل سے کم نہیں) ورنہ معلوم ہے کہ آپ کراچی میں کسی ماہر

سے حاصل کریں گے۔ جواب جلد لکھیے

غالب ٹائنڈی کی ترجمہ خوب رہا۔

دیکھو کہ آج کل کام کیا کیا ہے

یعنی معلوم ہوا کہ یہ اشارہ ادا کر لیا گیا۔ کالج کا مال وادو کہ شاہد کا ہندی کی ترجمہ ہوا۔ اندرا کے بعد ٹائنڈی کی تحقیقات۔ ابتدائی ادارہ کالج کا ہم ہے۔ یہ ترجمہ ساز ہو ہیں یہی مفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ آج کل کام کالج میں کالج کا ہم ہی تھا۔ مگر یہ لفظ ایسے کہ ہندوستانیوں سے آتے وقت ایسی آتی ہیں بگڑ دیا سمجھوں، یہ لفظ کس طرح استعمال ہوتا ہے۔ اب میں شادی پر بات سنے کے لئے تھا۔ عزیزہ فضل کی ہو۔ ہو اس سے پہلے نوع متفق ہو کہ اس پر معلوم ہوتا ہے میں نے اسے جواب بھیجا ہے کہ مجھے اعتراض نہیں۔ البتہ زبیدہ سے مشورہ کر لے۔ امی کی رضامندی حاصل کرے۔ روپے کا جو انتظام کرنا ہے اس کے متعلق سے پیسے لے کر دیں یا آگے چل کر دوں۔ ابھی لندن اس کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہئے۔ ہر شخص کی خیال ہے کہ کو دینا چاہئے۔ ہمیں کا استحقاقات اہل ہوتے۔ باقی حالات آپ برادر زبیدہ پر چھوڑتا ہوں۔ ان کے نزدیک شادی اپریل تک ملتوی ہو اس کے ذہنی رجحان لے) سے خوش گوار نہیں۔ بلکہ کچھ پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس کے خط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپریل پر ہواؤ مجھ کو اصرار نہ کرنا چاہئے۔ البتہ کوئی دیگر حالات مانع ہوں تو اور بات ہے ان کا مجھے علم نہیں۔ اگر تیاری میں کوئی کوتاہی رہ گئی تو اس کا الزام مجھ پر پڑے گا۔ لہٰذا اس بارے میں زبیدہ کو کوئی مزاحمت اپنی دیہاتی تنگ کرنا چاہئے۔ وہاں کا خط مجھے نہ ملا۔ اس نے کچھ نہ لکھا۔ تم ہی ماتم کی مسلمت نہ سمجھا۔ صحیح حالات آپ کو زبیدہ سے معلوم ہوں گے جب وہ کراچی واپس آئے گی۔

احباب کی یاد کبھی تازہ ہے۔ زبیدہ اور دیگر افراد اہل کو سلام کہئے۔ ۔۔

فرق کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی جو روشنی کہ شام ستاروں میں تھی

شام سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں گزری تھی۔ اور ستاروں سے مراد آپ کے بچوں کا رستہ

بخاری

---

(۸)

نیویارک۔ ۱۰ اپریل ۵۲ء

برادر محترم، سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا، نسخہ ان کی کتاب کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ خیال تھا اس کے متعلق علیحدہ خط لکھوں گا لیکن فرصت نہ ملی۔ مجید صاحب کو بہرحال میرا دلی شکریہ پہنچا دیجئے۔ نیک دل کی وجہ سے کئی دن اور شاید راحت میں ہو گئے۔ اور بچہ تیار ان پر ٹیپ کا مزہ آ گیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ نسیم کا لکھا ہوا کبھی کبھار وطن سے آ جائے تو میں کتنی دیر تک یہاں مست رہتا ہوں۔

تنخواہ میں جو تخفیف ہوئی ہے وہ پندرہ سو روپے ماہوار کے برابر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تخفیف کی ضرورت اس حد تک محسوس ہو گی۔ میں سمجھتا تھا یہ عہدہ اتنا اہم ہے اور یہاں ہم نے رستم کی گور پر دولت ماری ہے کہ ہم اس پر ٹکے رہیں گے۔ بہرحال ساری خوش فہمی وہم کیوں ثابت ہوئی؟ یہ بھی خیال تھا کہ جو لوگ خود ملازمت سروس سے متعلق نہ ہوں اور باوجود اس کے سفیر وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کبھی ساٹھ برس کی عمر میں ہو گی۔ ہمیں تو ملازمت سروس میں بھی

خدا کا شکر ہے رحمت اللہ۔ ذوالفقار حیات۔ خصوصاً ذوالفقار کی طرح سیاسی زندگی سے سفارت پر آیا ہوا۔ یہ پرکون سا قانون نکلا؟ ہم بھی ابھی تک نہیں سمجھتا تھا کہ علم آیا کریم اکثر پر سر شام سے تو بہر حال سبکدوش کر دیے جائیں گے۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ یہ پاکستان سروس والوں کا قانون وارد ہوا تو کیا جائے تو ایسے ہی توسیع ملازمت اندازاً فرمائیے۔ ضابطے کا تو ابھی پتہ نہیں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرپوزل کچھ لازمی منظور ہو گی اور مجھے ایک سال کی توسیع یعنی اکثر پر سے ملے گی مل جائے گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو کہ کچھ مہلت مل جائے اور اپنا مستقبل قدرے سہولت کے ساتھ ٹٹول۔ یکسوئی سے سوچ سکوں۔

ساتھ ہی ساتھ تلاش معاش جاری ہے اور ادھر ادھر ہاتھ مار رہا ہوں۔ قدرے امید افزا ہیں۔ سرکاری ملازمت پر اب یہ تکرار بے معنی سا ہے کہ کب تک ان میری معروضات پر غور کرتا رہے گا۔ ضابطے کا چکر ہے۔ ہوتا ہے بابا اپنے آپ کو مستثنیات میں سے ثابت کرنا طول عمل ہے۔ سو اس کی تلاش ہو چکی یورپ ہی میں کوئی پڑ سکے گی۔ وطن میں بجز سرکاری ملازمت کے کیا ہے جس کے لیے کم فرصتی کا تھا ہوں اور جب یہ کہ ملازمت سے الگ کی قربانی کیا سکتا ہے۔ پنشن کی میعاد سے ساتھ ہی ساتھ کہولت بھی طاری ہو جاتی۔ تو کسی بستر پر پڑ رہتا لیکن صحت جاتی کا کیا علاج؟ ابھی آپ ہی حرکت ہے۔ یا کرانے کرم تھا بہتر تھا نہیں۔ بیچارہ کیا کرے جو قابلے کا بڑھاپا اور دفن وطن کا افتتاح ہو۔

زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ہارون کی شادی ستمبر میں ہو گی اور آپ سب اس میں شریک ہوں گے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی شمولیت زبیدہ اور بچوں کو حاصل ہو گی تو یہ پریشان کیوں ہوں ہم وہاں نہیں اشکار ہے گا۔ جو سکتا آتا۔ لیکن جو کچھ پس انداز کیا تھا وہ منصور کی شادی پر خرچ کر دیا۔ جو کچھ باقی تھی اسے جوں توں کر کے ہارون کے لیے بھیج دیا۔ اب محض قلندر ہوں۔ آئندہ معاش کا بھی ابھی کچھ یقین نہیں۔ عمر بھر جو کمایا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ کسی اور وقت سے اس پر غور کروں گا۔ ممکن ہے میں نے کہیں دفن کر رکھا ہو اور بھول گیا ہوں۔ میں نے بہت دن تک آپ کو خط نہ لکھا۔ خیال تھا کہ آپ شاید مرزا غالب کے سلسلے میں سفر پر ہوں۔ خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں اور جو پہنچتی ہیں ان کا انداز واقعیہ اکثر اس طرح کچھ میں آتیں نہیں۔ بہرحال کچھ سمجھنے کی ایسی ضرورت بھی نہیں۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

آپ کی بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

---

(۹)

نیویارک ۵ مئی ۵۳ء

برادر محترم۔ آپ کا بے تاریخ خط آج ملا۔ اس سے پیشتر دو خط بھی موصول ہوئے تھے جن میں عزیزان اعجاز کے کوائف شامل (مشمول) تھے۔ اعجاز صاحب کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے بالواسطہ تحقیقات کی کہ ایسے گریڈوں میں کہاں تک کیا کیا گنجائشیں ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ابھی تک ہمیں ان سے سابقہ نہ پڑا تھا (آپ نے فرمایا ہے کہ ان کا ایک ساتھی حال ہی میں مقرر ہو کر امریکہ جا چکا ہے۔ معلوم نہ ہوا کہ وہ کون ہے؟ تفصیل مل جائے تو اس سے ہمیں اپنی سعی میں مدد ملے گی) جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ نیز اپنے گریڈوں میں ہمیں اپنے کسی سے نیازمند حاصل ہے۔ عام کرکے عموماً مقامی طور پر بھرتی ہوتے ہیں۔ دستکاری جانے کا فرد تو ادھر کبھی تھا عذر کرتا ہے گویا یا تو امریکنوں کو بھرتی کیا جاتا ہے یا ان لوگوں کو جو غیر ممالک سے آئے ہوں لیکن یہاں

سمجھتا ہوں۔ ۳ بیویاں مغرب پسند کام عورتیں کرتی ہیں۔ امریکی ذہنیت کے لئے ایسے کام پرکشش ہوں گے اور کام کرنا ایسے ہی پہننے کی بات ہے جیسے ہم اپنے ذہن میں پہلے ہی کے لباس پر کسی عورت کو متوجہ کرتے ہیں حالانکہ ظاہر ہے کہ کام وہ بھی کریں۔ یہ تو محض معمولی باتیں ہیں۔ میں خود کسی اختیار سے خاطر اپنے طور پر پوچھوں گا کہ باوجود ان رسمی معاملات کے کیا پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہے اور آپ از راہ مہربانی اس سے مطلع کریں گا۔

عزیزہ ترنم اپریل سے کم ہو گئی۔ توسیع کے متعلق ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی ہے۔ [illegible] اور یہ وہ نے توسیع کی سفارش کی ہے اور [illegible] نے اس پر صاد کیا ہے لیکن وہ ساتھ ہی منظور کئے [illegible] معلوم اب صورت حال کیا ہے۔ افسوس آپ شادی پر نہ پہنچ سکے۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا کہ بھائی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں نے آپ سے کراچی میں بھی عرض کیا تھا کہ [illegible] سے ذریعہ خط آپ بہت مشورہ کر لیں تو جواب لے کر بھیجئے۔ خدا کرے ان کی صحت اب سنبھل گئی ہو۔ شادی کے بعد زبیدہ کا خط نہیں آیا۔ اس نے تفصیلات سے بے خبر ہوں [illegible] کا وعدہ کیا تھا کہ کام کوئی سر انجام پا گیا۔ زبیدہ کے خط کا انتظار ہے۔ معلوم ہوتا ہے قریب اکس تدر گزشت ہوئی۔ لیکن [illegible] کے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگا۔ افسوس کہ زمانہ اب وہ نہیں کہ شادیاں بطرز قدیم چار چھ مہینوں سے کی جائیں۔ [illegible] نہیں [illegible] خوشحالیاں رہیں۔ [illegible] مجبوری ورنہ مجھے اکثر اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے۔ زبیدہ کو کسی قدر ذہنی شعت، ہجرت کا سامنا ہوتا ہے۔ آج [illegible] کا خط آیا کہ پروین کی منگنی پشاور کے رئیس خان [illegible] سے ہو گئی ہے۔ [illegible] خدا کرے اس کی زندگی کامیاب ہو۔ [illegible] مجھے بہت خوشی ہوئی۔

[illegible] مبارک [illegible] اپنی تہنیت بھی پہنچا دیجئے گا۔ [illegible] کے صفحات پر بھی [illegible] لیا۔ مجید صاحب کے ساتھ [illegible] لیا۔ مجید صاحب کو میرے [illegible] جو تصویر بنایا ہے وہ دل کی آنکھ اور دماغ کی غذا کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ [illegible] شوق کہئے گا۔ یقین مانئے کہ [illegible] کے بعض حصے پانچ چھ دفعہ پڑھے اور سنے [illegible] بالکل ہی [illegible] ہو گیا ہوں۔

سرفراز کا پنجاب چلے جانا حیرت کا باعث ہوا۔ میں سمجھتا تھا ان کا مقصد [illegible] سرور تھا لیکن [illegible] وہاں تنخواہ زیادہ ہو [illegible] مدت کی گنجائش زیادہ ہو۔ [illegible] معلوم۔ [illegible] خترصاحب کو بھی [illegible] دہاں وہ [illegible] آج کل کس شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی۔ [illegible] تو وہ [illegible] کر رہے ہوں گے۔ خدایا ان کا کیا کریں۔ [illegible]

بخاری

---

(۱۰)

نیویارک ۴ جون ۱۹۵۳ء

برادر محترم، سلام مسنون! توسیع کے متعلق آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی۔ [illegible] نے از حد محبت اور اخلاق کے خط لکھے۔ ایک سال کی توسیع منظور ہو گئی ہے۔ اب کاش کسی کو اس سے پہلے ایسے [illegible] خط لکھنے کی توفیق ہوتی۔ اکثر لوگ ضابطے کا خط لکھتے ہیں۔ [illegible] کرکے لکھتے ہیں کہ اس میں مکتوب الیہ کو اچھی طرح رگیدا جائے چنانچہ صورت اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ آدمی کو کبھی میسر نہیں انسان ہوتا۔

معاش کی یہاں دو صورتیں ہیں۔ تعلیمی ادارے اور ریڈیو۔ امکانات دونوں میں بلکہ جب سے لوگوں کے کان میں بھنک پڑی ہے کہ میں قومی خدمت

سے بیگانہ ہو گیا ہوں۔ [illegible] ادب سے پوری طرح سے دلچسپی رہی ہے۔ یہ سال ۱۹۶۶ء تک رہی ہے۔ [illegible] لیکن تحقیق و تنقید زیادہ ہے تعلیمی اداروں [illegible] تصنیف [illegible] ہو سکتا ہے۔ [illegible] کی [illegible] آج کل اس [illegible] تعلیمی کام [illegible] تصنیف [illegible] زمانہ [illegible] کی بدولت [illegible] کبھی [illegible] جب [illegible] کبھی [illegible] چاہیے [illegible] سے [illegible] اور [illegible] جب [illegible] ادب کا [illegible] نہیں [illegible] ہم [illegible] لیکن [illegible] میں۔ اس نے [illegible] سے [illegible] دیا گیا۔

[illegible] تصنیفات [illegible] اس دوران میں تصنیف کی طرف [illegible] لوگوں نے یہاں [illegible] دیا ہے۔ [illegible] (انگریزی میں) ایک امریکن [illegible] کی کتاب [illegible] امریکن کے لئے (ایک مختصر تاریخ ادب اردو) ان کتابوں کی [illegible] آپ کے [illegible] پاکستان [illegible] تاریخ ادب کے لئے [illegible] کی کتابیں [illegible] اور دو [illegible] پانچ چھ کتابیں جو کسی زمانے میں صاحب لوگ کے لئے لکھی گئی تھیں [illegible] اس کے بعد [illegible] تیار [illegible] ہیں۔ پہلے جو کتابیں [illegible] اداروں کا [illegible] ساتھ [illegible] فہرست کتب مرتب کرنا شروع کر دیجئے۔

یہ کام [illegible] کیوں [illegible] خیال آتا ہے لیکن وہ پیسے [illegible] کے لئے [illegible] دوستی [illegible] انہوں نے [illegible] ایک نہایت معقول کتاب آج سے دس پندرہ سال پہلے [illegible] عباس صاحب [illegible] کرتے ہیں لیکن وہ کچھ اپنے [illegible] میں [illegible] نہیں رہی۔

باقی آئندہ۔

خاکسار

[illegible]

---

(۱۱)

۱۲ جولائی [illegible]

برادر محترم، سلام مسنون۔ آپ کا [illegible] جولائی کا خط چند دن ہوئے ملا۔ کتابوں کا پارسل بھی مل گیا۔ بے حد شکریہ۔ جانتا تھا کہ کراچی میں کتابوں کا جمع کرنا [illegible] ہے۔ تاہم آپ کو تکلیف دینے سے باز نہ آیا۔ [illegible] کیا کرتا؟ [illegible] (ریڈیو والے) سے یہاں کی صحبتیں ہوئیں۔ ان سے کتابوں کے بارے میں میں نے اپنی مشکلات بیان کیں۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے کراچی میں ایک ایجنسی قائم کریں گے۔ جو آپ کے حسب ضرورت آپ کو اردو کی کتابیں بھیج دیا کرے تاکہ اگر آپ نیویارک میں بیٹھے تصنیف و تالیف کا شوق کرنا چاہیں تو بے کتابی سد راہ نہ ہو۔ میں نے کہا اس ایجنسی کا مہتمم کون ہوگا یعنی میں یہاں سے خط کسے لکھوں؟ انہوں نے اپنا نام

پیش کیا۔ یعنی میں جنہیں عقلوں کا ادراک اور احباب کو بیچ میں چھوڑ کر جیسا کہ سے موسا کائی میں حاضر ہوئے ہیں، بھی دیا کریں گے۔ اس وقت ملک سے باہر ہیں اور ہیں
کبھی نازماؤں گا۔ لیکن وہ بھی آخر آپ ہی کی طرف رجوع کریں گے۔ اور ان کی توجہ کبھی ادھر ہوئی تو اس میں آپ کا ہاتھ ہوگا۔ ان سے ملاقات ضرور کیجئے۔ یہاں آکر ان
کی طبیعت میں چند شگوفے پھوٹنے لگے اور ان کے ذہن کو ایسی جلا ہوئی جس کی انہیں سالہا سال سے ضرورت تھی۔ دلی پہنچ کر پھر سو گئے تو میں کہہ نہیں سکتا
آپ کی جوانی نگری کا اثر ذکر ہے۔ اگر زندہ رہے تو ضرور ہمت دے کر مشق کیجئے۔ وہ بھی راشد رشید احمد ایسا ہی ہیں۔ چند شعروں کی طرح روشن ہوئے لیکن کچھ
عجب بھاؤں کا سمتا ہوا شعلہ ہے۔ یا وہ وہاں ان کی قسمت ہی تھی جو کوئی فکر کا سامان ہی نظر نہ آیا۔ چنانچہ سالہا سال سے بس سلگ رہے ہیں۔ آپ کو جن
چشموں نے سیراب کیے، ان کی تازگی کو کہیں ہم نے پائی۔ اس پر یہ اور رشید گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ آج آپ کو ہزاروں دعائیں دے کر آپ سے محبت پھر
تازہ کیا۔ میں نے بھی یہی لکھا۔ پہلے رشید اور میری زندگی کے بہترین لمحے تھے ــــ اب تک آتو کس کو وقت فراموش کر دی۔

کتابوں کا بہت شکریہ۔ تاریخ ادب کی ستی کتابوں میں سے صرف آب حیات میرے پاس ہے۔ باقی جب میسر ہوں بھجوا دیجئے۔ پہلے ایک مری فاکنر ناول
ہیں لے سے حاصل کتابوں کی ضرورت بھی پڑے گی تو سب ان سے لے کر اردو کی تک لکھوں یہ مرحلہ بھی دور ہے۔ ابھی تو پہلے چند قدم ٹول رہا ہوں

اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے معاملے میں آپ نے کچھ موسموں کا سا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار دن سے زیادہ ادھر
ادھر نہیں ہوتے، اس لئے بارانِ کرم میں غیر معمولی تاخیر ہو تو ہم سمجھ جاتے ہیں۔ آج کل آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے کیا اب بھی آپ کا وہی منصب ہے جو
سابق وزارت کے زمانے میں تھا؟

مجید لاہوری، رشید اختر ندوی، اور حسرت اور دیگر احباب کو سلام پہنچے۔ امید ہے بھابی کا مزاج اب بخیر ہوگا اور تشویش کی کوئی وجہ باقی نہ ہوگی۔
انہیں میرا مودبانہ سلام کہئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۲)

نیویارک ۲۲ اکتوبر ۵۳ء

برادر محترم سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ بیماری میں آپ اکثر یاد آئے۔ جہاں گردی سیر و سیاحت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام ضرور کرنا چاہئے کہ انسان بیمار
ہو تو اپنے ہی وطن میں۔ اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر دنیا میں نہیں لیکن روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ روح کی مسیحائی احباب ہی سے ہو
سکتی ہے آپ خط جلدی لکھتے تو اچھا ہوتا۔ میں جواب نہ دے سکتا لیکن آپ کی آواز تو سن لیتا۔ بہرحال اب بھی آپ کا خط برکت کا موجب ہوا۔ یہ آپ نے خوب
پوچھا کہ عادت کیا تھی۔ جو ہم جیسے اہلِ دل ہیں وہ کب تک دل کو سنبھالے رہیں گے اس سے پہلے تو کوئی آثار نہ تھے لیکن یہ پچھلا سال مجھ پر بہت گراں گزرا۔ پاکستان
کا سفر اتنا مختصر تھا کہ اس سے جسم کو کچھ آرام نہ ملا۔ اخراجات بہت زیادہ ہوئے واپس پہنچا تو تعلق بزرگوں کی تنگ نظری سے جو خطرے لاحق تھے وہ سب صحیح ثابت
ہوئے۔ پھر تنخواہ کم ہوئی۔ پھر ریٹائرمنٹ کا نوٹس ملا۔ . . . . جب مجھے مایوس ہوئے تو امریکیوں نے اپنا ایک آدمی کھڑا کیا اور اسے منتخب کرایا

پرسوں حکومت پاکستان سے ایک سال کی رخصت لی۔ اس میں تلاش معاش شروع کی۔ کچھ تدبیریں کامیاب ہوتی نظر آئیں تو کسی قدر جی لگا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے
پھر ورزش شروع کروں گا۔

لاہور کے ادارے کا عروج سہی۔ آپ بہرحال عزیز تر ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ ہے مستقل اور شریفانہ صحبت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے بڑوں سے بھی اکثر ملاقات ہوتی ہوگی۔ حمید نظامی کو میں نے ایک خط کئی مہینے ہوئے لکھا تھا۔ درست پتہ معلوم نہ تھا جواب موصول ہوگا۔ میں نے دو بیان بازار میں پڑھے۔ اسی ضمن میں احمد ندیم قاسمی کا ایک خط (از صدر وقت تمیز) البتہ چند دن ہوئے آیا تھا۔

پچھلے دنوں ادارہ آپ سے کرنے کا خیال آیا۔ ایک پبلشر نے مجھ سے ایک کہانی مانگی ہے (قصہ ایک ہزار روپیہ) یہ ایک مجموعہ میں شامل کی جائے گی جس میں سب دیگر اقوام کے بچوں کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ مجھے ایسی کہانی چاہیے جو قدیم FOLKLORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے موزوں ہو اور ممکن ہو تو ایسی ہو کہ اس سے صلح و آشتی کا سبق، خدمت، ماحول جو بچوں کے کام کی اور ان کے نصب العین پر بھی پوری اترے۔ آپ ایسی کہانی کا انتخاب کر سکتے ہیں جس کی کوئی منظوم یا منثور کہانی ہو۔ پہلے خیال آیا تاثیر سے پوچھوں لیکن ان سے جلد جواب کی توقع نہیں اس لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی آج کل کراچی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب کر سکیں تو اور کون کر سکے گا۔ کہانی اردو میں بھجوا دیجئے میں اس کا ترجمہ یہاں کر لوں گا۔ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے یعنی یہاں تک جانا تھا آپ کو معلوم ہوگا) ... کے انتقال کی خبر آپ نے پڑھی ہوگی۔ میری بیوی کے پیش نظر اسے مجھ سے پوشیدہ رکھا۔ حسرت کاشمیری اور مجید لاہوری دونوں کو میرا سلام وہ کاشمیری اور لاہوری ایسے ہیں جیسے میں پاکستانی ہوں۔ ہم تینوں کی قسمت ایک ہی فرشتے نے تصنیف کی تھی۔ جس دیار کو فخریہ پہلے اپنایا اسی سے اخراج ہوا۔

خاکسار

بخاری

عنقریب ایک اور خط لکھوں گا پیاس نہیں بجھی

---

(۱۴)

نیویارک ۱۰ نومبر ۱۹۵۳ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ یکم نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر لیکن بہرحال مکتوب محبوب۔ دن میں دو ہوا اٹھیں تو کشش ہوئیں۔ اس اثنا میں بشیر ہاشمی کا خط بھی ملا جن دنوں آپ لاہور میں تھے، وہ بھی آپ کے اعزاز میں ہوئی تھیں۔ ان دنوں وہ بے چارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا تھا اور ماتم کر رہا تھا کہ آپ کی صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال ہی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار میں بھی بیمار۔ وہ بھی برلب پنشن میں بھی برلب پنشن۔ دونوں کے خط ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے زیادہ ہوتا ہے اور نزاکت طبع بھی مجھ سے وافر۔ پچھلے دنوں کے خطوط بھی حال ہی میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبد علاج میں میری بیماری سے بے خبر ہے چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ حد تندرست ہے اور اکثر شعری شامت ہوا

ہے۔ ایک کہانی انہوں نے اس دوران میں لکھ ڈالی ہے (یہ بات صیغہ راز ہے، آپ ہی سے ذکر کر رہا ہوں۔ بات باہر نکلی تو وہ برہم ہو جائیں گے) کسی فلم کمپنی کو یا فاؤنٹ بخش چاہتے ہیں۔ مجھے یہ مدت سوجھی ہے کہ اس کا پہلے انگریزی میں ترجمہ کروں اور پھر [illegible] کر لیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور ان کی سب توقعات پوری ہو جائیں لیکن میرے اختیار میں تو اتنا [illegible] کا اندازہ لگانے میں حائل دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر [illegible] کا نام تجویز کر ڈالا ہے کہ وہ بھی اسی قسم کے افسانے لکھ سکے گا۔ اور اسے تو آپ جانتے ہوں گے۔ بلونت سنگھ کی رونق . . . وغیرہ وغیرہ

آپ کا اور [illegible] کا شکریہ۔ بچوں کی کہانی جس کی کہ تلاش ہے محض وراثتی کام ہے [illegible] ادھیڑ عمر کی عورتوں نے ایک مضمون کا گلا بنایا ہے۔ اس سے پہلے مختلف [illegible] کہانیوں کے ترکیبی نسخے شائع کر چکی ہیں [illegible] کی طرف متوجہ ہوتی ہیں [illegible] اور تصنیف [illegible] کو ایک پتھر سے [illegible] چاہتی ہیں۔ نیاز کو کیا ہو کبھی خط لکھنے کا عادی نہیں تھے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی لیکن ہر مرتبہ تھک کر رہ گیا۔ کچھ عرصے سے احباب کی وساطت سے ان کو [illegible] شوق بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا تو اسے بھی ترک کر دیا۔ اب جب جا رہے ہیں کچھ عجیب کیفیت سی چھا گئی۔ سٹوڈیو اور گھر کے آنگن سے باہر نہیں نکلتا۔ زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ جواب ادبیات میں کبھی کا [illegible] واقع ہوا [illegible] سے یہ خبر سن کر بہت رنج ہوا لیکن کیا کروں۔ نیاز سنگھ [illegible] کے سب رشتے نہ معلوم ہوتے ہیں کبھی آپ سے عشق اللہ ہو تو میرا سلام کہیے گا۔

دو تین دن ہوئے آپ [illegible] (ڈاکٹر [illegible] الدین مرحوم) امریکہ کو وارد ہوئے ان سے لاہور کا ذکر دیر تک رہا۔ صوفی کی بے حسابیوں سے ہوں گے۔ کچھ تو اس میں ضیاء الدین کی اپنی تنگ نظری شامل تھی لیکن اس سے قطع نظر کچھ حقیقت بھی ان کے بیان میں مزید تھی۔ حمید کی نظر میں لاہور بے حد خراب ہو رہا ہے۔ گیارہ دیکھنے کے بعد محتسب تنگ کرتے ہیں اور ہر راہ رو کو آوارہ سمجھتے ہیں۔ کچھ حال عابد علی کا بھی بیان کیا۔ اس کی زندگی بھی سدا گردش رہتی ہے لیکن اگر مانند شیشے [illegible] کا ورد کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

چاہتا ہوں کوئی پبلشر ہم سے ٹیلنٹ بک لکھوائے۔ عمر بھر یہ کام نہیں کیا لیکن اب یہ گناہ کرنے کو بھی دل چاہتا ہے کسی کو شامل کر لو تو زیادہ لکھے۔ میں نے ہاشمی سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ لوگ خیال رکھیں تو ممکن ہے کوئی سبیل نکل آئے۔ مانا کہ اس عمر میں جب میں خود یونیورسٹی وغیرہ میں ہوں میری قیمت گر گئی ہوگی۔ تاہم کوئی معقول کا منصفانہ سہی کا نذر کا پورا ہو جائے تو عجب نہیں۔ عمر بھر میں "[illegible]" کہتا رہا اب "ہاں" کہنے کو تیار ہوں۔ مزید تا ایکاد کی ماں ہے۔ اور باتیں بھی کہنے کی ہیں۔ لیکن آئندہ خط میں ان کا ذکر کروں گا۔ آپ کو جب بھی خط لکھنے بیٹھتا ہوں جبراً اسے ختم کرتا ہوں۔ ورنہ عاشق کی داستان سے محبوب ختم سب ہوتی ہے۔ حسرت، ورمحید لاہوری، اور اختر ندوی اور عباس اور دیگر احباب کو میرا نام اور شوق یاد دلا دیجیے گا۔ تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ ڈان پر عتاب نازل ہوا۔ ڈان اور حکومت کے باہمی عشق کے رموز آج تک سمجھ میں نہیں آئے۔ مولانا کا شعر یاد آیا کہ ؎

عشق کامل کے دونوں ہیں مرغوب
سحرِ وصل و شامِ تنہائی

خط لکھتے رہیے۔

خاکسار
بخاری

---

(۱۴)

نیویارک ۱۸ نومبر ۵۳ء

برادر محترم سلام مسنون۔ نیویارک سے ایک کتاب پبلش کرنے میں کا عارضی نام ابھی "A Study of Pakistan"
قرار پایا ہے۔ پندرہ ابواب ہوں گے۔ ہر باب میں پاکستان کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مصنف ایک نہیں بلکہ کئی ہوں گے۔ بیشتر امریکی یونیورسٹی پریس یا کسی بڑے
ناشر اور امریکن ناشر ہوگا۔ کئی تصاویر اور نقشے وغیرہ بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔ ہر باب کا مصنف ... مقالہ لکھیں گے۔ کئی موضوعات پر مقالہ اشتیاق
حسین قریشی صاحب کو دعوت دی گئی ہے۔ چند ابواب راقم الحروف لکھے گا۔ ایک باب پاکستان کے جرنلزم پر ہے۔ ... مقالہ پانچ ہزار الفاظ کا ... میرا خیال ہے کہ آپ
سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ ہوگا۔ آپ اردو میں لکھ ڈالیں۔ انگریزی میں ترجمہ یہاں ہو جائے گا۔ ترجمہ تو ظاہر ہے شاید ... صحت کی ... ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا
کتاب بہر حال دنیا بھر میں مشہور ہوگی۔

مضمون عالمانہ ہونا چاہیے اور آپ کے قلم سے توقع بھی یہی ہے۔ تاریخی ... دو پہلو مد نظر ہیں اول یہ کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل ... جرنلزم نے
دوم دو تین برس میں جرنلزم کے نشیب و فراز کیا کیا طرح طرح کے ہوں گے۔ کچھ سلسلۂ کلام اس قسم کا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے پہلے ... اخبارات کی کیا حالت تھی
تعداد کیا تھی۔ اشاعت کیا۔ لکھنے والے، ایڈیٹر اور مالک کون؟ اخبارات کی چال ڈھال کیا تھی؟ سیاست کے کن سے پہلو ایڈیٹروں کو مرغوب تھے؟ تقسیم کے بعد
جرنلزم میں کیا انقلاب آیا۔ پریس کی کیا حالت ہوئی۔ انقلاب کے بعد توازن کہاں کہاں آن کر ٹھہرا۔ اردو کے کتنے اخبار ہیں۔ انگریزی کے کتنے؟ بنگالی کے
کتنے؟ اشاعتیں کیا ہیں؟ موضوعات کیا ہیں؟ اس پانچ چھ سال کے عرصے میں سب سے زیادہ بحثیں اخباروں میں کن موضوعات پر ہوئیں اور کس قسم کے
خیالات کا اظہار ہوا۔ اخبارات کی تیاری کیونکر ہوتی ہے (مثلاً ٹائپ وغیرہ) اشاعتیں کیا ہیں۔ حلیہ اور نقشہ کیا ہے۔ روزنامہ، ہفتہ وار ایڈیشن، ادبی مضمون
شعر، مجید لاہوری وغیرہ وغیرہ؟ پریس کے قوانین کس قسم کے ہیں؟ کیا اکثر اخبار ان کی زد میں آتے ہیں یا شاذ و نادر؟ ایسی باتیں احتیاط سے لکھنی پڑیں گی لیکن نہ اس قدر
کہ بالکل ہی بے ذوق ہو جائیں۔ ان کے لئے آپ کا خیال آیا کہ آپ میانہ رو مضمون اعلیٰ درجے کا لکھ سکتے ہیں) مضمون بہر حال معلومات سے پُر ہونا چاہیے اور یہ آپ
کے لئے مشکل نہیں۔ آپ سے مختصر سوانح بھی خود لکھوں گا۔ کہئے کیا خیال ہے؟ خدا کرے آپ کا جواب اثبات میں ہو۔ مضمون کے لئے آپ کو کتنی مہلت
درکار ہوگی۔ اوروں کو ایک یا دو مہینے کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ کم نہیں اور امید ہے کہ آپ کو بھی منظور ہوگی۔ جواب سے سرفراز کیجئے۔

ایک باب ادبی رجحانات پر ہے وہ خود لکھنے کا ارادہ ہے لیکن مواد اور رسالے یہاں ناپید۔ یہ تو ایک طرف یہاں سے یہ تک معلوم نہیں کہ
رسالے کون کون سے اور کتنے نکلتے ہیں۔ باقی آپ ایسے مضمون کے لئے جو معلومات درکار ہیں، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عباس صاحب کو بیگار میں پکڑیے
اور ان سے کہئے میری مدد کریں۔

جرنلزم کے سلسلے میں خیال آیا کہ اگر کوئی مزے دار اخباری نظمیں پیش نظر ہوں تو ان کا ترجمہ بھی نمونۃً شامل مضمون کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کا
ذکر بھی کیجیے گا۔

ذوالفقار سے ریڈیو پر ملاقات ہوئی تھی لیکن ... مختصر کے بعد وہ آج کل ہوپکی شادی کے انتظامات میں منہمک ہوگا۔ شادی ۲۰ دسمبر کو ہے کئی
ذوالفقار کا خط آیا ہے تاج ہاشمی کا خط بھی آیا۔ کسی کتابوں کا بازار مندا معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہاشمی کے ہزاروں لاکھوں کا نقصان گیا۔ اب کوئی دوستی ہزار

ان کتابوں سے مصنفہ واقف ہے لیکن اس نے مزید تفتیش کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب " PUNJAB PRELUDE " نامی میرے پاس ریویو کے لیے
، مصنفہ کا نام مس PRIDE ہے جو کچھ عرصہ ہوا ایچیسن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ سنا ہے اب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان (پنجاب) پر ناول میں اور ہندوستان
پر بار بار شائع کرتی ہیں کہ پنجابی اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشمی صاحب کے خاندان پر (مرتضیٰ احمد) ہے اور بیان سے لکھا ہے
کہ سکے حملے سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ " بیسٹ اینڈ گرل ڈبل " کے متعلق ہے ضمیمہ " اے انڈین ٹرین " کا حال بھی بیان کیا ہے۔

خاکسار

بخاری

نقوش یہاں کے اخبار میں چھپی ہے کہ کامینہ میں روز بدل ہونے والی ہے۔ خبر مرکز کے افسروں میں ہونی ہے۔ اللہ اپنے حفظ وامان میں رکھے
اور آفت سے بچائے۔ ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب اور اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔

---

(۱۵)

برادر محترم!

برادر محترم سلام مسنون۔ گرامی نامہ ۲۰ نومبر کا ملا۔ یہ آپ کے مفصل ترخطوں میں تھا۔ بندا بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے لمبی چوڑی مسافت طے کر لی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ ہے کہ قبل پاکستان کے ان اخبارں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے تھے۔ علاقے کی صحافتی مد و جزر کا کچھ حال معلوم ہو نیز ان اخباروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے لیکن جن کا پاکستان سے گہرا تعلق تھا مثلاً ڈان۔ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ دراصل پاکستانی صحافت کا حال بیان کرنا ہے۔ اب پس منظر بیان کرنے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے یہ آپ کے حسن مذاق اور احساس ربط پر چھوڑتا ہوں۔ ان سے بڑھ کر کسوٹی بھی کوئی نہیں البتہ یہ ہے کہ قارئین انگریز اور امریکی ہوں گے۔ اور جیسا پہلے سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا اس سے پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالنا مقصود ہوگا۔ غیر ملکی ایشیائی ممالک کے بارے میں اکثر باتوں سے بے خبر ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا کے لوگ کس قسم کے لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں کیا سوچ رہے ہیں فیصلے ہیں ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیر عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس اوزار کا ایشیا استعمال کیا ہے کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہ کتنے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور ہر اخبار کی اشاعت کتنی ہے کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقے کے ہیں کس قسم کی خبریں سب سے زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے کے اثر سے بالکل ہی نا واقف (یا محروم ہیں)۔ اس نوع کی باتیں یہاں لوگوں کے لیے از حد دلچسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کرید رہتی ہے کہ ایشیائی ممالک نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لوگ اس کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق ابھی بڑی بحثیں بھی چھڑی ہوئی ہیں انتخابات کے کالموں ہی میں ہو رہی ہیں۔ اور ممالک میں اس کے علاوہ مجلسوں، سیاسی جماعتوں، جلسوں اور ملکی حلقوں میں بھی مخالفت کا اظہار کیا جاتا!

لیکن مجھے سوال یہ نہیں ہے۔ صاف بات میرا خیال ہے کہ انگریزوں نے دہشت سے حقوق پر جو کچھ یا انتخابات میں ملکی حقوق کے لئے [illegible] ہے، اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کی کی باتیں آپ نے بہار تک [illegible] سوچیں گی۔ [illegible] اور
[illegible] بھی بھیج دیجئے۔

[illegible] کے متعلق عرض کیا تھا کہ میری جانب سے عباس سے استفادہ کیجئے۔ اس کے متعلق آپ نے کچھ تحریر کیا تھا، آپ کبھی تو اس سے براہ راست خط و کتابت کریں۔ آپ کو اس میں سہولت ہو گی۔ [illegible] کے متعلق آپ کی سائی کا شکریہ۔ [illegible] کے خط کا انتظار کر رہا ہوں
ہاشمی کہتا ہے۔ کتابوں والی بات یہ ہے کہ حالات تعطل کی ہیں ... اس سے قبل عرض کر چکا ہوں ... [illegible] صاحب کراچی کے [illegible] پبلشرز کو وہ نمونہ بھیجا ہو گا۔ چنانچہ ہاشمی صاحب کا رساله آپ نے [illegible] ہوں۔

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عنقریب ایک اور خط جلد ہی لکھوں گا۔ ہم قدرتی میں تمہارے تھے۔ صحت بہت خراب ہے۔ [illegible] یہاں سے رخصت ہونے یا حرکت کرنے کرانے کی مجبوری کو کراچی بھیج رہے۔ سیل ختم ہو۔ [illegible] پر بوجھ ہو گا۔

خاکسار

بخاری

حاشیے پتے پر یہ نام لکھ دیا تو منصب لکھنے کی ضرورت نہیں، دیکھا کہ آپ کو اس کے سبب ہی غلط قلم استعمال کرنا پڑا۔ اس سے بچ کر [illegible]

[illegible]

---

(۱۶)

جانِ برادر! کئی دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ کا آخری خط غالباً وہ تھا جس میں آپ نے رزمرہ کے تاریخی حالات لکھ بھیجے تھے۔ اس کا میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اچھا خاصا پُر از معلومات مقالہ بن گیا۔ اور اس کی بدولت یہ مفت میں تاریخ دان بن گیا۔ [illegible] ترجمہ بھی کیا نعمت ہے۔ اسی لئے تو احباب سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ ترجمے کے لئے مسالہ فراہم کیجئے۔ عباس نے اس بارے میں دستگیری کا وعدہ کیا تھا۔ ایک خط بھی اس مضمون کا انہوں نے لکھا تھا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ ملیں تو یاد دہانی کر دیجئے گا۔ آج کل کچھ پژمردہ رہتا ہوں۔ تخفیف کی زد میں آ گیا ہوں۔ تجویز ہے کہ اس عہدے کو [illegible] اپریل سے میرے [illegible] گھٹا کر [illegible] کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مجھے یہاں سے جدا کیا جاتا لیکن احباب اتنا اسنے اتنا کرم ضرور کیا کہ مجھے [illegible] بھی منظور ہو تو یہاں سے نہ نکالا جاؤں گا۔ میرے حالات آپ جانتے ہیں۔ ہمیں سامنے بھی سرطان کا خطرہ لاحق ہے اس کی وجہ سے میں یہاں سے ہل نہیں سکتا چنانچہ یہی منظور کر لیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اب نہ معلوم یہ بھی کب تک ہے۔ اکتوبر میں اپنی مستقل ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ وقت گزر گیا اور ہمیں اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ ریٹائر ہونے کا سال اور مہینہ بھی یاد نہ تھا۔ خاکہ کر وزارت تعلیم سے دریافت کیا جواب آیا تو رنگ اڑا۔ نہ معلوم اکتوبر کے بعد کیا حشر ہو۔ توسیع [illegible] کے لئے [illegible] شرائط پر [illegible] کیا [illegible] دیا جائے [illegible] عزت تھا کہ اس عہدے پر ہم نے وہ خدمت گزاری کی ہے اور [illegible] یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی [illegible]۔ لیکن ملازمت تو [illegible] ہے۔ [illegible] کی یہ حیثیت ہے کہ [illegible] سوچ [illegible] تک ہے۔ [illegible] کیا حشر ہو۔ آپ جانتے ہیں میں عمر بھر [illegible] داری سے [illegible] ملازمت گزاری اور [illegible]

صاحب سکتے ہیں تاجور کی ایسی ہی صحبتوں میں ڈاکٹر بیری سبھروری ماہر نفسیات سے ہر حال تھی ۔ انہیں کی شب و روز کی محفلوں یہاں سے گزرے ۔ وہ شامیں ان کی صحبت میں بسر ہوئی زندہ دل انسان ہیں ۔ اس ناول میں کا اسلوب بعض مقامات اس میں نہایت دلچسپ ہیں مثلاً غلیظ لہجے ہیں ۔ دونو ناحق اپنی اپنی جگہ آئے ۔ بعض بیٹھے اس میں تیار ملاقات ملاقات ہوئے ہیں ۔ مثلاً منظور علی بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گوشت کی چاٹ پڑ گئی ہے ؛ جیسے اپنا ذہن میں آئے وہ اصل کی طرف مائل تھے لیکن دوبارہ خود کیا اصل منظر روشن ہو گئے ۔ آخری باب میں جو پنجابی گیت شامل کئے ہیں ان میں سے بعض کئی روز دماغ میں گونجتے رہے ہیں ۔ میری گڈی کی کٹ نہ دیکھی تے تندی لال چک جاندا ۔ ہائے بگ بال کے دھوئیں جیسے تو کی رومال ۔ طور لبھ ۔ یہ ہر بندہ ہوتے ۔ ہیرے رنگ ۔ دیکھیا تو پالنے والا ۔ تے بیلیاں نے دل ٹل لئے ۔ کتنا خط ۔ دل بے ساختہ بولوں میں بند ہے پنجابی کے حصے ہیں ۔ مانتے تھے معلوم ہوا آپ کے ہم وطن ہیں ۔ جیسے ہی محلات میں شائع ہوا ۔ اس خط کی رسید ارسال کیجئے گا ۔ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان میں ہر طرح امن و امان ہے ۔ خدا ہم سب کا نگہبان ہو ۔

بخاری

---

(۱۷)

برادر مکرم ! اس ڈاک میں دو خط ملے ۔ ایک آپ کا ایک والد صاحب کے جذبات ایک سے تھے مگر مضمون مختلف تھے ۔ ان کا اثر طبیعت پر یہ سا ہوا ۔ انہی دنوں انفلوئنزا میں مبتلا ہوں ۔ تیز بخار ہے اور ڈاکٹر کے مفصل معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس جسم فانی میں کئی اور نقائص پیدا ہو چکے ہیں ۔ جن کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا ۔ قلب کی حرکت ، خون کا دباؤ ، جگر و معدے کی حالت ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ۔ بہر حال اب یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ زندگی بدلی ہے نہ اس بات سے لائق تھے ۔ کہ جوانی آنی جانی چیز ہے ۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کشاکش غم پنہاں نے وقت سے پہلے بیمار کر دیا ۔ بہر حال بقول ایلا ہیر و ملاکس کی اس نظم کے جس کا ترجمہ آپ کسی زمانے میں مشاعروں میں زور و شور کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ، وہ تنہائی پسند ہے ۔ اس لئے اب کیا آپ کی سمع خراشی کروں ، بہتری کر رہا ہوں ۔

آمدم بر سر مطلب ۔ حالات وہی ہیں جو آپ نے بیان کئے ہیں ۔ پالان اور طوق زریں کے متعلق جو نظریہ آپ نے بیان کیا ہے ۔ وہ بھی حرف بحرف صحیح ہے ۔ میری صرف اتنی درخواست تھی کہ آپ کو میرے خلوص یا مستعدی پر کسی شبہ نہ ہونا چاہیے ۔ میرے خط کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ اگر آغا صاحب مل کے کریں آئو رہا یاں ۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا جس طرح بن پڑا ۔ جب بن پڑا ۔ میں دریغ نہ رکھوں گا ۔ اس میں کوتاہی ہو تو اسے اپنی روسیاہی سمجھوں گا ۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اس وقت بری طرح بندھے ہوئے ہیں ۔ اس لئے میری بے بسی کو میری کم ہمتی نہ سمجھئے ۔ اسے بے اعتنائی پر محمول نہ کیجئے ۔ فی الحال آنا کیجئے کہ لاہور میں جو صاحب اختیار ہیں ۔ ان سے کسی وقت ملئے ۔ امتیاز کی معیت میں ملنا ہو تو اور بھی بہتر ہو گا ۔ دو ایک دن میں انہیں بھی پیغام بھیجوں گا ۔ اور جو ترکیب میرے ذہن میں آئی ۔ وہ انہیں سمجھاؤں گا ۔ ملتے وقت میرا نام بھی ضرور لیجئے اور کہئے کہ میں اس کے ایما سے مل رہا ہوں ۔ برادر مکرم ان کشمکشوں میں کئی معرکے اور مرحلے پیش آتے ہیں ۔ لامحالہ مسلسل کوشش اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔ بتا ۔ قسمت یاور ہو تو کامرانی جلد نصیب ہو جاتی ہے ورنہ بعض اوقات شکیبائی ! صبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ یہ وہ باتیں ہیں جو آپ کہیں اور میں سنوں ۔ برعکس اس کے میں آپ کو نصیحت کر رہا ہوں میں مجبور ہوں معذور ورنہ ہوتا تو آپ کو اس معاملے میں ذرا بھی تشویش نہ ہونے دیتا لیکن کیا کروں ۔

ساقیا برخیز و درده جام را   خاک بر سر کن غم ایام را

یہ اس خط کا جواب ہے نہ دیکھئے ۔ خواہ جواب پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو ۔ کرم اور کرم اپنی پریشانی میں مجھے ضرور شریک کر لیا کیجئے ۔

آپ کی بہت شفقت، عنایت کی بدولت یہ تقریب نصیب ہوئی ہے۔ جب آپ پریشان ہوں [illegible]
[illegible] آپ کے پاس اس کا لٹریچر [illegible] تھا۔

میرے [illegible] کا مصداق اکمل، [illegible] اور بہت [illegible] لطیفوں سے گذرا ہے۔ کچھ درست ہوا [illegible] ایک شاعر صاحب نے شعر [illegible]
[illegible] کے محتاج ہوں [illegible] بنا کر [illegible] ہے [illegible] میں آپ کو بھی اور گھر کے لوگوں کو بھی۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۸)

۲ تغلق روڈ

نئی دہلی ۱۱ دسمبر

مکرم و محترم سلام مسنون۔ فی الحال نیوز ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ یہ اخبارات خود اپنے مترجموں سے ان کا ترجمہ کرا کر چھاپتے ہیں۔ اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں:-

(۱) نیوز ایجنسیوں کو خبریں جمع کرنے کے لیے ایسے کارسپانڈنٹ رکھنے پڑتے ہیں جو انگریزی سے کماحقہ واقف ہوں۔ محض دیسی زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ (خواہ انہیں اپنی زبان میں کتنی ہی مہارت حاصل ہو) کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

(۲) تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں حالانکہ مضافات میں کئی ایسے دلچسپ واقعات پیش آتے ہیں جو دیسی زبانوں ہی میں بیان ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔ بضاعت کم ہو تو مترجم گھٹیا اور کم سواد ہوتے ہیں۔ اور خبروں کی ہیئت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ترجمے میں وقت صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لیے نیز دیسی زبانوں کی عزت افزائی کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نیوز ایجنسیاں اپنے کارسپانڈنٹوں سے خبریں دیسی زبانوں ہی میں منگائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی ایسوسی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار مقیم جھنگ (مثلاً) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے اور نیوز ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اردو ہی میں پہنچا دے جو آپ بعینہٖ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر ترجمے کی ضرورت پیش آنے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اگر اس میں آپ کو کوئی فائدہ اور سہولت نظر آتی ہے تو پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیونکر بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں لیکن اس کی شاید ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں اچھی خاصی آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے وہاں شاید دقت ہو لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

اس مسئلے پر اپنی رائے سے مستفیض فرمایئے اور اگر ہو سکے تو یہ بھی فرمایئے کہ عام طور پر ہمارے دیسی اخبار کس حد تک اس وقت پاکستان کا صحیح مقام ادا کریں گے۔ ممکن ہے یہ مسئلہ پہلے بھی آپ کے زیر غور رہ چکا ہو اور آپ اس کے نشیب و فراز پر دماغ سوزی کر چکے ہوں۔ مجھے اس پر ترقی کے بہت سے مقامات نظر آئے۔ اس لئے آپ کی طرف رجوع کیا کہ آپ کی رائے دریافت کروں۔ جواب کا منتظر

بندۂ خاکسار

بخاری

---

(۱۹)

برادر محترم۔ گرامی نامے کا شکریہ۔

میاں صاحب کی معاملہ فہمی اور آپ کی معاملہ فہمی کی بدولت خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا۔ کل مجھے کے نام حیدری کا خط پہنچا کہ پرنسپل کا عہدہ یکم مارچ سے خالی ہو گا۔ مناسب ہے بروقت مشتہر کر دیا جائے۔ چٹرجی کے ایک بھی خط اور میاں صاحب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوا کہ ڈکنسن یکم مارچ سے رخصت لے گا۔ میرا ارادہ اب یہ ہے کہ جنوری فروری دو مہینے کی چھٹی لے لوں۔ بہرحال دسمبر کے آخر تک عملی طور پر اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں گا۔

آپ کی نمک ورد کا شکریہ۔ درست وہ ہے جو کہ . . . ای۔ ایم۔ اس مسودے کے مطابق جو اسلے کے جو معنے نکلتے ہیں۔ ان کے مطابق ڈکشنری کے کیا معنی ہوئے؟ اور چڑھ وحکم کس کر سکتے ہیں۔ ایک نسخہ تصانیہ ہے کہ درست وہ ہے جو کہ دھکڑے درست کر۔

لطیفہ۔ انگریزی روزمرہ میں رخصت کے وقت ٹاٹا کہتے ہیں۔ جس کے معنی گڈبائی کے ہیں یاروں نے تجویز کیا ہے کہ چونکہ دلی کے ارباب اقتدار پانچ کل کے سرمایہ دار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لئے دلی میں جس طرح السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے اسی طرح ٹاٹا کے جواب میں کہہ بیٹھیں برلا۔ دنیا برلا جائے۔ جو لوگ دیندار ہندو ہیں اور جے رام جی کی وغیرہ کہتے ہیں۔ انہیں چاہئے۔ اب سری رام (یعنی سر شری رام، مالک دلی کلاتھ ملز) کہا کریں۔ مجھے کے اظہار کے لئے موزوں ترین لفظ ڈالمیا ہے اور اسے قومی ”ٹال“ بنا لینا چاہئے۔ جاہلے کا انڈھو۔

نومبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور سے دورے پر آنے کا ارادہ ہے۔ ملاقات ضرور ہوگی۔ سنتا ہے امتیاز لاہور واپس آگیا ہے۔ نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے دلی سے شمال جنوب کو گزر جاتا ہے اور ہم سے نہیں ملتا۔ جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو۔ ملے تو ڈانٹئے گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۰)

برادر محترم۔ گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جو زحمت اٹھائی اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ مجھے میاں صاحب کے دلی تشریف لانے کا علم نہ

تھا لیکن بالکل ہی بھٹکا ہی نہیں۔ یہ نئی سے یہاں عادت ہو گی۔ ممکن ہے وہ اور میاں صاحب دونوں کا مشغلہ ایک وجہ سے ہو [illegible] متعلق ہو۔ بہرحال یہی میاں صاحب سے بھی مل لوں گا۔ اور آپ کو ادھر کی کیفیت سے مطلع رکھوں گا۔

زبیدہ نے آپ کا خط پڑھا۔ آپ یہ سمجھئے کہ آپ کے بچوں کو دعائیں دیتی ہے۔ مجھے تو [illegible] صاحب نے اس خط میں ہماری [illegible] اظہار نہیں کیا۔ میں نے کہا یہ خط بالکل کاروباری تھا۔ اس کا لہجہ ہی جواب ضروری تھا۔ باقی حساب دوستاں در دل۔ بہرحال [illegible] واپس آنے کے خیال سے زندگی میں ابھی سے تھوڑی سی تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ جانتا ہوں کہ اس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور حالات میں کئی ایسی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے جن سے وہ پہلے امنگ نہ رہے۔ بارہا ہم کئی مرتبہ اور کئی موقعوں پر دل کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔ وہ سب نشیب و فراز دیکھے۔ کئی تلخیاں چکھیں اور کئی غلطیاں کیں۔ اس کے بعد بار بار اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ در زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است۔ صراحی مے ناب و سفینہ غزل است۔ لاہور میں جو صحبت تھے وہ سب [illegible] جنگ [illegible] کب ختم ہو۔ امتیاز علی [illegible] کی کئی داستانیں سنتا ہوں لیکن [illegible] جس کا حسن [illegible] کی طرح بقول شیکسپیئر کے مرور زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ میرے لئے اب اگر کسی شخص کا نام ہے تو وہ آپ ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ایک بار پھر آپ کی طویل صحبتیں نصیب ہوں گی۔ اور فراغت بے خلل ہو گی۔ طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ کس سال سے کوئی چھٹی نصیب نہیں ہوئی۔ آپ [illegible] ہوں گے۔ [illegible] بے خلل ہو گی۔ اور اگر فرصت بے خلل اس دنیا میں کسی کو نصیب نہیں۔ تو بہرحال اس کے قریب ترین کیفیت جو نصیب ہو سکتی ہے وہ لاہور ہی میں ہو گی۔ [illegible] کی باتیں ہیں لیکن [illegible] ضروری نہیں۔ ان باتوں پر میں نے بہت کچھ دماغ سوزی کی ہے کوئی ادبی بات [illegible] تو مطلع کیجئے گا۔

والسلام

بخاری

۳ اکتوبر

---

(۲۱)

[illegible]

برادر محترم۔ میں نے ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اس خط کو اس کا ضمیمہ سمجھئے۔ رات میرے ہاں [illegible] اختر [illegible] کے علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض، راشد، حسرت، عباس، حمید ملک سب موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک طرح کا مصرع دے رکھا تھا [illegible] شرط تھی کہ ہر ایک چند شعر اس طرح پر [illegible] چنانچہ سب نے مشق کی اور آغا حمید نے بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح [illegible] جمع ہوئے غزل بھی [illegible] مزاح بھی [illegible] اور دونوں اصناف میں خوب خوب شعر ہوئے۔ اس طرحی مشاعرے کے بعد جدید شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ [illegible] تاثیر، حفیظ اور فیض نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ پھر خوش گپیاں ہوئیں بحثیں ہوئیں۔ رات کے ڈھائی بجے محفل برخاست ہوئی اور میں [illegible] والوں کو موٹر پر گھر پہنچا کر ساڑھے چار بجے خود گھر پہنچا۔

افسوس صرف یہ تھا کہ سب لوگ جمع ہوں اور آپ کا ذکر ایک مرتبہ نہیں ہزار بار نہ ہوا ہو۔ جب یہ خبر ملی کہ آپ [illegible] کے لئے [illegible] آ رہے ہیں۔ تو سب [illegible] کہ آپ کے آنے پر پھر ایک ایسا ہی اور ایک ایسا مشاعرہ ہو۔ طرح تجویز ہوئی کہ "وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں" (قافیہ جہاں، آسماں) اور مجھ سے کہا گیا کہ [illegible] صاحب کو مطلع کر دوں تاکہ وہ اسی طرح پر غزل [illegible] تاکہ باقاعدہ پروگرام بنایا جائے۔ آپ کے آنے

تک تاثیر نہیں ہوں گے۔ وہ افسانہ اور ناول اور تعبیرات بھی تو ہیں لیکن ممکن ہے وہ بھی اس وقت تک نہ آئیں۔

اس طرح پر آپ کو بہت زمانی فرصت مل جائے گی۔ وہ سب کر لیجئے گا۔ اور [illegible] نظر انداز کیجئے۔ ورنہ ڈائری کے علاوہ [illegible] ہوگا۔ آپ کو فرصت ممکن ہے کم ہو۔ لیکن یہاں بھی ایک تاثیر چھوڑ کر باقی سب [illegible] فرصت میں آپ ہی ہیں کیا [illegible] پڑے گا ہے

اور کسی اور نے [illegible] فوراً [illegible] ایک [illegible] آدھ [illegible] زحمت گوارا فرمائیے۔ [illegible] اپنی [illegible] کر لیجئے [illegible] ہوں [illegible] بھی نصیب نہ ہو [illegible] معاش کے سلسلے میں [illegible] جب [illegible] کی [illegible] آپ کے [illegible] شام [illegible] کے قریب گاڑی جاتی ہے۔ مکان اسٹیشن سے [illegible] میل ہے [illegible] آپ روانہ [illegible] شام کو [illegible] صاحب میں تار دے دیجئے۔ خاکسار

بخاری

۱۴ تعلق روڈ۔ دہلی

ا/ جنوری

---

(۲۲)

۲ جنوری

برادر محترم، سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ معاملات متعلق ریڈیو کی مسائل ابھی تک جاری ہیں۔ اور اس میں بہت کچھ دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ اگر ہمارے بڑوں نے نہایت [illegible] سے کام لیا اور [illegible] کا اظہار کیا تو ممکن ہے بڑی حد تک مل جائے۔ کیونکہ یہاں تو معاملہ بعض [illegible] کا ہے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا [illegible] وقت سے کچھ [illegible] اخلاق کا اظہار ہوا ہے خدا کرے اخلاق بعض ہماری طرف سے اور بعض ان کی طرف سے نہ ہو اس میں کچھ شبہ کی گنجائش ہے۔ اس لئے ابھی مطلع صاف نہیں ہوا اور نتیجے کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ تاخیر ہو رہی ہے لیکن بہرحال اپنی تیاری مکمل کر رکھنی چاہئے۔ مجھے نتیجے کے متعلق کچھ ایسا حسن ظن نہیں۔ یہاں [illegible] اور دوسرے بھی چند در چند مشورے ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ معاملہ حسب منشا طے نہ ہوا تو وہ علاوہ یہاں کام کرنے کے [illegible] آئیں گے اور اس صحافت کو [illegible] سے آگاہ کریں گے۔ اور لائحہ عمل کے متعلق مشورہ دیں گے اس پر [illegible] تیار کر لیا گیا ہے۔

میرے بُن ران میں عرصے سے ایک رسولی [illegible] تھا۔ بڑھتے بڑھتے پون انچ کے قریب ہو گیا اور اس کی بیخ بھی گہری پون انچ کے برابر ہو گئی۔ مدت سے ارادہ تھا کہ اسے کٹوا ڈالوں۔ "کٹھالی" ہونے کی وجہ سے تکلیف دینے لگا تھا۔ مصروفیتوں نے مہلت نہ دی۔ اب رخصت لی ہے تو یہ فرض بھی پاک [illegible] کاٹنے کے بعد دو تین ٹانکے لگانے پڑے اس لئے نرسنگ ہوم میں چلا گیا۔ وہاں پانچ چھ دن ڈریسنگ گون میں فرصت اور خوشی کے گذارے۔ پھر واپس آ گیا کوئی تشویش کی بات نہیں۔ جو مضمون گذشتہ کل تھا اس کا معائنہ کرا لیا ہے۔ شبہ ہے کہ سرطان نہ ہو۔ ڈاکٹر اس شبہے پر ہنستے ہیں لیکن [illegible] ہوں۔ اس لئے احتیاط کرتا ہوں۔

[illegible] رخصت کے ایام میں برسوں سے جو کام معرض التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کو نبٹانے کی کوشش کر رہا ہوں اب معلوم ہوتا ہے کہ اس دن گیارہ سال

[illegible]۔

یہ بڑی خلافِ معمول اور مسرت کی بات ہے کہ ... قدر شفقت برتی ہے ساتھ ساتھ مطالعے کا شوق بھی ... تاریخ، صحیفے کے مطالعے میں ... ہو گئے ہیں۔ ان کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں ... آپ نے ... پڑھ چکا ہوں ... شعر ... ایک تنہائی ... سامنے اور ... کی لذت ... دوستوں کی محبت ... اب ... ہوں ...

والسلام

خاکسار

بخاری

۲۰ جنوری

---

(۲۳)

ڈاکٹر ...

برادرِ محترم، سلام مسنون

پہلے تقرر کی میعاد پانچ سال تھی۔ جو اپریل ۱۹۵۵ء کو ختم ہوئی۔ ... کے مشورے سے میعاد ... مزید پانچ سال کے لیے بڑھا دی جائے۔ پنجاب گورنمنٹ سے پوچھا جائے گا۔ ایک آدھ ہفتہ کے اندر یہاں سے خط روانہ ہو گا۔ ٹھیک کس تاریخ کو روانہ ہو گا ... یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جب معلوم ہوا تو آپ کو مزید اطلاع دوں گا۔ بہر حال ممکن ہے کہ کوئی ... ہو، اور خط روانہ ہو جائے۔ پنجاب کے ارباب حل و عقد کا ... آپ کے ... مگر یقین نہیں ... معترض ہوں۔ میرے ... اصحاب کو ترقی ... اس لیے ... ایسا ہو کہ مجھے ... رکھنا چاہیے۔

دو ایک نکتے قابلِ غور ہیں۔ اول تو یہ کہ میرے جیسے افسر کے معاملے میں میعاد کا مقرر کرنا محض ایک اصطلاحی اور رسمی بات ہوتی ہے ... نہیں۔ مستقل سرکاری ملازم ہوں۔ ... ان ... رکن ہوں جن کا صوبوں سے مرکز اور ... صوبوں میں منتقل ہونا خاص قواعد و ضوابط سے منضبط کر دیا گیا ہے۔ میں خواہ پانچ سال کے لیے صوبوں سے باہر کام کروں، خواہ دس سال کے لیے، بہر حال اور ہر وقت پنجاب ... میرا LIEN قائم رہتا ہے یعنی مرکز صوبہ اور میں خود، ہم تینوں میں سے جو جس وقت چاہے میری واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تقرر کی میعاد کا معین کرنا دراصل کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بجز اس کے کہ اس سے سب متعلقہ لوگوں کے ذہن میں ایک اندازہ سا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب میں میرا LIEN SUSPENDED ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے میری اسامی پر حکومت پنجاب کو کسی اور شخص کے مستقل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مجھے مزید پانچ سال کا ... حکومت پنجاب سے پوچھنے کے بعد کیا جائے گا۔

آپ اس معاملے میں کسی طرح سلسلہ جنبانی کر سکیں گے؟ یہ آپ پر چھوڑتا ہوں ... ہو کہ آپ کی کسی ... سے لوگ یہ اندازہ لگائیں کہ کوئی بہت اہم بات ہے جس پر کھینچا تانی کا امکان ہے حالانکہ دراصل یہ صورت نہیں۔ اگر ... تذکرہ یہ بات ہو جائے اور کوئی اس پر ... کے درمیان ... نگاہ رکھے تو مفید ہو گا۔

میں آج P.E.N کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے ... جا رہا ہوں۔ وہاں "THE URDU WRITERS OF OUR TIMES" پر ایک پیپر پڑھ رہا ہوں۔ دو تین دن ہوئے بمبئی سے واپس آیا ہوں۔ وہاں امتیاز ... صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ امتیاز کو ... فلم کے ... کسی چیز کا شوق معلوم ہوتا ہے ... اس سے کچھ ... وہاں یہ خیال آیا کہ آپ کو بھی ... سیر و تماشا کی غرض سے کبھی جانا چاہیے۔ وہاں آج کل ... آپ کا

باہم یقیناً ان کے پاس ہوگا۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ سمندر تو دیکھ لینا چاہئے تو آپ ابھی سے دو مہینے ... رہیں گے۔ تاہم

خاکسار،

بخاری

۱۹ اکتوبر

---

(۲۴)

مکرم بھائی

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط ابھی میں میرا منتظر تھا۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انقلابِ افکار و حوادث کے سبب سے میں محروم و نادم ہوں۔ کچھ کسالت، کچھ مصروفیت اور پریشانی۔ علاوہ بریں میں نے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور وقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب ہے۔ ۵ ؍ جولائی کی صبح کو روانہ ہو رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تمہارا ... بعد از تکمیل کا ساتھ بتاؤں گا۔ یہ وعدہ بھی روانہ ہوا تو آپ مجھے حلقۂ ... سے خارج تو نہ کریں گے کچھ اور ڈانٹیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے اور مزدوری کا لیکن مذاق برطرف۔ اس مہینے میں یہ کام ضرور ختم ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں انشاء اللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

... صاحب اپنے بارے میں غیر شعوری طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے تو جو اس عہدے پر مقرر ہے وہ کیونکر مستقل ہو سکتا ہے اور عہدہ عارضی یوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ کام رہے نہ رہے۔ ... کس قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو۔ کسی اور قسم کے آدمی کے سپرد یہ کام سپرد کیا جائے۔ یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں ... صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں بھی کسی کی شرارت مضمر نہیں۔ کیونکہ ان کوتاہیوں کا علم خود براہِ راست مجھ کو ہے تاہم ان کو ہم گھسیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ چونکہ مجھے برخاست نہیں کیا اس لئے میں مستقل ہونے کا حق دار ہوں۔ اگر چڑچڑی رہی ہے تو دور ہونی چاہیئے۔ یہ خواہ مخواہ ابدالطبعی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکھتے ہی نہیں۔ سفارش اور دستگیری کے عادی ہو چکے ہیں۔ دوسروں کو ظالم اور بے انصاف اور اپنے آپ کو مظلوم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا الزام کی بصیرت کام نہیں دیتی۔ کبھی خدا کا شکر نہیں کرتے بلکہ گلہ شکایت ہی کرتے رہتے ہیں۔ ایسے شخص کا مطمئن کرنا یا اس میں ہمت پیدا کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسا شخص ہر وقت مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی اس کے لئے وقف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتا۔

باقی عند الملاقات۔ کیا آپ کو دہلی بلایا جائے ؟ بے ترتیب ؟

خاکسار

بخاری

---

(۲۵)

ستارۂ پہلے عرض کا نقشہ کریں۔

۱۔ کبھی تو رہے محفل کا شبستان محفل آرائی   کہ اب تک خاک ان بربادیوں رونق ہے صحرا کی

آپ محفل آرا کو دشت پیما کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عشق و مجنوں کی زینت تھے۔ اب برباد ہو چکے لیکن صحن تمامی ان کی دولت میں ہے [illegible] بربادی سے وہ محفل آرا ہیں۔ اسی طرح کہ برباد ہونے کے صحرا کی رونق بن بیٹھے۔ دشت پہلے ہی چلا جائیں گے۔ لیکن آپ کو اس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تو صاف ہے کہ ہوئے ہوں گے۔ اس کی بعض باتیں ہیں جو ہے رسمی مات ہو رہی لہٰذا دشت پیما منظور ہو اس سے شعر کا مطلب دور ہے گا

۲۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چشم گل کی نمناکی

آپ فرماتے ہیں یہ شعر وضاحت طلب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اصلاح طلب نہیں۔ لہٰذا منظور۔

۳۔ کھلے سوتیا ــــــ منظور

۴۔ در میخانہ کھلے چشم ساقی میں ہے بیباکی

میں نے لکھا تھا در میخانہ کھلے تو آنکھ میں ساقی کی بیباکی۔ آپ فرماتے ہیں ایک ہی بات کی ہی ہے۔ آپ کی اصلاح مجھے منظور ہے گو میں اس بات کا ابھی قائل نہیں ہوا کہ ایک ہی بات کی کمی ہے۔ بعض فقرے بامحاورہ بیٹھ زبان میں آتے ہیں۔ جہاں اس کی یہی شکل ہوتی ہے اور وہ ایک ہی استعمال ہوتا ہے بہرحال اصلاح منظور۔

مقطع پر کلی اتفاق۔ اور بہتر بھی یہی ہے۔ وہ دو غزل ہی سے (تو دو ہو جاتی) آپ کی اصلاح سے متفق ہوں جب بھی اتنا ضروری ہے کہ آپ کے اعتراض سے اپنا قوی شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اتفاق کے بغیر چارہ نہیں رہتا (اس کو حسن اتفاق کہتے ہیں) بہرحال دماغ سوزی کا بہت شکریہ!

۳۰ جون سے (تاریخ یاد رہے) میں ۹ اشوکا روڈ۔ نئی دہلی جا رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کو 9 ASOKA ROAD لکھتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اور اقبال چند دن کے لئے آجائیں۔ برسات جون ہی ہے۔

اور بھائی۔ ممتاز کشور سے گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔ مضمون کا مطالعہ سے ہوتے ہیں اسلامیات پہلا فریش یا زیادہ سے ترکیب کرکیا مہر صاحب اور میاں صاحب کی گفتگو میرے مسئلے کے متعلق بھی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو کیا تیجہ رہا ہے۔ اس موضوع پر تو بہرحال سے آپ نے کچھ لکھا دیا ہے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۶)

۵ا پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

۴ر اکتوبر

محترم بھائی۔ گورنمنٹ کو اس سال کے بجٹ میں کچھ خسارہ نظر آتا ہے۔ اس سے خالی آسامیوں کی بھرتی یک قلم رک گئی ہے۔ اور معلوم نہیں کہ کب [illegible] کھلے گی۔ اس سلسلہ میں کام میں تاخیر لابدی ہے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو اس سے پہلے آپ نے لکھا تھا۔ اور جس کے جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہوں گے۔

پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ آپ کا ذکر [illegible] بار بار آیا۔ اور مولانا [illegible] مرحوم کا ذکر بھی آیا اور [illegible] کیا۔ اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا۔ [illegible] ترتیب نو [illegible] ہے۔ [illegible] علم و ادب و تاریخ پر ان کی بحثیں ہوتیں۔ شعر خوانیاں [illegible] ہوئی۔ علامہ اقبال کی یاد تازہ ہو گئی۔ کیونکہ بجز اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جو عالم اسلام اور اس کی رنگینیوں اور رنگ [illegible] کا آئینہ دار ہو۔ یہ نسل ہی اب ختم ہوتی جاتی ہے۔

اس خط کے دیکھتے ہی رائے بہادر منوہن صاحب سے ملیے۔ اور ان سے پوچھیے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ اگر ہو تو اس کا مداوا کیجیے۔ تفصیلات [illegible] سے معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی صاحب کو بھی شامل کر لیجیے۔

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر ہے۔ بشیر ہاشمی غالباً [illegible] کے جلسہ میں دلی آئیں گے۔ مس بے اختیار بھی بحیثیت ویمنز کانفرنس کی [illegible] کے شوہر کے آ جائیں۔ آپ ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی حیثیت سے آ جائیے۔

زبیدہ سلام کہتی ہے۔

خاکسار

بخاری

بمبئی انتخاب جیت کر لے الواقع صحت [illegible] کرتے ہو جس روز انتخاب ہے پہنچے اس دن حال معلوم ہوتا ہے کل یہ عنوان نظر آیا

لاہور میں گرنے اگریزی کی اکثریت

[illegible] کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر اس کے لیے سند موجود ہے۔ "قلیت مال و اکثریت عیال" مشہور فقرہ ہے

ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا آپ بھی سن لیجیے۔ خوب ہے۔

ہوں پہ وہ بے ترشیے میں ہنرمند ترے
وہ اور کوئی نہیں عاشقان چند ترے

بخاری

---

(۲۷)

۲۳ر دسمبر

برادر محترم۔ یاد آوری کا شکریہ۔ خط کے مضمون سے آگاہ ہوا۔ احساس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فردی [illegible] کر رکھے ہیں۔ اور جیسا کہ تقاضا ہے ان میں حتی الوسع دخل نہیں دیتا۔ تاآنکہ کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا۔ وہ بھی اپنی جزو تمام

یہ شائع ہونے تک پاس سے غائب نہ ہوں گے۔ [illegible] ایک نسخہ مجھے بھی [illegible]
بشیر صاحب سے متعلق جو آپ نے سعید صاحب کو لکھا [illegible] جوابات ان تک پہنچے۔ یا کہیں اٹک گئے
ایک [illegible] [illegible]

بالمشافہ۔

یہ تو سچ ہے کہ ہر ایک کے [illegible] [illegible] ی ا
ہم آہنگی ہے۔ احباب کو میرا سلام پہنچے۔ اور بالخصوص تاثیر صاحب، امتیاز صاحب اور حمید احمد خاں صاحب کو۔ زبیدہ آپ اور بچوں کو سلام کہتی ہیں۔
یہاں میرے بچے [illegible] لیکن دلی شہر نہیں ہوا ہے۔ فاصلے بہت ہیں [illegible]
دل ہی [illegible] میں اردو مجلس کے احیاء کی کوشش کر رہا ہوں دیکھئے

بخاری

---

(۲۸)

HOTEL MARIA CRISTINA

MAXICO D.F.

۱۰ جنوری

برادرم۔ نوازش نامہ ملا۔ آپ کے سوا کسی اور دوست کا خط اب تک نہیں آیا۔ [illegible] سب نے گویا مجھے دنیا بدر کر دیا۔ زبیدہ اور
[illegible] کے خط مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ان سے بالواسطہ کچھ احباب کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ [illegible] حالات سے تو باقاعدہ مطلع رہتا ہوں۔ [illegible] بالکل ہی [illegible]
بن جاتا۔ سیاسی حالات سے باخبر نہیں۔ [illegible] احمد کراچی سے جو خط لکھتے ہیں ان سے [illegible] باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ادبی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ نہ معلوم کون
سے رسالے بند ہو گئے اور کون سے [illegible] کی کیفیت طاری ہے [illegible] غالب کے [illegible]۔ آپ نے انقلاب کا ایک ورق بھیج
کر [illegible] بہت بہت مبارک [illegible] دوستوں کے اجتماع کا ایک [illegible]
دوستوں سے [illegible] خیر۔ [illegible] "انقلاب" کے [illegible]
[illegible] بہرحال آپ جیسا
قلندر ہی اپنی قلندری کو کام میں لائیے۔

کانفرنس کچھ تو [illegible] لیکن [illegible] معلوم ہو گیا کہ [illegible] سیاسی کھینچا تان کا اکھاڑہ ہے۔ [illegible]
کچھ نہیں۔ [illegible] کانفرنس کا [illegible] (۱۰۰) ہے۔ [illegible]
[illegible]

وہاں کے عالم ایلچی، امریکی، آسٹریلین بلکہ جزائر والوں سے بھی اوپر نکل گئے۔ پہلے سے دلسہ بنے ہیں کہ ہم دعدہ یہاں تقریر کیوں کریں۔ بات دن لوگ اصول اصول پکارتے ہیں۔ اور اس پاسداری میں ہر ملک خاص طور پر الدین چیتا پھرا۔ اور حالی جیتے کی ملک جنگ کے بعد معلوم ہوا کہ اصولوں کی کمی نہیں بلکہ بھرمار ہے۔ ہر ملک اپنے اپنے مطلب کے اصول وضع کرلیتا ہے، خیال ہوا کہ جو کیا اصول جن پر سب کا یا اکثریت کا اتفاق ہو، رائج نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اور اس کے بعد امریکہ ریاست ہائے متحدہ کو بے جا سے ہزار ہزار ڈالر ڈالر خرچ ہوا کہ PLAN ترتیب و تشکیل دیے۔ مدعیوں نے اپنے PLAN میں اپنے حواریوں کو مٹھیاں بھر بھر کر ہر نکلے دیئے۔ امریکہ نے لاطینی امریکیوں (یعنی جنوبی امریکہ کی ریاستوں) کو بڑی ترغیب دیں۔ غرض امریکہ نے اپنا سیاسی اثر بڑھانے کی کوشش کی۔ جن مسائل پر کانفرنس اس وقت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں سودے ہوں گے۔

وفد پاکستان کی جو اس سے پہلے کسی سے سودا کرے۔ سوچا کہ ہمارے پاس تو شخصیت کے سوا میدان میں کچھ نہیں۔ خدا کا نام لے کر شروع ہی سے اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کی لیکن اس طرح کہ اصل اصول کی بات ہو۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں آئے تو لوگ نہیں جانتے تھے بلکہ لوگ پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی مہربانی سے پہلے ہی ہفتہ کے اندر دو تین زور دار تقریروں کا موقعہ مل گیا۔ ساتھ کی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھائے۔ موقع پا کر بعض تقریر کے زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی کہ نہیں ... سے زیادہ ووٹ حاصل نہ ہو سکے۔ چونکہ لوگوں کو جیاں ہوں کہ بحث و تمحیص میں پاکستان کی دوستی مفید ہے۔ بہرحال ان کی دشمنی مضر ہو سکتی ہے۔ ... سلیقہ مازی سے بھی کام لیا۔ ایک مزاحیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں لکھی جو ... کے رستے سے کانفرنس کے روزنامہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی۔ دور لوگوں نے پاکستانیوں سے جو توقع ہو سکتی تھی اس سے بڑھ کر معافی مانگنا شروع کئے۔ ہندوستان والوں نے اپنا وفد محض انجینئروں سے مرتب کیا ہے۔ وہ لوگ بے چارے لائق ہیں لیکن ... صورت ... انگریزی ایسی بولتے ہیں جیسی پرزے جان سکتے ہیں۔ اور جو ہم بھی ... ہسپانوی بلا تکلف بول لیتا ہوں ... اخبار وغیرہ پڑھ لیتا ہوں۔ دوسری وقت ... دو ہفتے کی خصوصی تقریر ہسپانوی میں کروں گا۔ میری اس کے سات دوستی پر جنوبی امریکہ ... کے لوگ بہت خوش ہیں ... سب جملے استعمال کر رہا ہوں۔ بہرحال آکر انسان پہلے سے بھی ... پاکستانی ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ اب کانفرنس کے آخری مرحلوں میں ہیں، کامیابی نصیب ہو۔ ادر دو تین مہینے کی محنت کہیں ٹھکانے لگے۔ کانفرنس کا کام توقع سے بہت زیادہ نکلا۔ اجلاس صبح دس بجے سے شام سات بجے تک اور بعض اوقات رات کے دس بجے تک رہتے ہیں۔ ایک دن تو صبح کے دو بج گئے۔ سوائے سنیچر کے آدھے دن اور اتوار کے کوئی تعطیل نہیں ہوتی اور یہ اوقات ... کی ساعتیں ... مشوروں میں صرف ہو جاتی ہیں۔ کانفرنس کی دستاویزات کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ان کی تعداد اس وقت تک چھ سات ہزار صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔ انجینئر یا ... کے مسئلے بھی کہنے پڑتے ہیں۔ ریڈیو کی تعلیم جو دس سال میں حاصل کی ہے وہ ایسے وقت میں کام آتی ہے تاہم بعض باتیں کچل کی طرح بیٹھ کر سمجھنی پڑتی ہیں۔ آپ خوش ہوں گے کہ میں کئی مرتبہ بہ اتفاق رائے صدر منتخب ہو چکا ہوں۔ اور بلند طبقوں کے مشوروں میں مجھے خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔

میکسیکو مجھے بے حد پسند آیا۔ پہاڑی ملک ہے آب و ہوا خوشگوار ہے۔ رنگ رنگین طبیعت با اخلاق۔ رنگین پوش ہیں۔ پابندی اوقات کو رذیلوں کا شیوہ سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور ناچ اور سواری کے بے حد شوقین ہیں۔ کانفرنس کا افتتاح ... سے ہوا ... میں آپ جناب ... وغیرہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ رذیل سے رذیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ ادا نہ کرے۔ اور آپ شکریہ ادا کریں تو انکسار کے دو تین فقرے جواب میں نہ کہے۔ یہاں اکثریت اصلی باشندوں کی ہے۔ ان سے کم دوغلے لوگ ہیں۔ اور اصل خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔ پچاس ... سال سے یہاں ایک نئی نیشنلزم بروئے کار آ رہی ہے۔ جو اپنے آپ کو ہسپانیہ سے وابستہ کرتی تھی۔ اور ہسپانیہ کو بہت حرمت سے کہلا رہی ہے۔ چنانچہ ہسپانوی اقتدار کی دو تین صدیاں جو میکسیکو پر گذری ہیں انہیں تاریخ سے محو کیا جا رہا ہے اور موجودہ عہد کا سلسلہ قبل از ہسپانیہ دور سے ملایا جا رہا ہے جب یہاں کے اصلی باشندے برسر اقتدار تھے اور ان کی ایک

عظیم الشان سلطنت اور تہذیب تھی۔ اور ہسپانوی یلغار نے کس کو تہس نہس کر دیا تھا بلکہ شہر کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے اور ... ہے۔
شہر ہے گلیاں بہت کم ... میں کئی عجیب باتیں نظر آئی ہیں۔ پچھلے ہفتے یہاں تین سال ... جس میں ... ہو گئے۔ اب
یہاں REPUBLIC ہے۔ ... بہت شوق ہے۔ ... ترقی دینے میں بڑا اہتمام کیا ہے ... ملی تھی۔
ڈپٹی تعلیم پاکستان سے مجھے ملاقات کا ... پر ایک رپورٹ لکھا۔ میں نے بہت کچھ سامان اس پر جمع کیا ... ایک تاب
خواہ انگریزی ہو خواہ اردو خواہ دونوں زبانوں میں پاکستان کی خاطر لکھنے کا اہتمام ... کانفرنس کی ... وزیر تعلیم اور
اس کے افسروں سے تبادلۂ خیالات کے لئے کئی مرتبہ وقت مقرر کیا اور اکثر وعدہ ایفا نہ کر سکا۔

دنیا کھوں میں کئی دلچسپ خط تھے۔ اگر دوستوں کے خط اس کے ... ہوتے ... بہت کہتا۔ وہ نصیب نہ ہوئی۔ آ
سہیل اختیاری غائب آئی۔ فرصت بھی بہت کم ملتی ہے۔ تاہم آپ ... لکھ کر یہاں ... کے ... رکھ دیتا۔

دوستوں کو میرا سلام دیجئے گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۹)

HOTEL MARIA CRISTINA,

MEXICO. D F.

مکرم بندہ

برادر محترم سلام مسنون۔ آپ کا تیسرا خط ملا یعنی جس خط کے متعلق آپ کو شبہ تھا وہ بھی مل گیا تھا۔ جواب نہ لکھنے کا موجب یہ ہے کہ فرصت ہی نہ ملی نیز فرصت کے جو چند لمحے ملتے ہیں۔ اس میں اتنے خط لکھنے پڑتے ہیں کہ سب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ... زبیدہ، سرکار پاکستان، ... تاثیر سب کو خط لکھنے، کسی کو صرف ایک اور کسی کو مثلاً سرکار پاکستان کو ہر ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ یہاں رت بدل گئی ہے اپریل میں وہ حال ہے جو ہمارے ہاں مارچ کے اوائل میں ہوتا ہے۔ آنکھیں دھوپ سے گریز کرنے لگی ہیں۔ اور کوٹ پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ کانفرنس آخری مرحلے پر ہے۔ لوگ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ اس لئے صبح میں یا تو چڑچڑا پن دکھاتے ہیں یا ... دیتے ہیں لیکن جو آدمی ... ہیں وہ اب بھی ختم نہیں آنے دیتے۔ اور آج تک ... ہمارا کام خدا کے فضل سے بہت ہی ٹھیک رہا ہے۔ دو تین دن ہوئے یہ طے پایا کہ یہاں کی کانفرنس تو عنقریب ختم کر دی جائے کیونکہ اصول وغیرہ طے ہو چکے ہیں۔ باقی اصل پلان سازی کا کام جو تفصیل کا کام ہے اور جس میں کم از کم چھ مہینے اور شاید ... لگیں ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جو وسط جون کو پیرس میں جمع ہو جب چار پانچ چھ مہینے میں وہ اپنا کام ختم کر لے تو کانفرنس پھر جمع ہو لیکن چند دن کے لئے۔ اور پلان کمیٹی کے کام پر نظر ڈال کر معاہدے پر دستخط کر دیئے جائیں۔ اس پلان کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے ہر ملک نے ہاتھ پاؤں مارے۔ جتھہ بندیاں ہوئیں۔ سودے ہوئے۔ رعب گانٹھے گئے۔ تقریریں ہوئیں۔ آنکھیں دکھائی گئیں۔ غرض ... سیاست کے سب حربے استعمال ہوئے۔ خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب ستر ملکوں میں سے صرف پندرہ ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل پایا۔ یہ

فیصلہ ایک مہینے کے لعانی بحث کی گفتگوں کی ایسا گرم بحث اور تقریر بازی کے بعد ہوا۔ جب فیصلہ جنرل اسمبلی میں لوٹ کر واپس آیا۔ تو عجب اطمینان اور مسرت کی کیفیت تھی
پانا ہوا خوشی اور فخر ہو رہا تھا۔ اور یہ ہفتہ ہوں کی آپ کے ساتھ کی آواز ستائی دیتی تھی جب ۴۷ء کے اکتوبر کو ہم یہاں پہنچے تھے تو کوئی بھی جانتا تھا پاکستان
کے نام سے بھی لوگ واقف تھے ستر قوموں میں سب سے نئی قوم۔ ستر ملکوں میں سب سے نئے تجربہ کار ملک۔ ڈرانسپیر یا سمجھنے کیسی سال بجٹیر۔ ریڈیو
کی صف میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن پانچ مہینے کے عرصے میں پاکستان کو فوقیت حاصل ہو رہی ہے۔ کئی بڑی اہم کمیٹیوں اور اہم مشوروں میں اس کی حیثیت صدیا نائب صدر کی ہو گئی
تھی۔ اور اب جب کہ کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے تو اس میں بھی پاکستان کی جگہ ہے وہاں ہے کہ کسی کو اس کے حق عضویت پر شبہ کرنے کا خیال تک
نہیں آتا۔ وزارت تعلیم پاکستان کا۔ شاید ہے کہ کانفرنس کے بعد کچھ وقت نکال کر جاؤں اور میکسیکو کے نظام تعلیم کا مطالعہ کر کے اس پر ایک رپورٹ لکھوں۔ یہاں کے لوگ
بھی ہماری طرح نادار اور ان پڑھ تھے۔ میکسیکو کی انقلابی جماعت نے برسر اقتدار آتے ہی تعلیم کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا کہ تمام دنیا انگشت بدنداں ہو گئی۔ اس
لئے یہاں کا مطالعہ ہمارے لئے بہت مفید ہو گا۔ معلوم نہیں اس کام کے لئے سرکار کتنی مہلت دیتی ہے اور کیا ہوتا ہے اس لئے آنے میں اب کچھ تاخیر ہو گی۔ بہر حال
سالوں کی تاخیر نہیں۔ مہینوں کی۔ وہ بھی ابھی پوری طرح طے نہیں ہوا۔ دیکھئے۔ پہلے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور [illegible] سمجھتے تھے اور جب بھی انتخاب کی نوبت
آتی تو لوگ کہتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے صرف ایک کا ہونا کافی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم
ممالک کا بڑا بھائی ہے۔ پھر اس کے بعد یہاں تک نوبت آئی کہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا ہونا از حد ضروری سمجھنے لگے اب آئندہ خدا کے فضل سے کم
از کم ریڈیو کے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کو کرسی ہمیشہ صف اول میں ملا کرے گی۔ ہم پاکستانیوں نے اس پر ایک جشن منایا اور سب آبدیدہ ہو گئے۔

خاکسار

بخاری

۳۰

یکم جولائی ۱۹۵۱ء

برادر محترم۔ آپ کے خط سے بڑی ندامت ہوئی۔ جب آپ کا خیال آتا تھا تو شرم کے مارے لمحہ بھر کو ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے لیکن یقین مانیے
کہ اپنی خاموشی کی سزا بھی سب سے زیادہ مجھ ہی کو ملتی رہی۔ احباب بعید تر ہوتے گئے۔ اور میری تنہائی بڑھتی گئی۔ مہینوں کی غفلت کے بعد کسی کو خط لکھا بھی تو جواب
نہ آیا۔ کیونکہ وہاں توجہ کا چشمہ اس عرصے میں خشک ہو چکا تھا۔ یہ ندامت اور آپ کا صلہ بھی نہ ملا لیکن سالک کی وفا شعاری ہمیشہ استحقاق سے تجاوز کر جاتی ہے
خدا آپ کو زندہ و سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ آئین دوستی آپ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ ورنہ دائمی باہمی الفتیں مر رہی ہیں اور جو نہیں مٹیں وہ زندہ درگور
ہیں —

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں یہاں پہنچا تو ذیابیطس کو شکر اپنے ساتھ لایا۔ کئی ہفتہ روزانہ پیشاب کا معائنہ کرتا رہا۔ اور زندگی کے باقی اوراق سب تہ
کر کے رکھ دئے کہ شفا کے شائستی ہو لے۔ تو زندگی کا دھارا پھر ٹھیک سے بہنے لگا۔ لیکن جب تک اس میں شکر شامل ہے باقی شیرینیاں حرام ہیں۔ لیکے
کی پکاریں اور قطرہ پیمائیاں۔ دن رات اسی فرض کے "شیشہ آلات" کی نذر ہو گئے۔ اس عرصے میں مکان کی کوشش رہی۔ یکے بعد دیگرے دو اپارٹمنٹ بدلے۔
دونوں [illegible] یقین ہو گیا کہ اپارٹمنٹ میں رہنا ہم پنجابیوں کے لئے نا ممکن ہو گا۔ ایک پہاڑ وسی عمارت اس [illegible] جنوں [illegible] ہے۔ کوئی چھوٹے کوئی بڑے۔

جو صاحب عقل اور ہوشیار ہو ایک ہفتہ میں چھٹویں منزل پر رہتا تھا، کئی مرتبہ خیال آیا کہ [illegible] بلند عمارت میں [illegible]
تو حفاظتی نقطۂ نظر سے [illegible] چھٹی منزل تک چڑھنا پڑے گا اور وہاں پہنچ کر اس کا سارا دم نکل جائے گا اور اس آگ بھی تیزی سے
بجلی دبا کر تالا [illegible] ہے۔ [illegible] اس خیال سے ایک وحشت ہوتی تھی۔ [illegible]
کہ اس کے مرجانے پر [illegible] جب یہ [illegible]
چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی زندگی جانوروں کی طرح جاری ہے۔ اس موقع پر [illegible]
ہمیشہ باہر ملتا تھا [illegible] چنانچہ [illegible] میں مہارت حاصل کر لی لیکن [illegible]
[illegible] اس میں کبھی مہارت حاصل نہ ہوئی۔ ہمیشہ اپنے آپ پر ترس آتا تھا کہ اللہ [illegible] کی بات ہے [illegible]
وغیرہ چنانچہ زندگی احتیاج اور افسردگی کا مجموعہ تھی۔

ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء میں مکان کرایہ پہلے لیا۔ ایک جشن کا موسم گزر لیا لیکن ساتھ ہی جنرل اسمبلی کا زمانہ آگیا۔ ڈیلیگیشن کا قافلہ پاکستان سے نکل پہنچا۔ رات تو شہر میں گزرتی تھی لیکن صبح نو بجے سے شام کے سات آٹھ بجے تک لیک سکسیس میں رہتے تھے جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ دن کو ڈیلیگیشن پورے وقت سے شروع ہوتا تھا کیونکہ ظفر اللہ خاں صاحب جو یہاں سے اور بھی تیس میل دور رہتے تھے باوجود اس فاصلے کے صبح نو بجے سب سے پہلے آن پہنچتے تھے۔ سو شب زندہ دار ٹھہرے کچھ نہ پوچھئے کہ دنیا و عاقبت دونوں میں سرخروئی حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ حال تھا کہ رات بھی زمزم پیے اور صبح دم [illegible] جائے احرام [illegible] اسمبلی ختم ہوئی تو کشمیر کا شعلہ پھر بھڑکنے لگا۔ اسمبلی کے ڈیلیگیٹ اسمبلی ختم ہونے کے بعد اور مورخوں اور [illegible] کے بعد پاکستان روانہ ہوئے۔ تو محمد علی اور ان کا قافلہ آ پہنچا۔ وہ گئے تو ڈاکٹر گراہم کا تعفیہ [illegible] خدا خدا کر کے پچھلے ہفتہ گراہم یہاں سے روانہ ہوئے تو پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ بھی کب تک۔ رات دن چکر میں ہیں ساتوں آسمان۔

رفتہ رفتہ زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو دفتر کو (اپنے معیار کے مطابق) مردہ پایا۔ اس سے متقدمین کی گستاخی یا مذمت مقصود نہیں۔ ہر طبیعت کا تقاضا الگ ہوتا ہے۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ بے حسی سے کام آگے نہیں چلتا۔ [illegible] تو کہتا ہوں کہ حرارت غریزی سے محروم ہوں۔ اور جمود طاری ہو رہا ہے۔ یہاں حالت یہ تھی کہ [illegible] کا فیصلہ کراچی پہنچا دیا۔ کراچی کے کہنے پر ووٹ دے دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ مشن محض ایک ڈاکخانہ بن کر رہ گیا ہے۔ کار ما رخاص "بجز ہر کار سے کچھ نہ تھا" کام پھیلایا۔ تو خود اس کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑا۔ اپنی وقت پسندی کی شکایت کس سے کروں۔ یہاں کا کام وقت بہت زیادہ مانگتا ہے۔ ساٹھ ملکوں کے ساٹھ وفد ہیں ہر ایک کا ووٹ کسی نہ کسی موقع پر اہم بن جاتا ہے۔ سفارتی گفت و شنید بہت [illegible] ہوتی ہے ساٹھ وفدوں میں سے ہر ایک کو سلام کیجئے۔ مناسب [illegible] کے بعد خیریت دریافت کیجئے۔ بیوی بچوں کا حال پوچھئے کھانے کی دعوت دیجئے۔ موسم کا ذکر با تفصیل کیجئے۔ حرف مطلب زبان پر لیں نہ لائیے کہ بار نہ ہو پھر ہفتوں جواب کا انتظار کیجئے۔ اس دوران میں مسکراتے رہئے۔ اور نگاہ رکھئے کہ پیچھے چل رہے ہیں یا کہیں رک گئے۔ رک گئے ہوں تو روغن تازہ آتش سیال یا قطرہ تیزاب جیسا حکیم بتائے کام میں لائیے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں حاضری دیجئے۔ یہ کاک ٹیل پارٹیاں بھی خدا جانے کس موذی نے ایجاد کی تھیں۔ جب حکومتیں شخصی ہوا کرتی تھیں۔ تو کئی باتیں دسترخوان پر پوری ہو جاتی تھیں۔ بادشاہ ایسی دعوت دے کہ بادشاہ کا دل پسیج جائے تو یہ ہوتی سیاست۔ لیکن یہاں تو کوئی بغیر اپنی حکومت کے اشارے کے انگلی تک نہیں ہلاتا۔ پھر بھی کم بخت مہمانوں پر وقت اور روپیہ ضائع کرنے پڑتے ہیں۔ شراب کا میں کبھی عادی نہ تھا لیکن [illegible] بہلانے کے لئے ایک گلاس [illegible] ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ دس بارہ منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی آپ سے مخاطب ہوگا، اور آپ جواب دیتے دیتے اور دامن بچاتے بچاتے [illegible] اتنی

زیادہ ہوتی ہے کہ کوسے سے کوسے چھپتا ہے (دوپہر کا کھانا عموماً [illegible] ہوتا ہے) [illegible] شام کا کھانا اس سے پہلے
کھا سکتے ہیں نہ بعد میں۔ لیکن جو لوگ سفر یا دورے پر جائیں۔ ان کی قسمت میں یہی ہوتا ہے کہ ہفتے میں [illegible] مرتبہ [illegible] میں [illegible]
سفر کرتا رہتا ہوں۔ جیسے کوئی کسی ریستوران کا منتظم ہو [illegible] طبیعت بھی ہوگی لیکن اس سے [illegible] کبھی ہیں جس دن کوئی [illegible] نہ ہو میری تمام حالت ہو جاتی
ہے۔ دو چھوٹے مسکرا کے [illegible] رہ جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے مجھے مکان یہاں مل گیا ہے۔ [illegible] مکان [illegible] ہے لیکن [illegible] کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا
ہے۔ اور چونکہ رتبہ [illegible] تنخواہ کم [illegible]۔ [illegible] تنخواہ کے مطابق مکان لیجیے تو پاکستان کی توہین ہوتی ہے اور رتبے کے مطابق [illegible] تو جیب اس کی
نہیں دیتی۔ ہفتوں اسی کشمکش میں گذر گئے۔ آخر ایک مکان مل گیا۔ جس میں [illegible] پاکستان کے [illegible]
[illegible] سو روپے [illegible] ہے۔ اس کی [illegible] اور [illegible] [illegible] آئے جانے جہازوں
کے [illegible] سے تنہائی کا احساس کم ہوتا ہے۔ ایک ہزار کے قریب کتابیں [illegible] چند تصویریں، ایک اونٹ کی [illegible]
اور تین پاکستانی پھلکاریاں [illegible] یہ سب ساتھ لایا تھا [illegible] دل میں لہو کی ایک بوند ٹپکاتی رہتی ہے۔

میرے شغل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو سیاسی یعنی شطرنج، ملاقاتیں [illegible] دعوتیں اور بحثیں اور گفت و شنید ہیں۔ اور کراچی کے
ساتھ تلغرافات [illegible] احکام [illegible] دوسرے پبلسٹی یعنی مسلسل تقریریں [illegible] کشمیر [illegible] پاکستان کے عام حالات پر چند اور دیگر جنرل
معاملات پر۔ میری مانگ بہ نسبت [illegible] کے کالجوں، اسکولوں، یونیورسٹیوں، گرجاؤں میں زیادہ ہے [illegible] اب تک کوئی سو
دو سو لیکچر دے چکا ہوں اور اس سلسلے میں [illegible] سفر میں رہتا ہوں۔ دنیا میں ہمارا دشمن بجز ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا نام چونکہ گاندھی
اور [illegible] اور [illegible] سب اسی کے حصے میں [illegible] ہیں۔ پاکستان سے لوگ [illegible] ہیں کہ اتنا پبلسٹی کے لئے کھربوں روپیہ
چاہئے۔ اس لئے [illegible] ہیں۔ اس سے [illegible] اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے بے حد مرعوب ملتے ہیں۔
تاہم معقول بات کیجئے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک گرجے میں لوگ پاکستان کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لیکچر کے بعد سب نے زانوؤں کے
بل کھڑے ہو کر پاکستان کی بہبود کے لئے دعا مانگی اور ایک مذہبی HYMN میں پادری صاحب کے تصنیف کردہ دو بند پاکستان کے متعلق شامل کر لئے۔
کالجوں اور سکولوں کے بیشتر طالب علم میرے گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اور پاکستان کے ٹکٹ اور تصویریں اور پمفلٹ مجھ سے لے جاتے ہیں۔ ان دو
شغلوں سے فراغت ملے تو ادبی ذوق کی آبیاری کرتا ہوں۔ یہاں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں، عالم کم دیکھنے میں آتے ہیں مقررین اس قدر مختلف
ہیں کہ گھنٹوں سر کھپانے کے بعد بھی ہم خیالی کم نصیب ہوتی ہے۔ بچاروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امریکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے تو سب لوگ اپنے
حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ [illegible] دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ بجز حسن مذاق کے۔ چنانچہ حسن کو لپ اسٹک اور ہوائی جہاز میں ڈھونڈتے رہتے
ہیں۔ روپیہ اور سامان کی بہتات ہے جتنا کھا سکتے ہیں اس سے دگنا پھینک دیتے ہیں۔ دکانیں [illegible] سامان سے بھری رہتی ہیں اشتہاروں کی وہ
بھرمار ہے کہ سورج چاند نظر نہیں آتے۔ ایک اخبار کے ایک سنڈے ایڈیشن میں اتنا کاغذ لگتا ہے کہ پاکستان کے سب اخبار دس سال تک اس پر چھپ
سکتے ہیں۔ تاہم خوش نہیں رہتے۔ کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے۔ اور ایک بے قراری سی ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہے۔ جب موقع ملے ایک آدھ دن ہارورڈ
یونیورسٹی میں جا گزارتا ہوں۔ وہاں رچرڈز صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ ان کی مروت کی وجہ سے وقت وہاں اچھا کٹ
جاتا ہے۔ انہی کی بدولت میرے وہاں چند لیکچر بھی انگریزی اور امریکی اساتذہ کے متعلق ہوئے۔ نیویارک میں دوست مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ذہنی

ہم سادگی دونوں فلسفے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا حلقہ جس کے ہم عادی ہیں وہ یہاں میسر نہیں بجز اس کے کہ ایک "پدل" کا انتظام ہے لیکن یہ
سفید پوشیاں مع سیاحت والوں کے لئے وقف کر رکھی ہیں ان سے علیحدہ رہ کر نے کے بعد جیب میں تنہا پاس نہیں ہوتا کہ ان چار پانچ کے
دو تین مضمون اور ایک آدھ تقریر کے جواب میں دعوت سے ملاقات ہے ان کی بدولت کچھ کہ شام رنگین ہو جاتی ہے کہ آپ جانتے ہیں سنی
کے رشتے جو حساب میں قائم ہو جائیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تشنہ رہتا ہوں۔ اب کچھ معقول کتابیں بھی منگوائی ہیں۔ تیس برس
جینے مردوں کی صحبت سے محروم رہا یہاں کے مدرسے زبان بانجھ ہو گئی تھی

صحت کے متعلق پریشانی رہتی ہے ڈاکٹروں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ جو حکومت پاکستان کا جیالا ہے کہ علاج معالجے کے اخراجات
برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیسیں ایسی ہیں کہ خود ادا کرنی پڑتیں تو حالت ہی خراب ہوتا۔ زیادہ نہیں لیکن تاہم احتیاط ضرور کرنی پڑتی ہے۔ جو
کچھ سرطان کے عود کا شبہ ہوا۔ پھر جگر میں خرابی پیدا ہوئی جیسا کچھ ہر نہج ایک ۔ ایک ٹیسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آ گیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر زبیدہ
سے ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا۔ وہ بے چاری ناحق پریشان ہوگی)

احباب سے کٹ کر بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ اسماعیل کی شادی پر ان کو تہنیت کا ایک تار دیا جواب نہ آیا۔ حسرت صاحب
شمیم عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا دو جمع ہی ہیں عبدالمجید کے علاوہ رشید صاحب اس کی تصویریں کہ یہاں سے کچھ تحائف بھیجیے۔ اسے بھی ایک دو خط
لکھے لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں ان سے داستانیں سنتا رہتا ہوں لیکن وہ اپنی دنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دنیا کی بات کوئی
نہیں کرتا۔ پانچ ایک برس سے نہیں سنا۔ بار بار وہی شعر گاتا رہتا ہوں جو صدر رنگین میں ذرد میں گرم ہوئے تھے۔ اور جو نیم ساتھ لایا تھا کبھی کبھی اس پر
قوالی گاتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی۔ آفتاب۔ عبدالقیوم۔ زیڈ اے خان۔ عبدالقادر (فنانس) غلام محمد وغیرہم یہاں آتے جاتے رہتے ہیں ان
سے چند مجلسیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن علاوہ ان کی اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

بڑھاپا بھی آ رہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا لیکن آثار رفتہ رفتہ کچھ دکھائی دے رہے ہیں۔ وزیر اعظم کے ساتھ جو دورہ یکم کا
شروع کیا تھا اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی کسی دن دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے اعصاب پر بھی بہت اثر پڑا۔ اس کے بعد
آج تک تعطیل نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر نومبر میں تین مہینے کے لئے پیرس جانا ہوگا کیونکہ جنرل اسمبلی اس سال وہاں ہوگی۔ ممکن ہے کرسمس کے لگ بھگ
دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں لیکن دیکھئے حالات کیا کروٹ لیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وجہ سے انقلاب آ گیا ہوگا۔ خدا کرے آپ کی ہمت میں فرق نہ آئے اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھئے گا
انشاء اللہ میں اب خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھئے۔ کوئی سو مل جائیں تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے
کہئے فارن آفس کی معرفت ڈپلومیٹک بیگ میں بھجوا دے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی تو احساس ہوا کہ رونا رو دیا ہے۔ اور پژمردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ سمجھئے۔ پہلا خط ہے۔
اس لئے دکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

(نوٹ) یہ خط نقوش مکاتیب نمبر میں اور خط نمبر ۲۱،۲ اور ۲۸ نقوش کے سالنامہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنام مولانا غلام رسول مہر

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں:۔

۱۔ یہ اس زمانے میں جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو سے مستعار لی گئی تھیں، حکومت پنجاب کے مدبران نے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا تو یہ اعتراض اٹھا کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں وہ پہلی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں تو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں جس طرح اصل محکمے میں رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے جو اصل محکمہ میں برسر کار نہ ہو۔

۲۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قائم کر رکھی تھی۔ میاں عبدالحئی مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ میں نے میاں صاحب اور سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا کہ اوّل جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جائے لازماً وہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہوگا اور مستحق ہے کہ ان خوبیوں کی قدر دانی کی جائے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ان کے معاملے کو مستثنیٰ سمجھا جائے۔ دونوں نے میری یہ استدعا منظور کر لی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳۔ مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملنے کا موقع میسر آیا وہ اعتراف کریں گے کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے انسان تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہو گا کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایت جنوبی دستی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے پیش کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے اور چودھری چھوٹو رام کو اصرار تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹری سے ہٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ چودھری چھوٹو رام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کر کے انہیں راضی کیا گیا کہ مسٹر من موہن لیاقت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن، بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے ان سب نے اس دور ابتلا میں موصوف کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملہ پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلا یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴۔ دھرم پور میں ملاقات نہ ہو سکنے کا معاملہ یہ ہے کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات و وزیر اعظم سے ملنے کے لیے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا جو دھرم پور (کوہستان شملہ) سے قریب ہے۔ فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا کہ بخاری صاحب موٹر میں واپس ہوں گے۔ تو میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہو گئی اور کسی قدر

معلوم ہوا کہ میں دھرم پور اسٹیشن پر بیٹھا رہا جب کار موٹر آتی تو آدمی بھیج کر دریافت کر لیتا۔ بخاری صاحب اسٹیشن سے گذر کر اس سڑک پر منتظر رہے جو کسولی اور سناور کی طرف جاتی ہے میں مایوس ہو کر سناور چلا گیا۔ وہ مایوس ہو کر کالکا پہنچے اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے تو معلوم ہوا میں وہاں تھا۔ اس سے فون پر گفتگو ہوئی ہم کئی سال پیچھے رہ گئے ان کا علم ہوا تو وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر واپس پہنچ گئے تھے۔

۲۔ بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ "اول اس کی رسید بھیج دی جائے دوسرے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔"

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا کہ خط کسی کے ہاتھ پڑ جائے کہ اس کی اشاعت سراسر خلاف مصلحت تھی۔ میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا ہے۔ اس کی اشاعت کسی بھی مصلحت کے خلاف نہیں۔ اور یہ اس عزیز دوست کی نگارشات کا ایک مرقع ہے جس کی ہر تحریر کو اس وقت ایک بیش قیمت تحفے کی حیثیت حاصل ہے۔

---

(۱)

۲ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

بروز اتوار

مشفق محترم! نہ معلوم کیا بات ہوئی دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دیے۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹا انتظار کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون کیا اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا لیکن آپ سناور میں تشریف فرما نہ تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور وہاں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھے یہ خیال کر کے کہ آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہوگی جس کے لئے میں بہت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میری ہی بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے لیکن مجھے نظر نہ آئے۔

بہرحال قصے کی داستان سن لیجیے۔ ڈائریکٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا دونوں نے حامی بھر لی کہ تمہیں سلیکشن گریڈ دے دیا جائے گا۔ اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں یا نہ آؤں یا آؤں تو کب آؤں بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میاں صاحب کو گوناگوں دقتیں پیش آئیں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے جب انہوں نے مجھے بغیر واپس جانے کے سلیکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا تو اسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ میاں صاحب کا رویہ از حد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ؟ بظاہر تو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے فائدہ نہ ہو لیکن نہ جانے سے اغلباً نقصان ہوگا۔ اس لئے مجھ پر اتنا کرم کیجئے کہ ایک دن کے لئے شملہ چلے جائیے میاں

صاحب سے مل کر پوچھئے کہ سلکشن گریڈ کے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا اور میرے پنجاب واپس آنے کا تذکرہ نہایت سرسری۔ وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو کیجئے۔ ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے مس موہن صاحب سے ضرور مل لیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شاید میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شریر لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مس موہن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈائرکٹر صاحب ان کے کام سے خوش ہیں میاں صاحب بھی ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ مس موہن صاحب پر کلنک کا ٹیکا لگایا جائے؟ لیکن اہل غرض کا دباؤ دور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شملے سے روانہ ہوا حالات تشویش ناک تھے آپ سے ملاقات ہو جاتی تو مشترہ وقت میں اسی بات پر صرف کرتا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی، بعض افسروں کا وجود تو ضروری ہے اگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے عہدہ داروں کی حمایت نہ کی جائے جو لائق، فہیم اور ایماندار ہیں اور خدا گواہ ہے کہ مس موہن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا کیریکٹر خفیف سے خفیف شبہے سے بھی پاک ہے اور ان کی دیانت اور صائب رائے مسلم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں جو ان کی جگہ مقرر کیا جا سکے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ وہ اس قدر دلگیر ہیں کہ استعفیٰ تک دینے پر آمادہ ہیں۔ زبانی ان سے مل لیجئے اور اس کام کو میرے کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی مدد کیجئے۔ میں آپ کی عنایتوں کا نہایت ممنون ہوں آپ نے میرے لئے بہت زحمت برداشت کی اور آپ کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔ آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجئے۔ دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

۱۰ پرتھوی راج روڈ، نیو دہلی

۵ جون

محترم دوست۔ سلام مسنون۔ میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اب گرامی نامہ ملنے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں یقین مانیئے میں از حد شرمندہ ہوں کہ آپ کو اس قدر زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پورہ میں آپ کو تلاش کیا ستار روڈ کی سڑک اور بڑی سڑک کے سنگم اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالج پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرنسپل ٹیلی فون کیا اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا، ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں لے کر گیا۔ للہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں از حد نادم ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر رنج پہنچایا اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لئے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی اور ہر پیش قدمی کی لیکن میری بدقسمتی اور انتہائی بدقسمتی کہ بجائے اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کر سکتا۔ الٹا آپ کو پریشان کیا۔

میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے درخور اعتنا سمجھئے۔ بہرحال اگر آپ جو گستاخی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت

بھول گیا۔

دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ میں انصرام اور معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا قصور میری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کرسکتا سوائے اپنے عجز کا اظہار کے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خط ہمیشہ ملتان کے پتہ پر لکھا کیجیے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

۲ پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ پے در پے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ ۵ جون ملا۔ اس میں ایک فقرہ ایسا ہے کہ

"بہرحال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار ہوگا۔"

بمقتضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں۔ واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لیے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

(۱) گریڈ اور واپسی بیک وقت دونوں سامنے آجانے سے صاحبِ موصوف کو پریشانی ہوگی اور ایک کے پیچھے دوسرا بھی معرضِ خطر میں پڑ جائے گا

(۲) اگر میں واپس نہ آؤں اور یہیں گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہوگا چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحبِ موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہوگی۔

(۳) بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۴) واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جا سکتا ہے بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے جب چاہوں واپس آسکتا ہوں کوئی مجھے روک نہیں سکتا اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقع آئے گا تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جا سکتا ہے کہ کس عہدے پر واپس آؤں۔

(۵) گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع میں ختم ہو جانا چاہیے اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا تو جو مصالح آپ کے پیشِ نظر ہیں ان کو گزند پہنچے گا۔

(۶) فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحبِ موصوف کو یقیناً بعض دقتیں پیش آئیں گی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے اور ان کی قوتِ فیصلہ مذبذب ہو جائے گی کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہوگی۔

ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو پختہ اور بہت پختہ کر لینا چاہیے اصل چیز یہی ہے واپسی کا مسئلہ ایسا ہے ـــــ کہ اسے ہر وقت اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی زور سے اٹھایا جا سکتا ہے جتنا کہ آج۔ البتہ آج اٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی اور ممکن ہے غلط بحث کی رو میں اصل مقصد ہی بہہ جائے

چنانچہ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اپنی جانب سے [illegible] واپسی کے لئے [illegible] لکھ دیجئے [illegible]
[illegible] میں مفصل بحث ہوگی یا ایسی کوئی بات کہہ دیجئے تاکہ [illegible] ۱۹۴۷ [illegible]
جلسوں سے ہو جائے۔

جن مصالح کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ درست ہیں [illegible] کی حیثیت سے کام نہ کر سکیں گے
[illegible] ممکن ہیں میں نے ان پہلوؤں سے [illegible] مشورہ دیا تھا [illegible] رہا ہوں۔

[illegible] صاحب موصوف سے آپ ذکر نہ کیجئے [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

زود رنجی [illegible] نہ تم
[illegible] چشم عاشقاں را

بندۂ خاکسار
بخاری

---

(۴)

۱۰ اشوکا روڈ، نئی دہلی

۱۳ نومبر

برادرم محترم، سلام مسنون و تہنیت عید

گرامی نامہ جس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ میں فیصلہ کا اعادہ اور تغیر معمولی بات نہیں۔ جب خدمات مستعار دی جائیں تو عموماً یہی ہوتا ہے لیکن سوچتا ہوں کہ یہ ہو گیا تو بہر حال مستقبل کیا ہے سب کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ واپسی پر کالج میں تقرر ہونا چاہئے اور پرنسپل کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہئے۔ لیکن جو پوزیشن اب آپ نے بیان کی ہے اس سے تو مستقبل کے سب دروازے اغلباً بند ہو جائیں گے۔ نہ معلوم آپ نے اس پہلو پر غور کیا یا نہیں۔ اس لئے قدرے تامل ہے لیکن تامل کرتے ہوئے بھی متامل ہوتا ہوں کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ "تامل ارباب نظر کے لئے تکلف کا باعث ہوگا" اس فقرے نے کچھ خائف کر دیا اس کی تفصیل اگر

(۱) آپ کر سکیں تو سوچنے میں آسانی ہوگی اس لئے آپ کے مزید خط کا منتظر ہوں۔

(۲) کیا یہ صورت تو نہیں کہ واپسی پر میرا کہیں کھپانا مشکل نظر آرہا ہے (بجز اس کے کہ اوروں کو معزول کیا جائے) اس لئے یہ تجویز پیش ہو رہی ہے؟

(۱) ملازمت میں ابھی تک سیلیکشن گریڈ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کا انتظار ہے۔ ملاقات اپریل کی مدت تک پہنچ جاتی ہے اس لیے پہلے ہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(۲) ان مہینوں میں اگر آپ دہلی یا شملہ میں ہیں تو ... آپ کے پاس آ ہی سکوں اور فرصت ہو تو خود ہی آ جاؤں گا۔ اگر ہفتہ اتوار سے پہلے آنا مشکل ہو گا
میں نے پتہ حسب معمول پیشانی پر لکھ دیا ہے اسی پتہ سے خط بھیجئے تاکہ ... میں تاخیر نہ ہو۔ سلام شوق۔

خاکسار

بخاری

۵

... پر جیتے ہو ... [۱]
(۱) سالک صاحب مزاح کے دیکھا میری یہ تمنا کہ آپ کا گھر رستے میں حائل تھا۔[۲]

بخاری

(۲) آپ ہمارا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں۔[۳] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم دوستی کی وجہ سے ہیں۔ لہٰذا میں بھی خط لکھنے لگا ہوں لہٰذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسال خدمت ہے۔[۴]

۱؎ مراد یہ ہے کہ سالک اکیلے تھے۔ مہر ساتھ نہ تھا دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

۲؎ بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور نیلا گنبد روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رمضان بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں تھا۔ سالک صاحب میکلوڈ روڈ پر مقیم تھے۔ بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھا کہ سالک صاحب آ رہے ہیں لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

۳؎ جو کچھ لکھنا ہوتا تھا پنسل سے مضمون لکھنے کی سلپوں پر لکھ دیتا تھا۔ بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائج ضروریہ کے سلسلے میں استعمال

۴؎ یہ تاکہ جواب اس پر لکھوں

عاشق ...

بنام عبدالرحمٰن چغتائی

۱

مکرم بندہ جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

[illegible] (اور بعد [illegible]) [illegible] شکر [illegible] ضرورت [illegible]

سے درخواست کروں۔ کیا آپ انھیں [illegible] کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

ناشر

نقوش

اور اگر ممکن ہو تو "مرقع چغتائی" کی کاپی بھی جلد بھجوا دیجئے [illegible]

۲

۱۰ تغلق روڈ، نئی دلی

۱۱ر اکتوبر

شفیق و مکرم جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون۔ افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ معلوم ہوا آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے۔

واپسی پر ایک خط لاہور بھیجا ارسال خدمت ہے۔ خط کے دو حصے ہیں ایک آپ کے نام، ایک میرے نام۔ ملاحظہ کیجئے گا رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ان کے پڑھنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ خط کے لکھنے والے یعنی EVELY WOOD صاحب آج کل والٹر تھامسن کمپنی میں ملازم ہیں جو ADVERTISING کمپنی ہے اور آرٹ کے نقطہ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دل کش بنانے کے درپے رہتی ہے۔ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف، جیسا کہ معلوم ہوتے ہیں آج کل [illegible] میں ہیں لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں رہے۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ علاوہ بریں بمبئی کے اہل فن میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اکثر تصویروں کی نمائشوں میں کھنڈالا والا، مسز واڈیا اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہ راست ان کو بھیجیں خواہ میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

(۳)

۴ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۶ اکتوبر

سلام مسنون۔ گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط نے پرسی سے ڈی صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ (?) براہ راست آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہوئی تو ہر چند خواہ وہ ریزہ تو ہی نہ کرے گا۔ ایچنگ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقش کہ جس کے سب شیڈ اب تک میرے مکان بلکہ میری زندگی کی زینت ہیں اور میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ کتاب کا اعادہ (?) یا موں ظلم (?) کا معاملہ میں نے نہایت پڑھا اور وقت طلب ہے۔ ملاقات ہوتی تو تفصیلاً عرض کرتا۔

خاکسار

بخاری

---

(۴)

۴۹ جیل روڈ

۱۰ اگست (۱۹۳۸ء)

مشفق من جناب چغتائی صاحب سلام مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے ان کے خط کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

" آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی بے حد ممنون ہوں کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق میرا علم بہت محدود ہے اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اسے آپ کی بہت عزت سمجھتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ ان کے کمال کی کما حقہٗ داد تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ مجھے کتنے دن کی مہلت دی جائے گی علاوہ بریں مجھے " مرقع " کی ایک جلد بھجوا دیجئے کیونکہ میرا نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔ "

آپ ان کو مرقع کی نئی ایڈیشن (یعنی جس شکل میں اب آپ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھجوا دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب وہ مجلد میرے پاس لائے تھے جس میں سولہ صفحے دیباچہ کے لئے خالی چھٹے ہوئے تھے وہ بیگم سراج الدین صاحب کو بھجوا دیجئے۔ اس کے علاوہ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے یعنی کزنز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقالے بھی انہیں بھیج دیجئے تاکہ وہ ان کے پیش نظر رہیں کہ پہلے کیا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کے مرقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا ہو اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزوں سے ان

[illegible]

[illegible] آپ [illegible] نہ معلوم [illegible] شکر ہے

افسوس [illegible] آپ [illegible] چغتائی

کے شائع ہونے پر [illegible] ایک اشاعت

آپ کے خلاف [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] صاحب

[illegible] صاحب [illegible]

نیاز مندانہ [illegible]

آپ [illegible] چغتائی کی عادت

چغتائی صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

---

(۵)

پاکستان ہاؤس

۸ ایسٹ ۶۵ سٹریٹ۔ نیویارک (یو ایس اے)

۲۵ اپریل ۱۹۵۲ء

شفیق جناب چغتائی صاحب سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ بھائی آپ کو ایسے [illegible] پہنچنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ یہ سمجھئے گویا آپ خود یہاں ہیں جو خدمت میرے لائق ہو بلا تامل فرما دیا کیجئے۔ مسودہ ضرور بھیجئے۔ کم از کم دیکھ تو لوں۔ اس ملک میں کسی بھی مسودے کو خواہ وہ کتاب کا ہو یا فلم کا یا ریڈیو کا یا ٹیلی ویژن کا۔ منزلِ مقصود تک پہنچانا شاذ و نادر ہی براہِ راست مصنف یا ادیب کے انتظامات سے ممکن نہیں ہوتا [illegible] MIDDLE MEN شامل کرنے پڑتے ہیں جہاں کروڑوں کا ہیر پھیر ہو اور ہر دنگل میں لاکھوں چھوٹے بڑے پہلوان [illegible] رہے ہوں وہاں علم و فن، علم و فن نہیں محض بزنس بن جاتا ہے اور بزنس ہی کے طریقوں پر چلتا ہے تاہم آپ کی تجویز سے دماغ کو گدگدی ہوئی۔ فلم کا مرکز نیویارک نہیں، کیلیفورنیا [illegible] ہے لیکن آپ مسودہ تو بھیجئے آنکھیں تو اس سے روشن ہوں اس کے بعد کاری گروں سے مشورہ کروں گا اور نشیب و فراز سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

لاہور کا قیام از حد مختصر تھا جہاں برسوں تک شباب رنگین کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو۔ وہاں دل کی کلی [illegible] میں کیا

مجھے بھی قسمت پر ناز ہوں کہ صاحب کی صحبت میں مسرت بخش لمحے کی چند گھڑیاں گزار رہی ہوں۔ آپ سے سالہا سال جس کا سودا ... آپ کی محبت ... خلوص و درس سے زندگی بہرہ ور ہوتی رہیں۔ علاوہ ازیں آپ سے ملی اور آپ کی محبت حاصل کی ... دوبارہ فیض یاب ہوا ... تاج صاحب سے دو ملک کے پہلوؤں کا تبادلہ ... کے بعد جواب میں ... تو سلسلہ قدرے رک گیا ... میں تو انہیں میرا سلام کہئے گا ... ہاشمی صاحب کو بھی بہت بہت محبت بھرا سلام ... بھی ... نہیں تھی انہیں بھی میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور کس کس کا نام لوں۔ بس سب گھر والوں اور ... دوستوں کا بہت بہت ... کہاں تک ایک ایک کا نام لوں ... سے کہئے ... سلام کہتے ہے۔

جو بیماری ... پریشانی پر ... ہے اسے لیے ... کر لیجئے تاکہ میں آئندہ ... آپ کو تشویش نہ ہو۔

بندہ خاکسار

بخاری

---

(۶)

نیویارک

۱۴ جنوری ۱۹۵۵ء

بھائی! آپ کی شکایت بجا ہے ... میں نے مسودہ کی رسید آپ کو فوراً نہ بھیجی۔ آپ کو یقیناً تشویش رہی ہوگی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آخر اگست میں سخت بیمار ہو گیا۔ دو ہفتہ مسلسل بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رہا۔ ... ہفتے ہسپتال میں اور اس کے بعد دو مہینے گھر پر صاحبِ فراش رہا۔ نقاہت کے عالم میں بھی کام سے قطعی نہ ہوئی لیکن مصروفیت کو ضروریات تک محدود رکھا۔ اس عرصے میں آپ کا مسودہ پہنچا۔ معلوم نہیں کہ کب نصیب ہو۔ کوشش کر رہا ہوں کہ ہو سکے تو دو تین مارچ میں بھی پاکستان کا ایک چکر لگاؤں۔ اس شدید بیماری کے بعد اہل و عیال تو ہیں اور میں ان سے ملنے کو بے قرار ہوں۔ موت زیست کا کسی کو علم نہیں۔ اگر آنا نصیب میں ہوا تو سب باتیں ہوں گی۔

آپ کے فسانے میں کئی جدتیں ہیں جنہیں پڑھ کر بہت لطف آیا اور ذہن کو گدگدی ہوئی لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں یہ جدتیں ہی رکاوٹ نہ بن جائیں۔ میں نے ایک دو فلم باز دوستوں سے ذکر کیا اور اس کے چند حصے بھی ان کو سنائے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی EXPERIMENTAL GROUP اسے فلمائے تو بہتر ہو۔ ورنہ تاجرانہ کمپنیوں کے بس کا تو یہ روگ معلوم نہیں ہوتا۔ آج کل فلم کمپنیاں عجب مشکل میں ہیں۔ آمدنی سرعت سے کم ہو رہی ہے۔ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اکثر ایکٹر فلموں کو چھوڑ کر ریڈیو اور ٹیلی وژن میں ملازم ہو رہے ہیں۔ مزید سعی کروں گا اور آپ کو اس سے آگاہ رکھوں گا۔ اس دوران میں کیا یہ بہتر نہ ہو کہ آپ سیناریو کو بعینہٖ اسی طرح کسی اردو ادبی رسالے میں چھپوا دیں؟ میں نے اکثر سیناریو انگریزی رسالوں میں چھپتے دیکھے ہیں اور لوگ انہیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے یہ ایک نئی چیز ہوگی۔ اور اس کا سہرا آپ کے سر رہے گا۔ علاوہ بریں کاپی رائٹ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ کہئے کیا خیال ہے؟

خاکسار

پ۔ ب

(ب)

۲۰ جون ۱۹۵۳ء

[illegible]

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام

(۱)

نیویارک

عزیزی صوفی، سلام مسنون۔ ابھی ابھی الیس کا خط ملا جس سے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کا علم ہوا۔ یہیں معروفیت کا زمانہ ہے لیکن

کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۲۵ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ ایک بحث اساوہ کیا کہ آپ کا رونا کسی زمانے میں جو مستعدی اور جذبہ دلی کی علامت تھا وہ اب رسے سلسلے میں اتنے ناپید ہیں کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے اور تہ وبالی اور اہتمام محبت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگا ہے۔ اس لئے اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ جو صدمہ آپ کو پہنچا ہے اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی بیٹی نظری، آپ کی بنیا فیض آپ کی بھیبیں انہیں کی ضیں تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرے گی۔ یقیناً آپ کو بار بار ایک ایسا خلا محسوس ہوتا ہوگا۔ جس کو آپ کسی طرح پر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرا بھی کم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کر دے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں زندوں کا خیال نہیں کرتے۔

سینہ جو بڑا میں نے مستعدی سے ایک نادر طور میں امتیں کو ایک طویل خط لکھا تھا خیال تھا دوستوں کے دل کو اس سے رشک ہوگی امتیں سے کہا بھی تھا کہ خط احباب میں نشر کر دینا اگر وہ آپ کی نظر سے گذرا ہے تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر بار کرنا خصوصاً اس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں اور دل کا اور طبیعت تنزل پر ہو ایک مہم ہے۔ بہرحال کچھ صحت سہولت کی پیدا ہو گئی ہے۔ صحت کے متعلق تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے یا اپنے معدہ کی پرورش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی گود میں بیٹھ رہنا زندگی نہیں۔

حمید الدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ اب دو مہینے پرانی بات ہے ذرا اسمبلی کا کام ختم ہو لے تو پھر ان سے ان کے دل کا حال سنوں گا۔

آپ کو نظیر کی اتنی ضرورت نہ ہوگی جتنی مجھے ہے سالک کو میرا پیار اور سلام کہیے گا انہیں بھی خط لکھنا ہے ہو سکے تو مجھے کوائف سے آگاہ کیجیے۔ عابد، ہاشمی، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں؟

خاکسار بخاری

(یہ خط سالنامہ نقوش ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے)

۲

صوفی میرے بھائی! الیس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو کہ مجھے یہاں اس سال کے دوران، ایک یونیورسٹی میں اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ اور ارتقا پر چند لیکچر دینے ہیں چاہتا ہوں اس کے لئے مکمل تیاری کر لوں آپ کی خدمت میں بوسیلہ الیس یہ درخواست کی تھی کہ فی الحال ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجیے جنہیں پڑھ لینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید کی کتابیں (اردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ بھی فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھیے۔ جب یہ فہرست میرے پاس پہنچ جائے گی تو دیکھوں گا کہ اس میں سے کون کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگواؤں گا۔ فی الحال صرف فہرست کتب مطلوب ہے جو آپ کو

بہتر کوئی ترتیب نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ اس مضمون کے ماہر بھی ہیں اور لکھنے کے لیے ذرائع بھی رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے قلم پر غالب آئیں گے۔ آپ کے بزم میں شامل ہیں اس لیے درخواست کیا ہوں۔

لہٰذا ملتجیانہ درخواست ہے کہ اس میں غفلت یا تاخیر نہ کیجیے۔ ممنون ہوں گا۔ ہمیشہ چند تحقیقی پیام ایک ایک خط میں جو ہم نے میں نہیں آئے۔ الحمدللہ کہ یہ ان نصیب ہوئے اور دوستوں کو اپنے بخشتے دیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

مدت کے بعد معلوم ہوا کہ [illegible] نام تھا اس [illegible] اور [illegible] مضمون سے مجھے اپنے خلوص سے نوازا۔

میرا پتہ یہ کافی ہے، بنام UNITED NATIONS, NEW YORK, U.S.A

خاکسار

بخاری

۱۰ اپریل ۱۹۵۸ء

---

(۳)

برادرِ عزیز! قلم میں وہ اثر کہاں سے لاؤں جو آپ کے دل پر نقش ہو۔ عرصہ دراز سے آپ کے خط سے محروم ہوں۔ معلوم نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

سکسینہ کی تاریخ ادب اردو اور [illegible] کی کسی معنوں کی کتاب کی اشد اور فوری ضرورت ہے جن کے ملنے سب سے زیادہ بھروسا آپ پر تھا۔ لیکن آپ نے وہ چپ سادھی ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں

نیویارک

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

خاکسار

بخاری

بنام سید ہاشم رضا

(۱)

یونائیٹڈ نیشنز۔ لگزمبرگ (پیرس)

شفیقی و مکرمی۔ سلام مسنون! روما سے نیس اور نیس سے پیرس پہنچ گیا۔ یہاں سے لندن جاؤں گا اور وہاں سے ہفتہ عشرہ کے

اندر انشاء اللہ نیویارک۔

وطن کا رخ ہمیشہ مبارک ہوتا ہے خواہ حالات تلخ یا باعث تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ پہلے بھی یہی عالم تھا اب سے مل کر ایسا اطمینان ہو کہ بے وطن کی طرح اسے کراچی ہی برس دو برس اٹھائے پھروں گا اور زندگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بھٹکتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہوگئی اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ بندے نے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا کہ اس سے پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا۔ آپ جس لطف اور محبت سے پیش آئے، اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریے کے لئے۔ والسلام قبول کیجئے۔

ع منت آنکہ خوش کردی وقت ما خوش کردی

مجھے اپنا خادم سمجھئے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا تامل ارشاد کیجئے۔ بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہئے گا۔

بندۂ خاکسار

احمد شاہ بخاری

۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

(۱)

نیویارک

۱۵ ستمبر ۵۱ء

عزیز بہن۔ وہ جیسے مرزا غالب کہتے تھے نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ یا دل پر زنگ آن چھا گئی یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور آ گیا ہے۔ دفتری خط اور تار روز ہزار در ہزار آتے ہیں کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینئر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر رہتا؟ آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں دعا کیجئے۔ گنہگار کی دعا پر آپ کیا تکیہ کرتیں لیکن دوستوں بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا ایک بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شناسا سے سرسری سنا تھا کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے میں نے سن کر حسبِ معمول ہنسی میں اڑا دیا۔ دل کا یہ وہم یاران سرِ پل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنہوں نے خبر سنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا تو بہت تشویش ہوئی اور میں از حد اداس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا لیکن یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و محفوظ رکھے۔ انہیں میرا بہت بہت پیار دیجئے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجئے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بُعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا ان کا شریک ہو سکوں۔

میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا کہ جس زمانے میں ڈاکٹر گراہم کشمیر کی الجھن سلجھانے میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک مہینہ تعطیل

ہو کسی گوشۂ عافیت میں گمنامی سے چھپا رہوں گا۔ اور صحت کچھ روز درست رہی لیکن کام کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے مل نہ سکا۔ اب تو بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔ پہلی تین چار مہینے رہوں گا درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا۔ لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو۔ دل سخت اداس ہے۔

احباب کی یاد بھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ ان تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے مگر اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ ہاں میرے بھیا کبھی ہری کے ساون آیا۔

ہر جلسے، دعوت وغیرہ کے نقشے سے جلسے چلائے ہیں کہ کہنے میں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر بے بدل اور جانے کیا کیا ہے لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پنپے اور سرخرو ہوئے وہ کتاب بھی اب نایاب ہے

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہیں میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ذکر کیا اس کی خبر کچھ ان تک بھی پہنچی ہوگی لیکن ان کی جانب سے ابھی تک کچھ بھی نہ سنا۔ ڈی وی بیگم شاہد حامد صاحبہ (کس قدر باادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو میرا اسلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچنے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا، اور احباب و اقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

(۱)

لندن

۱۶ر اپریل ۶۵۰

پیاری ایلس

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتی ہو، نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے بارے میں کب سے ہوتی ہی ایسی بے تعلقی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں سے بے تکلف کب سے ہو گئے، کب سے .... لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پالی جائے اس کا اثر زیادہ دیر پا ہوتا ہے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مودب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔

تمہاری دلچسپ تحریر سے خط سے بہت مسرت ہوئی۔ رشیدؔ (Rashid) سے جو خطوط ہیں ان میں اکثر تمہارے متعلق باتیں ہوتی ہیں
تمہارے بارے میں بہت سے آتے رہتے ہیں۔ بدقسمتی کی بات ہے میرے مصاحبوں (دا بیٹا) کا خیال رکھتا ہو تو تم بھی اپنی تشویش کی جانب متوجہ تھا اور مجھے امید ہے کہ تم اس کی پڑی
میں بہت وقت نہیں گنوا رہے ہو۔ سرمست اپنی تحریک کے لئے تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں۔ تمہارے گھر کا اکثر احسان مندی سے یاد کرتا ہوں کہ شب ہے
سے بیتی گزار دی ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ تم نے یاد کر لیا میں چاہتا تھا کہ کہیں سے فیضؔ کی نظم کی خبر ملے اور میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کبھی لکھے گا نہیں۔ شاہد صاحب
ہوشیار کہیں، کہیں سے سنا تھا کہ اس نے جیل بھیجی ہے میں جہاں سادہ پانی اور نان جویں ہے اس کی تلاش کرے گا پھر سنا کہ وہ اپنی بات سے پھر گئے
ہیں اور یہ زبانی کی پیش کش والی سلسلہ ہے۔ ٹھیک سے کچھ نہیں سنا کہ کس بات پر رنجیدہ ہنسی آتی ہے۔ اس پر اسے بند کر رہے ہیں یا اس پر کر رہے
کر رہے ہیں۔ دوسری بات پر ہی سمجھو کہ پڑھو تو شاید ساتوں 'میں عام انداز یا وہ پسند کرتا لیکن میں اور تم (کرمس وانز کے نہ سے ہیں) غالباً یہی چاہیں گے
کہ وہ ہمارے پاس ہی رہے اس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے ہم قدم پڑھنے پھریں۔ ویسے وہ تو تمہارے پاس ہے کہ؟ میرا مطلب ہے
پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو وہاں نہیں ہوں۔ امید تو یہی ہے اور یوں نہیں تو پھر؟

یہاں موسم مستقل خوش گوار ہے، کیو (KEW) باغ، میگنولیا، میگنولیا اور چیری کے شگوفوں سے تنگ سی لگ رہی ہے لیکن یہاں
کے لئے تمہارا دل بہت ترستے تھے تو یہ بھی سن لو کہ یہاں زندگی واقعی کٹھن ہے میری کچھ بھی نہیں آتا کہ میں گھر والوں کی آمد کی آٹھ دس پانچ ہفتے سے
نا ذ نہیں وہ بسر کیسے کرتے ہیں کھانے پینے کی چیزیں نایاب ہیں، اور ہم یہ انہیں پکانے میں فرق نہیں کر سکتے ہیں۔ لوگ لاپرواہ ہوگئے ہیں بیرے صاحب کے
سامنے چیزیں یوں لا کے رکھتے ہیں کہ میاں اب جی چاہے تو کھاؤ ورنہ مت کھاؤ۔

آج کل لندن میں لنکا شائر (LANCASHIRE) والوں کا جو ہے، شاہی جوڑے کی شادی کی تقریب منانے کے جلوس (جیسے کیسی
پیاری لگ رہی تھی) گذشتہ ہفتے گروز سنیور میں مسز روزویلٹ اور ان کے خاوند کے مجسمے کا قصہ تھا (بہت اچھا ہے) تو یونہی چلتا ہے لندن شہر ——— آجکل
تھیٹر کے دن نہیں لیکن پھر بھی جون تک شیکسپیئر، برنارڈ شا، گورکی اور شان او کیسی کے کچھ کھیل دیکھے اور کچھ نہایت ہی عمدہ اطالوی، جرمن اور فرانسیسی فلمیں
کچھ کرنٹ میں دیکھیں کچھ اکاڈمی اور سٹوڈیو وغیرہ میں، تمہیں تو معلوم ہے کہاں کہاں۔ اگلے دن میں آڈن (AUDEN) سے ان کی نظمیں سننے گیا تھا۔ روی
میکنیس (MACNEICE) نے اہتمام کیا تھا۔ فیض کو سلام پہنچا ہے۔ کنگسلے مارٹن سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی کل شام ایک تقریب میں ان کا انتظار رہا
لیکن وہ دکھائی نہیں دیئے۔ ہمارا کام ابھی شروع نہیں ہوا، ہندوستانی وفد ابھی نہیں پہنچا تا خیر کی کوئی وجہ تو کسی نے بتائی نہیں یہ باور کرنے کی توقع کی جاتی
ہے کہ کسی پھٹے پرانی ہوگی یا ایسی ہی معصوم اور قسمتی وجہ کوئی اور ہوگی چنانچہ فی الحال متفرق کام کاج کر رہا ہوں۔

چھیکی (اچھا بھئی سلیمہ سہی) اگر یاد آتی ہے اسے میرا پیار پہنچا دینا، میرا مطلب ہے واقعی پہنچا دینا اور تمہارے دونوں بچوں کو بھی
پاشا یا ایک ہی بچہ ہے یاد نہیں رہتا بھئی ——— بہتا ہے کوئی چھوٹی موٹی چیز تمہیں چاہئے تو لیتا آؤں، کچھ ہو تو لکھ دینا

محبت سے

اے ایس بی

(انگریزی سے ترجمہ)

---

۱ ـ [illegible] گورنمنٹ کالج کی دو منزلہ عمارت، جہاں اس زمانے میں بخاری صاحب مقیم تھے۔

۲ ـ بیگم بخاری

۳ ـ بخاری صاحب انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔

منیزہ فیض کے نام

۴، ریورویو ٹیرس نیویارک

۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء

پیاری منیزہ[1]۔ کافی عرصہ ہوا تمہارا ۲۶ راگست کا خط ملا تھا۔ تم بڑی دیر خاموش رہیں، حق تو یہ ہے۔ لیکن ہوئی ہو تو حق بجانب ہو گی بات یہ ہے کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی اس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے خط و کتابت کا سلسلہ رکا رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں جو اقوام متحدہ کے سکرٹریٹ کی عمارت میں دسویں منزل پر واقع ہے۔ یہ عمارت ۳۹ منزلہ ہے ایک مستطیل سا مینار سمجھو۔ دور سے دیکھو تو یوں لگتی ہے جیسے ماچس کی ڈبیہ کو دن پر کھڑا کر دیا ہو۔ مطلع آج اتفاق سے نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکی میں سے اندر آ رہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں جو اوپر سے نظر آتا ہے۔ یہ دریا ہڈسن کی ایک شاخ ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر بحر اوقیانوس میں جا ملتی ہے۔ اسے یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں تو بڑی بڑی کشتیاں اور تیل کے بڑے بڑے جہاز دریا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے۔ دور نیچے کی طرف مجھے ان پلوں میں سے ایک پل نظر آ رہا ہے جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ ان سب میں مشہور بروکلن برج ہے۔ یہ اتنا ہی مشہور ہے جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج واشنگٹن پل ہے جس کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہوگی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ اب اچھی سردی پڑنے لگی ہے۔ نیویارک شہر میں ابھی برف نہیں پڑی۔ کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری فروری میں پڑے گی۔

یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے۔ امریکی لوگ اسے "FALL" یعنی زوال کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔ اس موسم میں درختوں کے پتے پیلے، زرد اور پھر نارنجی کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں کہیں درخت اکٹھے ہوتے ہیں وہ جگہ بس رنگ برنگ کا غالیچہ معلوم ہوتی ہے، جیسے اس نے پیارے پیارے رنگوں میں اپنے آپ کو رنگ کر سوکھنے کے لیے پھیلا دیے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک پر کار چلانے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑتے ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔ اس سال بھی فصل خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا۔ کئی روز تک لگاتار جنگلوں میں گھوما جا سکتا تھا۔ اور سیر کی جا سکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس آ چکی تھیں اور ابا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور چھوٹی کو پیار دینا۔ مجھے یہ بھی بتانا کہ تم نے اب تک تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی جائے تو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا سنڈیکیٹ تو خوب ہی چلتا ہوگا۔

جب بھی جی چاہے مجھے خط لکھنا مگر لکھنا ضرور۔

اور دیکھو سب کو میری جانب سے ایک بار پھر پیار دینا۔ بھولنا مت۔

تمہارا پیارا

اے ایس بخاری

---

[1] یہ خط فیض احمد فیض کی بچی کے نام ہے۔

پہنچتے پہنچتے میں نے اس صاحب کی پیشانی پر برجستہ لکھا ہے ''مہربانی کر کے مجھے نوٹ کر لینا اور آسمان سے ہی تھی۔ اسی سے مجھے لکھ دینا کہ وہ اسے جس یونیورسٹی کا پتہ ہے میں ایک آدھ ماہ میں یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں اور یہاں کی ایک یونیورسٹی میں کام کروں گا اس لئے تمہیں میرے دفتر کے پتہ پر ہی خط لکھنا۔''

(انگریزی سے ترجمہ)

سید امتیاز علی تاج کے نام

①

ڈیئر امتیاز۔ دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا جو بیشتر دلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گزاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں دل میں عجیب امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہاں کے اتنے سال تم سے وابستہ ہو کر گزرے ہیں کہ ہر امنگ کے ساتھ تم آپ ہی آپ دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نہ معلوم اس درمیانی عرصہ میں طبیعتوں کی آب و ہوا بھی بدل گئی ہو۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رشتے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کبھی تن جاتے ہیں لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں۔ اور الحمد للہ کہ تم اور میں دونوں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس امید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل میں نہیں اٹھتا۔ تاش کی محفلیں وہ سہ پہریں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل ہرزہ گوئیاں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی بھی رخصت نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھٹیاں اور دوستوں کی گرم صحبتیں یہ جاری ہے۔ زبیدہ واپس جانے پر جتنی خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام تسلیم اور یاسمین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر سے ملاقات ہوئی خدا ان کی زندگی کو کامران بنائے۔ بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن اب ان کے لئے کئی موقعے نصیب ہوں گے۔ ۔ ہو نومبر کو چند دن کے لئے شاید دورے پر بھی لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے؟

۲۔ نومبر

خاکسار

بخاری

---

②

یکم جون

یادش بخیر۔ ''دل حسینیا'' ۳ جون سنیچر کو دلی سے ہو رہا ہے۔ رفیع پیر اور رشید محمود پارٹ کر رہے ہیں۔ اس لئے عین آخری وقت میں انہوں نے پروڈکشن میرے حوالے کر دی ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔ مصروفیتیں زیادہ۔ اس لئے ادا کاری زیادہ شاید بے سکون ہو گی اس کا افسوس رہے گا۔ تاہم ایک آدھ بات آپ ایسی ضرور پائیں گے کہ دل پژمردہ نہ ہوگا۔ فرصت ہو آ کر سن لیجئے گا اور مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ فرصت نہ ہو یا RECEPTION برا ہو

[illegible] آپ [illegible] ہیں۔ اور اب کسی وقت لاہور [illegible] میں جا رہے ہیں۔ مدت سے [illegible] کے سلسلے میں آپ سے پھر تعلق قائم ہوا [illegible] کی
[illegible] ہے۔ تاہم پرانی یاد تازہ ہوئی اور دل [illegible] سالک صاحب [illegible] آنے کا پروگرام بنائیں اور
مجھے پہلے [illegible] کے نام لکھ دو۔

بخاری

---

(۳)

گورنمنٹ کالج لاہور

۱ جولائی

ڈیئر امتیاز۔ نیویارک میں میں نے چار برس [illegible] خیال تھا کہ اس کے بعد مہینے دو مہینے کے لئے لاہور آؤں گا لیکن مہلت صرف [illegible] اس میں سے بھی پانچ چھ دن [illegible] ضائع ہوئے [illegible] بیمار پڑ گیا۔ بالآخر [illegible] جولائی کو لاہور پہنچا۔ اب پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا [illegible] کو وہاں سے [illegible] نیویارک [illegible] نہ معلوم کب رخصت ہو گی [illegible] سب ایک ہو چکا ہے [illegible] جائے گی۔ وہاں سب مکان کا انتظام ضرور وہاں رہے گا۔ اور سیدہ [illegible] واپس گئی۔ وہ بھی [illegible] واپس گئی۔

احباب سے فرداً فرداً رخصت ہو لیا۔ آپ سے تاج صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ [illegible] یہاں پہنچا [illegible] نکلستان روانہ ہو گئے [illegible] ملنے کا بہت شوق ہے [illegible] نہ معلوم کب ملاقات ہو [illegible] جانے سے پہلے آپ سے [illegible] کیا خیال ہے۔ [illegible] کہ لاہور سے پھر [illegible] کر جاؤں [illegible] دن اور راتیں اس لیے [illegible] گزاری ہیں [illegible] لاہور چھوڑنے کا کچھ قلق [illegible] کے بعد [illegible] تو قیام ہو گا۔ میں سفر سے [illegible] پاسپورٹ، سوٹ کیس کا خیال آتے ہی رخصت ہونے [illegible] ہے لاہور میں [illegible] ہو گا [illegible] آپ [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] دنیائے عشق میں [illegible] کہاں تک [illegible] کتاب زندگی میں [illegible] مضمون کا [illegible] تھا رحمت علی خاں کا [illegible] گزشتہ [illegible] تھا [illegible] مولانا عبدالمجید خاں سالک [illegible] تھا [illegible] صاحب کون ہے [illegible] کیا معنی [illegible] ایک دور تھا جو گزر گیا۔ اس کے [illegible] سالک، سلمان، آپ اور میں حکیم احمد شجاع [illegible] ہو گئے [illegible] ہو گئے۔ یوں بھی مدت سے ان کا دین اور ان کی دنیا ہم سے الگ [illegible] کا زمانہ یاد [illegible] اور پھر [illegible] ان کا شام بھر رات بھر [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ باقی کون رہ گئے؟ آپ کے [illegible] آپ ہوتے تو اس میں [illegible] دخل دیتا [illegible] میرا اپنا پیشہ ہے [illegible] عادت ہو گئی ہے۔ اب معلوم ہوگا خلیفہ عبدالحکیم سے بھی [illegible] معلوم ہوا مری چلے گئے ہیں۔ ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں ان کو میرا اسلام اور پیار کہیے گا۔ بلکہ [illegible] کر کے [illegible] لیجئے گا۔ ([illegible]) بعض لوگوں نے یہاں میرے متعلق مجھ سے بدگمانی کا اظہار کیا [illegible] میں خلیفہ عبدالحکیم کا نام لیا کہ [illegible] معلوم ہوا ہے۔ نہ معلوم خلیفہ صاحب نے کیا [illegible] میرے متعلق کم فہم آدمیوں کے حلقے میں کی ہیں۔ خلیفہ صاحب کو ذرا متنبہ کر دیجئے۔ ان

کی دوست یہ کسی پریشانی میں موجود شناسی پر مزور ہے۔ وہ خود بھی کچھ ہیں اور کچھ فطرت اُن کی بدولت خدا ہی کا شاد رہ چکے ہیں۔ میری طرف سے ان کے لئے فرج کراں سے کہئے کہ بعد اب تم جلسے ہو گئے ہو اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است۔ بہانگ چنگ بخورے کہ محتسب تیز است۔ اگلے آج کل شعر کا دستہ ڈھونڈو نکالنے میں بڑے طاق ہیں۔ بات پر یاں زباں کٹتی ہے۔

یونیورسٹی وغیرہ کے حالات جس قدر سنے تھے ہی کم ہو گئے ہیں۔ بہر حال اب امید ہے اصلاح ہو سکے اُن کو سمجھیں گے خط لکھنے کا شوق آپ کو مدت سے کم ہو رہا ہے مجھے ابھی باقی ہے لیکن تحریک ہونی چاہئے۔ مالک اس معاملے میں دلکش میں خط لکھتے رہتے ہیں۔ جن سے یہاں کی محسوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ انہیں جواب میں مزید خط لکھتا ہوں اگر آپ بھی کبھی کبھی کرم فرمائی کریں تو مجھے وطن سے دوری کا احساس کم ہو گا۔ بہر حال آپ کی خیریت کی خبر ہمیشہ طمانیت کا باعث ہو گی۔ مجاب سے میرا سلام کہئے اور یاسمین کو میری جانب سے پیار۔ میرا پتہ نیویارک میں مختصراً یہ ہے ـــــ PAKISTAN HOUSE, NEWYORK, U.S.A.

ہوائی ڈاک سے خط بھیجنا مہنگا پڑتا ہے لیکن نہ اتنا کہ خط و کتابت کے مانع ہو۔ والسلام

آپ کا دوسری کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لاہور کے پتہ پر خط بھیج رہا ہوں۔ سنا ہے آپ عنقریب آنے والے ہیں۔

خاکسار

بخاری

---

(۴)

نیویارک ۲۵ اگست ۵۸ء

ڈیر امتیاز۔ تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم جیسا انسان جس نے عمر بھر زندگی کے لطیف اور مرغوب ہر رخ پہلوؤں سے سروکار رکھا اور خاندان میں اپنے فرائض کو تندہی سے سرانجام دیا زمانے کے ہاتھوں یوں شکایت اٹھائے۔ مجھ جیسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وقتاً فوقتاً کسی کی مخاصمت یا ایذا رسانی کا ہدف بنے لیکن تمہارے حسنِ طبیعت اور حسنِ اخلاق کا صلہ یہ ہرگز نہیں کہ لوگ تمہاری مخالفت پر آمادہ ہوں یا تم سے انتقام لینے کی تاک میں ہوں۔ . . .

. . . . یہ دور ایسا ہے کہ اس میں دوستیوں اور رفاقتوں کے خون ہوتے ہی رہیں گے۔ شاید لوگ اس زمانے میں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے حرص و آز دلی مردی سب باتوں پر غالب ہے۔ خدا تمہیں تقویت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے علو طبیعت اور اپنی بیوی اور بچی کی محبت اور رفاقت کی بدولت اپنی پریشانیوں پر غلبہ پا لو گے۔ میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں اور بے بس اور بے افتادہ۔ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آ سکتی ہے تو یقین جانو کہ وہ تم سے نہ کبھی دریغ رکھتی ہے نہ رکھ سکتا ہوں۔ میں ایسا شخص نہیں جسے بآسانی سلیم الطبع کہا جا سکے۔ میری لغزشیاں تم پر اور سب دوستوں پر واضح ہیں۔ کیونکہ تم سب کو ان سے پالا پڑ چکا ہے اور تم سب نے وقتاً فوقتاً بلکہ اکثر انہیں درگذر کیا ہے لیکن میرا عمر بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحانِ طبیعت یہ کہتا ہے کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ اسی لئے کوئی دوست چھن جائے یا دور ہو جائے تو میں کئی راتیں اور کئی دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔ افسوس کہ ہمارے دوست اب کم رہ گئے ہیں۔ تقریباً ہر ایک تفکرات یا ہوس کی گرداب میں آ چکا ہے اور نکل نہیں سکتا تاہم سالک جیسے لوگ معتنمات روزگار میں سے ہیں۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں تو تم ہی چلے جایا کرو۔ اس سے غم غلط ہو گا۔ اور جو مصائب پہاڑ سے نظر آتے ہیں وہ اتنے صبر شکن معلوم نہ ہوں گے۔ فیض اور ایلس بھی

مالیں آپہنچے ہوں گے۔ ملنسار لوگ ہیں اور ان کی محبت بھی مریم کا کام دے گی سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور فطانت فہم بیوی عطا کی ہے اور ایک بچی جو حقیقتاً تمہاری بہترین امیدوں کا مجسمہ ہو گی ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر ہمیشہ کے لیے نہیں تو کم از کم ہر روز چند گھنٹوں ہی کے لیے سہی۔ جو لوگ تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں غور سے دیکھیں تو ان کو خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دکان پر منتخب کی تھیں۔ اور ان ہی سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ طالبیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکے۔ انسان بیٹیوں کے کام آنے کے جو طبیعتیں پاتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود جناب ہی سب سے پہلے اس کی قدر دان ہوں گی۔

اس سال کے آخر تک یو این او سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ سبیل کچھ اور کرنی پڑے گی ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہو گی اس کا سہارنا مشکل ہو گا۔ دونوں بچے لندن پڑھتے ہیں۔ ایک یہاں ایک زبیدہ سنا ہے کراچی میں۔ کچھ فکر ان کی تدبیر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سہی لیکن دنیا بھر سے زیادہ مہنگے ہیں۔ سالک صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے ہیجان قلب کے لئے ترجمے کی راہ نکالی ہے۔ وہ ادھر ادھر ترجمے کر رہے ہیں۔ از بس غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر ضرورت سے زیادہ طاری رہتا ہے۔ شاید انہیں یہ احساس ہے کہ زندگی سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت نہ ہونی چاہئے۔ آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب لوگوں کے منظور نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت اور آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اردو زبان پر بھی لیکچر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں۔ ضرورت پیش آئی کہ کسی نجمہ... دوست کی معرفت ایسی کتابیں فی الفور جمع کروں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک کچھ تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ انہوں نے فہرست تو مرتب کی لیکن کتابیں بھجوانے کا کام مستعدی سے سرانجام نہ دے سکے۔ چنانچہ معاملہ کہیں ان کے اور مکتبہ... کے مابین لٹک رہا ہے۔ آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہنے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی کہ آپ اپنے مشغل میں گرفتار ہوں گے۔ اردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب . . . . سے امید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کر لیجیے۔ جناب کو میرا سلام اور یاسمین کو میرا پیار پہنچے۔ خط ضرور لکھتے رہا کیجئے۔

آپ کا خادم

بخاری

۲۵ اگست

---

(۵)

۱۱ مئی ۵۰ء نیویارک

ڈیئر امتیاز۔ واپس پہنچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا تاہم تقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھر کیا بنا۔ دو ایک کتابیں بھی آپ کو بھجائی تھیں۔ بہت اچھی نہ تھیں لیکن میری خاکساری کا ثبوت مزید ان سے ظاہر ہو گا۔ افسوس کہ کتابیں بھیجو تو سمندر کی ڈاک سے بھجانی پڑتی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے کم از کم پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آ گئے۔ جیب اجازت دے تو عقل اجازت نہیں دیتی۔ میتھ (MYTH) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے استفسار کیا۔ ... وہ ضرورت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق قطعی نظریے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں قیاس

بالکل مدہوش آدمی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر فیصلہ کیا ہے کہ آج سے پر پرماتما کے میں فوری کو ٹسیٹ ڈالوں گا۔ مجھے علامہ کپ کو ایک کتاب (جو بیسویں صدی کی) انشاء اللہ بھجواؤں گا حال ہی میں نقل ہے اس کا نام ہے "نظر بد" یعنی " EVIL EYE "۔ ایک ماہر چشم ڈاکٹر نے لکھی ہے اس میں آنکھ اور نظر کے متعلق جو جو توہمات لوگوں میں مروج ہیں انہیں یکجا کر دیا ہے: نظر بد بھی ان میں سے ایک ہے اور اس کی تاریخ بھی مختصر طور پر لکھ دی ہے کیونکہ ماہر علمی نقطۂ نظر سے مفید اور اور کچھ ہیں مثلاً عام خیال ہے کہ سست پڑھنے سے یا بہت کم روشنی میں پڑھنے سے نظر پر برا اثر پڑتا ہے اور آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں مصنف نے صاف صاف بیان کیا ہے کہ یہ غلط ہے اور اس وہم کا ڈاکٹری میں کوئی جواز نہیں ملا کتاب کا آخری عنوان ہے "STUDIES IN THE FOLK-LORE OF VISION." میرا خیال ہے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ بے حد مفید ثابت ہوگا باقی کتاب دیکھنے پر آپ خود اندازہ لگا لیجیے۔

مجھے اس سال موسم خزاں میں ایک یونیورسٹی میں ہندوستان اور اردو زبان و ادب کی تاریخ پڑھا رہے ہیں۔ صوفی تبسم نے بوساطت ایلس فیض (یعنی صوفی صاحب آج کل محو قسم کے انسان ہیں) مناسب مفید کتابوں کی (اردو انگریزی دونوں) فہرست منگوائی ہے وہ آنے پر دیکھوں گا کہ کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ جو نہ ہوں گی وہ پاکستان سے منگواؤں گا۔ اور غالباً اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت بھی ہوگی۔ امید ہے دریغ نہ رکھیں گے۔ مجھے وہ افسانوں کے ترجموں کا منصوبہ جو آپ کے مکان پر بعد طعام باندھا گیا تھا اور جس میں مجلس اقبال کو عموماً اور آپ کو خصوصاً پیش کرنی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ لاہور سے چلا آیا تو اس کے متعلق سے برخاست۔ کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیے۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر ہوں۔

چند ہفتوں کی بات ہے میں ایک لیکچر کے موقعے پر بر سر عام کچھ دیر بے ہوش ہو گیا اس کے بعد ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ بیسیوں ڈاکٹروں کو دکھایا۔ خاطر خواہ علاج جاری ہے۔ لیکن کچھ ٹھیک تشخیص نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دل وغیرہ بالکل درست ہیں۔ کام اور تعطیلات کی کثرت کا میرا مشورہ اپنے میں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سلطنت کی بے ہوشی کے اسباب مغرب میں متنازعہ فیہ ہیں ہماری بے ہوشی بھی آنے والی نسلوں کے لئے مبہم رہے گی۔ لیکن خیر ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ "غش کھانا" وغیرہ داستانوں کے ساتھ ختم ہو گیا معلوم ہوا کہ اس رسم کے زندہ رکھنے والے ابھی باقی ہیں۔

سالک، حفیظ، صوفی ان تینوں کو جب میرا سلام کہیے گا چغتائی صاحب سے ہم کلام ہونے کا موقع نکلے تو ان سے کہیے وہ مجھے ذرا خط لکھیں کہ ان کے یہاں آنے میں کیا رکاوٹ پیش آئی۔ خلیفہ صاحب ملیں تو ... کر دیجیے گا۔

ہاں بھائی، آغا بشیر اور حفیظ پر کرم کا میرا سلام کہیے گا۔

حجاب یاسمین کو میرا سلام و پیار۔

خاکسار

بخاری

---

(۶)

پاکستان ہاؤس۔ نیویارک

۱۲ اگست

ڈیر امتیاز۔ تنہائیوں میں آپ اکثر یاد آتے رہے اور اس ایک سال کے عرصے میں کئی تنہائیاں مجھ پر گزریں لیکن پہلے تو پہلے مصروفیتوں اور بیماریوں نے کئی شکستہ ارادوں کو پژمردہ کر دیا کبھی خط لکھنے کی نیت باندھی تو شروع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حال میں سالک صاحب کے دو تین خط آئے۔ ن۔ م۔ راشد نے

سے کچھ ادبی طیفے لکھے اور اردو ادیبوں کا ایک نیا [illegible] سے ہیں۔ میں دیانت سے طبیعت کو [illegible] یاد آتے ہیں۔ ایک لقب دوش کے بل
دل پشاوری کررہا تھا [illegible] انگلستان و نصیحت [illegible] نے [illegible] تار دہلوی [illegible] سب مقدر ہے ہمیں کو گھٹے
پڑھے لکھے جہل اور تعصب کا مغز ہے [illegible] ایک حیثیت نے [illegible] کہتے ہیں [illegible] خواہ مخواہ [illegible] اور پرستی
[illegible] کا نام بہادر ہے آغا حشر مرحوم [illegible] بات یہ ہے ان کا ذکر یوں کیا ہے کہ " hack writer of the
called Agha Hasni a third rate poetaster " [illegible] نہیں تھی یا
ساری میں [illegible] دل میں آگ لگ گئی [illegible] کتاب کہ [illegible] کے پاس ہے [illegible] آپ
نے [illegible] ہے وہ [illegible] کتاب [illegible] نہیں معلوم آپ نے
کا [illegible] مجھے [illegible] کوئی کام [illegible] حائل ہوئی تو اسے
[illegible] لیکن [illegible] کا کام مستقل معلوم ہوتا ہے [illegible] کتاب لکھ ڈالئے۔ آپ کا [illegible] اور علم تو آئندہ
نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ [illegible] کے ایسے آثار بھی باقی رہیں کہ [illegible] کی شکل میں
دریافت ہو سکیں۔

لاہور کے حالات سے [illegible] البتہ سالک صاحب [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] ہیں۔ معلوم سالک صاحب ہجرت کے
بعد [illegible] رنگینی کم [illegible] ہے۔ بہرحال لاہور [illegible] مرتے دم تک مشتاق رہوں گا
ہماری جوانی اس سے تھی اور [illegible] کے عرصے میں [illegible] گمان ہوتا تھا اس کی جوانی ہم سے ہے۔ دیار محبوب کی ہر خبر طبیعت میں ایک تلاطم پیدا کرتی
ہے اور کوئی [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان سے جو [illegible] اس کی اطلاع ہمیں [illegible] تفصیلات کے
لئے طبیعت [illegible] معلوم [illegible] صاحب کے [illegible] شاید آئندہ الیکشن کی ہوس
نے عمل [illegible] اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] ان کے [illegible] ہے۔ [illegible] یہاں کے کالم نویس
اور سیاست دان [illegible] پاکستان کی ہمت اور حق [illegible] کے معترف ہوتے جاتے ہیں اور پاکستان کے لیڈروں کے تدبر اور [illegible] کے قائل۔ لیکن کوئی [illegible]
ہندوستان کے کان نہیں [illegible] سب اپنا [illegible] کرتے ہیں۔

[illegible] فلم دیکھنے میں آئے [illegible] آپ کو تھیٹر اور سینما میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آپ سے تبادلۂ خیالات کرتا۔ لیکن طبیعت کو اس
سے کیا تسکین ہوتی۔ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے تماشہ کا فلم " THE RIVER " ستمبر میں یہاں آنے والا ہے۔ " JEAN RENOIR "
نے ڈائرکٹ کیا ہے ہندوستان کی سرزمین میں بنا ہے اور ایکٹر امریکن، انگریز اور ہندوستانی ہیں۔ [illegible] ہو رہی ہے پاکستان کے "دستاویزی" فلم
بہت [illegible] ہیں۔ اور اچھے نہیں۔ اس بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن پھر کبھی لکھوں گا۔ قلم [illegible] آپ کی جانب سے کوئی خط آئے تو
طبیعت پھر شگفتہ ہو جائے گی۔ حجاب کو میرا سلام شوق۔ یاسمین کو پیار۔

خیریت و بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

بنام آل احمد سرور

کوینز، نیویارک

۵ ستمبر ۱۹۵۲ء

محترمی ـــ

آپ کے خط سے طبیعت بھی بہلی لیکن تشنگی بھی رہی۔ رسالوں کا جو حال آپ نے بیان کیا ہے وہ کم و بیش وہی معلوم ہوتا ہے جو میری لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں تھا لیکن ادب دوستی کو حذف کر دینے سے وہ لہو نشاط ہے کہ باوجود آنکھ سے ٹپکنے کے رگوں میں دوڑنے پھرنے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے شام کا ادبی میلان جگہ میں بھی پھول اگتے ہیں جب شاعری زندگی کا دار و مدار ایک جاہل اور عامی سلطان پر تھا جب بھی اس لئے ایسے جیسے تماش رکھتے تھے کہ مدح کے علاوہ کئی راہیں ان پر کھلی تھیں۔ سب سے زیادہ دلکش کشش تو امریکہ جیسے ملکوں میں ہے جہاں منڈی کے بغیر کوئی چیز بک ہی نہیں سکتی۔ یہاں کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کامیاب شاعر یا افسانہ گر ہیں یا ناکامیاب تو مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ آپ نے پیسے کمائے یا نہیں۔ نہ یہ کہ آپ کو حسن فروغ شمع سخن نصیب ہوا یا نہیں۔

یہاں تک تو آپ کے ساتھ ہولیا یعنی مضمون سے جو گریز آپ نے کیا ہے اس سے ماتھے پر بل نہیں آنے دیا لیکن میں سمجھتا تھا آپ کے خط سے احباب کا حال معلوم ہوگا۔ ندیم صاحب اور خدیجہ اور آپ کے شب و روز کا کوئی نقشہ آپ کے خط میں نظر آئے گا۔ جو ملاقات کا کام دے۔ کچھ آپ کے خط سے لاہور کی سیر ہوگی اور اس عزیز شہر کی خیریت معلوم ہوگی۔ کیا اس کے باغوں میں اب بھی سفیدے کے اونچے اونچے درخت خوشبو سے لدے کھڑے ہیں۔ کیا اب بھی راوی ہفتوں کی یاد میں سسکتا رہتا ہے۔ کیا امرلوں کی گہری اور تاریک سبزی اب بھی عنابی بادلوں کے ساتھ آ ملتی ہے اور برسات میں ملاتی ہے؟ آنکھیں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈھتی رہیں لیکن ناکام رہیں۔ یا شاید بے نظر ہو چکی ہیں اور یہ بھی معلوم بھی نہیں۔ پھر خط لکھنے کا موقع ہو تو ان مجلسوں کا حال مزہ لے لے کر بیان کیجئے جن کی یاد دل سے کبھی محو نہیں ہوتی نہ معلوم مجھ غریب کا حشر کیا ہوگا۔ دنیا کے ہر کونے میں دل کا ایک پارہ کسی نہ کسی گلی میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ یہ سب ٹکڑے کب یکجا ہوں گے۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو؟

میں چند دن کے لئے یہاں (جنیوا) کام کے بہانے سے آگیا ہوں۔ مضافات میں تنگ کندھیاں ہیں۔ انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی۔ دن بھر کوہ بلانک کی برف پوش چوٹی جھیل کی سی دھوپ میں چمکتی رہتی ہے۔ دن ڈھلتے ہی فضا میں اور جھیل پر ایک پُراسرار نیلاہٹ چھا جاتی ہے۔ یہاں روح کو وسعت نصیب ہوتی ہے اور کئی پیچ و تاب تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سال میں دو تین مرتبہ یہاں ضرور آجاتا ہوں۔ ہفتے عشرے تک نیویارک واپس چلا جاؤں گا۔

خاکسار

بخاری

احمد ندیم قاسمی کے نام

ہوٹل ماریا کرسٹینا

میکسیکو۔ ۱۱ فروری ۱۹۴۹ء

عزیزی ندیم صاحب! آپ کا قلم کا نام پیارا رہا ہو تو شاید یہ بھی یاد ہو کہ آپ نے اور احمد نے اور خدیجہ نے مشترکہ اور منفرد وعدہ کیا تھا کہ اسے کوئی دنیا سے

لکھے گا ہے کوئی کتاب انگریزی رسالہ، کوئی نظم، کوئی اشارہ، کوئی خوشہ مجھ تک پہنچتا رہے گا۔ صبح و عدہ لیل و نہار ہوا کہ اردو تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ میکسیکو کو خلاف توقع دل کش اور رنگین پایا اور کانفرنس کی وجہ سے مصروفیت اس قدر رہی کہ اپنی وہ افتادگی پر آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ تاہم کسی گٹار بجانے والے کی تان کبھی رات کی خاموشی میں تیرتی ہوئی دل کے پاس سے گزر جاتی ہے یا ہسپانوی وضع کے مکانوں کی رومانی کھڑکیوں اور محرابوں اور سرو کے درختوں پر مہرِ سلطان کی سی شوخ دھوپ چمکتی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سائے گھاس پر لیٹ جاتے ہیں یا کونوں میں چھپ کر جا بیٹھتے ہیں تو لاہور والوں کا رابطہ یاد آتا ہے۔ سالک صاحب کے انقلاب کا جوبلی نمبر دیکھا تو اس میں آپ کی نظم سے آنکھیں سیراب ہوئیں۔ اب معلوم ہوا کہ نقوش پھر آزاد ہو گیا ہے تو دل چاہا کہ آپ کو مبارک باد کا خط لکھوں۔ ہاجرہ کی کتاب غالباً چھپ گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو انہیں بھی میری طرف سے مبارک ہو اور ہاجرہ، اور خدیجہ دونوں کو میرا سلام پہنچے۔ نہیں معلوم کہ کب واپس آؤں گا۔ دل چاہتا ہے جنوبی امریکہ میں کچھ ادھر اُدھر آوارہ گردی کروں۔ اور نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کا علیحدہ تو بہرحال رہے گا۔ لیکن ابھی جنوبی پر نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں۔

خاکسار

بخاری

(نوٹ: یہ خط سالنامہ نقوش لاہور ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

بنام حکیم یوسف حسن

محترم بندہ جناب حکیم صاحب!

آپ کا خط ملا۔ گویا آرزی سلام روستائی کے سلسلے میں تھی لیکن پھر بھی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کی ذرہ افزائی سے میرا حوصلہ تو بہت بڑھا لیکن نہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں۔ جون کو میرا پہلا امتحان ہے اور موسم اس قدر خوش گوار ہو رہا ہے کہ دریا کے کنارے اس جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی یا کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھسنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے اس دوگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے کہ آستیانہ جیسے عزیز دوست کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور سالک جیسے مشفق شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر، سراسیمگی رہا ہوں، عرصہ ہوا دوستوں سے خط لکھنا بند کر دیا۔

سوچتا ہوں تعطیلات شروع ہو لیں وہ خط لکھوں گا کہ دوستوں میں کھلبلی مچ جائے اس ہیجان کے دوران میں ہو سکا تو نیرنگ خیال کی خدمت بھی کروں گا۔

رسالہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں پھر بھی میری کج بیں طبیعت کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا۔ ہندوستان کی بدنصیبی ہے اور کیا کہوں۔ مجھے ذرا لاہور واپس آلینے دیجیے۔

خاکسار

بخاری، عمانوئیل کالج کیمبرج

(نیرنگِ خیال ستمبر ۱۹۲۷ء)

بنام کلیم الرحمن

نیویارک، ۶ر دسمبر ۱۹۵۵ء

عزیزی و مشفقی، سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ کام وہاں جیسے معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ابھی مشقت نہیں لی ابھی سے کانوں پر ہاتھ دھر لیں " ... BRIEFLY / " یا اسی قسم کے عنوان سے ہزاروں کتابیں اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں آپ کے زیر نظر کون سی کتب اس امر کی ہیں۔ اس لئے آپ کے نیویارک کے دفتر سے کتب میں پہنچیں گی تو پورا حال معلوم ہوگا۔

آپ کا نام جب زبان پر آتا ہے تو آپ کے والد مرحوم منشی خلیل الرحمن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میں ان کا خادم اور معتقد تھا۔ ان کے سر ... علم و دانش کا خوشہ چیں تھا۔ آپ نے جس خاندان میں تربیت پائی ہے وہ آپ کے حسن اخلاق اور صفات کا ہمیشہ ضامن رہے گا ... کے علاوہ آپ خود بھی ماشاء اللہ ذہن، دماغ، اور تخلیقی کا نمونہ ہیں۔ اس لئے ممنون صاحب کسی اور صاحب کے ساتھ آپ سے ایسا ہی تعلق رکھتے ہیں ... ہے۔ خدا آپ کی زندگی ہر طرح کامران کرے۔

آپ کی بہبود کا طالب

خاکسار بخاری

بنام حامد علی خاں

(۱)

مشفقی حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون

مجھے معلوم ہوا کہ میں نے آپ کے خطوط اور مسودوں کی رسید آپ کو نہیں بھیجی۔ مسودے مطابق فہرست مجھے مل چکے ہیں اور ان سب پر میں نے نظر ثانی کر لی ہے۔ کسی مضمون کو مختصر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ مجموعی طور پر ہر مضمون پیمانے سے ذرا طویل ہے لیکن نہ اتنا کہ قینچی استعمال کیے بغیر چارہ نہ ہو۔ البتہ ترجموں میں بہت سی جگہ ثقالت تھی جو اکثر ترجموں میں پائی جاتی ہے۔ اسے میں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ بعض اوقات تو مطلب ہی فوت ہوا جاتا تھا۔

تمہید تقریباً تیار ہے۔ محض انتظار اس بات کا ہے کہ آپ نے جو تجزیہ ساتھ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اسے بھی دیکھ لوں۔ ترتیب کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلا حصہ پاکستانی دوسرا امریکی ہونا چاہیے۔ پاکستانی حصے میں پہلا مضمون قائداعظم کا اور امریکی حصے میں پہلا مضمون لنکن کا ہوگا۔ باقی مضامین کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے۔ تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ شیخ پہلے میرے سامنے کیوں آئی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ایک بات اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں (خواہ امریکی حصے میں خواہ پاکستانی حصے میں) مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہاں مضمون کے آخر میں قوسین کے اندر بخط خفی لکھ دیا جائے (انگریزی سے ترجمہ) تاکہ لوگ طرز تحریر کی اجنبیت کو خود صاحب مضمون کی اختراع نہ سمجھیں۔

مضامین نگار میں خود شامل ہونا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے لئے تمہید نگار ہونا ہی مناسب ہے اور بس۔ جواب کا منتظر، خاکسار بخاری

کہ اتنے مضامین ابھی بغیر مزید مسالے کے انتظار کے بھیج دوں تاکہ کتابت شروع ہو جائے۔

---

(۲)

مشفقی، سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۱۸ ستمبر مع بقیہ مسودات کے ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں لہٰذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔

اب اگلی ڈاک سے انشاء اللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔

خاکسار

بخاری

نیویارک۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۸ء

---

(۳)

مشفقی جناب احمد علی خاں صاحب، سلام مسنون!

آج ہی ایک علیحدہ پیکٹ بذریعہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا ہے۔ جس میں ۲۹ پاکستانیوں کے مسودے اور ۳۰ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں نیز ۱ مضمون کی اصل انگریزی بھی اسی پیکٹ میں بھیج دی ہے۔ رسید سے ضرور مطلع فرمائیے۔ میں منتظر رہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک خط ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظر ثانی کی ہے مترجمین نے بعض حصے قواعد کے لحاظ سے بڑھا دیئے ہیں۔ بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی ہے۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلاست بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب جس حالت میں مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں امید ہے آپ انہیں خاطرخواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں اوّل تو اسمبلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے بگاڑ کی وجہ سے فرصت کم رہی پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا، جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا تو پھر وہی کیفیت ہوئی آخر تنگ آ کر میں نے ایک مختصر سے دیباچے ہی پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس وضع کے اور کس موضوع پر تھے۔ اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو ابجد کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم و نسق کے مطابق کتابت وغیرہ شروع کرا دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

جب میں نے سنا کہ کتبہ فرینکلن سے کرا دیا تو آپ ہی کی وجہ سے بڑی مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں۔ بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔

خاکسار۔ بخاری

(نوٹ: یہ خط ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ملا اس روز لاہور پہنچا جس شام پطرس کی وفات کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی۔ یہ خط اسی کتاب سے متعلق ہے جس کا غیر مطبوعہ دیباچہ اس رسالہ میں درج ہے اور یہ کتاب مکتبہ جدید چھاپ رہا ہے۔)

بنام عبدالقدیر رشک

عزیزی رشک سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون! آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب سے مجھے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خیال تھا کہ اس دفعہ کی سیاحی میں کچھ [illegible] آنکھیں اردو کتابیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ اول تو کتابیں ملتی ہی نہیں، مل جائیں تو فرصت کہاں!

عام امریکیوں کی طرح صبح سویرے اٹھتے ہیں جلدی جلدی کھانا کھایا اور کسی دفتر چل گئے، شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ شام طلوع افزا وقت ہو یا باہر کا اسپاٹ سا حال، طبیعت کچھ ہوتی ہے یا افسردہ، ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ ہیں اور نہایت دلچسپی سے باتیں کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس شہر میں ہزاروں لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑا رہے ہوں گے لیکن ہم کچھ ایسے بے بس واقع ہوئے ہیں کہ نہ نیند کی پروا، نہ محفل کا ہوش۔ فقط اندازِ سیاست کا علم ہوتا ہے کہ بعض باتیں کہی جاؤ۔ ایسے حال میں وہ کیا اردو ادب کے متعلق کیا لکھوں ع

بات بڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

وقتاً فوقتاً اردو ادب کی جو کتابیں نظر سے گزرتی ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے آپ کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ہمیں زندگی کے خدوخال تلاش ہی تھے نہ اعلیٰ صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں نہیں، واقعات کی دنیا میں پرورش پاتی ہیں۔ ان میں کئی اشعار نشتر ہیاں ہوں گے۔ اور کئی مصرعے دھڑکتے دل، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی شورش و استقامت اور انسانی مسائل کی امید افزا کرنیں نہیں پھوٹتیں۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے، ہمارے یہاں کے اکثر ادیبوں نے راہ گریز چھوڑ کر زندگی کو اپنایا۔ انھوں نے نہ صرف زبان کے ذریعے ملکی ادب کو آرٹ کی نئی قدروں سے دوچار کیا۔ علاوہ پاکستان میں جس زمانے کے سایے میں اردو ادب کی نشوونما ہوئی، تمدنی اور سیاسی اعتبار سے ایک ایسے ابتلا کا دور ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

رومانیت کا دور گزر چکا۔ اب اردو ادب زندگی کے تلخ حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ انسانی عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے مملو ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ رہے گا اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہوگا۔

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت سنگ میل کی سی ہوتی ہے۔ معاشرہ کی سربلندی اور انسانی بہبود کے لیے فنکارانہ تاثرات کو دوسرے افراد کی نسبت انسانی خدمات میں زیادہ کارآمد ہونا چاہیے۔ وہ عاقبت کے جن ادیبوں نے اردو ادب میں زندگی کو اپنایا ہے ملک کے دانشور اور عوام ان کی خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔

ہم دنیوی سے محتاجی ادب کی استوار کردہ عمارتوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور ایسے ادب کی پشت پناہی کر سکتے ہیں جو انسانی خدمات کے لیے زیادہ کارآمد ہو۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میں زیادہ کچھ آپ کو بتا سکتا لیکن عدیم الفرصتی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

بخاری

پطرس کے مضامین

یعنی مضامین

اے۔ ایس۔ بخاری
بی۔ اے (کینٹب) ایم۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور
سابق ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ

فہرستِ مضامین

اظہارِ عقیدت

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی
کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اسے
بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی اُن سے
فیضِ تلمّذ حاصل ہے۔

پطرس

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے۔ تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے۔ تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی ہرچند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔ آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کریں۔

"پطرس"

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارک باد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا۔ کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفے کا نہ ملنا خصوصاً اُن رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور بالکل غیر متعصب یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی۔ تصنیف و تالیف۔ دندان سازی، عینک سازی۔ ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشین پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا ہو سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد لاہور ہمارے لئے طلب کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات بیان کئے۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی رومان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیحد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک۔ تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان۔ اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چُور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے۔ لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور۔ مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ ازحد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیرخوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیلِ علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے

ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ شرفا وہی ہے جو شریف ہو۔ جیسے تیر انداز آتا ہو وہ بازو گھستا ہی نہیں۔ گھر پر لئے جانے والے دستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے، مٹھی بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی ایک فراخی ایک وارفتگی ہوا کرتی ہے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا۔ کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک کانسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لئے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں ہم دلی کو واپس گئے تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہئے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں۔ اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک آدھ نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد

ہمارے سیاہ عینک بینی تو کھلی ہی گئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ کہ ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی۔ تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی۔ کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدین: اغراض" کے لئے واقعات کو ایک نئے انداز سے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر مہینے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے ؎

بناداں آں چناں روزی رساند

کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا "دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ——— نہیں دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ——— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی ——— گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریئے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہیئے۔ شخصیت ایک بے ڈھنگا سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے "تو کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"
میں نے نسبتاً خفیف آواز سے کہا: "جی ہاں"۔
"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔
لیتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں؟"
میں نے کہا: "جی ہاں"۔
کہنے لگے: "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ میں نے اُس وقت توجہ سے سُنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدّومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جُلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان کی ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ غذا کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں۔ تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رعب بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویّہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مسکرا کر ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے۔ کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا۔ تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ پھر جب تین چار دفعہ یہی ہوا۔ تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت نہ رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ

میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے اس زمانہ میں بڑے دلچسپ اضافات کئے۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ عرصہ بعد دوبارہ دیں۔ ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی سفر کرتا ہے تو اس میں نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضمون انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے۔ تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا۔ لیکن بی۔ اے میں پہلے تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچئے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں یہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کی بجائے ـــــ مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے ازحد حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہئے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو۔ مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا۔ اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں۔

(۱) انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

(۲) انگریزی۔ تاریخ۔

(۳) انگریزی۔ فارسی

(۴) تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(۵) تاریخ میں فیل۔

(۶) انگریزی میں فیل۔

چھٹی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نمبروں کو اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہو گا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائیگا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہو لیں گے، پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا۔ تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں۔ تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن یہ بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر ادھر کے لوگ "ہائیں نہیں صاحب؟" "ابھی کیا کہہ رہے ہو" آپ بھی یہ

بھی کوئی بات ہے کہ اپنے نفرتوں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے ہم گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی والد کو تسلی دی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا تذکرہ بھی شروع کرنا چاہیئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب برابری کا فخر حاصل تھا ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ تو اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہو سکا۔ کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔ جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے، وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں تاریخ کے دلدادہ.........

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہو گی۔ اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے۔ تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے۔ اور فلاں فلاں

خواہ مخواہ اپنے آپ کو سینکڑوں الجھنوں کے ... اطلاع عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد جب ہماری بدنصیبی دیکھئے تو جب سمجھ نکلا۔ ہم پاگل ہو گئے۔

ہم پر تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ بد خوراکی والوں کی حالت ملاحظہ ہو۔ ... کر کے ... آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ
ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے، نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکّا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا، اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر، پنڈولم کی طرح ہلنے لگا، تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا، میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں...... "اچھا! ...... اچھا! ...... تھینک یو! ...... جاگ گیا ہوں ..... بہت اچھا! نوازش ہے!" آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں! اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا، نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے، پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخرکار جب لیمپ جلایا۔ اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے، یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی "لالہ جی! ...... لالہ جی!"

جواب آیا "ہوں!"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے، کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے "تو اس کیا تین بجے ہی سو رہا نکل آئے؟"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں!"

کہنے لگے "تین...... تو...... نہیں...... کچھ سات...... ساڑھے سات...... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا۔ کہ صبح جگا دینا۔ یا یہ کہا تھا۔ کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت داواجان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے! لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیر باد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے ہی سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا۔ "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟"

بولے "ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او ناہنجار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب۔ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لئے۔ نکٹائی کھول دی آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو

جواب آیا "نہیں انقلاب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔" وہاں سے لوٹ کر تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح چھ بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو دماغ نے الٹا آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ چھ بجے اٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ، چھ، سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی تو لازم رہے گی۔ اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہئے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے بستر میں ۔ ۹ بجے کے چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ تو دیں۔ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کوئی زبردست چیز ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے۔ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پیچ مارا "پلیں۔"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم کے درخواست کی کہ "لالہ جی۔ صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوگی میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت ٹھیک ..... ؟"

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: "جب چھ بجیں تو ...... تو آپ ہے! چپ۔

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا "سن لیا۔ سن لیا۔ چھ بجے جگادونگا۔ تھری کو ماپلس نو ملیفا پلس ..... !"

ہم نے کہا "ب۔ ب۔ ب۔ بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کردی۔ اُن کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اسی شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کردی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ یا شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے

سے کو کوستا رہوں گا۔ لالہ جی سے بہت منتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور ہم خیال کہ ان کی دل شکنی نہ ہو بعد میں جھوٹی نیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے ہم نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ وہ نہ ہوں تو اس کی طرح آج بھی دیر سے اٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے جو کچھ پڑھو فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹتا۔

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو کل سے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے وہ بہت شکرگزار ہوئے۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو تین کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ رکھ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوورکوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیاسلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈمارننگ" کیا۔ اور نہایت بیدار لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا۔ کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا "دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا "اور کیا! تمہارے تو یونہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔" ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں۔ تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بےخبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور خندہ جبینی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔ ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے۔ خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارا یوں کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگی .... "(لحاف کانوں پر سرک آیا) ...." تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں .... بہت ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے .... کیا بات ہے۔ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں۔ ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے ...."(لحاف سر پر)" .... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے .... "(آنکھیں بند)" .... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کونسی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانتا

شیکسپیئر بہتر ہو گا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے ؟ میرا خیال ہے کہ آپ کو جذبات کے ہنگامہ زار سے گریز کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہو گا۔ اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے ...... لیکن شیکسپیئر
...... ہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک ہے گو ...... شیکسپیئر ...... ہیملٹ ...... لیکن ورڈزورتھ
...... لیڈی میکبتھ ...... دیوانگی ...... سبزہ زار ...... سبز سبز ...... بادِ بہاری ....
.. شاید ہوں ...... کشمیر .... میں آفت کا پرکالہ ہوں ....

یہ مسئلہ اب مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سر پر سے نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو دیکھا دس بج رہے تھے۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر! آج میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی آپ نے جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں .... اس کے بعد .... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں؟"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر فلسفیانہ چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس شش و پنج میں رہے۔ پھر یکایک ایک مجرمانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ غالباً میں اس وقت .... اَے .... اَے .... نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد و اتقا کی تمکینی میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب ہو۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار

ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور کیف و سرور کی صورت نوری بن جائے تو جائے گی کہ ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے

غرض یہ ہے کہ پہلے [illegible] کی آواز اور دروازے کی [illegible] سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد گاڑی کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گاڑیوں کے گڑگڑانے —— بچھیوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، قلابوں کے چٹخنے، کرسیوں کے گھسٹنے، کتابوں اور بوتلوں کے گرنے، کھنکھنانے اور کھڑکھڑانے کی آوازیں تو گویا باقی الدہر عطا ہی ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ ان سازوں میں شہزادی کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے!
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

———

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے، دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے، تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن کبھی ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں کوئی ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے، یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے، کتے نے برآمدے میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بیتالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں، نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ایسے موقع پر

ہونے بھی شیر گرہ سے مرعوب ہوا ہو۔ شاید آپ اس کو ذاتی مجبوری [illegible] ہی ہو۔ [illegible] انگریزی۔ سکالر دوستوں نے علاج دی۔ کورات کے وقت لاٹھی چھڑی۔ [illegible] میں دیکھی جا چکے [illegible] لیکن ہم ان سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا مطلب جاتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری [illegible] آیتہ الکرسی [illegible] دیکھیں تو نیند [illegible] سمجھے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا اخلاق ختم ہو جاتا ہے [illegible] ایسے [illegible] سبھی [illegible] کا نے کی [illegible] نو کا ہیچ کی [illegible] کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہے تو آپ [illegible] کے ڈالنے کا موقع پڑتا ہے اگر بھی آپ کے ذہن سے آتا جائے گی۔ اس جگہ آپ شاید ذرا نے قوت [illegible] ہیں۔

بعض دفعات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے تھوڑی گھڑی تھیٹر سے واپس آرہے ہیں۔ وہ ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں۔ اور نوشی کا عالم بھی ہے۔ اس لیے سیٹی پر اکتفا ہے کہ بےسُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا۔ انگریزی موسیقی ہے۔ راستے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک کتا اور بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بےآواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں۔ سمجھ لیجیے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے۔ تو ہم بھی چاروناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے) لیکن یہ کمبخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو۔ تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟

ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شکریہ، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری)، اس ہنگامے میں دماغ بھلا کیا کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کئے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی۔ تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انہوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نکند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔" یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

اردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا، جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولہا کب بنے گا۔ اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم کب بڈھے ہوں گے؟

(۵) تو کب کمائے گا؟

(۶) آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو اسے جھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے۔ اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کچی نیند میں رونے لگتا ہے تو بے چاری ماما کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچہ کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے۔ کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ واہ۔

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا، بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ در اصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے

یہ تو صندوق پر بیٹھے ہیں۔ نالی میں روز نہلا سکے۔ بائیں طرف نیچے اور مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا، کسی میں چھوٹے بچھڑی اور پانی کا مٹکا ہے۔ جب چاہے آگ جلائے جب چاہے پانی ڈال کر بجھائے۔ آٹا گندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے۔ مسالہ سب تیار ہو چکا ہے۔ بیلن اور چوکی بھی ... میں رکھی ہے۔ میاں جب آتا ہے تو ... کر سامنے رکھتی ہے۔ تھکے بھی نہیں تھکتی۔ کھانا پکتا ہے تو کتنا بھاری ہے۔ ... ہے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے۔ کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو، کھانا کھا کر ... کی بدولت بیماری بھاگ گئی ہے۔ آپ ... ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے!

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ پھر بیکار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی ... لاتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی تالاب پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ تاکہ کپڑے دن ڈھلے کبھی ... سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے مگر ہمارے لئے ہر موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہو گئی ہے۔ اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بند ہے۔ چھاؤں کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے ... ایک کشتی دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انھیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھو دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پتھر پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے۔ اب دھوبن کھانا کھلائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب! حفاظت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آ جائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے لے جائیں پھر واپس نہیں لے جا سکتے۔ میاں دھوبی! تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھرتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے۔ تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ

ملنگو شاید کہنے لگے۔ اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا۔ نہیں۔ تم ہی باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک بوری پر ناک منہ پیٹے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! ہم نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کہنے لگے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق کیجئے کہ اس سے کسی ذہانت سے بات شروع کیجئے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا۔

"مرزا بھئی! گیہوں تو بہت مہنگے ہو رہے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کمیونسٹوں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا اس کے بعد غلے کی مہنگائی کے متعلق کل باتیں کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی ترکِ صحبت کا ارادہ دل ہی میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل۔ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری بیوی کو ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات بیہودہ کھٹکتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی نابود ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری۔۔۔ ۔۔۔" اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھا لی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی۔ تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں۔ بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک گانا گاؤں۔ بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو، ورنہ تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔ "خط ضرور لکھتے رہئے؟" میں نے کہا۔ "ہر روز، اور تم بھی؟"

کھانا وقت پر کھا لیا کیجئے۔ اور وہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں؟

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں جی چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں سٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو یا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔ اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سُن لیا نا! کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام و نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی۔ شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی نمٹا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر؟"

کہنے لگے "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

باہر کے طرف ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا۔ ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے۔ اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پر جمائی۔ جمائی پر جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ گپ شپ میں بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر ایش ٹرے ہی میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہونے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرخ رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہترا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ "میں بہت اداس ہوں تم فوراً آ جاؤ!"

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لئے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے

کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مزید یوں مرتب کر سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت متین طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیے۔ حالت یہ کہ آنکھیں بچا اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا لیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ ادنیٰ لطیفہ کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جائے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آ جائے گی!" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے!"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتا ہوا جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے!" کوئی کہے "نہ حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چپتیں کھائے!" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے!" آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو اس میں کیا ہے۔ آج ہم ہیں۔ کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا سے چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آرا!

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آ جاؤ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی ... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا سوائے ڈاکیے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"منٹو ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تم سے جاؤ، چلے جاؤ۔"

"کاغذ تماشا دو۔"

"بھاگ جاؤ!"

میں اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ آپ دیکھیے تو سہی!

مُریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا۔ ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ جیسے شائستہ سے شائستہ خانوادوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگرس کے جلسے میں چلا گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگرس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگرس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی ببانگِ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکینِ غرور کے لئے کانگرس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدنیتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض مغنیوں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگرس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھوں گا۔

جب کانگرس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر

اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے موصوف میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب پڑھا پڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے۔ جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام مرید پور گزٹ ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسبِ ذیل ہے۔ رنگ گندمی۔ شکل و صورت بہتر۔ نسل سے جوان معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہو گی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک کانگرس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشاپردازی، صحیح الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی یہ تذکرہ تک بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جب سنتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جابجا جلسے نکل آئے۔ جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانانِ ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا۔ کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ مانا کہ ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی ازحد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ ؎

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہینِ قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آکر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔ خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ تو رفتہ رفتہ باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک گزرہ افسر ہوں اور یہ لیڈری کا فتنہ ایک لمحہ ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہل وطن کی بے حسی پر ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا۔ کہ ان بیچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اٹھ! سینکڑوں لوگ تیرے سننے کا انتظار لئے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہتے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں۔"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنہوں نے نفاق اور پھوٹ کی بات سوچ لیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں یہ سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا! والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی۔ کہ

"پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے ۔۔۔ فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے

نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے ۔۔۔ یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم

ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کئے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کے یہ الہامی الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے۔۔۔۔۔۔ وغیرہ"

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس۔ غربت۔ بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔ جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت۔

آپ ہماری مغربی تہذیب ہے۔ لیکن میں سب کو باری باری غلط قرار دوں گا۔ اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ آخر میں اتفاق کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا۔ کہ

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اسی طرح غور کرنے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)
۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت
(الف)۔ افلاس
(ب) جہل
(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی۔
۳۔ اس کی وجہ۔
کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں
کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں
کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں
تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو)
۴۔ پھر بتاؤ۔ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لئے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔
(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ)
(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)
(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد۔ جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ اس کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے۔ اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن لیں۔

مریدپور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مریدپور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی

مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے انھوں نے کہا "سر باہر تشریف لائیے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ باہر برآمدے میں گئے تھے۔ ایک گلدستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہو گئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہونے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً "ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔" "مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔" "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:۔

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے......"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یکلخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھال کر پھر دوبارہ اور کئی جیبیں دیکھیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مرید پور کا شہر اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انسان کے لیے......"

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا۔ جاہل کہنا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

"......ان کی اعلیٰ سیاست دانی ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں۔ لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے......"

ہاں وہ تقریر کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر میں چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں۔ لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے...."

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔

مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بے ہوشی سے ذرا ہی ورے تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھیں جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی۔ یہ تلخے اور لومڑی کی کہانی؟ نہیں ٹھیک ہے دو بیل . . . . .

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اُسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول لیں اور مُسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ : ۔

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا۔ تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ لیکن چونکہ پہلا لفظ جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا : ۔

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا : ۔

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں جھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے۔ کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں . . . . مجھے آپ! (وقفہ . . . . .) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

مثلاً آپ لڑکیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔ لڑکیاں اکثر شرمیلی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔ اس لیے گویا لڑکیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھیے نا کہ اگر

(بلند اور طویل قہقہے)

"حضرات! اگر اپنے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ غیرت مند لوگوں ہے! شیفتہ اور ستم ہوتا......

ایسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی کیا کہتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ: ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے رہا سہا جوش کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیدار ہیں، کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان کی حکومتیں چاردانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے ....."

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے ہال کے پچھلے قطارے کی طرف ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے ارد گرد سٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے!

تم ذلیل ہو......"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کوشش کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مریدپور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

انجام بخیر

(منظر)

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔
زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر۔ ٹالسٹائی۔ ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیر کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔

باہر گلی میں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق۔ دمہ۔ کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پیٹرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گزشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پیٹرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پیٹرس: حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو۔ اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

(کمرے میں ایک پُراسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (گھٹنوں بل گر کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے۔ اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

(کتابوں کو چھوڑ کر اُن پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس:۔ کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی یہاں دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم:۔ اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ دینے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم:۔ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم:۔ اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس:۔ یہ نہ کہو، یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا، اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ! تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم:۔ (سر فگندہ اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ گرمیوں اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہو گیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے علم و تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ ہم اظہارِ تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اُسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس:۔ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باجا بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم:۔ (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب و احترام کے ساتھ لفافہ پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم:۔ (آگے بڑھ کر) اے فرشتے میرے ہدیے کو شرفِ قبولیت بخش (لفافہ پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم:۔ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز انسان کو متشکر فرما (لفافہ پیش کرتا ہے)

پطرس:۔ (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے (تینوں لفافے اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم:۔ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس:۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس :— تمہارے ہی بھروسے پر (سجدہ کر کے) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے بدلے بہت دنوں تک زندہ رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہماری کمائی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے اپنے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار سی روشنی چھا جاتی ہے اور درختوں کے پتوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے اٹھتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس :— خدا کے راستباز اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو!

ملازم :— (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔ کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے کچھ لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس :— آہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے جھینگر کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(پھر سجدہ میں گر پڑتا ہے)

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے)

پطرس :— آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس :— اے مرد، نیک انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ دنیا کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ ہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر۔ اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ جھینگر زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس :— خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ۔ اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ۔

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

(باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے .... ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ جھینگر بدستور بج رہا ہے۔

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)

پطرس :— (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز: ۔ (باہر سے) سنہ رہیں غلاموں کا غلام ہوں اور دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں۔ اور عرض حال کروں۔

پطرس: ۔ (دل میں) میں اس آواز سے نا آشنا ہوں۔ لیکن مجھے یہ پایا جاتا ہے کہ باہر کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجائیے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے۔ لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس: ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت ہیچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے محترم اجنبی! اس الماری سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کیجیے اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

اجنبی: ۔ اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: ۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: ۔ اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کردو۔

(آبدیدہ ہوجاتا ہے)

پطرس: ۔ اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی: ۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو۔ کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور غم زدہ انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کرلو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی زور سے چیختا ہے)

پطرس: ۔ ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آگیا۔ لیکن حضور والا۔ آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لئے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: ۔ (مبہوت ہوکر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: ۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس :- آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھ غلام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر پیچھے ہٹتے اور کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)

اجنبی :- (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ سمرقند کا شہزادہ ہوں۔ والیِ سمرقند و کاشغر! یہ حقیر ان چاندوں کے ساتھ یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس :- (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آہستہ آہستہ کانپنے لگتا ہے)

اجنبی :- ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

گانا۔ آج موری انکھیاں نہ لاگیں۔

پطرس :- اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کر ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چار پانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی :- (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس :- خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں۔ یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دُکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اُس کا نام سُن پاتا ہوں۔ بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بین بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما کا ارادہ ہو، ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں۔ اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں ہرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں:

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں۔ اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں "بھئی ہمیں معلوم نہیں!"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے!"

"اب تمہارے خیال کی تو کوئی سند نہیں"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ چھ بجے شروع ہوتا ہے!"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہئے میں کیا بولوں؟

تیسرے جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں۔ لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں۔ اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس اُمید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا غالباً اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے۔ تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آجاتی ہے۔ آخرکار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:-

"کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟"

"ہاں اندر ہی تھا۔"

"میری آواز آپ نے نہیں سُنی؟"

"اچھا یہ تم تھے! میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں۔ اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں۔ اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:-

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں؟"

"ارے بندۂ خدا آج سینما نہیں جانا؟"

"ہاں سینما! سینما! (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر اُلجھن رہتی۔"

"تو چلو پھر اب چلیں"

"ہاں وہ تو چلیں ہی گے۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کم بخت کپڑے لایا ہے یا نہیں۔ یار ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"

اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ کہ

"مرزا جی! للہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما دیکھنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو۔ پونے چھ بج چکے ہیں۔ اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے پر پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آ جاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو!"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟"

"پان کے لئے ذرا تمباکو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تیز رفتار سے ہوں۔ لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو جی!" یا اللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں۔ تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لئے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاندتا، اس کے ٹخنوں کو ٹھکراتا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچاتا آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں۔ "میں نہ کہتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروا دیا نا! گدھا کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں۔ اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب قصّے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کون سا ہے۔ اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے۔ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں۔ جس کے دوران میں کم از کم تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو ختم کر لیتے ہیں۔ تو اپنے سر کو کھجانا شروع کرتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے۔ بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نگاہ کے لئے راستہ نکال لیتا ہوں۔ اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے میں ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں۔ اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ عمل یونہی جاری رہتا ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے "یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں یہاں لائے ہو تو غور سے دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور قتلِ عمد۔ خودکشی۔ زہرخورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔ اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرّے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھی فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی۔ لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا بھی شوق تھا۔ یہ بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں یا کنسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب پڑھتا یا نیا مصنف دریافت کرتا، تو دوسرے کو ضرور بتا دیتا۔ اور پھر دونوں مل کر اس پر چھوٹے بڑے حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے، تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں۔ اور میں بعض اوقات ترحم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی مانند میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ ادھر میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی۔ اور ہفتہ بھر کے بعد انہیں میرے کمرے میں پھینک جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انہیں پڑھ چکی ہوں۔ تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اوّل تو میرے لئے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا۔ لیکن فرض کیجئے مردوں کی لاج رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے غور و فکر درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا۔ اور وہ نہایت

حالانکہ اندر ہی اندر جی میں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لئے دروازہ کھولتا یا اس کے سگرٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا یا اپنی نشست پیش کر دیتا یا کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جاہل یا مال کا لیتا۔ سہل ہے۔ لیکن ذلت کا عالم نیک سے نیک انسان بھی ایک آدھ دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے لیکن یہی حالت میری بھی ہوگئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہ پڑھی تھیں۔ انہیں بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا:

"ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں۔ بہکی بہکی۔ بہکی سی۔"

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا۔ لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا تھا:

"ہاں پڑھا تو ہے۔ لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:

"اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔"

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میبل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آگئی تھی۔ اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں۔ تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری لعنتیں بھیجیں گی۔ کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانئے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی

مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے علمیت جتا رہا ہوں۔ میاں تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے۔ تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی، میرے اپنے نزدیک تو مسلم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا اور باپ آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میں کو صرف ذی علم سمجھتا تھا۔ اب وہ اپنے مقابلے میں پالیٹکس اور ریاست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ ہولک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا تاہم گذشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میں کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میں کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی۔ دوا پلائی۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) ''میں مجھے خدا کے لئے معاف کر دو۔'' اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ ورلپنے آپ کو سزا دینے کے سلسلے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی خاصہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا ''میں پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں۔ ان کے متعلق میں سب سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہو گی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہو گا۔''

کہنے لگی ''نہیں تو۔''

میں نے کہا ''مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا۔ وہ سب من گھڑت تھا۔''

کہنے لگی ''کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔''

میں نے کہا ''پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟''

کہنے لگی ''ہاں پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔''

اس کے بعد میری گذشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میں رخصت ہونے لگی تو بولی ''تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟''

میں نے کہا ''ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب میں انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انھیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انھیں پڑھ چکی ہو۔''

کہنے لگی ''ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔''

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میں نے بھی انھیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی، اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا، ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر؟"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو۔"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا! کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں .... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم میں میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دُم ہوتی ہے، تمہاری دُم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں، کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔

میں تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں، دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے، ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے وفائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت بھینچ لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں۔"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگرٹ والا ہاتھ میں نے منہ تک اس انداز سے لانا اور ہٹانا شروع کیا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں۔"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولیں۔ تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں۔"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "وہ کون کون سا پرزہ؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس چھوڑ دوں گا۔"

مرزا بولے "یہ سمجھو کہ آدھے تو یوں ہو گئے۔ باقی ڈھائی ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے رک گیا ہے۔ چنانچہ میں مرزا سے جدا ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ یہ بات کچھ میری سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا "وہ روپیہ دے گا تو پھر جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے "مفت۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کون سی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی، اور بلبل کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "یہ ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو۔"

میں نے کہا "پھر کہنا۔ پھر کہنا!"

کہنے لگے "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے۔ جب میری ہے تو تمہاری ہے۔ تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔ تمہیں ضرورت ہے۔ میں سوار ہوا، تم سوار ہو لئے۔"

میں نے کہا "مرزا! مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم میرے اپنے ہو کر مجھ سے ایسی اجنبیوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوگی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینی ہی نہیں چاہیئے لیکن ...."

میں نے کہا "نہیں مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں۔ یہ تو کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ ٹمٹموں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہیں تو کل چھیالیس روپے۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن ایک

غرض وہ ستائیس روپیہ پر منظور کر لی تھی۔ اپنی تو یہی معمول ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔

مرزا چلنے لگے تو میں نے یہ کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا کل نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ ہو .... خدا حافظ . . . . . اور دیکھو میرے عزیز میں پرسوں کو بھی زیادہ کہنا .. ..خدا حافظ.......اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں ... . . . کل صبح آٹھ نو بجے تک ... ضرور ...... خدا حافظ!

مرزا کہنے لگے: "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا۔ اور تیل ویل ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا۔ ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔"

میں نے کہا: "ہاں ہاں وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل ضرور بھیج دینا۔ اور دیکھو آٹھ بجے تک یا ساڑھے آٹھ بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا .... خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر ارد گرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح بہت سویرے کی ہوا خوری کے لئے ہر روز بلا ناغہ جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہو گا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آ گئی ہے۔

میں نے کہا: "اتنی سویرے؟"

نوکر نے کہا: "وہ تو رات ہی کو آ گئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا: "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ۔ اور دیکھو۔ بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے۔ اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ۔ اور دیکھو، ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا۔ اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا۔ اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل کو باہر نکال کر رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں۔ اور دیکھو صاف کر دینا۔ اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا۔ بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ غسل کیا، پانی بیچ میں "ٹھہا رہا" اس کے بعد کپڑے بدلے۔ اونار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "یہ کیوں ہے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا کہتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے کوئی زمین پر رینگتا ہے۔ اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چرخ چر چرخ کی قسم کے سر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی۔ اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ ...... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اترائی پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ۔ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یکلخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم داہنی طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹھکیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یکلخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا۔ اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یکلخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور میں لائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی۔ اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے

کہا "دیکھو یہ دم ہلایا کر رہا ہے!" دیا اس بدقسمتی نے ترکیب میں یونہی ترتیب رکھا ہوا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو از سرِ نو ٹھیک کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس میں سے ایک اور ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ سیر کے دوران میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں۔ بہت ہی کم رہے۔ اس دوران میں بھی یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے نیچی ہو یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہو کر بیٹھے بلا جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل باقی رہ گئے اور بائیسکل کی اُکھاڑ پچھاڑ نے ایک معقول صورت اختیار کر لی تو یہ فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑاہٹ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا: "ذرا اس کو مرمت کر دیجیے۔"

وہ مستری آگے بڑھا۔ لیکن بائیسکل سواری اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹٹول کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی سے ان تمام حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا: "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا: "بڑے گستاخ ہو تم! دیکھتے نہیں، صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کر دو اور ان کو کس دو اور کچھ ہلے ہیں ان کو فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا: "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا: "ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا: "اگر باقی چیزیں بھی لگا دیں۔ ایسا ہو تو اچھا ہو؟"

میں نے کہا: "اچھا کر دو۔"

بولا: "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے ہوں گے؟"

کہنے لگا: "بس کوئی چالیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا: "بس جی، جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا: "میں نے کس تو دیا ہے، لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا: "بڑے بدتمیز ہو، تو کیا تم نے پیسے مفت میں لے لیے؟"

بولا: "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہوگی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ .... للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا: "واہ، مرزا صاحب کے وقت کے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان کو ابھی کالج چھوڑے صرف دو سال بھی نہیں ہوئے۔"
مستری نے کہا: "ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مُردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اصل میں بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔"

دکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا: "لوگے؟"

کہنے لگا: "کیا مطلب؟"

میں نے کہا: "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کونسی ہے۔ آخرکار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا: "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا: "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا۔ انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ

بیچ رہے ہیں؟

میں نے کہا: "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے اس گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا: "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا: "تمہیں بتاؤ۔"

کہنے لگا: "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

پھر کہنے لگا: "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا: "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا: "تین روپے دیں گے ہم اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا:۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا۔ اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے میں دس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے اور آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا۔ ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں۔ گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا۔ اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقیماندہ بائیسکل کو تھاما۔ اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کاہے کو لئے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انھیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک دیجیے۔" ایک دوسرے صاحب بولے "بے حیا بائیسکل۔ گھر پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھو بیٹا یہ

سرکس کی بائیسکل ہے، اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں!

لیکن میں بچ نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عالم سے چال باقی تھی جو کسی ٹمٹماتے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب سب ملا کر ہو گیا تھا میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو الگ الگ کر کے اس بے ہودہ پہلی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی بڑا بھاری بوجھ اتار رہا ہو اور واپس گھر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ"۔

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں!"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا:

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں"۔

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کُرے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں نام لکھا ہو وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا۔ تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے۔ وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔ پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں ——— اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا اس کا دارالخلافہ پنجاب ہو گا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہلِ شہر ہوا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو کہ موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے۔ کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے روپیہ خرچ کر کے جابجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی ہو جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے لوٹے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر مست مناسب ہیں۔

ذرائع آمد و رفت ۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کی چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ میں ہوتی ہے۔ اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ عبرت پکڑنے میں سہولت ہو۔ اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے

اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک بیجا اعتدال پیدا کیجئے تاکہ سڑک کا ہر تانگہ ایک گھوڑا اور تانگے کا ہر یکہ اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کو یہ ایک باقاعدہ تو ہو چکے

قابل دید مقامات ۔ لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کو پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "آب لاہور" "مژدہ" یا "ایجاد اور ستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "کریجویٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چپکا ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے گانوں کا خلاصہ۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتدا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "ڈاکٹر بھوتی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔ جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار ۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی

قصداً یہ رسالہ ورک بھیجے جاتے ہیں نسل در نسل چلی آتی ہے ۔ ... ہوشیار ہیں کہ کر تیار ہوتی ہے۔
طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جلالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبہ عام طور پر پہلے مدرسوں کے ہاں پلا کرتے ہیں اور دھوبی اور حلوائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ ... اس عمل کے بعد کسی رستوران میں ان کی زکوٰۃ کی جاتی ہے۔ ... کتاب کے بعد کسی
... کے گرد و نواح میں سے
از خود روشنی کے لئے شمع رکھ اور ... اور ... ہے دیکھیں یا ادھر پھاڑتا ہے
قسمیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن سب کی تصویریں ایک ہی ... کر کے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کر کے
لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ... سال کا تخت و تاج ان کی ملکیت
جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لے نکلتے ہیں اور جو ... کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ ... کی خوراک انھیں راس نہیں آتی۔
ملے ہوسٹل میں درویش بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر مذہب اور اخلاق اور ... اور جمہوریت پر باقاعدہ تبادلۂ خیال
کرتے پائے جاتے ہیں۔ اقتصادیات اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے
ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں۔ لیکن
بے سُرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں،
مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملول
نہیں ہونے دیتے۔ اور تعلیم اور تعلم اور درس و تدریس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے
پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے
استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر کر سکتے
ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں
میں سے ہوں۔

طبعی حالات:۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

یہ مضامین بروقت نہ ملنے کی وجہ سے ترتیب سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے بامر مجبوری یہاں درج کیے جاتے ہیں

"غنچۂ تبسم" کے دیباچوں پر ایک نظر

نیازمندانِ لاہور

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسوم بہ "غنچۂ تبسم" حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کے شروع میں پانچ عدد دیباچے ہیں ایک دیباچہ تو کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے لکھے ہوئے ہیں۔

کچھ عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ کوئی کتاب شائع کرتا ہے تو اس پر دیباچہ لکھواتا ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ [illegible] اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے یہ ہوتا ہے کہ [illegible] نہیں ہوتا [illegible] تو اعلیٰ [illegible] کہ [illegible] بھی تک پھیلا کی کثرت ہے اور ہمارے [illegible] لکھتے ہیں [illegible] ایک مصنف کے نکات ابھی پہلے [illegible] مصنف مجرد اشاعت لوگوں کے سامنے [illegible] زبان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے لیکن "غنچۂ تبسم" کے لکھنے کے [illegible] زبان کا [illegible] تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب تک [illegible] انہیں [illegible] وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیکھنا یہ ہے کہ اس سے نہ تو تمکین صاحب کی شان سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، نہ دیباچہ نویسوں کی شان سخن فہمی کی داد ہوتی ہے البتہ نوبت [illegible] ہم اصول پرورشی مدح پڑتی ہے کہ "دو سخن گفتہ شد [illegible] باشد"۔ یہ شعر [illegible] شروع میں شیخ سعدی کی [illegible] ہم بہرحال [illegible] قارئین کے لیے [illegible] کے چند غیر معروف [illegible] دیباچہ نویس حضرات بہرحال اپنی قلم [illegible] کے بعض بزرگ [illegible] میں سے ہیں [illegible] اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا "سرآغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ دوسرے دیباچے کا نام "اعلام" تیسرے کا نام "تاثر" چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے۔ (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقفیٰ نام نہ مل سکا ہوگا) یہی تکلفات کتاب میں جا بجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "فہرست" نہیں لکھا گیا ہے کتاب کا فہرست کی عنوان "مجموعہ نگارشات" رکھا گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور "ملنے کے پتے" کی بجائے "سبیل ہائے وصول" اور قیمت کی بجائے "نذرانہ" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے

تو بھی سہی

اس تو ہم تمکین صاحب کے "سرآغاز" کا ذکر کر رہے تھے۔ چار دیباچوں میں اپنی تعریف کرنے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نہ ہوئی تو انہوں نے خود قلم اٹھایا۔ شروع میں آٹھ صفحے بنام خدا و نگارش کر رہے۔ لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا اور تین صفحوں تک انا الحق کہتے چلے گئے۔ جابجا قارئین کو حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانہ آئندہ کے مورخ کو کوئی وقت پیش نہ آئے۔ ۱۹۲۸ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مصروفیت زیادہ رہی پر ادھر اواخر اللہ" مدیران رسائل نے مضامین لکھنے کے تقاضوں سے ناک میں دم کر دیا۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ دو جگہ کوشش کے نیچے ہم نے خط خود اس لئے کھینچ دئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوب صورتی سے کوشش کی ہے۔ سامی جبلہ غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب اسی طرح کی چشمکیں اردو سے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "تا ملک دکن تو کھینچ بلا" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں۔

"میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں،

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا۔"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟

تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں جو دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں،

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بدذوقی کا محتاج نہ ہوں جنہیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے۔"

الحمد للہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچے میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ذات گرامی تک چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں؟ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گونا گوں دلفریب عنوان قائم کئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ خوش نویس ہیں مگر،

"بد ترین قلم نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیئے ہیں۔"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعویٰ نہ فاضل ہونے کا اور ضمنے کے واسطے یہ تو بتائیے کہ یہ بائے

کی تصنیف" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی لغتے کے اصول کے مطابق لکھا! اگر کاتب صاحب کی کم سوادی کا قصور آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے۔ کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایجنٹ" کو ہر جگہ "ایلزمان" لکھنا بھی اسی کے سر تھوپئے گا؟ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتحپوری کے "اعلان" سے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"غنچہ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو ظرافت میں شامل کرتا ہوں اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں" کتنا بھونڈا فقرہ ہے "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے انشاء پردازی کے عجز بیان کی دلیل ہے۔ ہم اصلاح تو نہیں دے سکتے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہیے تھا:

"غنچہ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ظرافتی مضامین کا مجموعہ ہے۔"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو ظرافت میں شامل کر کے لفظ بڑے بڑے جودت سے ہم حیوانات کے سر جوڑنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل تو غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہار ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھنا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی الاضلاع ہو"۔ بیچاری بک کر رہ گئی۔

یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زعم سے کہہ دیا کہ میں الف، بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی، اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت یورپ کا کوئی شعبہ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرز تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی ادب لطیف کے سلسلے میں کر گئے ؟) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ، طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کون سی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں ؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابل قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوے پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ "اس وقت" سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دور حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیش نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، اور جنیا دولف، اکیڈمیز بینفیلڈ، لڈلٹن

سے پروفیسر گرڈ، ولسن نائٹ، ولیم برگ کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاحیہ نگار ہے؟ بہر نوع یہ ست ادبی نقادوں کی بحث ہے لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسیوں کتب لکھی ہیں۔ [illegible] چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا عنصر اتنا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ برٹرنڈ رسل جو دنیا کے عظیم فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے، بھولے سے بھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھتا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور یورپ کے ہر شعبہ علم اور تنقید و تنقیص کی ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑا دی تو وہ کن جہال کو اپنا مخاطب بنا رہے تھے؟ ایسی باتیں تو دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہئیں۔ ان کو سپرد قلم کرکے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا ہواؤں کے پیچھے ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:—

"جب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ وہ اس صنف ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

یہ [illegible] آپ نے خوب لکھا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں جیسی فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں)۔ فقرہ بہرحال مہمل ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کرکے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہئے تھا

"وہ اس صنف ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ "اس صنف ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس صنف ادب پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:—

"ظرافتی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔"

دوسرے فقرے میں "دونوں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ "جو محاورے یا اصطلاحات کہ اہل زبان کے کانوں میں پڑے ہیں ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آ جاتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خواری کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہئے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے۔ اس میں اُن اہل زبان ہی کو آپس میں نبٹنے دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں۔ کس بھولپن سے فرماتے ہیں کہ "ظرافتی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے۔" "یہ" "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے۔ بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ (اب ہم تو اَن پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں۔ تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ ظرافتی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل [illegible]

سے کی بھیگیا پچھے چلتے فن تنقید کی شاہراہ یا ایک تنگ سی گلی ہی تو نصب کرتے ہیں۔ اس بے سود بات کی تردید کس طرح ہو؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاءاللہ ہمیں بھی فرصت اس کا جواب عرض کر دیا جائے گا۔ اتنا ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر بسوں کی کتاب "موسیقی پر تبصرہ" یا میری ڈیتھ کا مضمون ضرور کسی سے پڑھوا لیں کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ نیاز صاحب "یہ سب کچھ منصب علم" کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مضمونوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ لکھتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی آشفتہ ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پاتے تھے۔ نیاز صاحب کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشق کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کا دائرہ ماشاءاللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے شوق افق پروازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا تو کیا اچھا ہوتا۔ اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"مآثر" مولانا احسن مارہروی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے۔ رشحات میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو ذکر ہو جانے تو معنی کس طرح بدل جاتے ہیں، بڑے طمطراق کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ پھیلا پھیلا کر ایک دو تین چار صفحے پر بیان کیا ہے اور سیدھی سادی بات کو دہرایا ہے کہ آشفتہ بیانی کی ستم ظریفی کے لئے احسن مارہروی کی کلام وحدت بنا دیا ہے۔ انہیں اقتباس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (ناظرین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو ذرا غور سے پڑھیں)

> "غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب تربیت میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تدریجی علامت
> عام تصنیف و تالیف، سیاسی لیکچر، منبری مواعظ، روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے
> جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب مراحل کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک وعیت خاص
> ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کے لئے مزاحی اور جزو لاینفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس کا غالبی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب ہمیں خود بتائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں بہرحال احسن صاحب کی پروفیسری کے سامنے ہر فقرہ اس زور سے روانئ ادب ترک کرتا ہے کہ مطلب تڑپ کر باہر نکل جاتا ہے اور مفعول میں گھٹتے پڑے رہتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دوسرے ٹکڑے پر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے سنبلہ تبسم تسکین کاظمی

ایسا مذاق جس میں منت ترے لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرت داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۲ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھوا لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دیتے رہنے کی علامت ہے جسے اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہو تو بھیک منگے سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہوسکتے ہیں۔ اہل دانش کے نزدیک اس کی وقعت آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور پھر یہ لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے مخفف اور لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا خاص جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابو ذری کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں یا ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے کو تو میرک (شکارپور) لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکار عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔
اور ظریف وہ جو عمدہ سے عمدہ ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف
تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔ (یہ نکتہ اتنا نیا ہے کہ آفرینش سے آج تک کتم عدم میں انتظار کر رہا تھا کہ بیسویں صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے تو اسے معرض ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں۔ اگر یہی صحیح ہے تو ہر پیشے سے بڑا بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں جیسے تیسے لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی در اصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (دیباچہ نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے

"اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو . . . ."

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگا دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی لئے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مدائح میں فرماتے ہیں:-

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی
کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیاء الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین من مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ انہوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی

ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگذر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بد ذوقی ایسی ہے جسے ظرافت بھی اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے شہاب صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے وہ درجہ قابل نفرین ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے اور اپنی ظرافت نگاری پر نازاں ہوں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے اور بے شمار باتیں ہیں جو طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم ظرافت میں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق میں کہیں آپ یہ بھول جائیے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے۔" ملا رموزی نے کہا: "ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔" آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ ضرور آپ کو حیدرآباد بلاتا۔" (سخن سنج لوٹ لوٹ گئے۔ ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً نوک قلم سے جواب دیا کہ "میں کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں۔" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا: "ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جیے۔" آپ نے نوٹ اپنا دکیا کہ "مسلمانوں عزت حاصل کرو۔" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا: "اللہ انہیں منصب دار بنا دے۔" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہے اب بھی ہے۔" دیگر مرزا اکمال لوگ تو مرعوب ہو گئے۔ سبحان اللہ کیا ادبی پھلجڑیاں ہیں۔

تعزیت کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی کی طرح بانگ دہل ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتاً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتہً ادعائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زور قلم خود نمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ سپنسر، میتھیو آرنلڈ، کارلائل، رسکن، لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا۔ اور اپنے دوست کو بات بات نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور رسکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط۔

حسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاق شعر بھی قابل ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" تو "حسن پرستی" کو "عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینت کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:

بتو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں

نہ تر شتے تو پتھر تھے جو تر شے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ آخیر پھر بھی گنگنانے کے قابل ہے لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بیلچوں سے بھرتی کی گئی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا

اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سینے کے بال اور ابھی سیاہ ہو سکے

اسی کو لوگ ہو ما خضاب لگتے ہیں !

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے احساس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سیدی صاحب کچھ ایسے تذبذب میں پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے جملۂ قوسین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو صد درجہ قابل احترام سمجھتے ہیں۔ اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے زبان پر لانا ہم سے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر داد کے گن میں کی مزا آباد و اجداد کیوں بھلکیں اور پھر یہ بات بھی بے محل کی جائے تو بری معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریرات ایسی ہی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہو جائیں۔

دوسرے حصہ میں سیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر عموماً اور تمکین پر خصوصاً تنقید کی ہے یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے سیدی صاحب کے پاس خیالات کی قیمت ہے اسی لئے بے چارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں:-

(۱) اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

(۲) پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

(۳) فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

(۴) امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھتے رہے۔

اس کے بعد ہم سمجھے اس نے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائیگی کے یا شاید اسی کم مائیگی کی وجہ سے معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا"

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا کچھ واقف ہے "اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شغل سیدی صاحب ہی کو مبارک ہو۔ ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:-

"بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔"

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پبلشر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں سیدی صاحب شاید کامل کے معنی نہیں جانتے تھے انہوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے ـــــ آخر میں سیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بقول ان کے بہت کافی ہو گئی ہے۔ بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے۔ تو کیوں۔ اس لئے ہمیں سیدی صاحب کے زوردار فقروں میں بجز جوش کے اور سوائے ہنسنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سیدی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے جو لوگ تمکین صاحب سے رشک

کرتے ہیں ان کی ذاتی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

آخر میں ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذاللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں صاحب ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں اور اوچھے پن، رنگ خوردہ تلواروں اور ٹوٹے دستوں والے ساز و سامان کے ساتھ خوش خوش نعروں کے ساتھ مدرجِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ یہ بھی لکھتے ہیں اچھا بھی لکھتے ہیں جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے کہ ہر ایرے غیرے کی کھپت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے مقابلے میں چھیڑ کر ان پر احسان اور دوخوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آرا سے مستفید ہوتے، غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے۔ لیکن انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے ایک صاحبِ ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مؤدبانہ عرض ہے کہ شملہ بمقدارِ علم رکھیں۔ چلّو بھر پانی میں گر کر نہ اچھل پڑیں۔ عالم دیکھے ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ ہے بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دو قلم سے جو نقل جلسے سے نظر ثانی تک کا محتاج ہو، مجھا جہالت کی نشانیاں ہیں۔ لنکن کا قول ہے

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لئے دھوکا دے سکتے ہو، لیکن
سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے نصحائے زیرِ بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آ گئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد دکن، گلبرگہ، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لائیو تو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آپس میں باتیں شائع کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ زور آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے "جوابِ مضمون" کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "نمونۂ تبسم" یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بلا امتیاز فحاشت سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی مخلص صاحب اور ہم نیازمند

نیازمندان لاہور

دسمبر ۱۹۳۰ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک موت کے عنوان سے" "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار یعنی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہم سے میلوں آگے، ہم ان کے پیچھے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعت ذہن چیونٹی بھر سے بھی زیادہ نہیں، آدھ چلو بھی پانی جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی لیجئے کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زور قلم زیادہ تر اسی صنف ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازیں نکلتی ہیں۔ لکھتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ "انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے۔ وہ بجائے مبارکباد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔" مطلب یہ چاہتے ہیں کہ "تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہو گا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ 'تنقید' زمرۂ ادب سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ انارکلی کا ڈرامہ تو اتنا بھی بھاری بھرکم نہیں جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی ذہنیت کے آدمی کو بھی بھا سکے یا اس پر رعب ڈال سکے" اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریا برد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا کہ کسی دوست کو تار بھیجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو ایک جلاب دے دیں تاکہ یہ قے تو رفع ہو جائے۔ اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب ذرا بڑے ہو جائیں گے اور کچھ تھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو ٹریجڈی اور ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرمائیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہئے کیونکہ وہ ایسے ہی نحیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہو گی اب تو ماشاءاللہ اہل زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں، اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں۔ یوں تو "اہل زبان" کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دم میں نمدہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چھنا پات لگا ہو۔ اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بد اخلاقی کا ثبوت

دیباچے دونوں میں تین جگہ اپنی حیثیت بھی مرد خانی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا اختر علم ان کی بے رخنہ جہالت سے نہیں زیادہ دل چسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیات کا صحیح کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بکھرے پڑے ہیں موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ اہل زبان کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے کیونکہ ژولیدہ بیانی بینے نقادوں کی خاص صفت ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

"انارکلی . . . تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈرامہ ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی پرداخت سامنے لائے ہیں۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ جو مسئلے سے ترجمانی کریں تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈرامہ دلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض نا واقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ بات کیا ہے کب ہوئی اور اس کا کوئی مفہوم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکارپور کے سفر کے دوران میں دہلی کے بک اسٹال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوش گوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب معنونہ لال بجھکڑ سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ —

"(انارکلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، نقش اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہئے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونہ برت ہونا چاہیے۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور اس اظہار علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ معیار گویا کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جسے آپ نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بگھار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالئے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرفہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جبکہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیمو بقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

برسبیل تذکرہ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہئے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ کیوں بے تو نے جوانی میں ہیمو بقال کو مارا تھا؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کرکے

ساتھ لکھنا پڑتا کہیں فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی کہیں پیراگراف کو دوسرا ترتیب دینا پڑا کہیں فقروں کے معنی کو تشریح سے پہلے پڑھے اور اس وقت جو پہلے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو بہ قول ان کے "نقش" تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

"... فرماتے ہیں "اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون نگار قبل اسی قسم کی تنقید کا مضمون لکھ چکے ہیں) کہ انارکلی سٹوڈ کر آپ نے اس کی با عظمت سیرت تباہ کی ہے"

اس سلسلے میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دئیے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصور ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، وہ آپ کے اکبر سے کوسوں دور ہے بالکل نہیں ملتا" جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے (اس کا جواب مختصراً تو یہ ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیے۔ اس کی انشا پردازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشا پردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو اس تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد کہیں گے کہ ہم)

پھر آپ فرماتے ہیں:

"ڈرامہ نگار کی تو یہ ہی ہے کہ زندہ جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو"

مخلص صاحب یہ دوسری بات لکھنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ بہ ندرت تو کبھی اس پایہ تک جائیں کہ آپ اپنے مضمون میں لکھ دیا لیکن آپ کی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کیریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں مقام پر اکبر نے کوئی بات کی جو انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اور کیریکٹر جاتی کی ادا کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دئیے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم بادشاہ نوجوان ہوتے ہوئے بھی نہتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلاف فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو لکھی تھی اصل مطلب ان کا یہ ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک روزانہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد ہونے والے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی تو ایک عالی وقار علم دوست روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھا رہتا ہے اور جو ان خوابوں کی تعبیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شان دار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر سراسیمہ و پریشان ہو جاتا ہے اور جہانبانی کی اہم ذمہ داریوں کا اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں جھجکتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے خواہ مخواہ وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو مبادیات ڈرامہ کے متعلق کسی سڑی بسی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغلِ اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔ فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف

گئی جیسے کہ سُنے سُنائے مسالے مہیا کر سکتے ہیں۔ تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات صرف انتہا درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلاتشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں (اور اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے ان سے یہ بدسلوکی کی حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اڑاتے رہے) پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتائیے کہ آپ اس شخص کی دماغی صحت کے متعلق ایک حقیر رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ یقین جانیے اس نقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوع تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں۔

"میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں۔ سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلئی شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہوگا جس میں شاہانِ سلف کے سحر و سحر کے حسین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بسیط رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے ..... دو آتشہ منزل (جھروکہ) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے . . . اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو یعنی نوروز سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشن نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ تک تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی .. یعنی یہی کہ بادشاہ امرائے سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے ..... بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کر کے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے کے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انارکلی کا لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیونکر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں۔

"اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو ....."

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آ گیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نوروز ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب انارکلی کا قصہ تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انارکلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علم[?]

ہے اگر خدمت درست ہے تو کم از کم تزک بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہئے کیونکہ بابر بہرحال اکبر کا رشتہ دار تھا اور بقول مخلص صاحب وہ "بزرگ زنگار" میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آن انڈیا منقل کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ مخلص صاحب کو تاریخ کا ذوق تو بہت ہے لیکن ان کا مذاق ایکسپلور سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی آبزرویشن بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹے کے قریب وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا۔

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی معاشرتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھئے تو شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس نقشے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور محرابوں کے سایے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں "یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سایے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سایے کا طویل ہونا کہتے ہیں۔ دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اول تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم خلیل ہو شیخو؟" "تو معاملہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص اہل زبان ہو کر بھی یہ نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے اس کو کوئی غیر اہل زبان بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہل زبان کو کیسے طرح بتائے کہ اہل زبان ہونا اور بات ہے زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرز تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تعلیت وہ طور پر نامعلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی تو لوگ اس پر یونہی معترض ہوئے تھے اور ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کمبل جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ لوگوں کو خنجر اور ردا" اور اسی صنعت کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا۔

مخلص صاحب تاریخِ ادب سے واقف ہوتے تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آورد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن" اور "پھیکا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرمایا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے۔ کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ بے شک نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً پختہ حسن صرف مبتدیوں کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے۔ آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ "اہلِ زبان" کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس طرح کی گرہ یعنی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے: "دنیا کی تو انارکلی انارکلی کہتے زبان خشک ہوئی جا رہی ہے۔ اور تجھے اتنی توفیق نہیں کہ چھوٹے منہ سے دو بول شکریے کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب کہتے ہیں "چھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں۔ یہاں "بھولے منہ" چاہیئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ چھوٹے منہ کے معنی ہیں "ظاہرداری سے اور نمائش سے"۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور تجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہرداری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریے کے کہہ دے۔

"بھولے منہ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "(دیکھو بُرے) جو "خراب منہ سے، بُرے منہ بددلی کے ساتھ"۔ آئین میں جو "تحقیر" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے۔ گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انارکلی کی ماں اس موقع پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انارکلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

دوسرا اعتراض "سیخچوں دار روزن" پر ہے۔ "سیخچہ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں: "چھوٹی سیخ۔ لوہے کی چھوٹی سلاخ"۔ "سیخچوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہوتا تو ممکن ہے وہاں سیخچہ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے "بزمِ آخر"۔ پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے ضرور مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پا کر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے جائیے اس میں آپ کو گنگا جل، کڑا، اور گرش پیچ کی گوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوئے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابو الفضل کے آئینِ اکبری کا مطالعہ فرمائیے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ ہائے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں نہ بزمِ آخر کو۔ اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیئے پہلے اہلِ زبان آپس میں نپٹ لیں جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

آوردن درچہ کردی کہ بردنِ خانہ آئی

یہ تمام درست ہے اس تنقید کی۔ قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انارکلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں محض ضمنی اور فروعی باتیں ہی ہیں۔ اچھا ہوتا انارکلی کے کیرکٹر کے متعلق کچھ فرماتے جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے ارد گرد تمام واقعات کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا، ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے۔ اردو ڈرامے کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انارکلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا ممنون ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی، پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں، کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انارکلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہوگا۔ کیا تو یہ کہا کہ اگر بہت اچھے آدمی تھے سایے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ان سے کچھ نہیں نکلتا ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ بیٹھے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کنایۃً بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انارکلی کو مس حجاب امتیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا، چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی زینت کو رونق بخشی۔ تاج صاحب اور مس حجاب امتیل یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو موضوع بحث میں نہ لانے چاہئے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے "نقادوں" کو ذہنی اعتبار سے کبھی ہجو نویسی کے درجے سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا سوقیانہ چڑچڑا پن خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہئے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب امتیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشاپردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لئے ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہئے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چار دانگ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے" اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہئے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے اس کی اشاعت ایک دامان عالیہ کے سپرد نہ کرنی چاہئے تھی۔ مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا ذاتی کلچر شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے۔

ہم اس مضمون کے کسی کھسیانے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں کے دوستوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

یہ عصمت چغتائی کا وہ مضمون ہے جس کا بعد میں نے انگریزی میں
ترجمہ کیا تھا۔ یہاں اصل اور ترجمہ دونوں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ اور تالی بجانے کے لیے بھی ۔ ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور عرف عام میں ان دو ہاتھوں سے ہمارا مطلب ہے کہ ہیرو اور ہیروئن سے۔ ہے وہ ناولیا ادب ہی ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں ہوا۔ ادب بھی ایسی ہی ہے جیسے کسی نے ایک ہاتھ ادبیت کے ٹکڑے کی مدد سے تالی بجا دی۔ سو ایسی تالی بج تو گئی مگر کتابوں کی الماریوں میں گونج کر رہ گئی عوام تک اس کی آواز نہ پہنچ سکی اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستونی رسالے میں پس جاتا

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے جب مداری ڈگڈگی بجا کر تماشا دکھاتے ہیں تو وقفہ لانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ زمانہ سارے تماشے تو دیکھے گا کوئی بھی نہ سنے گا۔ دیکھیے: محکمۂ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا کترا کے نکلتے ہیں۔

لہذا جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو بندر یا بکرے کے گلے میں ڈوری باندھی اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی۔ ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارناموں سے سی رنگینیاں بھریں کہ لوگ ٹوٹ پڑے، کچھ احساسات کو پھسلایا کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا۔ شعبہ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت دلچسپ اسباق کو حاصل ہے ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہیے کہ بچے اس میں کچھ نہ ادب کی رعنائیاں پا کر متوجہ ہو جائیں۔ ادب کا بھی کچھ یہی حال ہے کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دے دیجیے لوگ واہ واہ کر کے نگل جائیں گے۔ [illegible] ورنہ عبادت کا زمانہ کب کا ختم ہو گیا۔ آج کل کی بات تو ہوا ہے عظیم بیگ چغتائی نے قرآن کی مدد سے پردے کو چاک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن شریر بیوی نے گزمیں کھلا کر، دو کو نشانہ نے عقلوں پر پڑا ہوا پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا۔ علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے لباسوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے مرنٹ بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے انگڑا رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی" ادب اور سماج، ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرو اور ہیروئن کو الگ کر دیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گی۔

میں سب سے زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن جام جم کی سی حیثیت رکھتی ہے اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً "فسانہ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جو قابل ذکر عورت تھی وہ نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور دلچسپ طوائف تھی۔ ترشا کو بھلا

شریف گھرانے کی عورت کہیں کی ہوگی۔ اور وہ بھی مسلمان خاندان کی۔ اس وقت شریف بیویاں گھر میں بیٹھی ہنڈیا چولہے سے سروکار رکھتی ہوں گی، مرد جو تسکین ذوق کے
تھے اپنی بیویوں سے اکتا کر اگلی طوائفوں کی آغوش میں سکونِ دل و دماغ تلاش کرنے جاتے تھے۔ یہ طوائف تھی بازاری اور کاروباری قسم کی نہ تھی وہ بالکل
زلیخا یا لیلیٰ کی طرح رہتی۔ گو شریف زادیوں سے زیادہ خوش مذاق اور لطیف تھی۔ ظاہر ہے کہ طوائف کی حیثیت بالکل ایک باغِ عام کی سی تھی جو عوام
کے چندے سے عوام کی خوشنودی کے لئے قائم کیا جائے۔ ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ یا سلیقہ مند بیوی کی شکل والا مکان میں پھولوں سے لدی
اور عطر میں بسی ہوئی رکھ سکے۔ سب سے اس کا نہایت آسان علاج نکالا گھر میں بیوی رکھی جو کھانا پکانے اور نسل بڑھانے کے لئے دوسری ضرورتوں کو بھی پورا کرتی
رہے اور بازار میں طوائف جو جذبات لطیفہ کی پیاس بجھا کرتی رہے۔ یہ بڑا کارآمد انتظام ثابت ہوا، گھر بھی بنے رہے نگینیاں بھی۔

مگر طوائف کی سوتن گرہستن نے شرارتیں شروع کر دیں۔ اگر میاں سو کوس دور بھی رہے طوائف کے یہاں گئے تو وہ بھی تعلقات میں آنکھ لڑانے
لگیں۔ مجبور اور ستم رسیدہ بیوی "باغِ عام" کی بے پردہ رنگینی کو تکتی واپس گرہستن کی طرف لوٹ پڑے۔ سوچا جو پڑا ہے کی ہانڈی سے تو پیٹ بھرا، دل رنگینی ہی
چاہتا ہے۔ عورت بھی کچھ شیر ہو گئی اس نے وہ سب کچھ سیکھنا شروع کیا جس کی تلاش میں شوہر طوائف کے پاس جاتا تھا۔ گو آہستہ آہستہ اس نے قدم بڑھائے۔ آدھا
کر پالیسی کے تحت طوائف کے دوسرے جیسے ... نے عزت اور توجہ حاصل کرنا شروع کی۔ سرشار کی فتح مند طوائف کو شکست دے کر پریم چند کی گرہستن نے
پر کچھ نکھار آئے۔ قدم قدم پر پیر تولتی چلنے لگی۔ ادب میں بیٹھنے لگی۔ باغِ عام کے میلے اپنے تنگ گلے میں چھوٹی موٹی کالا پھنسنے دیکھ کر کچھ تو
کچھ شعور نے کی سیکھانی کرنے لگے۔ رنڈی تو خیر ہی ہی گھریلو بیوی معصوم سی بے مزہ چیز کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی۔ طوائف کا پلڑا ہلکا پڑ گیا۔ اس کی
خوبیاں عیب ہو گئیں۔ وہی تازہ ادا جس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے، رنڈی کے چونچلے بن گئے۔ جو اسے کھلی کر گندہ کہا کرتے اور لوگ اپنے گھر
میں کنواری لڑکیاں کھڑا شروع کر دیے۔ گھریلو کنویں روز بروز گہرے ہوتے گئے یہاں تک کہ کنارے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور ڈوبنا پڑا۔ طوائف بہت کھلائی کی
بہت بگڑی مگر تاج سدا ایک کے سر نہیں رہتا۔ نا عاقبت اندیش نے پھل تھے پکے خوب۔ کھانے کو کوئی پوچھتا نہیں تھا اور ادھر معصوم گھونگھٹ والی نے
نئی پودیں لگائیں اور پیالوں کو بھی سینچا۔ نتیجہ یہ کہ رنڈی کے کھنڈروں کو میٹ کر گرہستن نے دنیا بسانی شروع کر دی اور پھر اس کی کمان چڑھ گئی رہی
انہی تھے کچھ والے مرد اس کی حمایت میں ایک دوسرے کو سخت ملامت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے عیب کھول کر شاہراہ پہنچ گئے۔ وہ خود مگر جانبدار
رہے نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑی۔ انہیں کی قائل مگر جیسے کانچ کی برت رکھ رکھ کر ... کر دکھلائے۔ جیتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے بھی آنکھوں سے
نقاب کے پیچھے سے حشر بپا کرنے لگی۔ لیکن اب بھی پوری فتح حاصل نہ ہوئی کیونکہ طوائف کے بعد فیشن ایبل میم ... اس نے کچھ نہ کچھ حصہ میدان کا گھیرے رکھا
اب کی اس قسم کی بیوی ... کہانی اور ہر قصہ میں گھسنا شروع کیا۔ مگر وہ جیسے طوائف کو ... اس میم سے کیا دبتی۔ اس نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ
گھر میں بیٹھے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ دیکھ رہی تھی اسے گھر میں نذر کے اکیلا باہر جاتا ہے گو وہاں وہ اکیلا رہ نہیں سکتا۔ وہ سیدھے ہاتھ میں چھڑی اور الٹے ہاتھ
میں عورت چاہتا ہے۔ تقویت ... کے لئے گھر میں رکھی ہوئی معشوق دفتر اور کاروبار میں بھلا کیا مدد پہنچا سکتی تھی۔ لہذا وقتی ضرورت کے لئے اس
نے دفتری میں دوڑ بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ، کبھی کبھی نظر آ جانے والی غیر کی حسین لڑکی اور ایسی ہی کتابوں کی ہیروئن ڈھونڈ کر جسم تاپنا شروع کر دیا۔ اس کے جواب
میں گھر کا اصل ... روشنک بیگم ... زہرہ بیگم کی ہیروئن کو دیکھ کر یہی ماننا پڑتا ہے کہ عورت کی جنگ برابر جاری رہی اور جیت آخر میں اسی کی ہوئی۔

مگر اسے پھر بھی قرار نہ آیا ـــــ اس نے تو بالکل ہی طرح گھر گھسنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بڑھی۔ پہلے تو گھر کی چار دیواری میں رشتے کے بھائیوں
ان کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ عظیم بیگ کی ہیروئن کے پردے اور برقعے کے تانے بانے کر اندر کشتیاں بچھانی شروع
کر دیں۔ موقع بے موقع سر پر چڑھ بیٹھی۔ گردن میں جھول گئی۔ سینے سے آن لگی۔ یہ پیچھے ڈھکے چھپے اور بھی زیادہ گدگدانے لگے طوائف کے نخرے

برابنے دو پر چند لی آہنسا کی قائل مقدس جیسل بے رؤف اور بزدل نظر آنے لگی اس لئے نیچے پن سے دل جل گئی بیتا بھی رونق رگڑائی گئی اس سے نفرت ہونے لگی یہاں تو اسے حیرت وہ ہیروئن پر جا سکتی تھی جو منہ کا نوالہ اچک لے بھڑوں کا چھتہ سر پر اٹھا لے کہ جانے ہی مجنوں لفنگوں نے کونین میں سے ہوئے تیر لے سے کام دو تین کی تمانچے کرے پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر زندگی تماشہ اور ہاتھوں سے کان سیک دے۔ نخرا اکر گذر مشکل لیکن اگر کسی شوخ شائستہ بیوی ہو تو سارے دکھ درد جھنکوں میں اڑا دے تو پھر کیا جنت کی آس دل میں مرے

مرد عورت کے ظلم سہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جب بھی بنے کوئی رہ نہ ہو سکا ۔ حضرت آدم نے بیٹھے بٹھائے پسلی چیر کر اس نقطے کو نکال ڈالا اور اپنے سر پر سوار کر لیا ۔ خیر د بیوی ہر بار زندگی جو لگام پکڑے سیدھے چلے جائیں گے۔ جتنے زور سے زیادہ ڈھیل لگے چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے دل کے ساتھ تو وہ قانون عمل ہی ہی چوکڑ سن بیٹھی اور [illegible] کی پاسبانی شروع کر دی۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہو گئی جو نگلی جائے نہ تھوکی جائے چھتری ٹوپی اور رسالہ کوٹ کی طرف [illegible] رہ گئی۔ یہاں تک کہ مرزا جی تھا سب سے پہلے پطرس تھے اور ان کے بعد عظیم بیگ اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر ہاتھ دینے لگے ۔ سر پھا پھکن منشی جی مرزا جی اور مرزا ان جی بھی پکار اٹھے ۔

"یہ یاد آتی ہے بیگم! ہمیں منظور مگر نہ اتنا پیٹ میں درد اٹھے گے۔"

دہر ہیروئن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی جس نے یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ اگر وہ درد دل ہوئی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کر میاں پیسوں پر اکڑتے ہیں کیوں نہ چار پیسوں کی کمان توڑ کر الگ کر دی جائے لہذا محدود کی سلائی سے شروع کر کے معاشی [illegible] مارے مرے کیے بیٹھے تھے اس نے روپے نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ دیکھے کر عورت کیسے بدل کر نئے رنگ ڈھنگ میں [illegible] اس پر عاشق ہو جاتے جب کمانے لگی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آگیا ہے عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے ۔ ناچ رہا ہے [illegible] عورت ڈاکٹر بن گئی جیتے جی مارے حیرت کے ٹھکیں چھپکانے لگے۔ عدالت میں وکیل مخالف [illegible] کے مارے تھانیدار کا دم رہ گیا [illegible] عورت آ رہی ہے: دیکھ گھبرا کر الٹے لگو اور ادھر ادھر میدان [illegible] اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ بھلا دل کی دنیا کیوں نہ تاراج کرتی لہذا مرد وقت [illegible] کی مچا دی

تو ــــ ہر کاؤ ہیروئن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند بالکل لیڈروں کی طرح چاروں [illegible] مارنے لگی ۔ اب تو مذاق کی حد ہو گئی جو کونین کھلاتی تھی تیر لگاتی پھرتی کوئی معاملہ نہ تھا یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے ۔ چوکیداری کرتی تھی ۔ ذرا سی بات پر آنسو سے بہانے لگتی تھی۔ مرد بن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا کہتی تو اپنی دست نگر! اپنی بی بی بھی کبھی نخرہ مارتی ہے مگر خود کے کھانا نرم گرم جسم پیروں سے رگڑا منا بھی تو سیتی ہے جیش بھی کرتی ہے۔ خرچ ہے تو کیا ہے تو اپنی۔ ہم سے تو مانگ کر اتراتی ہے۔ سارے ہی جیبوں سے تو کھلا کھلا کر پیسہ نکالتی ہے لیکن یہ بالکل مردانہ وار اقتصادی دنیا میں خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کہہ کر گھسیٹ لے جاتی ہے یہ تو سر سر ڈاکہ زنی ہے ... صاف دھوکہ ۔

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی یہ ہیروئن ڈائن بن گئی ۔ بہت سمجھایا، صاف صاف دکھا دیا کہ ایسی خود سر اور خود مختار عورتوں کا بڑا بدانجام ہو کے حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ساری دنیا جہنم میں ہو کتی ہے ۔ دفتر میں کلرک بہلائے جاتے ہیں ۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹر روگ لگاتے ہیں۔ اسکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی: اسکول میں لڑکی کو کم از کم ایک بار ضرور ناجائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے پڑھنا لکھنا کچھ نہیں صرف عشق بازی سکھائی جاتی ہے: شرم دلائی: بیٹیوں اور بیویوں کی کمائی کھاتے ہو ۔ ڈوب نہیں مرتے ۔ یہ ماسٹر دیکھئے ہیں کمائی جیسے چرغ گھر ہر ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے ۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے بس استاد اور طالبہ کے پرسوز عشق اور عبرت ناک انجام سے پر نظر آئے گی۔

جتنا یہ ادب بھی اپنا اثر دکھاتا اور ہیروئن واپس بیسوا کے چکلوں میں سرنگوں ہو کر بیٹھ نہ جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ بازار میں ضرورت سے کہیں زیادہ
سے زیادہ لڑکیوں کی مانگ ہو گئی۔ اگر ایک گریجویٹ بیس روپیہ کماتا تو ڈاکٹر ایک سو میں بیتی۔ جوں جوں تعلیم نسواں کا رواج ہوا گھٹی تعلیم مردوں میں مقبول اور
بے کار ہو گئی۔ ہیروئن نے پردے سے باہر بیٹھنا جان لیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کشمکش شروع ہو گئی۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ بڑھی ضرور مگر اتنی
نہیں جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی لکھتی پڑھتی تھی اب گلی گلی گریجویٹ اُگ آئیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری
مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کے لیے کم از کم آئی سی ایس یا پی سی ایس تو ہو، گزشتہ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا قحط پڑ گیا۔ تو یہ
مصیبت کیوں نازل ہوتی۔ یہ گنے چنے افسر تو جہیز کی ڈالیوں میں زیر و زبر ہو کر رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی وہی لے اُڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجویٹ اور
تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس انتظار میں کہ کب گزشتہ افسر ... مختلف شعبوں میں ... اس سے یہ نہ سمجھا چاہیے کہ افسروں
کی تعداد کم رہی تو کلرک، اسکول ماسٹر، ناکام اور اجڑے ہوئے ڈاکٹر نہیں پیدا ہوئے، وہ تو بڑی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بے چاروں
کے پاس دو راستے رہ گئے یا تو جاہل لڑکیوں سے سر پھوڑیں یا امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیلی عشق کر کے زندگی ان کی یاد میں گنوا دیں۔ جنہوں نے
دل پر پتھر رکھ کر معمولی ان کی جیسی بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکیں۔ زندگی بھر ہم خیال و ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں چھپائے اپنا سا، اور جو زیادہ
ہمت والے تھے وہ پڑوس کی کبھی کبھی نظر آ جانے والی اپ ٹو ڈیٹ حسینہ کی آگ میں سلگتے رہے۔ آخر لڑکی تعداد میں زیادہ بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں
اور مرد پیدا ہوتے رہے اور دنیا میں رہتے رہے کیونکہ دوسرے کے لیے نہیں بلکہ موزوں رشتے کے لیے۔ بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑے کے تھان
پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہوں۔ ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیوں اور کھانوں کے انبار موریوں میں انڈھائے جا رہے
تھیں۔ اور دوسری طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھر جاتے ہیں سڑکوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھتی
جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کر کے بیچ میں چال چلن کے پہرے دار بٹھا دیے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ
گئیں اور لڑکے حیوان بنتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ انسانیت زیادہ بھوکی، منحوس اور غیر انسانی بنتی گئی۔ اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کی چھپی دبی
خواہشوں کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس نے جو پہلا کام کیا وہ تخریب تھا۔ بڑھتے گھٹتے ہوئے جڑ کاٹنا، اکھاڑے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے۔ پرانے مکان کو
ڈھا کر ہی نئی کوٹھیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری
تھی گھر میں اپنی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ پاسبانوں نے۔ لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا۔
گرہستی ہیروئن کے راج میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی۔ ناقدری اور دھتکار نے اسے صورت سے بے صورت کر دیا تھا۔ کچھ دل ایسی ہو کر نکاح کر
بیٹھی تھیں۔ کچھ لمبی چوڑی دکانیں لٹا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچہ لگا چکی تھیں۔ کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا۔ اور جیسے طوائف ہیروئن سے مرد کو چھیننے
کے لیے گرہستن نے گھونگھٹ اٹھایا تھا۔ آج اس نے اسی چھینے ہوئے آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی گرہستن نے اس کے چھنکنے اور بناؤ سنگار
چھینے تھے آج اس نے گرہستن کی بے چارگی اور بے کسی کی آڑ لی اور سوائے بالکل نچلے طبقے کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا اور جب یہ باغی طبقہ
طوائف کی تلاش میں نکلا تو اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا۔ طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہی تھی بلکہ بھوکی کمینی بلی بن
گئی تھی۔ سوائے فقیروں اور یکہ تانگہ والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا۔ اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو شعروں میں پرو ڈالا
قصیدوں میں گوندھ کر، ناولوں میں سجا کر ادب کر اس کی لونڈی بنا دیا اور پھر جو بھولے تو ایسا بھولے کہ لوٹ کر خبر بھی نہ لی۔ گھر میں نل لگ گیا تو میٹھے پانی کی کنویا
کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن بن گئی۔ اور اب وقت پڑا تو اسی کے کنارے پیاسی زبانیں نکالے ہانپ رہے ہیں۔ یہی نہیں

بلکہ سوپنیلی ہے کہ کرمنا ن کرانے پر تلے ہوئے ہیں گو یہ اندھا کنوں دوبارہ کارآمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مرمت کا طالب تھا چنانچہ باغی طبقہ اس کی حمایت میں چیخ پڑا۔ پکار پکار کر اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر بج بجا رہا تھا۔ غریب مزدور اور جوان اس طبقے کی حفاظت کرانا کو اپنا فرض سمجھتا تھا جس کی تھی۔ اس کے عالم آشکی بھی۔ اسے ساحس اور تمام لطافتیں اس کھیال اور دقیق میں نظر آتی ہیں جس نے دیا ہوئی غلاظتیں مذب ہو چکی تھیں۔ گر جو آ ل سکتی تھی۔ ناقدری کی وجہ سے وہ گر گئی تھی اور اسی کے کرم کی محتاج تھی۔ شریف عورت اس نوجوان کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ اس نے جاننے کی کوشش کی۔ اس کی نظروں میں وہ صرف ایک نمک مرچ تھی جو گوشت اور ہڈی کی مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو گناہ اور عشق کو گناہ سمجھتی ہے۔ جو محبت کرنا ہتک سمجھتی ہے، اور مرد کی حفاظت اپنی توہین۔ اس میں عام طوائف جیسی لذت کہاں کہ جاذبیت کہاں۔ عام طوائف سے وہ طوائف مراد نہیں جو بڑے آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ گندی بھولی کنتی جو راہ چلنے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگڑا بنا دیتی ہے اس کی گندگی دو علاقت کھن لگانے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر سامنے مکان میں نالی سڑ رہی ہے تو یہ اس بیچاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے۔ اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی۔ صحت گندی اور بیمار رہتی اور خطرناک ہے تو اس کا قصور نہیں بلکہ اس نظام کا قصور ہے جو انسانیت کی اس بے قدری کرتا ہے۔ [illegible] ان سے طوائفوں کا علاج کرکے سماج ایک متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبیعتوں پر برا اثر ڈالا مگر اس پھوڑے کا مواد نکال جانے سے دنیا کے کتو لے [illegible] بہت۔ کچھ مٹ جانے کا امکان پیدا ہو گیا طوائف کیسی ہی ذلیل ہو، ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے اسے برا کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے۔ وہ جو دنیا کے ہر دکھیا سے کا سہارا، ہر بھوکے کا دستر خوان ہے۔ وہ بے شک عورت نہیں مگر اس سے بھی زیادہ کارآمد ہستی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کا نوجوان گرہستی سے زیادہ بازاری مال کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے دور اور یہ قریب ہے۔ سے لیا غرض جو تعلیم نسواں نہیں ہوتی یا ہوا میں جن بیابی سوکھ رہی ہیں یا میاں بیویوں کی ناکیں کاٹے ڈال رہے ہیں اس کی بلا سے دنیا بھر بیوہ ہو جائے اور عورت بنتے پا رہے۔ دیکھئے نا آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا بھی نہیں کرتے کہ اس سال ٹڈی کی وجہ سے دلکش پھولوں کے عمدہ بیج نہ بوئے جا سکے اس لئے اس سال تختہ گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی ضرور صاف ہونی چاہئے۔

اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک، عریاں اور مکروہ کہے زمانے نے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی ترتیب دی ہوئی ڈھالی ہوئی اینٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ پا گئی۔

یہ تو ہوئی ہیروئن سرشار کی نازو ادا بھری نازنین، جسے دنیا میں سوائے کھانے پینے اور عیش کرنے کے کسی بات کی فکر نہیں ——— میں نے غلط لکھا ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے فارغ البالی کا۔ پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت، اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بیوہ۔ یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش کا اور سدھار کا۔ پھر لیجئے مزاح نگاروں کو ——— یہ ہنس گئے اور ہنسا گئے۔ چڑیا سی مگن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادھو لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے تنے جانے والوں سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونروں کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں مس حجاب کی بے دقوت، کاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہوں سے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا ——— جہاں حسن و عشق کو بناوٹ نے اڑ نہار کھا ہے۔ یہ زمانہ ہے ما حول گرا در لٹنے کا۔ اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن، منٹو کی جیتی جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی، عصمت کی بے چین منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی، ستیارتھی کی خانہ بدوش، عسکری کی فلسفی میم صاحب ——— یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا، کچھ تعمیر کرنے کے لئے جد و جہد کا، کچھ مٹانے کے لئے اور کچھ بنانے کے

لئے دین و دنیا کو چوپٹ کرنے کا۔ جیسا کہ موجودہ فضا سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے یا شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے۔ اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم بلکہ صرف ایک عورت ہوگی۔ اور ماہرین دیوداسی کے بجائے ادیب اسے عورت کا رتبہ ہی بخشیں گے اور پھر تعمیر شروع ہوگی۔

(ایک بات)

---

custom to re-marry should live in misery, if jealous husbands should chop off their wives' noses. It would matter little to him if all respectable women were widowed or if the whole of their tribe was wiped out. It is the drain in his own neighbourhood that he wants cleaned up. Whether the flowers in other people's gardens bloom or not is a matter of complete indifference to him, for in any case he has no access to such well-kept places. The heroine of present-day fiction may be an unclean outcaste. Nonetheless she has been shaped and moulded by the vicissitudes of life itself and it is good that she has at last caught the artist's eye.

Faked Romance

Well, such is the story of our heroine. We have seen her as Sarshar's alluring courtesan, who ate and drank and was merry without a care in the world, except the worries of love-making. That was in the age of grace and good living. Next, we met her as "Prem Chand's" obedient housewife and Raashid-ul-Khairi's pathetic, downtrodden widow. That was in the age of economic stress and social reform. Next came the humorists, full of fun and laughter, complacent and static. And then the period of drowsiness, in which the sadhu's young daughter of M. M. Aslam's stories wandered dreamily on the banks of brooks, singing among the butterflies and dallying with the passers-by, and Hijab's stupid, indolent and futile maidens swooned away at the sight of a mouse and lived in a world of faked beauty and faked romance. And now, in our own day, we see our heroine as the living woman in Krishna Chandra's stories, as the business like woman in Bedi, as the lively, impudicious, common harlot in Manto, as the restless, outspoken unblushing girl in Ismet, as the nomad in Satyarthi and as the philosophising mem-sahib in Askari -- all pointing to the fact that ours is the age of conflict ; of the struggle to live; to shape and to build , to destroy, in order to create ; an age, in which everything between heaven and earth must be evaluated anew.

In fiction, woman is invested with a power greater than all other forces of nature, second only, if at all, to the Almighty. We must wait and see what role is assigned to her in the days to come. As far as one can peep into the future, the heroine of the coming age will be neither tyrant nor martyr, neither goddess nor hell-hag. She will be just a woman and writers will proclaim her as such. When that happens, the foundation of our fiction will have been well and truly laid.

had once borrowed her allurement and charm, she now adopted the submissive ways of the homely woman So much so that unless she was the lowest of the low, it was difficult to recognise her as the prostitute. When the rebels at last sought her out, they were shocked to find her sunk so low that only the beggars, the coolies and the tonga-drivers knew where she lived. She was no longer the sweet little songstress of Sarshar's novels, but only a mangy and mean-looking cat rummaging about in the refuse heap. In the days gone-by, when man depended on her for his moments of supreme joy, how he had extolled her in prose and poetry, how fiction had paid homage to her charm and beauty! And how man had cast her aside now! Having installed a water pump in his house, he had let the wells of sweet water fall into disuse, till they were infested with reptiles and vermin. Panting with thirst, with his tongue hanging out of his mouth, he now returned in his desperation to the same wells.

Young Crusaders

Not only did he return, but he demanded that the municipality should clean them up and keep them in good repair. For, such a lot had to be done before the prostitute could once more become useful to him. So the rebels vehemently took up her cause and exposed this festering sore to the gaze of the world. Impecunious but spirited young men crusaded for her, for she, whom no one else seemed to want, could be a great source of comfort to them. They discovered all the beauties of the world in this wretched, down-and-out, fly-blow street-walker who lived in such filth and squalor because she was about the only kind of woman they could consort with The respectable woman had so far receded from their life that they hardly knew anything about her and cared even less To them she was just a snooty, selfish sham of a woman who was outraged at every offer of love and indignant at the suggestion of male protection She lacked the squalid fascination of the harlot—not this time the demi-mondaine who scintillated in the highest social circles, but the hungry, street-bitch who tugged at every passer-by's leg and gave herself to every one for a handful of coppers. Her squalor, they argued, was not something to be shunned but a wrong to be redressed. If she had no morals or scruples, if she was filthy and disease-ridden, the fault was not hers but of the social system which permitted human beings to sink so low The new writers, by dwelling on this theme, did a great deal of muck-raking which offended the fastidious, but they helped, nevertheless, by their frankness to lighten the burden of human misery However disgusting the prostitute, she is after all part of our life and one cannot ignore her simply because she is unpleasant to contemplate. Because she is the common refuge of many frustrated and hungry men, because she is there for any one to have, the world denies her the status and dignity of woman. But she is even more useful than an ordinary woman. That is why the young crusader of to-day is more solicitous about her well-being than about the welfare of the woman-in-the-home whom he finds so aloof and remote. It is of no concern to him if women's education should not make much headway, if thousands of widows forbidden by

New Problem

In time, the supply outstripped the demand. There was a time when you had to go far to find a girl who had passed her school, now you found a whole crop of women graduates jostling with each other in the marriage market. This created a new problem. How could an educated woman marry any one who was not, at least, a civil servant? But Government unfortunately had forgotten to arrange that the number of its civil servants should keep pace with the number of educated women waiting to marry them. There was, therefore, a regular scramble for each eligible young man that appeared on the horizon and after he had been grabbed by the highest bidder, the rest of the crowd of women graduates returned to their perches and lay in wait for the next taking up various jobs in the meantime

In the world of men, on the other hand although civil servants were few and far between, ill-paid school teachers and penniless doctors were rapidly growing in number. These unfortunate men had only two courses open to them to marry some uncouth simpleton and be miserable for ever, or pine away, dreaming of a life of eternal bliss with this or that woman of education, refinement and charm Some did both. They married as the fates ordained and at the same time continued to torture themselves with dreams of the ideal soul-mate. Most of them, of course, just fell in love with the chic young lady in the neighbourhood, who though utterly unapproachable was at least occasionally visible in the flesh.

So our world filled more and more with men and women whom nature had made for each other but whom the match-maker could not "suitably" pair off. It was a scene of poverty in plenty warehouses full of cloth and the streets full of naked people, food over flowing into the gutter and people starving by the thousand, all the men imprisoned in one cage, all the women in the other and Mrs-Grundy standing guard in the middle Young women languished and became faded old maids, young men became sex obsessed brutes, and the pangs of hunger dehumanized both and warped their souls.

At last the pent up forces found an outlet. These stresses and strains threw up a band of rebels, who set out to destroy, to uproot the old tree and plant a new one in its place, to demolish in order to build afresh. They first crossed swords with Mrs Grundy. She would not be easily bound and gagged. But what finally defeated their efforts was the impassable economic barrier that stood between them and the women of their choice. Thwarted and frustrated, man once more returned to the courtesan's bosom.

But the great courtesan of the early days was now just a common harlot. Gone was her glamour, for during the reign of the domestic heroine, she had been robbed of all her glory, and poverty and neglect had put their hideous stamp on her face. Some had sought refuge in marriage, some still plied their trade in the gutter, others camouflaged themselves as respectable women Years ago, the woman-in-the-home had thrown aside her veil to win back her man from the courtesan. The bankrupt courtesan now picked up this discarded symbol of modesty and tried to disguise herself in it. Just as the respectable woman

Unperturbed, the woman not only kept her hold, but set about tightening it, if she could. She discovered, for example, that her economic dependence on man was a bad chink in her armour which she must close up She started in a small way, by taking in the neighbours' needlework, but very soon was found crawling about in every corner of the career market. The novelty of this role added to her charms. Let woman but appear in a new guise and even the husband would fall in love with her. She became a school-teacher and the old mullas gaped at her in wonder. She became a doctor and ancient apothecaries could hardly believe their eyes. She pleaded in law courts and men in the profession stammered and spluttered in her presence. The advent of the career woman was like a grand circus come to town: every one leaned out to watch and stare. Men shouted: "Look out, for there comes the New Woman", and fled in confusion. She advanced steadily and conquered new fields The more she cut into men's wages, the more she captured their hearts.

This was too much of a good thing This wage-earning heroine, physically fit and mentally alert, waylaid man like a brigand, So long as she was just saucy and pert and boisterous, she was rather delightful. Even if she was spoiled and moddlesome and difficult to shake off and somewhat of a nuisance, as long as she depended on man for her bread and butter, she was quite acceptable. Now and then, perhaps, she put out her claws but in the end she always made up for it by rubbing her soft body against his legs and putting him into good humour again. Vain and extravagant, she was nevertheless man's property, proud to live on his charity and willing to pamper him to earn her keep. For her, now, to fight man as his equal in the economic field and to cheat him of his last superiority over her was sheer highway robbery !

In fact, she became quite a terror and writers felt called upon to point out the error of her ways. They told her that independent women always came to grief; they were ravished, had illegitimate children, were seduced by clerks and doctors and school-teachers with whom they came into contact, were shunned and despised by society. They put husbands and fathers to shame for living on the earnings of their wives and daughters. They warned parents that in the schools and colleges, their daughters would learn nothing but lovemaking and would end up as unmarried mothers, for these weedy-looking school-masters were all gay Lotharios in disguise Every other story written during this period is at pains to show how the school-girl and her teacher succumb to temptation, have a passionate affair and come to a pitiful end.

Deterred by this type of fiction, the heroine might have returned to her husband like a penitent who had learnt her lesson, but for some reason, just about this time women began to fetch higher salaries than men, which enabled our heroine to consolidate her newly acquired position. As education paid higher and higher dividends to women, it became less and less profitable to men.,

Her success at first was partial, for though the courtesan had retreated, the field was held for a while by the Occidental and the Parsee, both of whom were regarded as "fashionable" types and had worked their way into many of our stories. But she, who had vanquished the courtesan, was not likely to be daunted by these. She knew, of course that as long as she stayed at home, there were dangers abroad that she was unable to avert. Confined to the four walls of the house, how could she dispel the loneliness that man would feel away from home? For, when on his jaunts, he rather fancied a woman in one hand as much as he fancied a walking-stick in the other. She was the tonic for domestic use only; how could she sustain him during his business hours, for example? True enough, as a temporary expedient, man did cast hungry looks on the typist girl or the manager's beautiful daughter, or found others to warm his blood. But the domestic heroines of such novels of the period as *Godari ka Lall*, *Raushanak Begum* and *Zohra Begum* kept up the fight and very much held their own against such pirates.

The role of the docile, homely woman does not, however, seem to have satisfied her for long; for, in the next phase of her career, we find her very much bolder than she had ever been before, archly flirting with her cousins, with her cousins' friends and with the neighbours. She was now transformed into the saucy, boisterous, unabashed, self-assertive female that we find, for example, in Azim Beg's stories. The fact that she was still very much the woman in-the home living in purdah, added piquancy to the situation and made her sportiveness even more devastating. Beside her fetching ways, the erstwhile charms of the courtesan appeared commonplace, and "Prem Chand's" submissive and goody-goody heroines, insipid and irritatingly inane and their humility almost contemptible. The docile heroine now gave place to a much more robust and hearty female. True, she was unlettered, with no claim to grace or refinement, but she was full of crude vitality and primitive fun. She slapped and kicked and punched and played practical jokes and was up to all sorts of pranks. To the man with the modest income, such a vivacious wife was a great source of joy, brightening up his little home and lending colour to his dreary existence. Life for him had, indeed, become heavenly.

Willing Victim

The male, it is true, is ever the willing victim of the female. After all it was he, who finding even Paradise desolate without her, made her out of his rib. How gladly he hands over the reins to her, be she courtesan or wife, and follows her around. The harder he is driven and the more he is pulled about and whipped, the happier he feels. But once in a while, the limit is reached and the woman turns. It was all very well for our domestic heroine to be the queen of his heart, but when she entwined herself round him and began to bully and dominate and tantalize him and stood guard over his every word and act, man was exasperated. The first groan was at last heard in "Patras," and, later, Azim Beg and Shaukat Thanvi and many others joined the chorus. Before long, our fiction was crowded with male characters like Chacha Chhakkan, Munshiji, Mirzaji, etc, all of whom raised their voice in protest against woman's tyranny.

in those days were household drudges They were the unappetising housewives and dowdy maids-of all-work, from whom men turned to courtesans for heartsease and pleasure. The courtesan of Sarshar's days was not just a vulgar mercenary. She lived as graciously as any red-blooded lady, except that she was even more refined and possessed greater wit and charm and gaiety. She was the town-garden, maintained by public donations for the pleasure of the community. Not every one could afford a fine house, adorned by an accomplished and elegant wife, flower-decked and attar perfumed. So man adopted a convenient formula for smooth living—in the home, the wife to bear him children and to minister to his daily needs; in the street, the courtesan to appease the hunger of the soul A most useful compromise ... that could thus accommodate both the domestic ideal and the romantic urge.

Jealous of the courtesan, the woman-in-the home grew restive. When man was away from home seeking joy in the arms of the courtesan, she made eyes at the neighbours. Those husbands who had already found the public garden an expensive resort, promptly returned home, arguing that after all the little that belonged to you was better than the much that belonged to all. Having won the first round, the woman-in-the-home gained a new confidence and proceeded to fight the courtesan with her own weapons.

Woman Stoops to Conquer

She proceeded slowly and with caution. At first, she stooped to conquer and insinuated herself into man's affection by following the path of docility and self-abasement In time, Sarshar's impetious courtesan was vanquished by "Prem Chand's" homely woman, and henceforth this soft treading, feet-kissing, modestly-veiled, obeisant creature was found crawling shyly across the pages of fiction Those who used to feast their senses on the riot of colour in the public park, were suddenly attracted by the modest little violet growing in their back garden Surprised, and somewhat proud, to find it there, they began to tend it with gentle care and affection. The courtesan's sway was seriously challenged. Her blandishments were now found to be distasteful and her charms, which had once enslaved the hearts of men, were put down as mere tricks of the trade The water-pump in the public square was contaminated, declared the male—and began to dig a well in his own courtyard. But every day, the well became deeper and deeper, till at last man lost his foot-hold and began to drown.

This stung the courtesan to exasperated fury But her day of glory had passed While she had been resting on her laurels, the modest, ingenuous, homely female had stolen a march over her by using weapons both old and new. On the ruins of the courtesan's world, the woman-in-the-home built her tower of victory and reigned supreme. Men who used to crush her under foot, now took up cudgels on her behalf. Chivalrously, they pilloried themselves and railéd against their own kind for their past neglect of her. She watched this tournament with quiet confidence and took no sides. The docile believer in ahimsa fought no one, but just as Gandhiji exasperated the rulers by his acts of renunciation, she, with her downcast eyes and submissive ways, confounded the enemy from behind the veil.

"YOU clap with two hands, not with one," says the proverb. In literature, the two "hands" are the hero and heroine of fiction No doubt there is a type of literature which does without them. But that is like striking your hand against the sole of your foot—you make some noise which echoes within the pages of the book, but seldom travels beyond them to the common reader Banish the hero and the heroine and most literature would be hard to swallow and would stick in the throat like dry bran

Make a performing monkey and his mate dance to the rattle of a dugdugi and you collect a crowd Preach and exhort and you lack an audience People never take kindly to the mosque and the school. So when you have something to say, you lead forth the performing monkey and his mate on a string and rattle the dugdugi You exhibit the tactics and exploits of the hero and the heroine and collect a crowd You tickle the senses and seduce the emotions and thus achieve your end In short, you employ the same stratagem as the wise instructor who wins over his pupil by pretending that what he is about to teach them is just another game, like kabaddi or tip-cat. Sugar-coat the bitterest pill and people will swallow it with delight.

Literature Wedded to Life

How else should the ancient *Mahabharata* and *Ramayana* be as fresh after all these centuries as though it all happened only the other day? Azim Beg Chughtai tried to abolish the purdah by quoting from the Quran and only drew the imprecations of the maulvis on his head. But in *Sharir Biwi* and *Gul-tar* how easily was the veil rent with the help of his lively heroines! Were it not for their heroes and heroines, Raashid-ul-Khairi and "Prem Chand" would now be rotting on the musty shelves of libraries instead of living in the hearts of men. Literature is wedded to society, to history; in other words, to life. Part them asunder and they both wilt and die. Banish the hero and the heroine from literature and you banish life, leaving a void behind

Of the two, I wish to talk of the heroine and of the social level at which our fiction found her from time to time. For, she is like Jamshed's wine-bowl in which the whole universe and all eternity were reflected. Fix our gaze on her and the entire economic, social and political panorama of her age unfolds before our eyes.

Look, for instance, at the heroines in *Fasana-i-Azad*. They leave you in no doubt that the woman who really mattered in that age was that embodiment of refinement and charm, the courtesan. This is only to be expected, for where could Sarshar have come across a respectable woman in those days, above all a respectable Muslim woman? Respectable women

THE HEROINE IN URDU FICTION

By
ISMET CHUGHTAI
Translated by
A. S. BOKHARI

As a writer of short stories in Urdu, Ismet Chughtai is well known for her studies of middle class life, her intimate knowledge of woman's mind and her pungent prose. This is one of her critical articles appearing in her latest collection " Ek Bat ".

قدیم یونانی حکما اور ان کے خیالات

(۱)

مغربی فلسفہ کی تاریخ کو عام طور پر حکماء کے اس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر ملیطس میں آباد تھا۔ یہ حکماء مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہ عالم کون و فساد ہے۔ اشیاء ہمیشہ اور لگاتار بدلتی رہتی ہیں۔ تغیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وجود میں کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی۔ اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل نئی ہو کر ظاہر نہیں ہوتی اور نہ کبھی فنا کی انتہا ہی پہ پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر یہ تغیر کس چیز کا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جو مختلف شکلوں میں آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کون سا ایک مادۂ بنیادی ہے جو تغیر پذیر ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک عقدہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکماء نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے طالیس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد انیکسی مینڈر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ مادہ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ انیکسی مینیز نے اس کو اجزائے ہوائی بتایا جو لطیف حالت میں حرارت پاکر آگ بن جاتے ہیں یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر ملیطس کو تاراج کر دیا اور حکماء کے اس گروہ کا [illegible] ملیطس میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں ملیطس سے کچھ فاصلے پر شہر افسس میں ایک فلسفی ہرقلیطس نامی موجود تھا جو ملیطس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلیطس کو دنیا کی سب باتیں قابل تاسف و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اسی لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دیمقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ اس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلیطس کے نزدیک کائنات کا مادۂ بنیادی آگ ہے۔ وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اسی مادی آگ کا ایک حصہ ہے۔ جس سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا [illegible] خیال کی اس بے ترتیبی اور بے نظمی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخِ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اس نے بہت زور دیا ہے وہ مسئلۂ تغیر ہے۔ تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ اجسام و اشیا کی حالت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی مسئلے کی وجہ سے کلام کرنا ترک کر دیا تھا اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اس جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے —————— کیونکہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی دریا سکون کی حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بجائے ایک دریا ہونے کے ایک نیا دریا بن کے ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلۂ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قرطائیلس نامی ایک فلسفی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قرطائیلس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے۔ اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قرطائیلس کا شاگرد رہا تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سنا اس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہرقلاطیس اور اس کے پیرو مسئلۂ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ان معنوں میں قائلینِ مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور آخر میں اس نے منزل پر پہنچنے کے لئے جو راہ اختیار کی وہ ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ ان کا حال ان کے ہمعصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے حالات زیادہ تر یا تو ارسطوفانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا تو پہلی دفعہ یہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطوفانیس، زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اس کے اپنے استاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے

بنائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسٹوفانیز نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہلِ ایتھنز کا ماننده ہو کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور یہ منطقی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از حد مضر ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفن سقراط کو ایک کامل روحانی مددگار، پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک بے جا نمونہ اور ان تمام لغو وسوسوں اور خیالات کا جو توہم پرستی اور گمراہی کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کن کن مختلف زاویوں سے خیال سے ایک ہی شخصیت کو ان دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں ایتھنز جیسی بستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں بجلی کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی جن کو اس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔

وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہیں۔ سقراط منطقی یاوہ گو نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اس کو الہام ہوتا ہے۔ اور خدا نے اُس کو ہدایت بنی نوع انسان کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی طاقت بخشتا تھا۔ اس کی آزاد زندگی اُن تمام بندشوں سے خالی تھی جن کی وجہ سے ایک دنیا دار پابہ زنجیر ہوتا ہے۔ اس کی روش میں غضب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلیٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اس کے معتقدوں کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخربِ اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلو ہرگز نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون، زینوفن اور افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہلِ حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگر چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کرا سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا۔ مگر اُس کے پیروؤں میں سے اکثر ایسے متمول تھے جو اس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہتا تو اُس کی ایک جنبشِ ابرو کی تعمیل میں اُس کے بے شمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقیماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا۔ اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اُس پر لگائے گئے ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا جنھوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے بذاتِ خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اُس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبطِ نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بدعنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلنے لگے۔ اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصدِ اعظم سمجھ کر اُسے ہمیشہ اپنے مدِ نظر رکھنے لگے۔ تخریبِ اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایامِ جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی۔ جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اس کے مشہور جانبداروں میں افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا۔ اور زینوفن ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں شامل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

ہیراقلیطس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اشیائے تغیر کی وجہ سے اُن کا علم بھی ہر لحظہ متغیر ہونا چاہیئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اُس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم آئندہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پہ پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" کہتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس گروہ لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں کوئی قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی تمیز نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے۔ جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے، وہی فعل بعض اور واقعات کے باعث "بدی" ہو جاتا ہے۔ جس پر خطر زمانے میں ایسے بیہودہ خیالات سے وابستہ مرد زندگیوں کے عقیدے سے متزلزل ہونے لگتے۔ اور اخلاق انسانی ایسی ہی بحثوں سے معرض خطر میں تھا۔ اس وقت سقراط آگے بڑھا اور اس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس نے کہا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے کسی اور حالت میں برا ہو۔ اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے۔ مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری جانچنا چاہیں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے بے خبر ہوں۔ اس طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں"۔ مگر ہم یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے"۔ کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف تھے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے۔ پوری طرح واقفیت ہو۔ مثلاً سچائی، انصاف، بہادری وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں کی توضیح کریں"۔

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف، بہادری وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور ان کے معنوں کی تحلیل ان کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے۔ افلاطون کو اندھیرے میں سمت ہدایت دکھائی۔ ہیراقلیطس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رخ تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے انوار ادراک سے نابود کر دیا۔ یہ حقائق "محسوسات" کے نمونے سے باہر ہیں۔ اشیا کا احساس ہمیں اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اُن موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی مثال ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذات خود ادراک سے تعلق ہے۔ نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ سوائے محسوسات کے علاوہ جس میں اشیا ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ایک اور دنیا حقائق ابدی کی بھی ہے۔ اور ان حقائق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے۔ عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقت ابدی ملحق ہے۔ اور جو اوصاف ہم عالم متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں۔ اس میں اس حقیقت ابدی کا علم صحیح مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے دائرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بہ آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا۔ اور اس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط ا ب خط ج د کے مساوی ہے، مساوات کے علم کو تسلیم کرنا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقت ابدی ہے۔ جس کا احساس حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے "مساوات" بذات خود موجود

کل مجموعہ آج بھی ہے۔ اور کل بھی رہے گی۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہو جانے دو خطوط ... درحقیقت اس میں برابر ہیں۔

یہ مسئلہ حقائق ابدی، افلاطون کی تعریف والے ... کا بنیادی ہے۔ ... معانی کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا ... ہے۔ مگر ... زبان میں موجود ہے۔ ... جن معنوں میں اطلاق ہوا ہے ... استعمال کیا۔

(۲)

کچھ کہنا مشکل ہے کہ ... وہ ایک مستقل حکمت ... ایک شخص ... سے روشنی ... تھا۔ ... یہ کہنا غلط ہوگا
کہ ہر قلاطینس اور ... کے علاوہ ... نہ دماغی تعلیم۔ نہ اس نے ... خوارزمی ... کو ... ایک گروہ ... کو ... عشق
اس نے ... فیثاغورس سے ... تقریباً ساٹھ سال
پہلے جزیرہ ساموس ... جہاں سب سے پہلے ... کیا کرتے تھے
... مشہور ہے۔

فیثاغورس نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی، جس نے کچھ عرصے کے لئے ... کی حکومت پر غلبہ پایا۔ ... زمانے
... سے ... کی ... عقل سے ... مطلب
محض ... گو ... ایک طرف ... لوگوں کے اعمال اور خیالات
... اور عقیدۂ دوام روح سے ... اور انسانی زندگی کی
... دلوں میں ... کے دل نشین کیا ... اور ... حرمت
... ایک ایسی حقیقت ... جس ... کی تمثیل کسی
... کی طرح فیثاغورس علاوہ حکیم ہونے کے ... سمجھا جاتا
ہے ... افلاطون کے زمانے میں فیثاغورسیوں کی شہرت ... حیثیت ... دماغ
... کے انتقالات پر غور ... کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ ... ریاضی دان اور موسیقی ... جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثاغورس ... نے افلاطون پر بہت سا اثر ڈالا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان تھا کہتے ہیں۔
... کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا ہو اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ ... حقائق کے ابدی حقائق
کے موجود ہونے کا ... فیثاغورس بھی اپنے عقیدے ... ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل فیثاغورس کو
اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار سُروں کے تناسب پر ہے ... ساتھ جب جیسا ...
کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے ... مظاہر قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطابق دیا گیا تو اس خیال کو اور
بھی تقویت مل گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائق ابدی میں علاوہ اعداد کے اور بھی کئی باتیں شامل ہیں۔ مگر افلاطون اور
افلاطون سے بڑھ کر اس کے پیروؤں کی یہ عادت ... جہاں تک ممکن ہو سکتا ... فیثاغورسیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات

میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائقِ ابدی اور فیثاغورس کے عقیدۂ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائدِ روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائقِ اعلیٰ کی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل و ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی، تغیر پذیر، مادی دنیا کے درمیان حائل ہے۔ علاوہ ازیں یعنی موخر الذکر دنیا کے متعلقات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے ——— یہی ایک ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے۔ یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) جو ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی کارپردازی یہ ہے کہ وہ کیفیتِ نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقتِ ابدی کو سمجھتا ہے تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہ روح بھی ان حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افراد کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور ان کے لئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ سلسلہ اور روح جو اس انتقال لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روحِ کائنات تھی نہ زید، عمر، بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوئی ہے۔ اور نہ صرف حقائقِ ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ ان اوہام اور خواہشات کا منبع بھی ہے جو ہمارے مادی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفترِ خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف ان نتائج کا نام ہے۔ جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر فلسفے سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق ان غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو ان کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علمِ حقائقِ ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔ یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے۔ جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہیئے جس کی کوئی بات علمِ حقائقِ ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہیئے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا؟ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات درجۂ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس ذاتی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ غالباً یہ بات اس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اسے بھولا ہوا تھا۔ جب اس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اس کی یاد تازہ ہو گئی اور اس نے فوراً صحتِ حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا۔ کہ ہر ایک روح جون بدلتی رہتی ہے اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ، بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیروؤں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے کبھی ایسی نجات کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورثیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقۂ ایلیائی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلاطیس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس کے خیالات ہرقلاطیس سے بالکل ہی متضاد واقع ہوئے ہیں۔ ہرقلاطیس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا۔ وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب کبھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقام ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب نوع سے کوئی محل ایسے لاموجود شے ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدیس کا یہ خیال تھا کہ جیسے خلاء لاموجود شے ہی ہے جیسے کے محل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیستی بھی ہستی میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیستی کا محل وقوع تصور میں آنے سے انکار کرنا ہے۔ جس چیز کو تصور سے گریز ہو اس کی حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت، انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر، غیر متحرک، ناقابلِ انفعال حقیقت ہے جس کی وسعت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سالم ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلوّن نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس یک رنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہیے۔ سو فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش سے رہائی اور مکمل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بے دردی سے پامال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ حقائق کی رو سے ہر ایک حقیقت ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الوجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلوّن اور سراپا فریب نظر دنیا سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدتِ حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرتِ حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالم حقائق ابدی اور عالم محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے۔ علاوہ بریں افلاطون عالم صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالم صوری ہست و نیست کے درمیان ایک برزخ ہے کیونکہ اس کا وجود تو یقینی ہے۔ مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل تہی از حقیقت، عاری از وجود اور نیستِ محض خیال کرتا تھا۔

فرمانیدیس کا حرکت جیسے امر واقعہ سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا پھیر معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ عدم حرکت کو خلاف قیاس سمجھتے تھے۔ فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینو نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلاف قیاس نظریہ کی حمایت یوں کرنی چاہی کہ جب ہم اس (بقول معترضین، "ظاہر فی النفس حقیقت الامر") یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمانیدیس کے عقیدے سے جتنی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاصرۂ ٹرائے کا نامور جانباز اخلیس جو اپنی سرعتِ رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہ دینا

بڑا ہی تماشا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ ۔ فرض کرو کہ اکلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو تھوڑا سا سبقت کی رعایت دی گئی ہے یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اکلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کر چکے گا تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اکلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اکلیس وہ دس گز طے کریگا تو کچھوا اکلیس سے ایک گز آگے ہوگا۔ جب اکلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ۱/۱۰ گز آگے ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس، بہرحال آخر تک کچھوا اکلیس سے آگے ہی رہے گا۔ زینو کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو مسئلۂ پروازِ تیر کہتے ہیں۔ جو جدید متحرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالتِ پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جا سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس نقطۂ وقت پر جب کیمرے نے اس کو کھینچا ساکن تھا۔ اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس لئے گویا وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معموں سے ہمیں یہ ثابت کر دکھانے میں بڑی مدد ملی ہے کہ مسافت اور وقت دونوں کو مسلسل اور ناقابلِ تجزیہ تصور کرنا چاہئے یعنی جس طرح ایک عدد اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس طرح یہ نقطوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریقِ مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں، یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (..... DIALECTIC) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد کہا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پورا ماہر تھا۔ اور افلاطون نے اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقۂ دلیل سمجھا تھا کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انکسا غورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم ملطی حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر پریکلیس کے ساتھ مشیر و صلاح کار کے طور پر رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا اسی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جس کی کہ ہماری پامالی روندی ہوئی حقیر زمین تو (نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس زمانے میں (اور سقراط کے وقت میں بھی) جمہوریت حکومت کے مذہبی معاملات میں آزادیٔ خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی خصوصاً جبکہ انکسا غورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقوں پر پڑتا تھا۔ جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ ابتدائی ملطی حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ مگر ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیات میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انکسا غورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہمارا نفس علیحدہ کر کے سب کو منظم ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مختص جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انکسا غورث کے اس طرح نفسِ انسانی کو بطور ایک مرتب اور ناظم کے اہمیت دینے نے سقراط کے دل پر بڑا اثر کیا تھا۔ ترتیب نظامِ قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا

اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انکساغورث نے اتنا کچھ کرکے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تفریحات بحیثیت ہر ایک کے متعلقات کے کیونکر ستھری ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضا سے اور تولید کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ یہ دنیا کسی رشتے عقلمند اور رحیم صانع کا کام ہے۔ اور یہ عالم عام شعور ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا عالم مقصود ہے اور مختلف حقائق بمنزلہ ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اس توحید پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ۔ ۔ کے مجلس اور ملک کی منتظمی درحقیقت اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب محل جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظام عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے ان سربراہوں کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنایا ہوا ایک کالج چھوڑ گیا۔ یہ بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا مرکز بنا رہا۔ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ ان نوجوانوں میں سے جنہوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطاطالیس بھی تھا جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطۂ خیال کا ہوتا ہے یا ارسطاطالیسی۔ ان دو یونانی حکما کو بلحاظ ان کے ذہنی رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو متضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائق حیات کو عظیم دیگر سے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کا توسن عقل و فہم اس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا جو تجربے، مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی طبیعت افلاطون کی طرح آزاد نہ تھی۔ وہ عرصۂ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس اور تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا جن کا اثبات مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات فلسفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون ایک منطقی تھا اور ارسطو اس قدر مقید اور محتاط نہ تھا جس قدر اس کو کہا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک ممبر تھا مگر وہاں کا طرز خیال اور طرز تعلیم اس کو پسند نہ آیا اور اس نے اس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقائد پر نکتہ چینی کرتا ہے جن سے اسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے

جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جس میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا بہت کم زور دیتا ہے۔

ارسطو افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائق ابدی کا علم ہے۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائق ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ "منقسم" یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طرز بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے۔ جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذات خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آ کھڑے ہوں۔ تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اس کے اوپر ہوگا۔ یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو "نقل" کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوعی کی تعبیر کے لئے ایک دوسرا نمونہ فرض کرنا پڑے گا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہو گا کہ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جزو و کل یا اصل و نقل کے تعلق سے۔ ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا ناقابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا بلا تعلق دماغ انسانی قائل تھا۔ دگرنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے مختصات کی دو قسمیں کی ہیں۔ مختصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مختصات صفاتی (مثلاً عقلمند، سفید یا عقلمندی وغیرہ)۔ مختصات صفاتی مختصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اور مختصات ذاتی صرف کلام میں افراد موضوع سے علیحدہ شمار کی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و افعال کے لئے روح کا محتاج ہے روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جا سکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیاء ایک قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیاء کی ترکیب عناصر اربعہ۔ خاک آب آتش باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفدا قلیس نے جو پانچویں صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا۔ عناصر قرار دیا۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ اٹنا کے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اس کے اس طرح ایکدم غائب ہو جانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جائے۔ یہ عناصر اربعہ جو چار خواص بنیادی۔ حرارت۔ برودت۔ رطوبت۔ یبوست سے پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پا کر مختلف اجسام بن جاتے ہیں۔ اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے۔ اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خامس کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے۔ اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی

نوع ہستی اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں

اس مختصر بحث سے یہ تو واضح ہو گیا ہوگا کہ ارسطو نے اپنی توجہ زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا
اسی سے اس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ درست ہے کہ اشیا کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم
کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار
دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح نباتات کی حرکت کو خود رو نہیں سمجھتا تھا۔ ذی روح اجسام کی حرکت کی علت ہمیشہ مادہ کے اندر حرکت ہوتی ہے یہ علت
تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی حاجات کو اکسانے سے ان کی حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اس نے ضروری خیال کیا کہ وہ خود متحرک
ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ
بالآخر تمام اشیا کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود ان کی حرکت کا
باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ علت اول خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی محبوب اپنے
عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھنچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ اس کمال اعلیٰ وجود۔ یہ بے نیاز
ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اس کی
اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی اور ابدی ہے۔ نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ مکمل ذات ہے جس
کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت سے ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو
ان کے ارتقا کے اولین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے۔ جس کی طرف ان کے ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی
بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں علت مادی۔
علت صوری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آں را سبب نیز گویند بر چہار قسم
ہست۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوہ۔ آں را علت مادی گویند برائے پیدا شدن مسبب چوں چوب یا سریر و اگر
داخل بود بالفعل آں را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشند یا مسدس۔ و اگر خارج بود اگر آں سبب موجد اوست۔
آں را علت فاعلی گویند چوں نجار۔ اگر ایجاد برائے نسبت آں را علت غائی گویند۔ چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور موخر از ہمہ
علت ہاست و در ذہن متعقل از ہمہ مقدم۔ ...... علت غائی غایت و منتہائے جمیع علیہا ہائے اربعہ است ...... و ہرگاہ اطلاق
علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ روا ندارد چرا کہ حق تعالیٰ در خلقت اشیا محتاج بغرضے نیست۔" اگر بنظر دقیق دیکھا جائے
تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ قابل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ نجار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ
تخت کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال (علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز
کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر یہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو متباین پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک
مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل و صورت

بلکہ ہمیں دخشندہ سنگ مرمر یا کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا "مادہ" بن جانے ذخشندہ سنگ مرمر کا بت یا مادہ بغیر شکل و صورت کے نہیں مل سکتا۔ اصلی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا ارسطو کے خیال کے مطابق شکل بغیر مادہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو اگرچہ کسی شعور کو خدا کی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک قسم علم ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین مشغلہ جانتا تھا۔ وہ یہی تصورات "اخلاقیات" میں کہتا ہے کہ محض علم سے ہی انسان اپنی بہترین قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ان باتوں میں اس کو وہ مرتبہ بلند کون ذہن پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی مسرت ہی کا باعث ہو سکتا ہے جو خدا ملا اور الٰہی محض نہیں بلکہ ادراک اور حیوانیت کا ایک مجموعہ مرکب ہے۔ اس لئے مسرت علمی مدنی اور معاشرتی زندگی کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوان متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ جو وہ سوسائٹی میں ہی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سب سے زیادہ فروغ زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد شخص کے مہذب فنون میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس کا اپنے علم اور تصور کی بنا پر یہ خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی بالکل ایسی دولت سے مالامال ہوتی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی مدنیت کے آئین لکھا کہ سمجھا ہے۔ اگرچہ اس کے اسے ہی ایک شاگرد سکندر اعظم کی بادشاہت میں یونانی مدنی حکومتوں کے اتحاد اور ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مگر ارسطو کو کبھی ان انقلابات کا خیال نہ آیا۔ اس کے دماغ میں ایک مہذب حکومت یہی ایک چھوٹی سی خود مختار دولت مشترکہ ہی ہو سکتی تھی جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے زیادہ نہ بڑھنے پاتی ہوں۔ جو کہ اس کے تمام باشندے معاملات مملکت میں ذاتی حصہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کیلئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کے سپرد کر کے حکومت کیلئے وقت نکالنا چاہیے۔ طریقۂ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی قومیں ایسی ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے آمر مختار حکمران انتخاب کر لیتی ہیں جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دولت مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہیے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذاتی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہیے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مانیں۔ علاوہ بریں نواں لاز اور افلاطون کی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے سرپرست (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند۔ اپنی بیوی۔ اپنا بچہ۔ اپنی ماں۔ اپنا باپ تک نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ شہر میں اشتراکیت اور اشتراکیت کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے اور نیز اس طرح سب کو حقوق مساوی دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولتمند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ وہ پیداواروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ غریب کے ننگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

"پطرس"
کہکشاں - مارچ ۱۹۱۹ء

سر محمد اقبال

وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا

ان کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہو گیا۔ وہ [illegible] فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے علاوہ ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی اعلیٰ شاعری تک رسائی سے قاصر تھے [illegible] نہیں وجود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا لیکن ادبی اور عوامی دنیا میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تھا۔ اس کی ذات سے جہاں ہندوستان سے ایک فصیح اللسان مفکر اور اس کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھن گیا وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی [illegible] اور منزل منصہ [illegible]۔

کم و بیش چالیس سال گزرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری [illegible] بس سے لطف اندوز ہونا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں بلکہ محض زندگی کے حاشیے کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقولہ عام نہ تھا کہ [illegible] محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا [illegible] شاعری کیا تھی؟ محض ذہانت انگیز چیز تھی [illegible] نازک اور دل خوش کن [illegible] اختیار کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا اور لوگوں کی [illegible] تعمیرات ملت اور ترقی کے خواب آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے انہوں نے آرٹ کو [illegible] انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلیٰ سنجیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حالی ایسا غزل گو [illegible] سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مسدس کا مصنف بن گیا جس نے خواب غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کر سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے [illegible] اپنی شاعری شروع کی تھی محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں، اس کے والہانہ عشق سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذبات محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے"

اب تک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پُراثر اپیل ہے۔ جو کسی محب وطن کے قلم سے نکلی ہو۔ اور اس کا شہرہ آفاق گیت "ہندوستان ہمارا" [illegible]

خیال میں بہترین قومی گیت ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے گہرے مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا اس کے ان خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی فطرت کے خلاف تھا اپنی شاعری اور نثر کی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں تقسیم کرنے کی بیہودگی ثابت کیا کرتا۔ وہ ایک ایسے تمدن سے بعید العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے۔ وہ زندگی کو ایک مقصد و مدعا سمجھتا کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا بامقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت اصلی کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

مجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غم ناک کیفیت موجود ہے ہم سب شاید کسی کوئی فن کار ایسا ہو جس کے من میں گھر کے لئے اداسی مشدہ مرض کے موجود ہو ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزو مند ہیں۔ اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی۔ ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پُرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب از اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو صرف اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز نہ ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو لارنس کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت "انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں"۔ اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرار خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے، انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یو۔ پی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے۔ اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا۔ جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا۔ اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پیرو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے۔ اگر افراد کے وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو ترقی اور ممتاز صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زوردار اور لچکیلی زبان سے مالا مال کیا جس سے وہ پہلے قطعاً ناواقف

تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور تیزی بخشی جس کا راز انہوں نے عربی زبان کے مطالعہ کرتے وقت پالیا تھا لیکن چھپے ہوئے مضامین بااثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے ورنہ نثر زبان پر زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جدید اردو کے بولنے والوں میں اقبال (اور اس طرح اس کا یعنی رد غالب) کی ملک بھر سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے۔ ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادوں نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ: صوفی ریاض حسین)

ولیٹن صاحب اور میں

نتھیا گلی سابق صوبہ سرحد کا ایک پہاڑی مقام ہے جو سرسبز پہاڑیوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور اس کے پہلوؤں سے
ایک خوبصورت منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ اور برسات زیادہ ہو رہی ہے اس قدر کہ کوئی دیدہ ہوں۔ وہاں کے گھنے جنگل بہت حد تک تہذیب کی پیچیدہ تعبیر
کی وسعت دراز یوں سے محفوظ ہیں۔ قدرت کی شان و شوکت کے علم بردار آسمان بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی مہیب خاموشی
میں کھڑے ہیں۔ ندیاں ان سے قدرتی آبیاری کا کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ کیا آبادی سو دو سو سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کشمکش حیات
واضح ہے کہ وہ طرح طرح کے جو پھلے پھولے ہیں۔ وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ قدرتی حسن کو متمول طبقوں کی رنگ
آمیزیوں نے میرے سادگی پسند دماغ کے لئے کثیف بنا دیا ہے۔ دل دلدل جیسا مل گیا ہے اور ... کے لحاظ سے وہیں لگی
تو نا قابل برداشت ہے۔ اس لئے مجھے وہاں جب لطف نہیں آتی۔ اور ... سے تو تیب دوں ... پائیں ... لذت میری نفسانی پسند
طبیعت کی خواہشات کے مانع ہے۔ لیکن گذشتہ برسوں کے موسم میں ... ایک ... وہ ہی شخص جس نے مجھے نتھیا گلی جانے پر مجبور
کر دیا۔

میں نے مجبور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مگر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھا۔ ولیٹن صاحب جن کو
... دولت کی تھوڑی سی لطافت اور ... کے علاوہ وہ ... اور نام سے پکارنا غلط نہیں سمجھتا ہوں۔ گذشتہ موسم گرما میں یا رہ دن مغرب سے اور
انہی کے قرب کی خواہش مجھے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ یا رہ گلی نتھیا گلی سے پانچ سات میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی
مقام ہے جس میں ایک ہوٹل تحصیل، شفاخانہ، کچہری اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ولیٹن صاحب اسی
ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار مشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریات زندگی
مہیا کر سکتی ہیں اور بس۔ یہ دوکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر کمڈ کی طرف واقع تھیں اور ڈاکخانہ سے شاید اس
کی عمارت ... مرغوب ... ذرا فاصلے پر تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانے اور دکانوں کے مقابل بازار
میں سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر دس بارہ قدم چڑھنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی۔ جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما
پتھر کے ستون اپنی بلندی پر سے کم و بیش دکانوں اور بیکار ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ہفتے کے دن دوپہر کے
قریب میں اسی برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو

رہی تھی۔ اور [illegible] اس کی روح [illegible] تاریکی [illegible] تھا۔ لطیف [illegible] پرے اور [illegible] دائیں بائیں [illegible] معدوم [illegible]
کے ٹیلوں میں سے [illegible] سامنے کی [illegible] ہو رہا تھا۔ جوں جوں [illegible] ہم ہوٹل [illegible] پہنچے تھے۔ بارش کے مسلسل
ترنم سے میرے دماغ میں ایک عجیب [illegible] خواب [illegible]
مسلمان [illegible] ہندوستانی [illegible] آزاد اور خود مختار [illegible]
[illegible] اور [illegible] ایک دوسرے
سے [illegible] اپنی نسبت [illegible] مجھے [illegible]
ان کے متعلق میرے [illegible] جاتی ہے [illegible]
مجھے شرف بخشا [illegible]
سامنے اس طرح سمجھ جاتا [illegible] جیسے [illegible]
کھیلتے رہے ہوں۔

[illegible] خیالات یہاں تک پہنچے ہوں گے کہ [illegible] اور ہم [illegible] ہاتھ میں [illegible] کیا۔
مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز [illegible] اور [illegible] آنکھوں سے [illegible]
تو [illegible] سوار [illegible]
سیاہ [illegible] مجھے رکابوں میں [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ [illegible]
اتار کر ہاتھ میں ڈال لیا۔ اور [illegible] چڑھنے لگا میں پہلے سے [illegible] اس کی طرف [illegible] ہو گیا۔

قریب آ کر اس نے مجھے ایک [illegible] بڑا [illegible]
ولیمز صاحب کا [illegible] سگرٹ کو [illegible] صاحب [illegible] کرتے تھے [illegible]
[illegible] ہے اور [illegible]
بانده گئی

پیارے انجم!

[illegible] لباس پہن کر فوراً یہاں آ جاؤ [illegible]
[illegible] میرے کمرے کی چابی [illegible] پانچ چھ نوٹ [illegible] آؤ۔

تمہارا مخلص

"ایچ۔ ڈبلیو۔ ویلش"

میں فوراً اندر گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے [illegible] کے نیچے سے
اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر برجس کی جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ [illegible] دستے سے چھ [illegible] سے ولیمز
کے کمرے کی چابی اٹھائی (ولیمز صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے [illegible] دے رکھی تھی کہ [illegible] پہاڑیوں میں پھرتے

پہنچتے باندہ گلی کے قریب جانکلتا۔ درحقیقت اگر کبھی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا۔ سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور برساتی کوٹ پہنتے پہنتے باہر نکلا۔ نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ معلوم نہیں کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں! یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک رویہ بازار، ہوٹل، ڈاک خانہ وغیرہ ایک مسلسل مناسب فاصلہ جانے نما کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کو بازار بالکل نمتیا گلی کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک حدی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ میٹھائی فروش ہے تراب۔ تمباکو، قلم، کاغذ، پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی یا سی قطار میں کچھ فاصلے پر تحصیل، تھانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل بھیک پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور نخوت کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۲۳ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا مسکین دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ولیٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ولیٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے۔

"میرا پتہ منیجر سے پوچھ لو ——— یہ کارڈ جلا دو۔"

میں نے ان دو فقروں کو شاید کچھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیا سلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے منیجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور منیجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر تھے اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ولیٹن صاحب کو اس سے خاص انس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں اس سے جب ملا اسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے بہت ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور برساتی کوٹ کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا "ولیم!"

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ تبسم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ———

"ولیٹن صاحب ۱۲ نمبر کمرے میں ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا۔

"ڈیم! تم آج اس قدر فکر مند کیوں ہو؟"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔"

اور سر جھکا لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"ڈیم! تمہیں اس قدر دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو؟"

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہا۔

"آپ کسی سے کہیں گے تو نہیں؟"

"مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

"ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔"

"قتل! کب؟ کس کا قتل؟"

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا ہے۔ فوق العادت۔ پہلے ریمنڈ صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر۔ میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ڈیم کی آواز نے آخر کار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ پھر بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آکر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسب معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ از حد بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتاً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔ میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہٖ ویسے پایا جیسے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر امجد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے طشت از بام ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھیے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا۔ وہ کہاں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؛ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ دنوں ہی بدقسمت اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا نہ جانے کب تک رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آئے تو پہلے پہل ہم نے برلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا لیکن تھوڑے

وجہ سے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا تھا جس کو میں [illegible] کرد [illegible] کی عادت مجھے پڑ رہی تھی، اس کی سرگرمی [illegible] بو ل کے [illegible] حضرت رسالے کی [illegible] طرح [illegible] کر دیا مجھے سخت [illegible] رہتا تھا اس کے جواب [illegible] تھا [illegible] کہ بہت زیادہ تھا اور میں [illegible] مشغل [illegible] ہو [illegible] سے پہلے [illegible] جب [illegible] ساب یہ [illegible] جائے تو [illegible] جاؤں :

[illegible] سے میں [illegible] ہو [illegible] کے [illegible] سے میں اس کے پاس سے بہت جلد [illegible] ہزاروں طرح کے سوالات [illegible] نے سب [illegible] کر لیا۔

[illegible] بہت جلد جب کہ تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم سے کیا کہ [illegible] صاحب [illegible] میں جی ؟

"ہاں [illegible] عسلخانے [illegible] جاتے ہیں ؟"

تب "[illegible] "اچھا" [illegible] آیا [illegible] ختم ہو گئی اور [illegible] سے نیلا [illegible] کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

[illegible] گھر میں داخل ہوا تو پہلے سونے کے کمرے [illegible] کی تلاش [illegible] پڑی تھی۔ یہاں سے [illegible] اس وقت داخل ہوا جس وقت ولیمز صاحب [illegible] ایک کرسی پر بیٹھے سگریٹ [illegible] نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر [illegible] نے سگریٹ [illegible] طرف بڑھا [illegible] سگریٹ [illegible] ولیمز صاحب بولے : ۔

"بچا تو تم [illegible] سے [illegible] آئے ہو ؟"

"ہاں [illegible] آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟"

وہ سگریٹ جلا چکے تو [illegible] کو [illegible] میں [illegible] کر کہا : ۔

"جس وقت [illegible] سے چلے تو [illegible] ہو رہی ہوگی نا ؟"

"[illegible] تھا۔"

"تو تمہارا [illegible] کہاں ہے ؟"

"وہ تو . . . . . [illegible] کے [illegible] میں بھول آیا ہوں"

"اور [illegible] سے [illegible] ہے۔ اچھا یہ دیکھو [illegible] اپنے [illegible] خوبصورت چھپوا تا ہے ؟"

یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں [illegible] کا ایک بل دیا۔ بل [illegible] کے نقش [illegible] چیز پر خرید نے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور جو [illegible] ایک رسید [illegible] ہوتے ہیں۔ بل پر خریدار کا نام [illegible] اس قدر [illegible] ہوا تھا۔

آنہ، ڈیڑھ پاؤ سگار	۰	۰	۲۵
ایک چھوٹا وسکی	۰	۱	۰
	۰	۶	۲۵

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگ دار روشنائی میں واقعی بہت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان ہونے کی وجہ سے شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب؟ معمولی درجہ کی؟"

"نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ ہے۔ دیکھو یہ ہوٹل کے فارم اگرچہ سادہ ہیں اس سے کہتے ہیں کہ چھپائی میں کس قدر خراب ہیں۔"

اب کے بار لفظوں سے باقاعدہ کئی ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا ولیمز صاحب نے مجھے محض اس لئے بلایا ہے کہ انھیں بل فارموں کی چھپائی کے اہم مسئلے پر میری رائے لینا مقصود تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا۔ چھپائی واقعی کچھ قابل تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی:

بل بنام ٹی براؤن صاحب کمرہ نمبر ۲۔ بابت ماہ جولائی

	پائی	آنہ	روپیہ
خوراک وغیرہ	—	—	۱۱۰
کرایہ	۰	۰	۳۰
	۰	۰	۱۴۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے داہنے ہاتھ میں تھا۔ اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ ولیمز صاحب بولے۔

"یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ قتل کی شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھ کر میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا۔ منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب بالکل نہیں پیا کرتا تھا۔ نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے ہر ماہ چارج کرتے ہیں اس سے نہیں لئے جاتے تھے۔"

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آفریں کہا کہ ایک نیکی کا کام تو کرتا تھا) ۔ ولیمز صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا:۔

"اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدقہ ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے قتل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟"

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

"اب تم دیکھو۔ یہ شاید پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب موجود پر سگاروں کا نام "سلطانہ" لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو "سلطانہ" سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ قتل اس نے "پانامہ" سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن شراب

مقتول معمول سے اس قدر انحراف کرے۔ کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خریدے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا، لیکن نہیں۔ انگیٹھی کے پاس سے مجھے یہ دو جلے ہوئے سگاروں کے باقیماندہ حصے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ غالباً پانامہ سگار ہی ہیں (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا۔ اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے)۔ تو گویا اس کمرے میں دو پانامہ سگار پیئے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے — اب چلو غسلخانے کا معائنہ کریں۔"

یہ کہہ کر ہم دونوں غسلخانے میں گئے۔ ولیٹی صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر پچھتر برس کی عمر کا ایک لمبا دُبلا قریباً چھ فٹ دو انچ قد کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اردگرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

"کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونوں ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کند وزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کند وزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابل غور ایک اور بات ہے۔ وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک جگہ بالکل نیا پھٹا ہوا ہے۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھی تو کیا براؤن میں باوجود ایسے مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گاؤن پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیٹو صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریک فضا تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ نہ دکھائی دیتی تھی۔ جب میں ولیم کے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیٹی صاحب مجھے ساتھ لے کر غسلخانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:۔

"یہ ہم چوروں کی طرح غسلخانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

"ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

"لیا تھا!"

"ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کی جارہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا۔ اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دنوں تک اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انھوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انھیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

"اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟"

"ہاں ہو۔ ولیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ صبح سب انسپکٹر صاحب خانی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ منیجر کے کمرے میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

"تو انھوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟"

"پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس کے بعد سرسری طور فہرست ان سے جا کر پوچھو تو انھیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہوگی۔ پھر ولیم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ صرف ایک فیروز خاں بہرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ کلی ہی میں رہا اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔"

"چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے۔"

"ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور بدمزاج سا ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا۔ اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل وہ یہ اسی کے لیے آیا تھا۔"

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ کلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ ہے۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم منیجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ولیمز صاحب کو دیکھا تو ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں....... ہم چائے ڈاک بنگلے میں پئیں گے۔"

میں نے اپنا باران کوٹ منیجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ولیمز صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھا لو۔ مجھے دوست یوں بھی دسترخوان کا صاحب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ولیمز صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں کچھ فالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انھوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آ گئے۔

میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میں نے سپرد کر دیا، مگر کسی خیال سے چپ رہا۔ اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر دیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ اور مسکرا کر کہنے لگے:۔

"میرے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمہارا چھ کارتوسوں کا قرضدار ہوں؟"

ان کا یہ انداز ہر تکلف نا انصیفت میں بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انھوں نے مجھے اس کی زحمت نہ دی اور دفعتاً پوچھا:۔

"تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے جن کا معاملہ حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں سیٹھ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پانامہ کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کس نے خریدا تھا؟"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو۔ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمہیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لئے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لئے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا!"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دروازہ سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ولیمز صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے اور ایک منتظرانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا "کل مورخہ م۔ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور منیجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادرس کی دکان سے ایک ڈبہ پانامہ سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انھوں نے کوئی گھوڑا کرائے پر نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکہ دار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انھیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لئے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ولیمز صاحب سے کہا:۔

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھایئے۔"

انھوں نے فوراً میرے "ارشاد" کی تعمیل کی۔ میں نے الماری کھولی اور اسے کھول کر پھر ان چھ پانامہ سگار جن میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مربیانہ لہجے میں ولیمز صاحب سے کہا

"آپ کا قیاس صحیح تھا۔ یہ جلے ہوئے سگار سب کے سب پانامہ سگار ہیں۔"

انھوں نے جھک کر کہا "آپ کی عین نوازش۔"

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں۔"

میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ وہ پانامہ سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ دو گھوڑے

لیے اپنے یاران موت وہاں باندھے جہاں سنگھ نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا۔ اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہو، ہری کی طرف روانہ ہو گئے۔

ماندلی سے آدھ میل دور ہم نے گھوڑوں کو دلدل پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں میں عجب ظلمت تھی۔ دو طرف کھنڈ اور پہاڑ کے اونچے اونچے درخت، ایک طرف پہاڑوں کی سیہ شکوہ بلندی، دوسری طرف کھنڈ کی پراسرار گہرائیاں نظر آتی تھیں۔ سڑک پر ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں کی مسلسل آواز آلتی ہوئی کانوں کو ٹکراتی دور دور تک گونج رہی تھی۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے بعد ستارے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر مجھے بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں معدوم ہو رہا تھا اور کھنڈ میں دوڑنے کو چھپ جاتا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ولٹن نے جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ جب میں ان کے برابر جا کر ٹھہر گیا۔ تو وہ بولے۔

"تمہاری بائسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے۔"

"اور اب ... ... سوا چھ بجے ہیں اور یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا ہلکے ہلکے چلیں؟"

"میں خود یہی کہنے والا تھا۔"

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر یکایک ولٹن صاحب نے قماربازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پرزور لکچر دینا شروع کر دیا۔ اس شد و مد سے کہ گویا اس فعل مذموم کے اختراع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پرمغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انہوں نے دفعتاً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:۔

"اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہل فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ عیوب کو از سر نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز کر دیا ہے۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے براؤن کی موت پر تحقیق و غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح لاتعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے، جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر اس وقت جب کہ کم از کم میرا تو دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے بیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ولٹن صاحب میں میں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے

کر وہ ایک لمحے اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیراعظم انگلستان کے کیر کر ہیوبرٹ کو تم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر ہیں گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں اور پھر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور گرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ولیٹن صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

———

مری پوٹیلسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ولیٹن صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگرٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوک کرنا شروع کیا۔ ولیٹن صاحب بولے:۔

"یہ بھی گھڑی کو کوک دینے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں۔"

"تو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اس میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور ——— شاید...... ہر ایک...... عقلمند......"

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ولیٹن صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویئے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرف لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انہوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا:۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو، تو براؤن کل شام کے چار بج کر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا:۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔ اور چونکہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد غالباً رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خوابگاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔"

میں تحیر، استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس تیس چیزوں کا مجموعہ مرکب، ان کے چہرے کی طرف منہ کھولے باولا کرنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ولیٹن صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگرٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں

کمرہ اجھال دیا اور بولے :-

"جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سیٹھ فیروز جی کے بل اور ہوٹل کے علاوہ مجھے براؤن کی جیبی گھڑی بھی ملی تھی جو مجھے یاد ہے کہ چار بجکر دس منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ خیال کیا کہ گھڑی اس لئے ٹھہر گئی کہ اسے کوک دینے والا مر گیا ہے (مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیں) براؤن کی نشست گاہ میں جو میز پر اس کا ٹائم پیس بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور اس کے ٹھہر جانے کی وجہ بھی میں نے یہی خیال کی۔ لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں بھی [illegible] دس بجے پر [illegible] تھیں۔ ٹائم پیس [illegible] تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے دونوں [illegible] وقت ٹھہرا [illegible] ہے [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ براؤن اپنے ٹائم پیس کو ——— اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا جس سے تو دونوں گھڑیوں کو ——— فرمائیے نوٹ کیجئے دس بجے رات کے بعد [illegible] کوک دیا کرتا تھا جیبی گھڑی جو چار بجکر دس منٹ پر ٹھہری ہے تو اس کا مطلب [illegible] ہے [illegible] براؤن کو موت سے [illegible] تھا یقین کرنی پڑی۔ گر تم اور میں [illegible] باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا [illegible] یہی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جس کی زندگی کی ہر ایک حرکت بندھی ہوئی اور ہر ایک عادت قاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ [illegible] یقینی نہیں کہ وہ بھی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟"

جوں جوں وہ یہ کہتے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر [illegible] ہوتی گئی۔ لیکن دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی الجھن صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے :-

"سیٹھ فیروز جی کا بل اور ... دیا نامہ نگاروں کے جلے ہوئے باقیات کو ... صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم صرف براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے ٹھہرا ہے (دو درجن نامہ نگاروں کے جلنے کے لئے کچھ وقت چاہئے)۔ سو بلا خوف و تردید فرض کر لو کہ براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا۔ اور براؤن کی تبدیلی لباس اور [illegible] بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب باتیں باقی ہیں۔ :-

اول :- یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم :- یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟

سوم :- یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالنے کی کوشش کیوں کی کہ براؤن کے کمرے میں جلا ہے؟

چہارم :- یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا بل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟

براؤن مارا کہاں گیا ہوگا؟ اغلباً ادھر ادھر کہیں جنگلوں میں؟

شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے۔ بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی۔"

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر متحیر کر دیا کہ میں گرد و پیش کی سب چیزیں بھول گیا۔ ولیمز صاحب جیسے جہاں گشتے بھی میں بھی ان کے منتظر رہا۔ وقت چلا جاتا تھا۔ آخر کار وہ اٹھے ہوٹل کے ... ٹھہرے اور دیکھنے لگے۔

"یہ چارلس ولیمز صاحب کا ہوٹل ہے میرے خیال میں ان کی ملاقات تمہارے لئے مزید مسرت کا باعث ہوگی۔"

اس وقت شام کے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کے کنارے بتیوں کی روشنی رات کی محیط تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب مگر مؤثر مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمرے ... کہیں کہیں کوئی نوکر پھرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ وہاں دروازہ کھلا تھا اور میز کے سامنے ایک شخص بیٹھا تھا۔ ہم نے اس سے منیجر کا پتہ پوچھا۔ تو معلوم ہوا منیجر صاحب ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ منیجر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے۔ چارلس ولیمز ایک آرام کرسی پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر ایک خوش نما گلدان اور ایک گلاس ... اپنے ... صاحب کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پڑے تھے۔

میں دیکھتے ہی چارلس کو پہچان گیا۔ مجھے اس کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ وہ جان ولیمز کا بھائی ہے۔ لیکن اس کے تبسم اور جان ولیمز کے تبسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیمز جب مسکراتا تھا اس کے چہرے سے صاف گوئی اور ایک قسم کی بشاشت ٹپکتی تھی۔ برخلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور چہرے کے خد و خال کچھ مصنوعی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ ہمیں دیکھ کر کہنے لگا۔

"صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ولیمز صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

"ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں دوسری منزل کے کمرے میں رکھو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

"بہت خوشی سے" یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا "ان کو نمبر ۲۲ اور ۲۳ میں لے جاؤ" پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"آپ کو کچھ کھانا تو نہیں چاہئے؟"

"نہیں تو صاحب بس۔"

"نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔"

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں پہنچے تھے کہ نوکر ایک طشت میں کافی کے دو پیالے لایا۔ ولیمز صاحب نے اس سے کہا:

"منیجر کو یہاں بھیج دو۔" یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا:

"آپ نے منیجر کو کیوں بلایا ہے؟"

خدا جانے مجھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیمز اندر داخل ہوا اور ہمارے سامنے آ کر ایک خالی کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ولیمز صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر چارلس ولیمز! میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم باندہ گلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ مگر اس کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تو ہوٹل کی بدانتظامی کی نسبت قاتل

کی شرافت سے زیادہ متاثر ہوا ہوں کہ یہ تو دو قتل کرنے کی تکلیف اٹھائے۔ یہ نعش کو پہنے کند ہے۔ ڈال کر [illegible] میں اوپر رکھے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو رات بھر سردی نہ لگے اسے ڈریسنگ گون پہنائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سیفٹی ریزر بھی اس کی [illegible] کی جیب میں [illegible] جائے۔

مانا اس کا پتہ لگانے میں کوئی دقت ہے۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے جواب دیجئے کہ آپ کی [illegible] کے علاوہ آپ کی شرافت کی [illegible]؟

میری ساری دلچسپی صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طرح حیرت انگیز اور حقارت نفرت سے متاثر تھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک پیچ در پیچ بل ڈال لیا۔ [illegible] کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ ہٹائی۔ [illegible] دیکھ کر میں نے جلدی سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

ولیمز صاحب [illegible] بے پروائی سے [illegible] کے بیلے کی طرف بڑھا۔

دفعۃً چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ [illegible] تو [illegible] ولیمز صاحب کے سر پر آ پڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ارادے کو ملتوی کر دے۔

ولیمز صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

”امجد، چارلس صاحب کو اسی طرح رکھو۔ میں ذرا کافی پی لوں۔“ ولیمز صاحب [illegible] کرسی پر سے اٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی پڑی تھی۔ انہوں نے اسے گھما کر تالا بند کر دیا۔ اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

”اسے جیب میں ڈال لو۔ ابھی چارلس صاحب کے لڑنے کا وقت نہیں آیا۔“

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

”مسٹر چارلس ولیم! ہم نہ تو پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں نہ پولیس کو اطلاع دے کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے۔ (تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ) تم قدرتی طور پر پوچھو گے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے۔ میرا تعلق صرف اس قدر ہے کہ [illegible] ہوٹل کا مالک تمہارا بڑا بھائی میرا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر نقصان اور رنج برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے بریلی میں تم نے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ انہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ بیچارہ نوکروں کی بددیانتی کا تختہ مشق بن گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑ کر [illegible] سرمائے سے یہ ہوٹل جاری کیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس کا دل تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ یہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر شرکت میں تم سے یہ ہوٹل خرید لیا اور شکر کیا کہ بالآخر تم نے از سر نو شریفانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا نوکر فیروز خاں

قتل کے الزام میں گرفتار رہے۔ گو بہ ظاہر یہ بات بڑی افسوسناک اور حماقت آمیز ہے کہ ہم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھ دیتے

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہونے لگے۔ اشتعال، خفت، اس کے بعد نرم دلی، ندامت و افسوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ولسن صاحب نے اپنی تقریر اسی سادگی سے کی۔ جب ختم ہوئی چارلس کے ماتھے پر اور اس کے کندھوں کے پیچھے جھٹنے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے آپ بجا فرماتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ مجھے جو کچھ میں نے کیا بہت برا کیا اور میں انتہائی شرم و ندامت کے ساتھ اس امر اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور شاید میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"ہاں تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے معاملات بیان کر دو تو میرے دوست سامنے۔ تم لکھتے جاؤ گے۔"

ولسن صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب میں سے نوٹ بک (جو میں احتیاطاً ساتھ لایا تھا) نکال کر پنسل اور ولسن صاحب سے ان کا حکم لے کر جو کچھ چارلس کہتا رہا لکھتا گیا۔

وہ تحریر تو اس وقت مجھے لفظ بلفظ یاد نہیں۔ مگر اس کا بیان ہو بہو نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ جمعہ کے دن باندہ گلی کی نوشہرہ کو جیسے پینے کے بعد براؤن کی تلاش وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سامنے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے صاف آ کر نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کھوپڑی کو ایک مہلک ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا۔ چارلس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام بی براؤن ہے اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک بڑا ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آ کر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آ کر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا۔ اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خوابگاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو قتل اسی کمرے میں ہوا ہے۔ اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے میں رہا جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی پیشتر اس کے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں اس کا سارا بیان لکھ چکا تو ولسن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا "ان پر دستخط کر دو۔"

کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرا لئے گئے۔ پھر ولسن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوا لیا۔

سب انسپکٹر پولیس، باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس، ضلع ہزارہ — ایبٹ آباد۔

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس سے بولا۔

"اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا [illegible] کے لئے کافی ہوگی۔

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے برآمدے میں میں اور ولش صاحب آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ولش صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے [illegible] سے سگرٹ پی رہا تھا اور کل کے واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا۔

ولش صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا تو میں نے پوچھا۔

"وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آ گیا؟"

"سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا بل نکالا تو اسے پڑھ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے۔ وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکرگزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکرگزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

"جو جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا۔

ڈیر مسٹر امجد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو ناانصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت سا حصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا

ہو گا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جرنل میں شائع کر دیا جائے۔ امید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔

آپ کا مخلص

......

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جناب عالی۔

مسٹر براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے جارج ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ جو سب انکشافات مجھ سے ایک درجہ اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔"

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے کسر نفسی ہی سمجھیں گے مگر میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے کیونکہ ہر کوئی ان کی دیانت داری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے انہوں نے اس کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

"میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو۔ ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ لے کر ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لائے گا ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔"

دکان والے نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ خواجہ صاحب عزت والے آدمی ہیں اور پھر بات کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی۔ یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے۔ جب چاہوں گا، رقعہ دے کر روپے لے لوں گا اور دیر سویر بھی ہو گئی تو کیا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکان دار کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا: "میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں۔ ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں۔ یہ دیکھو ان کا رقعہ۔ رکھ جاؤ، تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی۔ کہنے لگا: "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو۔ میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی۔" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا۔ خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور اس سے

بیس روپے وصول کروں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے گن گن کر دے دیئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دے دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دیانت داری پر سب کو بھروسہ تھا۔ اور جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے۔ اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا کہ ان کا کیا پتہ۔ آدمی نیک اور شریف اور دیانت دار سہی لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کھول کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عند المطالبہ حامل ہذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کر دوں گا۔" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے۔ بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنا سکتے ہیں

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہئے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اسی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو، اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔

بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے۔ روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو، عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں، اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے۔ وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا اسی کو روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہو گا۔ میں جب یہ چیک لے جاؤں گا مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا۔ اور کہا کہ مجھے اس چیک کا روپیہ ادا کر دو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہے گا لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ مگر فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کے نام لکھ لیتے ہیں ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقع پیش آتا ہے کہ بنک چیک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چیک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔ اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی مد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک جانا پڑا اور روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چیک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چیک، ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے) (خیابانِ اردو)

رونا رُلانا

کہتے ہیں ازل سے دنیا میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ مرد ایک منہ زور جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے رکھتا ہے۔
مصنف کی طبعی شوخی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کچھ
اتفاق بھی نہ ہو لیکن بہرحال موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ایسے
واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ
شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ کسی کی موت کی خبر سے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر سنانا ان کی اسی
خبر جب بھی سب سے سنانا شروع کرتی ہیں ہر ایک تفصیل کا اعادہ کرتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ
موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو، گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچے والے
کا بچہ بیمار ہو، کوئی اتفاقی اڑتی خبر ہو، کوئی افواہ ہو غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے ۔

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں بھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر
ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں ہمیشہ نچلے طبقے کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے قلم نگار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے
وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا سرورق غمزدہ لڑکی کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی
آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ جو ایک پہلو سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ
پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور کبھی رقت دلانی ہو تو اسے سیدھا نیچے
ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگنا سکھا دیتے ہیں کہ میری بوڑھی ماں مر رہی ہے دوا کے لئے پیسے نہیں خدا کے نام اللہ دیتے جاؤ کبھی کسی ستمگر
خوب صورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا۔ یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور دل کی
بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والیاں ہیں کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں تر ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نزع،

بادشاہ زادی بسل خودکشی، زہر، ظلم، تشدد، المیہ نہ ایک جز کا سال باندھ دینا گویا ذہن وا بیان کرنی کر دینا یا کمال فن ہے کی کتاب میں تو عام بات ہے۔

تو یہ مصیبت کیا ہے؟ ہر بات بات رحمت ماتم ہو جاتا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس درجہ نقادوں نے کیا غضب کیا؟ حل کے کہا سہی لیکن ہر کسی بات کیا بھی!

کسی گھر میں موت واقع ہو جائے تو زندے اور مردے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچے کئے چپ چاپ۔ آنکھیں کچھ سرخ ہیں جن کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں۔ کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر قلق۔ اداسی سی ہے۔ دو قدم ذرا آہستہ اٹھتے ہیں۔ اور زنانے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے۔ اور جب کوئی نئی عورت پرسے کو آتی ہے تو اندر جاتی ہے تو ماتم کی جھنجھناہٹ میں ازسرِ نو ایک ابال اٹھتی ہے جیسے یک لخت کوئی ہوائی ہیا۔ بڑے گرپڑے مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے ہاں سینہ کوبی کا ایک طلب قائم ہو جاتی ہے۔ گھڑیاں برگھڑیاں طاری جاتی ہیں اور جنون پر جیسے ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پڑی ہو جاتی ہیں تو بیماریں وہ وہ بیماریاں بیان کے آتی ہیں جو لڑکے دہم و گمان میں نہ تھیں جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں بیماری کی مرز عرصہ یاد دلاتی ہیں۔ بے چارہ کہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۂ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر بار ناچار منحنی آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ جوں جوں بیمار پرس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے موت قریب آتی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مرے لے کر روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اتنی باری سے اپنے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں۔ ایک پرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر دوا ہی کبھی اپنا حساب نہیں رکھتیں۔ اگر کوئی پڑوسن آ کے کہہ دے کہ اے بوا! ماشاء اللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے تو جھنجھلا کر بول اٹھتی ہیں کہ یہ سد یہ دن میں خاک۔ میں آدھی جاتی ہوں اور میرا چاہنے والوں کو بھی میں مٹی کی نظر آتی ہوں۔ اور کوئی آ کے کہہ دے کہ اے ہے بیٹی تجھے کیا ہو گیا۔ تو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سناتے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے، بہت ذلیل مرض ہے لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر دادیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا مجھے نصیب نہ کرے کسی کا بڑا ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ، ضبط، تحمل، اور خندہ پیشانی سے دور ہو سکتا ہے کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے۔ اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ۔ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے ـــــ غرضیکہ مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریر سے ہزاروں لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زورِ قلم سے ہزاروں جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رُلاتا ہے۔ اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور بڑا قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشا پردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیبِ نسواں)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ درخت اور پودے ایک دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آ رہے ہیں۔ پھول اور پرندے، نغمہ اور نکہت، رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں کہیں اُڑ سکتی ہیں مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے۔ درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے پٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چھپ چھپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں۔ یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا۔ لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کر اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک پہنچا دے۔ اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! یا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہہ رہے ہیں، میری ضعیف التجائے درد کون سن سکتی ہے!

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ چھپا ہوا سنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں کہ میرے نغمے کی صوت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینہ کے ٹکڑے چھلک دیئے تھے۔ میرے دل میں خواہش ہوتی ہے اس بلبل کو بھیج دے کہ آ کے گُن جائے اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصودِ انتظار! تو بارش کے اس پار آ جا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں۔ اس پار آ جا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

مسئلہ تونیسیہ

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو حفاظتی کونسل میں تونس کے مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے۔

اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے۔ اگر میرے رفقا کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع کروں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں میرے وفد نے انہیں اسی غور اور توجہ سے سنا جس کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریق کار کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تاہم جب انہوں نے اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی حیرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی طرف سے اس قسم کے رویے کی توقع نہ تھی۔ اس لئے ہوئی کہ اصل مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر ایسی کر ڈالی جو یہ سوال ایجنڈے پر آ جانے کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرز عمل بظاہر اس لئے اختیار کیا کہ کم از کم اسے واقعی یہ اصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ یہ ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لئے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ ایجنڈے کی منظوری کے خلاف ووٹ دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھا لیا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ لیکن وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقع سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انہیں بحث میں حصہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لئے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک نامناسب اور غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کر لی اور فرانس کا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا ــــ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قابلیت سے پیش کیا ــــ گویا اس نمائندے کی حد تک ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ پھر ایجنڈے کی منظوری کی مخالفت کر کے دس دوسرے وفود کو اظہار رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر چھاپہ مارنا ہے جو اس غرض سے حفاظتی کونسل کو تحریری درخواستیں بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے اگر اس کی پیروی کی جائے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفود سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ اور فرانس کے زاویۂ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں ــــ واضح رہے کہ یہ وفود ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو جمعیۃ اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے

درخواست کر چکے ہیں۔

فرانس کا نمائندہ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا یعنی دس وفود نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکاتیب کے ساتھ جو تفصیلی نوٹ اور مذکرہ گوش گزار رپورٹ — نمائندہ فرانس کے نزدیک ناخوش گوار — بھیجے تھے ان میں سے وہ تمام عبارتیں پڑھ دیں جن کا ترجمہ ان کے خیال کے مطابق درست نہ تھی۔ موصوف نے نہ صرف ان باتوں کا جواب دینے پر زورِ فصاحت صرف کیا بلکہ انہیں بہتان سے بھی تعبیر کیا۔ حالانکہ خود انہوں نے گیارہ ممالک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومت فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے، دوسرے دس وفود بھی — اگر انہیں اظہار خیال کا موقع ملا تو — اس کے خلاف احتجاج ہی کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کو یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دار طریقے سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واضح اشارے کئے ہیں اور رمز و کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں نے "پیلیس ڈی شیلو" کی راہداریوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھایا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے ایسی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع دیا کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تذبذب سے یہ معاملہ غور و خوض کی غرض حفاظتی کونسل کے سامنے لائے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت تونس کے دو وزیر — ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زمانے میں حکومت فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا — پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا جس میں کونسل کی توجہ تونس کے بعض افسوس ناک اور الم انگیز حالات کی طرف منعطف کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب طویل عرصے تک اقوام متحدہ کے دفتر خانہ میں پڑا رہا۔ سورج کی کرنیں نہ اسے پیرس کے "پیلیس ڈی شیلو" میں چھو سکیں اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا جب میرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام ارکان کے پاس بھیجی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچا دیا گیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اسی دور میں تونس قتل عام، فسادات، گرفتاریوں اور تخریبی کارروائیوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا — میں صرف تشدد کے واقعات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس مرحلے پر کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا — اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر بڑے صبر و تحمل سے انتظار کرتے رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی، موقع کی نزاکت کا احساس کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خوش گوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی جن کا شمار روئے زمین کے شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کئے۔ اس مسئلے پر بحث و تمحیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع کو غیر رسمی طور پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ نا واجب جلد بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے بشرطیکہ اس کے ارادے نیک ہوتے، اور ہمیں یہی امید تھی کہ اس کے ارادے نیک ہیں۔

عام احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے آخری ہفتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہیے۔ پندرہ ملکوں کے نمائندے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی

سے صدر مسٹر پیلا نزدو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وفد فرانس سے نیز اس کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہل تونیسیہ کا یہ مسئلہ اس منزل پر نہ پہنچایا جائے جس کے بعد انسان تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے۔ امن عالم کا تقاضا یہی ہے۔ مقاصد منشور کا تقاضا یہی ہے اور دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور اسے پورا کیا ہم انتظار کرتے رہے پلیس ڈی چیلوٹ کے برآمدوں میں سراسیمہ نشست لگانے والے لوگ تیونس کے وزیر نہ تھے بلکہ ہم سے تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے مگر افسوس کہ نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ہوا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرائع سے پہنچا دیئے جائیں جنہیں وہ بہتر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے عین مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار جنرل اسمبلی کے اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری ایام میں کچھ اچھا معلوم نہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے کام میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا کر دیں۔ صدر نے ہم سے پھر یہ وعدہ کیا کہ یہ پیغام حکومت فرانس تک پہنچایا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ بھی پورا کر دیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہئے، اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں۔ انتہائی الم انگیز، افسوس ناک اور ناخوش گوار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے بعض نے مراکش کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیر بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس دستاویز پر ثبت ہیں۔ جنرل کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی یقیناً اس نے لکھا کہ اس سوال پر بحث فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ "فی الحال" کا مطلب ایک غیر معین عرصے کے لئے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیر بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے ہم دل شکستہ ہو گئے پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم برابر اخباروں میں تشویش انگیز خبریں پڑھتے رہے ہر روز اصلاح احوال کی نئی امیدیں باندھتے رہے، ہر روز یہی توقع لگی رہی کہ فرانس اور اہل تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت ہو جانے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہل تونیسیہ اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کاملاً انحصار نہ کر لینا چاہئے اور غالباً بہتر ہو گا کہ اہل تونیسیہ میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا جائے تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورت حال کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ اہل تونیسیہ کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونیسیہ کے ذمہ دار وزراء سے ان کے سفارتی پروانے راہداری واپس لے لئے گئے ہیں۔ اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کر سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ بہرکیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزراء پروانۂ راہداری کی مشکلات کے باعث نیویارک نہیں آسکتے تھے۔ عالم اضطراب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے راستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات حائل تھیں

اس کے بعد ان جملہ اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دیئے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا کہ حکومت فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو لیتا، حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم کچھ زیادہ پُر امید

نہ تھے۔ پھر بھی ہم نے سوچا دانش مندی اور سیاسی بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ فرانس میں حکومت کا استحکام ہو جانے کا انتظار کیا جائے۔ آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کا استحکام ہو گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پر امید تھے کہ حکومت فرانس کوئی قدم اٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں تیونس میں صورت حال اصلاح پذیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے سامنے وحشت اور حیرت کا ایک طوفان امڈ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تیونس کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پوری کابینہ سے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے قابو میں آ سکتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حکومت فرانس کابینہ کے دو ممبروں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کابینہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان مصالحت ہو جانے پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اور یہی کابینہ تھی جسے فرانس اور تیونس کے درمیان بہتر مفاہمت کے لیے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ وہ سب اب جیل میں پہنچ گئی۔ تیونس کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو قید ہوئے۔ تیونس کی سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی یعنی حزب دستور کا کوئی حیثیت کا لیڈر رہا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری اطلاع کے مطابق ہزاروں تیونسی نظر بندی کے کیمپوں میں پہنچا دیے گئے تھے۔ سینکڑوں ہلاک کر دیے گئے تھے۔ اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ تیونس کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے پھر بھی انتظار کیا۔ اور سوچا کہ بہرحال ہم پوپ سے بڑے کیتھولک ہونے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ اگر اہل تیونس ایک اور حکومت کی تشکیل کر لیں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لیے کوئی وجہ اضطراب نہ ہو گی۔

ہمیں اس انتظار میں بہت دن گزر گئے اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ باکوش نامی ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کیے جو اس کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سول کے سرکاری ملازم تھے اور دوران جنگ میں تھوڑی دیر کے لیے وزارت عظمیٰ کی گدی پر براجمان رہے تھے۔ تیونس میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جنہوں نے ہماری دانست میں فرانس کے بارسوخ وقت وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ کابینہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گزرتے گئے۔

یہ مسٹر باکوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کی ساری قوت اور ہماری ان کی پشتیبان ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد و اعانت کے لیے کمربستہ ہے لیکن یہ حضرت اب تک کوئی کابینہ نہیں بنا سکے۔ "ہیرلڈ ٹریبیون" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تیونس کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بے تاج حکمران تیونس سے ملنے کے لیے محل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔

وزیر اعظم یا فرانسیسیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے عوام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاسن پر بیٹھنے کی ہامی تو بھر لی۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عوام کی خفگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا یہ "تاج" سر پر رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیونس نے آج کل برائیوں اور خرابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بنیے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جائیے۔

اس کے بعد ہم ہے مناکہ فرانس کی جانب سے موسیو ہاٹکلوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہل تونیسیہ کے لئے امیدوں کا جو شمارہ لے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں دو مہینے مانک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے سامنے میں فراہم کردہ اطلاعات میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا کہ موسیو ہاٹکلوک کے تونیسیہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے گئے تھے کہ تونیسیہ کو درست بنائیں۔ اور فرانس کے وعدے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالا مال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاٹکلوک ۱۳ جنوری کو تونیسیہ پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سب سے بڑی تقریب بنا یا گیا جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ جدھر سے گزرے سڑکیں مسلح فوجیوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا راستہ جنگی گاڑیوں، مسلح کاروں اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے موزوں ترین موقع بنا لیا گیا تھا۔

ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست رابطہ رکھنا پسند کریں گے۔ تاہم وزیر اعظم نے ریذیڈنٹ جنرل کو بے کی جانب سے مطلع کر دیا ہم ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری روابط وزیر اعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیسیہ نے ۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے علیحدگی اور تخلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بے نے انکار کر دیا۔ اور انہیں وزیر اعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی ۱۵ جنوری کو ریذیڈنٹ جنرل نے لکھا کہ وہ بے سے وزیر اعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد شرائط پیش کیں ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ دوسری یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسری یہ کہ بے دو فرمانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گارب کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گارب وہی ہیں کہ جن کے نامۂ اعمال میں مڈغاسکر میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے بے نے وزیر اعظم کو ہدایت کی کہ ریذیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے۔ وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے اس نے بتایا کہ وزیر اعظم کو بے نے تونیسیہ کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیر اعظم کے اختیارات ہی کافی تھے۔ لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہئے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کی گئی تھی۔

اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل اور جنرل گارب کو پیرس طلب کر لیا گیا وہ ۲۲ مارچ کو تونیسیہ واپس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے بھی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴ مارچ کو بات چیت کے لئے انہیں طلب کیا گیا۔ لیکن اس موقع پر تونیسیہ کے وہ تمام وزرا بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ریذیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے ——— مجھے امید ہے کہ میں بعد میں کسی موقع پر یہ واضح کر سکوں گا کہ استعمار پیشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے ——— اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔ اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریذیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک

فرانس کی حکومت تونیسیہ کے حکمران سے کر رہی ہے جس کے بارے میں فرانسیسیوں کا دعویٰ کا رہنے ہے۔ ریذیڈنٹ جنرل پیتھول کی تازہ ملاقات کے بعد اسلوکی قوت کا مقابلہ کر کے اس عمر رسیدہ اور قابل احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ اس حقیقت سے جواب حاصل کرنے کے متعلق بجز کسی ضمیر کے سوا اور کسی ضمیر کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

جب سے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو بجری تار بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل نے حکومت کے تمام سے ان پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریذیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اسی رات ریذیڈنٹ جنرل نے تونیسیہ کے وزیراعظم اور تین دوسرے وزراء کو گرفتار کر لیا۔ ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث سے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے۔ اس بوڑھے اور بیمار وزیر نے ریذیڈنٹ جنرل کو لکھا مجھے گرفتار کیجئے تاکہ میں قید و بند میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں۔ ان سب کو تونیسیہ کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا سینکڑوں سیاسی کارکنوں، صحافیوں، مدرسوں، وکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی ہمدردیاں نیشنلسٹوں کے ساتھ تھیں گرفتار کر لیا گیا۔ تمام نیشنلسٹ اخبارات کو بند کر دیا گیا۔ تمام بڑی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دئیے گئے۔ اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں کس قدر گرفتاریاں ہوئیں ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نظر بندی کے جو بڑے بڑے کیمپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہو گی!

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ ریذیڈنٹ جنرل ۵ اپریل کی صبح کو بے سے ملنے کے لئے گیا مگر اس اثنا میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے نے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تونیسیہ کے حکمران اور ریذیڈنٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے کے لئے ہرگز خوشگوار نہ تھا۔ لیکن جب ریذیڈنٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اندر تو بڑے پیار محبت کی باتیں ہو رہی تھیں" یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے چھین لئے گئے تھے۔ اور جو تونیسیہ میں فرانسیسی حکام کے بھاری فوجی دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورت حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آلۂ کار کو جس کا نام باکوش ہے وزیراعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کب تک وزیراعظم رہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ اسے اپنے ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے مقید نیشنلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیر اثر یہ عہدہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالت یہ ہے کہ وہ تا حال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا۔ اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوب صورت سکیموں اور تونیسیہ کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ منتظر کھڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنا ہے؟ کیا خواہش یہ ہے کہ جس میز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنا ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقعہ کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ عام عقل اور منطق کے نام بھی عمدہ طریقہ لازم ہے کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صورت حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسیہ میں امن، خوش حالی، شادمانی اور دوستی کا دور ہے۔ ——— لیکن حالات وہی ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ہزاروں تونسی جیلوں میں بند ہیں۔ پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشنلسٹ تحریک کے تمام لیڈر جیل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہی وہ خوش حالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے نے سنائی ہے، وہ کہتا ہے کہ ہمیں اس صورت حال پر بحث چاہیے؛

اس مسئلہ میں یہ میری پہلی مداخلت ہے۔ میں اسے مختصر رکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے وقت کم ہے اور دوسرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں مسئلے پر پھر اظہار خیال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مختصر طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سابق اعلان کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے مثبت ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال اتنے ووٹ ہمیں نہیں مل سکیں گے۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہے کہ یہاں ووٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی ووٹ ہوتا ہے اس کا یہ مطلب ہے اب بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا۔ لیکن کونسل میں یہ سوال گیارہ ملکوں نے پیش کیا ہے یہ تمام ملک رکن ہیں۔ اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اقوام متحدہ کے راستوں میں یونہی گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ میں اقوام متحدہ ہیں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جس میں وہ دکھ درد کا مداوا تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہ نجات نہ ہو۔

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہل تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالہ کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؛ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے کیا چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام اہل فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے اجزاء دیر یا بدیر پہنچیں گے اگر تونیسیہ جیسی صورت حال پر بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر مظلوم و مقہور اقوام گیارہ ذمہ دار ممالک کی وساطت سے ——— نمائندہ فرانس نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں ——— اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکیں تو پھر ہم لوگ کس سے رجوع کریں: عملی طور پر سارا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجئے۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ پروانۂ آزادی دے دیجئے۔ صرف یہ کہتا ہے کہ از راہ کرم اس سوال پر بحث کیجئے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو۔ ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے خواہ تم کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لئے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آ جائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے سامنے یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ ذرا اس آگ کو دیکھئے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے یہ صورت حال ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سوال سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی جن ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کئے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح محکوم و مجبور تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گذرا کہ وہ ابھی ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں جن کا تختہ مشق وہ محکوم ہونے کے باعث بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم اہل تونیسیہ کی حالت زار کو فراموش نہیں

کر سکتے ہیں۔ ہم اس سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے صوابدید کے مطابق جو کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہے۔ اس کونسل کے میز پر بعض ایسے آدمی بھی رونق افروز ہوں گے جن کا ہر عمل بار بار کہہ رہا ہوگا کہ ہم اس معاملے کو آتش بازی دیکھنے کے روادار نہیں) ہم اپنے دلوں میں چراغ روشن رکھیں گے اور چراغ جلاتے ہوئے کام کرنے میں تعاون دریغ نہ کریں گے۔

اس مقام پر میرا وفد فی الحال رک جانا چاہتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا وفد ان کے متعلق بھی جواب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت تونسیہ کی صورت حال سے مزید دھچکے ہو جائیں گے۔ اور وہ استعماری کیفیت سامنے آجائیں گے جو وہاں موجود ہیں۔ اور اس پوری بے چینی اور اضطراب کی بنیاد وہ اساس ہیں۔ فی الحال ہم صرف طریق کار کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آگئے ہیں لیکن ان کا باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لئے۔

جناب میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

---

(۲)

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تونسیہ کا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری — پطرس —
کی دوسری تقریر جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کے اجلاس میں کی بخاری اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے۔

تقریر کرنے والوں کی جو فہرست میرے پاس موجود ہے اس میں اگلا نام پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں کونسل سے خطاب کروں گا۔

اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ چھ ملکوں کے وفد اسے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں کے وہ دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے سارے دل میں انتہائی احترام ہے ان میں سے تین ملک ایسے ہیں جو عام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری مفاد کے نمائندے ہیں۔ چوتھے ملک کی عظمت و شان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری مفاد سے کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں ووٹوں کی نوبت آئی اور جب کبھی بھی آئی۔ ہم ہار جائیں گے۔

آج کا دن ——— ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء ——— اقوام متحدہ کی سرگزشت میں ایسا دن منصور ہوگا جب مختلف معاملات پر آزادانہ غور و بحث کو بار دینے کی بنیاد رکھی گئی۔ میرے دور اندیش رفیق چین کے نمائندے ڈاکٹر سیانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع تجربے کی بنا پر ہمیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ اس انجمن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں کونسل کے اندر اس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو صد درجہ افسوسناک اور الم انگیز طریق پر الٹ دیا گیا۔

پچھلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا تو اس کی سرگزشت میرے معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر صد درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے لئے استعمال کروں۔ مجھے ایسے طرز عمل سے احتراز

ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ اس موقع پر اپنے رفیق کے سامنے خود حکومتِ فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات پیش کروں۔ یہ رائے اس مسئلے پر نہیں کہ کسی مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی جب آنسہ کا مسئلہ لفظاً زیرِ بحث نہ تھا۔ ۳ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایت پر بحث کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر کی تھی اس میں کا ایک حصہ یہاں پڑھوں گا۔ جناب شیر پردڈی (MR PARODI) نے اس موقعے پر کہا تھا:—

"ایک معاملے کو ایجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے کون سے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ ملاں شکایت کے لئے مناسب بنیاد موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی صورتِ حال سے متعلق قیاسی طور کی بنیاد پر فیصلہ صادر کرے گی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا اس قسم کی شہادت سے پیش تر کونسل کے لئے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لئے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا؟ اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو جائے گی۔ اور ان مقاصد یا انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں"

فرانس بہت بڑا ملک ہے۔ وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے امم متحدہ کے پورے نظام کے نشوونما میں حصہ لیا تاکہ انصاف مساوات اور آزادانہ غور و بحث سے مسائل کا تصفیہ ہو سکے لیکن آج اسی فرانس اسی ملک کے ایک سابق نمائندے کے الفاظ میں) عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو گیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیشِ نظر نہیں رکھے جو خاص مسئلے میں پیشِ نظر رہنے چاہییں تھے۔

جس حد تک میرے معزز دوست نمائندۂ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی مداخلت کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ کہنا ہے—

میں سلطنتِ متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست سر گلیڈ ون جیب (SIR GLADWYN JEBB) سے کسی قدر بطورِ خاص مایوس ہوا۔ معزز سر گلیڈ ون جیب کی تقریر میں متعدد خوش گوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی کے لئے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے گلہ ہے کہ سلطنتِ متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترکہ محبوب کی بے حرمتی کر دی ہے انہوں نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جب وہ اس پر پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منشور کے مطابق اختیار کرنے کے لئے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہوگی کہ یہ گیارہ قومیں حفاظتی کونسل سے معقول اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے میں نمائندے کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کوئی ابہام نہیں الا یہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سر کیڈوگن یہ بات کہہ کر اپنے تعلق سے آگے بڑھے۔ وہ زیادہ یا کم از کم برطانوی وفد کی جانب سے یہ نہیں کہ فرانس یا برطانیہ پر کوئی حل ٹھونسا جاسکتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا لفظ موجود ہے جس سے آپ یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جاسکے یا کہا جاسکے کہ کوئی چیز ٹھونسنا مقصود ہے؟ اگر سلطنت متحدہ کے نمائندے کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی تجویز یا سفارشیں پیش کرسکتا تھا جو فریقین پر کوئی حل ٹھونسنے سے بالکل پاک ہوتی۔ سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ کیا اس مسئلے پر بحث کریں۔ ہمیں برطانیہ یا فرانس پر کوئی حل ٹھونسنا نہ چاہیے۔ محض یہ سفارش کردینی چاہیے کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر جھگڑے کا تصفیہ کرلیں۔ کیا اسے فیصلہ ٹھونسنے سے تعبیر کیا جاسکتا تھا؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطۂ نگاہ جس انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ مبہم اور لغو تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دھمکی بھی موجود تھی۔ ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات مزید تھی جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لیے لازم ہوجاتا کہ وہ اپنا حل برطانیہ یا فرانس پر خواہ مخواہ ٹھونسے۔ یہ امر حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

سلطنت متحدہ کے نمائندہ کا بیان ایک ملکی پالیسی کا بھی اہم اور المناک انکشاف ہے۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ اس موقع پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ میں حفاظتی کونسل میں سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا۔ جب روس کے خلاف ایران اور احوال یونان سے متعلق روس کی شکایتیں زیر بحث تھیں ——— مسٹر بیون (Mr. BAVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا:—

> "میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی بات سنے خواہ وہ کوئی ہوں۔ اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی بیرونی یا بڑی طاقت کے خلاف شکایت کے باوجود اس کونسل میں نہیں آسکتی اور اپنا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کرسکتی تو میرے نزدیک یہ غلط ہے۔ جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں۔ اسے بھی امن کو خطرے میں ڈالنے کا ملزم ٹھہرایا گیا ہے۔ یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوال ہے اس کی پوری تحقیقات کرلی جائے اور اس پر بحث بھی ضرور کی جائے۔ میری طرف سے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔ اگر حکومت ایران کو حکومت روس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو مزید موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے اس وقت ہم یہ اندازہ کرسکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو ایجنڈے پر رکھا جائے اور اس پر برسرِ عام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے ہی پر امن کا انحصار ہے۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا غلط۔" (سرکاری ریکارڈ سال اوّل سلسلہ اوّل صفحہ ۱۷)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دئے گئے ہیں۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ ——— مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے ——— اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہنچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت برا اثر ڈالے گا۔

اس معاملے کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوام متحدہ پر بڑا اثر پڑتا ہے آمیری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں اقوام متحدہ کا اہم کونسا فرض اور وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنت متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوام متحدہ کو انحطاط سے بچنے اور آگیا وہ قومیں اس پر جو بڑا اثر ڈال چاہتی ہیں ان سے بچا کا بہترین طریقہ یہ ہے وہ تمام بحثیں ختم کر دی جائیں اور وہ سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ ساتھ ساتھ وہ اس نئی عمارت کو تالا لگا دیں جس میں ہم جمع ہیں۔

سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ نیدرلینڈز کے نمائندے نے ایک بات بہت خلوص اور دیانت سے کہی اور وہ یہ کہ اگر ہم نے اب کوئی قدم اٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تونیس میں جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے تمام آزاد وزارت جیل میں ہیں اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تونیس کو ملی۔ تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو پیٹا گیا یا کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ تونیس میں اس وقت وسائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ پھر فرانسیسی کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تمحیص کر رہے ہیں؟ کونسی گفت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریذیڈنٹ جنرل تونیس میں کون سا ایسا نازک کام انجام دے رہا ہے جو یہاں ہماری بحث کی وجہ سے معرض خطر میں پڑ جائے گا؟ اگر اقوام متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تونیس کے اندر ریذیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لیے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی بڑے کام ہی کے درپے ہوگا جس میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا امکان ہی نہیں۔ اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوام متحدہ میں کوئی بحث بہبود انسانی پر ایسا مہلک اثر ڈالے گی۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تونیس میں بے چینی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ یہ بات شروع ہی سے جاری ہے یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی خلوص کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تونیس میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اول وہاں کے اصلی باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں ان کے ساتھ ٹینک ہیں توپیں ہیں۔ اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اہل تونیس کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ دراصل اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی مؤثر طریق پر مشتعل ہوں گے۔ اہل تونیس میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے وہ بھی کبھار ایک آدھ بم پھینک سکتے ہیں وقتاً فوقتاً شور مچاتے رہتے ہیں لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضے میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت ان کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان افعال کے مرتکب نہ ہوں جنہیں "مظالم" سے تعبیر کیا جا رہا ہے ـــــ یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تونیس میں فی الحال اور کچھ نہیں ہو رہا البتہ ریذیڈنٹ جنرل یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ بات چیت از سر نو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنت متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ اس لیے کہ سلطنت متحدہ کے سوا دنیا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ سے زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ مقامی معززین نے حکومتیں بنا لی تھیں (یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تونیس میں اپنے پٹھوؤں کے لئے استعمال کی) زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے سمجھوتے ہوتے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سمجھوتہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ جب تک عوامی

خواہ بدقسمتی سے امسال بعض [illegible] مصالحت کی کوئی تسلی بخش صلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی۔ بہر کیف کم از کم ایک فیصلہ طرز عمل کی بنا پر جو میرے نزدیک تاریخ میں ہمیشہ شاندار اور روشن رہے گا سلطنت متحدہ نے یہ مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کرے جنہیں ایک موقع پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا اس کے بعد یہ ہوا کہ ہندوستان اور سلطنت متحدہ کے درمیان پائیدار امن و دوستی کی بنیاد پڑی۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرأت مندانہ اور فراخدلانہ قدم نہ اٹھایا۔ وہ [illegible] وقت گذارنے [illegible] سے کام لینے، دور دنیا کو اپنے اور دوسروں [illegible] در پیش کے متعلق وعدہ کر دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرأت مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہوگئی اور عوام کے حقیقی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کی۔ دوسری تنظیم میں یہ طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوئی دو ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر مستعمرات اور برطانیہ کے وزیر مستعمرات کے درمیان بات چیت ہوئی تھی اور موضوع گفتگو تیونس تھا۔ اگر سر گلیڈون کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو مذکورہ مسئلہ کی حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنے کے لئے دیا گیا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سر گلیڈون جب نے انگریزی زبان پر قابل رشک دسترس کا مظاہرہ [illegible] مجھے اپنے آپ کو گھوڑے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی ہے۔ اس طرح مجھے [illegible] کا اظہار کرنا [illegible] موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں مجھے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے بھانت بھانت کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شتر مرغ بھی موجود ہیں تو وہ میرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو میرے نزدیک [illegible] دراصل گھاٹ ہے یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف جس حد تک آزادانہ بحث و تمحیص کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو زیادہ جرأت مندانہ ریکارڈ پیش کر سکتا ہے۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی ہر ابہام سے پاک رہی اور وہ حد درجہ بلند آہنگ تھی۔ گذشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادی تقریر کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے ——— اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہتر اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض حصے بڑے روح افزا ہیں ——— میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں تغیر آچکا ہے

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی جب مسٹر سٹے ٹینیس (Mr. Stettinius) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل کو ایجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی۔ میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر اقوام متحدہ کے ارکان میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات سنانے کا حق حاصل ہے۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی ہے وہ اپنے معاملات

کونسل میں لے آئیں۔

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے ایران کے خلاف جمہوریہ شورائیہ روس کی شکایت پر ۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا۔

"اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت کا موقف یہ رہا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل سے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ میری حکومت اس اصل کو بہت اہم سمجھتی ہے۔"

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۷ء میں یہ کہا۔

"یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی چل رہی ہے اور آدمی مارے جا رہے ہیں۔ لہٰذا حفاظتی کونسل کو اس پر توجہ کا حق حاصل ہے خواہ سیادت کا تصور کچھ ہی ہو اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے۔"

روس نے چیکوسلاواکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت پیش کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن ــــــ (MR. WARREN AUSTIN) نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسے معاملے کے ما لہ و ما علیہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک مسئلہ پیش ہو۔ جیسا کہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے ایجنڈے پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر مزید غور کر لینا چاہیے۔ تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔"

مسٹر آسٹن نے مزید کہا۔

"کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا اغماض کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں ووٹ دے گی۔"

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ ماضی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی ہم آہنگ اور محکم رہی ہے۔ میں مسٹر جیسپ (MR JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں جو میرے ذخیرے کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر وارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی مؤقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا۔

"اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آ سکتا ہے۔ جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے

پر غور و خوض ہونے سے پہلے انکار پیش نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ انکار کے معقول وجوہ موجود ہوں۔

تاہم یہی نمائندے اور متعدد دوسرے اختیار کی بنا پر اس موقع پر ہمارے نقطۂ نگاہ کو قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اختیار کے مسئلے کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس پر بحث نہیں کی گئی۔ بعض نمائندوں نے کہا کہ جب تک اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کی درخواست منظور نہ کی جائے گی وہ کونسل کے اختیار یا عدم اختیار کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔

اس طرح امریکہ نے حالیہ سال تک واضح روش پر قائم رہنے کے بعد اپنی پالیسی بالکل بدل لی۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ طرز عمل ہمارے لئے بہت بڑی مایوسی کا باعث ہوا ہے۔ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار گذشتہ موسم خزاں میں جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے دوران نمایاں ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں مراکش کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ نے جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے اختلاف کا فیصلہ کیا۔ جب اس معاملے میں امریکہ کے اس طرز عمل کی سرگذشت کا علم تھا ہم نے محسوس کیا کہ امریکہ کے اس ماتحت سے ایک حقیقت کا اعتراف ہے جو اس نے اپنے لئے چن رکھا ہے۔ بعض یقیناً ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہوئے خوش تھے ... اور اس کے نتیجے میں امریکہ کے وفد کو انتہائی تحسین کا مستحق سمجھنا چاہئے ــــ کہ امریکہ نے کسی بھی معاملے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ اس میں خود امریکہ پر کوششیں یا الزامات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی سرگذشت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھا کہ مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ کو ایک منفرد مثال سمجھنا چاہئے۔ تاہم بہت سی مصلحتیں پیش نظر تھیں جو مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ پر اثر انداز ہوئیں لیکن پیش نظر مسئلے کو کسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید ایک مستند یہ بھی کہ ہمارا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا جو نمائندے یہاں تشریف فرما ہیں یاد ہوگا کہ فرانس کے وزیر خارجہ نے جو تقریر کی تھی ویسی عجیب و غریب تقریر اقوام متحدہ میں کبھی نہیں سنی گئی۔ اس نے مقام تقریر پر پہنچ کر اسمبلی سے درخواست کی کہ مسئلہ مراکش کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے متعلق ووٹ دینے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ دوسرے معاملات کے علاوہ اسمبلی اس وقت فرانس کی مہمان ہے۔ یہ امر موجب افسوس ہے کہ جو وفود اس موقع پر موجود تھے ان میں سے متعدد نے اس مروت اور خوش خلقی کو اپنے اوپر لازم کر لیا جس کے متعلق وزیر خارجہ فرانس نے یاد دہانی کی تھی۔ اس قسم کی مروت و خوش خلقی پر کار بند دنیا میں آج بھی مزید حوصلہ افزائی کی موجب ہوتی۔ اگر لاکھوں مراکشیوں کی زندگی اور آزادی معرض خطر میں نہ ہوتی جس طرح آج لاکھوں تونیسیوں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔

آج ہم کس کے مہمان ہیں کہ ویسی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوں جو پیرس میں اختیار کی گئی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا ووٹ سے احتراز پیرس میں ووٹ سے احتراز کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہم اس احتراز کا ماتم کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امریکی دوستوں اور امریکی وفد کے دوستوں کو یاد دلانا میرا کام نہیں۔ کہ ان کا فیصلہ دنیا بھر میں آزادی فکر و خیال کے حامی عناصر کی بہت بڑی تعداد کے لئے باعث ... ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ حفاظتی کونسل کے گذشتہ اجلاس سے اب تک یہ مسئلہ بہت سے ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ دلوں کو ٹٹولنے کے بعد اس پر گہرا غور و خوض ہوا۔ میں کسی ملک کے کسی آزاد خیال اخبار سے آگاہ نہیں۔ جس نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلے پر بحث کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی پالیسی ہوگی۔ اور امریکہ بھی ان ملکوں میں شامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی حکومت نے خطرات کا پوری طرح محاسبہ و موازنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ اور ہم دونوں ممبر جو اس شکایت کو حفاظتی کونسل میں لائے ــــ محض ہمیں نہیں بلکہ آج کی تمام آزادی پسند قومیں ــــ کشیدگی اور تناؤ کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ اور وسیع سے وسیع اتحاد پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو مصائب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کی خاطر، ہماری اپنی خاطر اور امن و آزادی سے محبت رکھنے والے تمام ملکوں اور جماعتوں کی خاطر اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا کہ امریکہ کا یہ فعل اصل مقصد کی تلاش میں کوئی مزید رکاوٹ ثابت نہ ہو۔

میں حقیقت میں اندازہ نہیں کر سکتا ہوں کہ [illegible] ایک [illegible] عمل اختیار کر لینے کے بعد [illegible] کے برعکس [illegible] ایک اس معاملے میں [illegible] معمول تو یہ ہے امریکہ کے بہترین دوست بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے۔ [illegible] ایسا ہی معاملہ ہے [illegible] صرف ایک [illegible] پر [illegible] رکھنے والے [illegible] چلتے چلتے اچانک [illegible] کا مرکزی [illegible] فیصلہ [illegible] میں کچھ نہیں [illegible] کے [illegible] گیا [illegible] امکان [illegible] انہوں نے اپنے بیان میں بہت سے حوصلہ افزا الفاظ کہے۔ انہوں نے [illegible] وضاحت سے [illegible] تیونس [illegible] محدود [illegible] میں فرانسیسیوں کو شامل کر لیا گیا۔ امریکی وفد کے اصحاب خوب جانتے ہیں [illegible] وضاحت [illegible] حالت [illegible] سے [illegible] زیادہ [illegible] تیونسیوں کا [illegible] ان کے لئے [illegible] مطلب [illegible] قوت استعمال کرنے سے متعلق فرانس [illegible] تیونس [illegible] مستقل [illegible] جب تک قانونی [illegible] صورت حال کے خلاف [illegible] فرانسیسی [illegible] ہے جب [illegible] استعمال نہیں [illegible] کوئی بھی [illegible] ذکر [illegible] اس پر عمل نہیں سکتا؟

لہٰذا میں [illegible] ان الفاظ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور [illegible] ان کا خیر مقدم [illegible] ان [illegible] یہ [illegible] جانے [illegible] اہل تیونس نے جب پہلی مرتبہ امریکہ سے امداد کی اپیل کی تھی [illegible] میں مسٹر ایسن [illegible] تھے۔ لوگ یہ حقیقت فراموش [illegible] تیونس [illegible] یا چار مرتبہ [illegible] انقلاب [illegible] ہوتے [illegible] لوگ بھول [illegible] کہ [illegible] قومی تحریک کا آغاز [illegible] تحریک کل کی پیداوار نہیں [illegible] اس معاملے پر کل آج اور [illegible] کی [illegible] اہل تیونس جب [illegible] نہیں [illegible] مجھے یقین ہے ان کی [illegible]

[illegible] آخری جملے سے بھی اس [illegible] تسکین [illegible] کرنے کی کوشش [illegible] ممکن ہوگا [illegible] امریکہ [illegible] مرتبہ [illegible] دینے سے [illegible] جب پیرس کے اجلاس میں [illegible] اس وقت بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا اس وقت کہا گیا تھا [illegible] دینے سے [illegible] کرتے ہیں۔ آج امریکہ نے [illegible] مرتبہ [illegible] کا جملہ استعمال کیا ہے۔

[illegible] معلوم ہے کہ [illegible] ڈپلومیٹک [illegible] کے الفاظ محض لیپ پوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی [illegible] ایسی جگہ رکھتا جہاں [illegible] زیادہ زور کے ساتھ کہے کہ [illegible] معقول [illegible] دل میں ابھی [illegible] تحفظات باقی ہیں۔

[illegible] اس جملے کے استعمال کو [illegible] معنی [illegible] گے میں کہتا ہوں کہ اس جملے کی تعبیر کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ امریکی ضمیر کی ایک چھوٹی [illegible] وفادارانہ ڈپلومیسی کے [illegible] کچھ آزمائش کر رہی ہے [illegible] اس لحاظ سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ وقت [illegible] جب ہمیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا پابندی قول و عہد نہ کرنے کا طعنہ دینا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ ساری ناکامی اہل تیونس کی ناکامی نہ ہوگی۔

مجھے ایک چھوٹی سی بات اور کہنا ہے جو میری تقریر کا یہ حصہ ختم ہو جائے گا۔

ہم اس معاملے میں فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے [illegible] ہم ہمدردی کے ان زبردست روابط سے بے خبر ہیں جو [illegible] کے ادھری جانب بیٹھے ہوئے ممتاز ملکوں کے درمیان قائم ہیں۔ ہم فرانس کو یقین دلانے ہیں کہ ہم نے [illegible] شمالی تجاویز کا ہمیشہ احترام کیا۔ [illegible] آلام کے دور میں ہمیں اس کے ساتھ گہری ہمدردی رہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمدردی ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور ہم مستقبل میں [illegible] کے امن و خوش حالی کے آرزومند ہیں۔

تاہم ہم نے یہ مسئلہ اس لئے اٹھایا کہ ہم بصمیم قلب یقین رکھتے ہیں فرانس کے مفاد کا تقاضا اہل تیونس کے حقیقی نمائندوں سے پر امن مفاہمت [illegible] ان [illegible] مفاہمت نہیں [illegible] خود فرانس [illegible] مسٹر ڈی ہاٹی کلاک (MR. DE HAUTECLOCQUE)

(ریذیڈنٹ جنرل) اس وقت انتہائی سرگرمی سے تاش کے پتے پھینٹنے میں مشغول ہیں۔ انہیں امید ہے کہ یہاں کسی وقت بھی ان کے ترپ آجائیں گے۔ لیکن افسوس کہ جن چار بیگموں کی وہ امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں مسٹر ڈی۔ اے۔ ڈی گلوک نے جیب میں ڈال دیا ہے۔

فرانس کے ارباب بست و کشاد غالباً یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انہوں نے حریف کو مات دے دی ـــــ ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں لائیں ـــــ شطرنج کی بازی لگی ہے اور انہیں جلد سے جلد چال چل جانی چاہیے ورنہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ یہاں سے شطرنج نہیں کھیل رہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ شکایت کبھی مستعفی سے بہت پہلے پیش کر دیتے اور فرانس کے بر خلاف پیش کرنے کا موقع نہ دیتا کہ پہلے اہل تیونس کے ساتھ بات چیت جاری کر رکھی ہے یہ معاملہ آج بالکل شکایت پیش کرنے کا نہیں۔ اگر مسٹر ڈی ہاؤٹ کلوک کی اپنی آستین سے کابینہ وزارت نکال کر پیش کر دیں تو وہ اپنے سوا دنیا کے کسی آدمی کو متعجب و مبہوت کر سکیں گے۔ وہ ہمیں مات دینے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ وہ ہم سے جنگ نہیں کر رہے۔ اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں اور اگر وہ واقعات کی رفتار سے مرکز شکریہ لینا پسند کریں نہ فرمائیں تو ناکام رہیں گے۔

لہٰذا میں تیونس کے فرانسیسی ارباب بست و کشاد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جان لیں یہ ہمارے ساتھ شطرنج کھیلنے اور تیز تر چالیں چل کر ہمیں مات دینے کی کوشش کا موقع نہیں۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ امریکہ کے جریدہ نیشن کے الفاظ میں: محتاط تیز رفتاری سے وزارتیں بنا دینے سے حل ہو جائے گا۔ یہ معاملہ گہری متانت کا متقاضی ہے اس کا تجزیہ ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجام کار یہ دوست نمائندہ امریکہ کے الفاظ میں عوام کا ارادہ اور عوام ہی سے کار گر ہو گا۔

ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے میں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست و کشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہاں مٹھی بھر فرانسیسی آباد کاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں۔ جنہوں نے تیونس میں بے حد وسیع مراعات حاصل کر رکھی ہیں اور پیرس کے سیاسی حلقے ان کی حمایت میں صدر وبر زور اور گرم جوش ہیں۔ فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جس نے تیونس کی موجودہ صورت حال کو ذلت خیز قرار دیا فرانس آزادی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے میں نہیں سمجھتا کہ تیونس کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آباد کار ان روایات کی درخشانی کو مدہم کر سکیں گے وہ تھوڑی دیر کے لئے ان روایات کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔

لہٰذا اگر چہ ہم پندرہ قومیں ـــــ پانچ جو حفاظتی کونسل کی رکن ہیں اور جنہیں اس سلسلے میں ووٹ دینے کا حق ہے اور دس ہم جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ووٹ کی مجاز نہیں ـــــ ہم اس کام میں ناکام ہو چکے ہیں جسے اپنا فرض سمجھ کر اٹھایا تھا۔ گو آئین ہمیں شکست دے رہی ہیں۔ دنیا خود بخود اس واقعے سے صحیح نتائج اخذ کر لے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس غم ناک صورت حال کے مداوا کی موجودہ مرحلے پر کیا صورت ہے! کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم بحیثیت اقوام متحدہ اپنی عزت ایک حد تک بچا سکتے ہیں؟ اگر حفاظتی کونسل اس مسئلے کو مسترد کر دینے پر تلی بیٹھی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ پیش نظر ضوابط کے مطابق کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ صرف ایک چھوٹا سا کام شاید باقی ہے۔ جس پر حفاظتی کونسل مناسب سمجھے تو راضی ہو سکتی ہے۔

جن گیارہ قوموں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا انہوں نے دفعہ ۳۵ کے ماتحت درخواست کی تھی کہ حفاظتی کونسل اس معاملے کو پیش کرنے کی اجازت دے۔ وہ موقع جس کے بھروسے پر ابتدائی درخواست پیش کی گئی تھی اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ معاملہ ایجنڈے پر نہ آجائے ہماری درخواست اس وقت ختم ہو جائے گی جب ووٹ لے لئے جائیں گے۔

اندریں اثنا طریقِ کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں، جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں، اور ایک قوم جو کونسل کی ممبر ہے [illegible] قوموں نے بین الاقوامی امن کی خاطر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ یہ سب فرانسیسی رفیق نے ہماری شکست لی۔ اس نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم بیانات بھیجنے سے ان کو [illegible] پہنچانا چاہتے تھے جو حاصل کردہ ہم میں سے بعض پر دنیا اعتماد نہیں رکھتا جیسا وہ سمجھتے ہیں۔ کہنا ہے لیکن یہ زیادہ سے زیادہ دو درجن ملک کا معاملہ سامنے [illegible] حالت ہوں کہ تیونس کے دل میں پروپیگنڈے کی کوئی غرض ہو سکتی تھی جبکہ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا جو نمائندہ فرانس نے [illegible] موقف پر حفاظتی کونسل میں ایک جب طریق کار پر بحث ہو رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے بارے میں غور و خوض کیا جا رہا تھا تیونس کا فیصلہ [illegible] تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے درخواست پیش کی کہ کوئی کام کیا جائے کہ ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے تو کم از کم ہمیں اتنا مروت ہی سے اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے۔ ہم پر الزامات لگائے گئے ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے ممبر [illegible] کے دوران میں اعلان کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم کیا جاتا ہے جیسے قطعاً لگائے گئے نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تیونس پر بحث سے [illegible] دس قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا ہم کو موقع فراہم کر سکے اور دس قوموں کو کونسل کی میز پر بلائے تاکہ وہ دفاع کر سکیں۔ پیرا پاکستانے [illegible] ان بیانات کے سنگین الزامات کا مفصل جواب دے سکیں جو فرانسیسی نمائندے نے گذشتہ جمعہ کے اجلاس میں ہم سے خلاف عائد کئے۔ اس وجہ سے [illegible] کی تجویز یہ ہے کہ زیرِ غور مسئلے کے بارے میں فیصلے سے پیشتر آپ حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہئے جنھوں نے آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے۔ اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں پڑھ کر سنا چکا ہوں۔ دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الزامات کے جواب دینے کا اخلاقی حق استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کئے۔

پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

---

(۲)

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا

مسئلہ تیونس کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں، پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں ضروری تصریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہاں ہوں۔

سال رواں کے قریباً آغاز ہی سے تیونس میں شدید بے چینی جاری ہے۔ قتل، تشدد، آتش باری، اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوام متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گذشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تیونس میں جو درد ناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی ہنگامے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہوا یا معمولی امن شکنی کے واقعات پیش آئے جسے روکنے کے لئے نظم و قانون کے عام اقدامات کرنے پڑے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورت حال کی جڑیں ماضی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے اور مستقبل کے دامن میں ناخوشگوار واقعات ہی نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے نقطۂ

دہ منظر نگاروں کی توضیح و جواز کے لئے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام اور اہلِ تونیسیہ کی حکومت کے درمیان جس کش مکش نے حال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے یہ اس کش مکش کا حسن . . . ترین منظر ہے جو ستر سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیسیہ پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (ایک مورخ کے بیان کے مطابق) الجزائر سے اس بہانے تونیسیہ میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی منظور تھی۔ داخل ہوتے ہی اس طرح سے ناکہ بندی کی کہ تا ... حاکم حکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اور حاکم تونیسیہ کو فرانس کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال معاہدہ باردو طے پایا۔ یہ معاہدہ اپنی عمومی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا۔ جو استعمار کے دورِ عروج میں طاقت ور اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ سہ دول اس کی تمہید میں مرقوم ہے کہ فریقین دوستی اور حسنِ ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آرزومند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان عرصے سے چلے آتے ہیں۔ اس معاہدے کی دفعہ ۲ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا۔ جب فرانس اور تونیسیہ کے حکمران اس امر پر متفق ہو جائیں گے کہ مقامی انتظامیہ قیامِ امن بحال رکھنے کے قابل ہے۔

یہ عارضی صورت جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال رہے، بہتر برس سے قائم ہے اور اس کی کڑیوں میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تونیسیہ پر فرانس کی گرفت بار بار سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔

فرانس کو تونیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے، جب ۱۸۸۳ء میں ایک کنونشن پر دستخط ہوئے جو لامرسی (LA MARSA) کی کنونشن کہلاتی ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ تونیسیہ کے لئے "زیرِ حمایت علاقے" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے اس ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ اسے بدلا گیا، جو دو حکومتوں کے درمیان ہو چکی تھی۔ اس کا منشا یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان تعاون رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس انتظامیہ کا براہِ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم عملاً یہ تونیسیہ کی غلامی کا آغاز تھا کیونکہ اس کے بعد صدر جمہوریہ فرانس نے یک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمرانِ تونیسیہ سے اجرائے قوانین کے تمام اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے پھر بتدریج یک طرفہ حکمناموں کے ذریعے تونیسیہ میں فرانسیسی ریذیڈنٹ کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دیے اور ریذیڈنٹ بطور خود تونیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے اختیارات کا تحویل دار بن گیا۔

کسی علاقے کو زیرِ حمایت لے لینے کی وجہ جواز یہ پیش کی جاتی ہے کہ پس ماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے لیکن تونیسیہ کے تعلق میں اس کے برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی سیادت اور برتری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور جو خود مختاری اسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر تونیسیہ میں فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آباد کاروں کو زمینیں بھی دی گئیں۔ اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تونیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آباد کاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں جو براہِ راست فرانس سے آئے تھے یا انہی قریب میں انہیں تونیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ مخواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے سے ان تمام جنگلات کی حد بندی کر کے خاص آباد کاروں کے فائدے کے لئے از سر نو تقسیم کر دیا گیا۔ تونیسیہ کی آبادی پینتیس لاکھ کے قریب ہے ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ تیس ہزار چھوٹے بڑے افسر ملک کا نظم و نسق سنبھالے بیٹھے ہیں۔ گویا ایک سو باشندوں کی ہر جماعت کے لئے ایک افسر مقرر ہے۔ ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں۔ تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مدرسوں میں جانے والے تونیسی طلبہ کا تناسب ½۱۱ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی

قسمہ کا ضابطہ ۔ ۔ ۔ نیفیسیہ

سب پر مستزاد یہ کہ فرانس کی طرف سے جو ریذیڈنٹ تونیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمراں کے تمام اختیارات غصب کر لئے ہیں اور اس فریب کی ۔۔۔ کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی مہر استعمال کی جاتی ہے تونیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے ممبر رائے عامہ سے منتخب ہوئے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو اگرچہ وہاں وزیر مقرر کر دئے گئے ہیں تاہم احکام نافذ کرنے کا ۔۔۔ اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے ۔ اہلِ تونیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیب خاطر قبول نہیں کیا ۔

موجودہ صدی کے آغاز سے تونیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ قوت و حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے وہی شکل اختیار کر لی جو دنیا کے دوسرے حصوں کی محکوم اقوام نے دورِ حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے ۔ یعنی وہ بیدار ہوئے آزادی کے لئے جد و جہد شروع کر دی اور بعض طاقتوں میں اب تک اجنبی اقتدار اور لوٹ مار کے خلاف سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں

اہلِ تونیسیہ کو بھی ایسی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں ۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائلِ ملک پر قبضہ کر رکھا ہے ان کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کرتا دھرتا نہ استعمال ۔ قوم پرست لیڈر بے دھڑک یا تو جیلوں میں ٹھونس دئے گئے یا جلاوطن ہو گئے ۔ ان میں تمام لوگ بصیرت اور دانش و ہمت کے مالک تھے ۔ ان میں سے بعض جلاوطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں تاہم عارضی پسپائیوں کے باوجود تحریک نے ترقی کر لی تھی ۔ پہلی جنگِ عظیم اور پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کے بعد اہلِ تونیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے چمک اٹھے ۔ جریدہ ۔۔۔ ([illegible]) کے بیان کے مطابق عین اسی وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے سپاہیوں اور چھوٹے چھوٹے آبادکاروں کی تعداد بڑھانے کا منظم سلسلہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف فریقوں کی حمایت میں لگ گئے ۔ بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند جماعت " نو دستور " سے ۔۔۔ ہو گئے ۔ بعض نے آبادکاروں کی پشت پناہی اختیار کر لی ۔

پیرس میں حکومتیں بدلتی رہیں ۔ ہر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہلِ تونیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا ۔ ۱۹۳۸ء میں ایک طرف نو دستور پارٹی حد درجہ مایوس ہو گئی ۔ اور اس نے آخری فیصلے کا ارادہ کر لیا ۔ دوسری طرف آبادکاروں کے حامی فرانسیسی حکام ۔۔۔ کرنے کو تیار ہو گئے ۔ اس طرح وسیع پیمانے پر تشدد کا دور دورہ قائم ہو گیا ۔ قریباً ایک ہزار قوم پرور جیلوں میں ڈال دئے گئے فرانسیسی حکام نے اعلان کر دیا کہ تونیسیہ میں محاصرے کی صورت پیدا ہو چکی ہے ۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ صورتِ حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے طویل و دشوار گذر چکے ہیں ۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ تونیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظرِ ثانی کا محتاج ہے حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے نہ انصاف و آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا میں یہاں پھر جریدہ ۔۔۔ سے اقتباس پیش کرتا ہوں ۔ جریدۂ مذکور رقمطراز ہے :-

> " جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تونیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے ۔ بے (حکمران) ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا جس میں سات فرانسیسی اور چھ تونیسی شامل تھے ۔ لیکن اس کابینہ کے فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی ۔ کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی منتخب کونسلیں مقرر

کردی گئی تھیں، جن کے ارکان کی تعداد یکساں تھی۔ ایک تونسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر
لیکن ان کونسلوں کی حیثیت محض مشیروں کی سی تھی۔ رول آرڈیننس بنانے کا کام تونسیوں سے لے
کر لی گئی تھی۔ علاوہ پورا اقتدار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام
اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا اور حکمران تونس کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے دستخط بھی ضروری تھے۔
سب سے آخر میں اس لیے کہ صرف فرانسیسیوں کے ہاتھ میں عام ملکی انتظامات تھے وہ بلدی اور
دیہاتی اداروں کے بھی نگران مقرر تھے۔

۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں، ۱۹۴۹ء کے واقعات نے اہم نتیجے پیدا کیے۔ فرانسیسی آبادکاروں کے سخت احتجاج اور عام مخالفت
کے باوجود نئے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کر دی جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں اہل تونس کی حمایت حاصل کی جائے۔
اول فوراً حکومت از سر نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے کی شرطیں تبدیل کر دی جائیں تاکہ اہل تونس بھی معتد بہ تعداد میں لیے جا سکیں اور مقابلے
کا امتحان ضروری نہ ہو جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دیتے رہے تھے۔ سوم بلدیاتی خود مختاری جاری کر دی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریذیڈنٹ جنرل نے
حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تونسیوں
اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی۔ اور اس کی صدارت تونسی وزیراعظم ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تونسی وزراء
مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لیے کہ آخر الذکر بھی مشرق کی طرف دیکھ
رہی تھی۔ بہر حال نو دستور پارٹی اس کابینہ میں خدمت گزاری پر راضی ہو گئی۔

فروری ۱۹۵۱ء میں تونسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے کئی تبدیلیاں کرلیں۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وزارت جو فیصلے کرے گی
انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نفرت انگیز توثیق ضروری نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سامنے اس صورت حال پر غور سے
پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے: ماضی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ نو دستور
پارٹی نیز تونسیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کامل خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کی رائے یہ
ہے کہ ان حدود سے آگے پیر کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہیے۔

وزیراعظم تونس نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے نام ایک خط بھیجا: "موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے
کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مخالفت ہوتی ہے ۔۔۔۔ مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا۔
خاص طور پر اس لیے کہ مہینوں سے یہ وزارت تونس اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تحقیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے تونس
اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی روش اور ان سب کی کوششیں کہ گفت و شنید ناکام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت
رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کیے گئے جن کی بنا پر حکومت تونس اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استعفے دے دیے
گئے خاص سیاسی نقطۂ نگاہ سے قرار دادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے ترمیموں کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اسے مخالف مندوبین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔"
۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیراعظم نے پھر ایک چٹھی ریذیڈنٹ جنرل کے نام بھیجی جس میں ان تمام کارروائیوں کی تفصیل کھولی گئی جو وزارت سے پہلے اور اس کے بعد
اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے وفدوں کے روبرو پیش کیے

گئے۔ چنانچہ ان کارروائیوں کا بھی ذکر تھا۔ نیز پیرس تار بھیجے گئے۔ مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی کام کرتے تھے ان کا ماہانہ مشاہرہ بھی مقرر کر لیا تھا میں ان نازیبا
اشاروں کا ذکر نہ کروں گا جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہوا۔ ان ذرا ذرا سی باتوں کو یاد دلا کر جنہیں میں سراسر میرا مادی کہنے کیلئے تیار ہوں ـــــ البتہ میں آپ
کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف مزید منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہل تونیسیہ کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیش عداوت اور تونیسیہ
میں فرانسیسی مفاد کے عجیب و غریب تصورات کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں۔ تاہم اب بھی ہر چیز کا مداوا ہو سکتا ہے۔ سمجھوتے کے امکانات موجود ہیں
دیانت دارانہ اور خیر خواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ خیر سگال لوگ جن پر نمارت مشکل ہے مایوسیوں اور دو باتوں کے باوجود گفت و
شنید جاری رکھنے کے لئے تیار ہیں اگرچہ بار بار اس میں مداخلت ہوتی رہی۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی و انتظامی تعطل ہی
میں فائدہ نظر آتا ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے کچل کر رکھ دی جن کی حیثیتیں تونیسیہ سے وابستہ تھیں۔ تونیسیہ کی وزارت جو اس
غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اور اہل تونیسیہ کی خود مختاری بحال کرنے کے لئے حکومت فرانس سے گفت و شنید کرے اسے غلط طریق پر محروم اختیارات کیا
گیا۔ فرانسیسی آبادکاروں کی سازشوں اور بے جا دخلوں نے وزارت کو بے عمل بنا دیا۔ تونیسی وزیروں کو مسلسل وقت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس و ناامیدی کی یہ فضا تھی جس میں تونیسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخر ہی سے عازم پیرس ہوئے تاکہ حکومت فرانس کو اس کے عہد و پیمان
کی یاد دلائیں۔ فرانس کے وزیر خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس سے امیدوں کا آئینہ ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس جواب میں جزوی اصلاحات کی مذمت
کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے تونیسیہ میں تہذیب کے لئے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا گیا کہ تونیسیہ
میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس جواب نے اہل تونیسیہ کو صد درجہ مایوس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے ان کے دلوں میں
بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۱ء میں ایم رابرٹ شومان (M. Robert Schuman) نے کہا کہ "فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں سے ہمارا نصب العین
آزادی ہے۔" اس سے اہل تونیسیہ کے دل مسرور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت
فرانس موجودہ ادارے (گراند کونسل) میں ترمیم پر غور و خوض سے نفور نہیں لیکن اس کے نزدیک ہز ہائی نس بے کی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے اجزا
کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔"

اس بے حسی اور مایوسی سے اہل تونیسیہ کو جو صدمہ ہوا اسے اس خط سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو تونیسی وزیر اعظم نے حالات کی اس
اچانک تبدیلی پر حیرت زدہ ہو کر صدر فرانس کو لکھا۔

> "تونیسیہ میں فرانس کے مفادات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت تونیسیہ نہ صرف ان
> مفادات کو تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کی حفاظت کی ضمانت دینے کے لئے بھی تیار ہے۔ اور ایسا کرتے
> ہوئے وہ اہل تونیسیہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ لیکن ان مفادات کو خواہ
> وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں سیاسی حقوق کی صورت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی
> جن کے تحت اہل فرانس کو تونیسیہ کے انتظامی اور منتخب اداروں میں دخل دینے کا حق مل جائے
> ..... جہاں تک فرانس کی طرف سے مالی امداد کا تعلق ہے اس امر کی پوری پوری وضاحت

ہونا ضروری ہے کہ اس کی حیثیت قرضے کی ہے جس پر اصل اور سود دونوں واجب الادا ہیں، اور جس کے اضافہ جات سالانہ بجٹ میں بسلسلہ قرضہ زیرعنوان "قرضۂ تونیسیہ" کئے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قرضے سے ملک اور عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس امداد سے جو مفادات سب سے زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں وہ معدنی ذخائر، نقل و حمل کے وسائل اور بجلی وغیرہ کی تیاری کے لئے مراعات ہیں۔ ایسے مفادات میں تونیسیوں کا حصہ کم طلب ہونے کے برابر ہے۔ جناب صدر انصاف کوئی سے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اول تونیسیہ پر فرانس کے احسانات کا آپ نے انتہا پرچار کیا جاتا ہے لیکن تونیسیہ نے آڑے وقت میں فرانس کی جو مدد کی، اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے۔ . . . . کیا یہ سب کچھ بھلا دیا گیا ہے؟ کیا تونیسیہ کو وقتی فرانس کا ہمیشہ کے لئے دست نگر تصور کر لیا گیا ہے؟

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا کسے علم نہیں؟ تونیسیہ کے ہر دل عزیز محب وطن رہنما حبیب بورقیبہ (HABIB BOURGUIBA) اور دوسرے قومی لیڈر جنہیں تونیسیہ کے عوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ۱۸ جنوری کو گرفتار کر لئے گئے۔ فسادات رونما ہوئے، گولیاں برسائی گئیں، جان و مال کا نقصان ہوا، ہزاروں تونیسیوں کو اور انجام کار تمام تونیسی وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے کہ کشمکش کے گذشتہ تین مہینوں میں دونوں جانب جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالی جا سکے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے اس، فسادی کردار کے کٹہرے میں جانچئے جس نے ایک مظلوم کا گلا مروڑ اس جرم کی پاداش میں شدت کے ساتھ۔ بار بار دم گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تونیسیہ کی صورت حال کو محض ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا کہ وہ اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے ہمارے دلوں میں اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس نے تونیسیہ کے ان تمام قومی لیڈروں کو جیل میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے؟

تونیسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ بہت اضطراب انگیز ہیں۔ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون "تونیسیہ کی کابینہ" کے زیرعنوان ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ ۱۲ اپریل کو تونیسیہ میں نئی کابینہ قائم ہوگئی لکھتا ہے:۔

"اس کابینہ کو کوئی قابل ذکر اختیار حاصل نہیں۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریب قریب ہی قرطاجنہ میں منائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے زیر حمایت علاقے تونیسیہ کے بائے نام حکمران سلطان کے چہرے پر اس وقت تبسم کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کر کے یہ کردار ادا کرایا جا رہا ہے۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل جین ڈی ہاٹی کلوک (JEAN DE HAUTECLOQUE) نے وزارت خارجہ کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ تونیسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی

> [illegible] حکومت کر رہی ہے جن خطوں میں [illegible] ریاست [illegible]
> کے ہیں۔ [illegible] (Mr.
> — Baccouche) [illegible] وزیر اعظم [illegible]
> [illegible]
> [illegible] موجودہ حکومت [illegible]
> کیا اور فرانس نے [illegible]
> کر رہے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت فرانس [illegible] استعمار کی صورت حال کو برقرار رکھنا چاہتی ہے جس میں قوم کے جذبات [illegible] استعماری طاقت کی [illegible] کے لئے سازگار فضا قائم ہے۔ استعماری طاقت کے لئے [illegible] کا نام [illegible] مقامات پر [illegible] جب [illegible] دے گا۔

ایک مشہور [illegible] رسالے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے: "بڑی عجیب بات ہے کہ افریقہ [illegible] ان کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو دنیا کی طاقتوں میں سب سے زیادہ [illegible] اپنی سلطنت ختم [illegible] مقالہ نگار کے قول کے مطابق فرانس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت بن گیا ہے [illegible] میں آباد ہیں جو رقبہ میں ریاست ہائے متحدہ سے ڈیڑھ گنا ہے۔ فرانس کے لئے اب بھی [illegible] پالیسی اختیار کرے۔ استعماری نظام کی جگہ تعاون کا نظام رائج کر دے اور مقصد یہ ہو کہ بہرحال [illegible] دوستی [illegible] اس طرح فرانس تمام دنیائے اسلامی ممالک کے لئے [illegible] کی حیثیت میں [illegible] ہوگا۔"

یہ دست کشی نہ تو موجب شرم ہے اور نہ اسے شکست قرار دیا جانا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر اقوام متحدہ کے منشور کے کوئی معنی ہیں تو استعماری طاقتوں کے لئے انجام کار اس سے زیادہ تر روش اور کوئی نہ ہوگی کہ اپنی نوآبادیوں کو چھوڑ جائیں۔ تمام امن دوست قوموں کی دلی خواہش یہی ہے کہ یہ دست کشی امن و نظم کے ساتھ پوری ہو۔ اس میں کم سے کم اخلاقی یا جسمانی بربادی کا موقع آئے گا۔ اور دونوں فریقین میں ایسی خوشگوار یادیں باقی رہ جائیں گی جس سے بابِ امن کو تقویت پہنچے گی۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں میرے وفد کے مقاصد یہ تھے:۔۔

۱۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تیونسیوں کو بے عزتیوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب سختیاں ان پر اس قصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے جو فرانسیسیوں اور تیونسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔

۳. افریقہ اور ایشیا میں عوام کے جذبات پر منفی اثر کر رہا ہے کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک کمزور نسبتاً پسماندہ اور شریف قوم اور ایک صدی پرانی یورپی طاقت کے درمیان خونریز جدوجہد جاری ہے۔ وہ یورپی طاقت درحقیقت زیادتی کر رہی ہے اور دوسری قوم کے ذاتی امور پر قبضہ و تصرف کے لئے کوئی اخلاقی وجہ جواز پیش نہیں کر سکتی۔ باشندگانِ افریقہ و ایشیا کے جذبات کی برانگیختگی کو جلد سے جلد روکنا ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اور میرے ملک کو فرانس کے ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ روایات کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے "ڈان" نے لکھا ہے: "بعض سیاسی مسائل میں ہمیں فرانس کے ساتھ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہیں سے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اٹھے تھے۔ ہم فرانس کو آزاد دنیا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اور فرانس و پاکستان کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے کی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اگر ان اعلیٰ اصول کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس کے سر باندھا ہے میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندوں کے صبر و تحمل پر زیادہ بوجھ ڈالا ہے تو میں صمیم قلب سے معذرت خواہ ہوں۔

ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ و سفیر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو
انہوں نے برنارڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے ۷ اپریل ۱۹۵۲ء کو فرمائی۔

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے ڈین میکنٹاش[1] پروفیسر پیرڈن[2] مسٹر ولیم ہنڈرسن[3] اور مس روتھ شیکٹر[4]
کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے طفیل مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس
ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لمحے کے لئے مجھ پر صورت حال کے ابہام نے تحیر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے علم تھا کہ یہ اجتماع
جس نے اپنے لئے ماڈل اسمبلی کا نام تجویز کیا ہے، یہ کام اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی جو دنیا کے ایک [illegible]۔ تعجب ہے یا اقوام متحدہ
کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کی گئی ہے کہ وہ [illegible] آپ کے نمونے کے مطابق بنائے گی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اقوام متحدہ میں
ہی اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب ہے [illegible] اگر آپ کے طرز عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ مجھے یقین کامل ہے
کہ ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اپنی زندگی سدا رہے گی اور مسرت میں بھی۔

میں یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو فیصلے کریں گے ان کا انداز کیا ہوگا لیکن؟ [illegible] اسی مثال پر قائم رہیں گے
جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو ہم میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلافات رہنے سے بھی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی
کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ بھی کبھار اور شاید بسا اوقات اپنے آپ کو شکست [illegible] پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار
سوال آئے گا کہ آیا یہ تنظیم چل سکتی ہے:

اختلافات کی کئی صورتیں ہوتی ہیں لیکن میں ایک خطے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان سب سے پہلے اختلاف کی توضیح
بالکل سہل ہے اور مجھے اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ اختلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی مثالیں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بارہا
نظر آتی ہیں۔ اور جس کے نعرے اس مجلس میں بار بار [illegible] سے [illegible] کی آویزش کہا جاتا ہے۔

---

1. MACINTOSH 2. PEARDON 3. MR WILLIAM HENDERSON, 4. MISS RUTH SCHACTER

مرے نزدیک [illegible] نسلی امتیاز و تعصب سے [illegible] گزارش کیا ہے [illegible] کی اقوام مرد و عورت ، نسل
[illegible] رابطہ [illegible] ثابت [illegible] کی [illegible] ہو سکتی ہے ؟

اس میں [illegible] اختلاف کی [illegible] مستردہو [illegible] یہ اختلاف [illegible] تم نہیں [illegible] کی حیثیت
سے [illegible] احکام کا موجب ہے کا

آپ نے [illegible] ابتدائی بلاک لکھتے ہیں [illegible]
[illegible] کے مفہوم میں کوئی خاص [illegible]
[illegible] مفادات کا ایک عام [illegible] کی تاریخ [illegible]
[illegible] انسانی [illegible] شاید آپ [illegible] کہ یہ اختلافات کیا ہیں ، کہاں پیدا ہوتے ہیں ؟ ان سے [illegible]
[illegible] ؟

یہ اختلافات [illegible] ایک طرف تو [illegible] یورپی [illegible] مشرقی اقوام میں [illegible]
[illegible] لفظ [illegible] آپ نے [illegible] میرے لیے آسان [illegible]
[illegible] کا استعمال کرکے [illegible] بالعموم [illegible] آج کل [illegible] کا لفظ [illegible] استعمال کیا جا رہا ہے ۔
مغربی یورپی قوموں [illegible] اختلافات [illegible] کے ہیں ۔ [illegible]
[illegible] کا لفظ [illegible] مستعمل نہیں [illegible] ۔

ان میں سے [illegible] کے متعلق [illegible] اکثر [illegible] اقوام ماضی میں
شدید [illegible] کا شکار رہی ہیں [illegible] کے لیے فراموش نہیں کر سکتیں
جو نسلی [illegible] کا عقیدہ رکھنے والوں [illegible] نسلی امتیاز کے [illegible]
[illegible] جہاں کہیں بھی دیکھیں گی شدید مخالفت [illegible] غلط سمجھیں [illegible] ان چھوٹے موٹے حادثات کو
نہیں جو [illegible] ملک میں [illegible] انفرادی واقعات کی جانب [illegible] وہ وقت ابھی بہت دور ہے
جب کوئی ملک [illegible] کر سکے گا [illegible] نسلی امتیاز کا ذکر [illegible] بین الاقوامی
[illegible] کا باعث ہے ۔ آپ نے اخباروں میں کئی ملکوں کی خبریں
پڑھی ہوں گی جہاں نسلی امتیازات کے واقعات ظہور میں آتے ہیں ۔ ایسے واقعات [illegible] علاقوں میں بھی رونما ہوتے ہیں اور چند دوسرے ملکوں میں بھی ۔
مجھے مغربی یورپ یا [illegible] ممالک کا کوئی ایسا [illegible] خیالات [illegible] ہوں جیسے [illegible] فرق ہے تو صرف صورت حال
کے جذباتی رد عمل کا ہے ۔

دوسرا مسئلہ جس پر [illegible] عام طور پر [illegible] تعبیر کیا جا سکتا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا
ہوں کہ [illegible] اقوام دنیا کی نصف سے [illegible] آبادی کی نمائندگی کرتا ہے ۔ ایک وقت تھا جب مجھے یہ بات یاد دلانا پڑتی تھی اور [illegible] اس سادہ سی حقیقت
کو تسلیم [illegible] اس وقت [illegible] جب تک [illegible] اطمینان نہ کر لیتے تھے میرا خیال ہے کہ آج دنیا

[illegible]

[illegible] نامساوات دور کی جائے۔

ایک وقت تھا [illegible]

[illegible]

کی مخالفت اسی طرح کرتے تھے جس طرح [illegible] اس دور میں اسی قسم کے

مسائل حقیقی اور واقعی طور پر درپیش تھے اور اصلاح کے علمبرداروں [illegible] اقتصادی نقصانات [illegible]

کو وصول کرنا ان میں سے کچھ میں اس نفس کو نہ پایا جاتا۔ اگر کسی مہذب ملک میں یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت نہیں کہ امیروں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس وصول کرنا چاہئے، اور یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ دولت کا اجتماع بحیثیت مجموعی معاشرے کا فرض ہے۔ ہر ادارہ محسوس کرتا ہے۔ تاہم یہ صورت ابھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں ہوتی۔ آج اگر امیر ملکوں کا کوئی فرد پسماندہ ہے تو وہ اسے بیماریوں کا مارا ہوا، افلاس اور قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے اگر جیش میں تصور کر لیا جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ امداد خیرات کے طور پر دی جانے، یہ وہی جذبہ ہے جو اب سے ایک یا دو صدی پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں میں کام کرتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہم اس امداد کو خیرات تصور نہیں کرتے۔ ہم اسے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ ہر شخص سے اس کی مقدرت کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو حق اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے، تو کئی دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاسی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط اور قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفس مضمون سے ذرا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد تازہ کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو طویل عرصے تک خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ رہے۔ اب دو صدی سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی حرفتیں دنیا کے ان ملکوں میں مرتکز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے اس وقت تک وہ خود کفیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار پر ہو تو اس کے متعلق شک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے۔ دوسری طرف ہمیں جو امداد مل رہی ہے ——— مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی کہہ لیجئے ——— ملتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال مہیا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق سمجھے گی۔

لہٰذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد جن وجوہ کی بنا پر کرنی چاہئے۔ جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زرعی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دریافت کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے جا چکے ہیں اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گذر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی، دور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے یہ اختلافات کبھی شاید اور کبھی کم تر ہوں گے، یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان بنیادی اصول پر مکمل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزاد فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں جس کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قدر ہستیوں نے جدوجہد کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم کر دی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل اسی بنیاد

[illegible] ہیں۔ آپ کا ملک [illegible] آپ پسند [illegible] ہو گی [illegible] آپ [illegible] ملک کے مذہب [illegible]
[illegible] مستقبل کا [illegible] اس بات پہ کہ آپ اس ذمہ داری کو کس [illegible] خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔

اب مجھے اپنی بات ختم کر دینی چاہیے کیونکہ مجھے معلوم ہے [illegible] کی مدد [illegible] آپ کے لئے [illegible]
[illegible] نہیں جیسا کہ میں نے کہا۔ میں آپ [illegible] آپ کی [illegible] ہوں گی [illegible] وفد [illegible]
[illegible] نصیحتیں کرنے کی جرات کر سکتا ہوں اور وہ پاکستان کا وفد ہے [illegible] وفد [illegible] ایسے [illegible]
[illegible] ہے جسے آزادی کی دولت حاصل کئے ابھی [illegible] سال گزرے ہیں [illegible] سمجھنا چاہیے کیونکہ
[illegible] ایسا نہیں ہے البتہ ہے [illegible] کرنی چاہئے [illegible] مشکلات کے بہتر حل میں [illegible]
[illegible] اقوامی معاشرے کے مفاد [illegible] اپنے ملک کے [illegible] محدود [illegible] کرنے کی ترغیب [illegible] سامنے آ جائے۔ ایسے موقعے کے لئے [illegible]
[illegible] قسم کی ذہنی کشمکش جیسی حیثیت رکھتی ہیں [illegible] موقع [illegible] معاشرے کی [illegible]
[illegible] گے۔

پاکستان کے وفد کے لئے میری ایک چھوٹی سی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہو تو ضرور کہیے لیکن جب
[illegible] کچھ نہ ہو تو براہ کرم خاموش رہیں۔

[illegible]
[illegible] کا شکر گزار ہے

پیغامات

خلیفہ عبدالحکیم

[illegible] اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے [illegible] زبان پر جاری ہو گیا

[illegible] بیٹھے ہیں
[illegible] بیٹھے ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مرزا غالب کی نسبت حالی نے لکھا ہے [illegible] شخص تھا [illegible]

[illegible] زندہ دلی بھی تھی اور روشن دماغی بھی۔ ایسے چراغ جب بجھ جاتے ہیں تو زمانے کی ظلمت اور بڑھ جاتی ہے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا ۔۔۔ شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

حفیظ جالندھری

دوست بخاری کا انتقال ہو گیا ہے۔ بخاری سے میرا بھی یارانہ تھا۔ میں جب پہلی بار صاحب ۱۹۱۹ء میں لاہور آیا تو میری شناسائی پطرس بخاری
سے ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم تین شدم نوجوان شاعر ... عبدالمجید سالک ... غلام رسول مہر ... شیخ عبدالحمید ... سید امتیاز علی تاج تقریباً
... سب ہم تاج صاحب کی بیٹھک میں بیٹھتے۔ کبھی کبھی ایک ہوٹل میں تین تین کبھی نئے شاعروں میں جاتے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بھی شریک ہوتے۔ پھر بخاری کی ثابت
جلا گیا۔ ... سوئی پڑ گئیں۔ بجری موتی شیشکی ... بن گئی۔ اب تاثیر اور محمد دین ... پنڈت ہری چند اختر بھی ... سب شامل ہو گئے اور
سب نیاز مندان لاہور کہلائے۔ لیکن اس انجمن کی شمع بطرس بخاری کی ذات تھی۔

شعر و سخن، ادب و فن اور نقد و نظر سے ... نکات اور لطائف و ظرائف ... کی زبان سے ظہور میں آتے تو ہم سب کے لیے بصیرت
تھے۔

پھر ... کا مستقل اعلان کر دیا گیا۔ ۔۔۔ ... جدید ... مجید ... چند اختر ... اور حسرت ہی دل ہی دل میں جمع ہو گئے ۔۔۔
... بخاری ... کبھی کبھی میرے ... ملنے ... سالک صاحب لاہور سے ... جاتے ... صاحب چغتائی اور صوفی تبسم بھی قدم رنجہ فرماتے اور ... بیٹھے ۔۔۔
پاکستان بننے کے بعد بخاری برائے کار ... دنیا کی سب سے بڑی انجمن میں شامل ہو گئے۔ دوستی کی محفل بے چراغ ہو گئی۔ امید تھی وہ آ جائے گا اس نے
... کیا تھا کہ آ جاؤں گا اور ... جو اس پہ جمع ہوا ... لیکن ... اس کی ... جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ؎

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

لیکن اس سے میرا رشتہ آسمانی نے ساتھ ٹوٹنے والا نہیں۔ جہاں تک ... حسرت ... کی چند اختر ... بخاری وہاں پہنچ گیا ہے ۔۔۔ اور میں بھی جلد
اسے وہیں پا لوں گا۔

خواجہ منظور حسین، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی وفات پر ان کے پرانے کالج کے سوا کسی ادارے کو بھی، جس سے ان کا تعلق رہا، سوگوار ہونے کی اتنی وجہ نہیں کیونکہ
ہمارے رفقائے کار میں سے کسی نے ان سے زیادہ نہ اس کالج سے کچھ حاصل کیا نہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ فائدہ پہنچایا۔ انہوں نے اس جگہ اور کیمبرج میں اپنی
زندگی کے سب سے زیادہ مسرت بخش اور فیض رساں سال بسر کئے۔ یہی وہ درس گاہ ہے جہاں ان کی شخصیت نے پہلے پہل چکاچوند کر دینے والے اوصاف
حاصل کئے اور ان صلاحیات کو استعمال میں لانے پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ یہیں سے ان کی اثر آفرینیوں نے دور و نزدیک کرنیں پھینکیں اور تہذیب
و شائستگی پھیلانے کی سرتوڑ کوشش کیں۔ وہ ایک ممتاز اور متبحر عالم تھے جو مشرق و مغرب کی حیات پرور ادب کے نشوں سے سرشار تھے۔ ایک جوش آفریں استاد
کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ترشیدہ لطائف اور درخشاں فصاحت رکھنے والے ادیب اور مقرر تھے۔ بات بات میں نکتے پیدا کرنے اور تلوار کی
طرح تیز کاٹ رکھنے والی ظرافت کے مالک تھے۔ انہوں نے جس چیز کو چھوا اس کی ہیئت بدل دی اور جس سے ملے اس کی رفتار تیز تر کر دی۔ تحقیق و تجسس کا شوق

باتیں بھی نئی نئی گذرگاہوں میں بہہ گیا۔ تازہ بتازہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کئی بار یورپ کے کتنے ہی سفر کئے ... اپنا
کو سیراب کیا۔ میلانات میں مطابقت پیدا کی یہاں تک کہ وہ کناروں سے اچھل پڑا۔ بزم احباب کی تشبیہ کی مجالس میں ہم نے دیکھا ... ذوق
والوں کی صحبت میں ... کا انتخاب ... کرنے کے ... بے پناہ شگفتگی ... بعد
آخر رہے۔ ان کے معاشرتی ترقی پسندی، روشن خیالی، ذہنی ... کی قوت کے سلسلے بخاری کی یاد ... رہتی ہیں۔ (مرتب)

سید عابد علی عابد

پروفیسر احمد شاہ بخاری کے رخصت ہو جانے سے بہت سی چیزیں ان کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ظرافت، شگفتگی اور ... کی وہ اعلیٰ اقدار رخصت ہو گئیں جو مشرقی اور مغربی وضعداری کے نہایت بانکے امتزاج سے پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اسلوب تحریر رخصت ہو گیا جس میں مختلف زبانوں کی جوہری لطافتیں اس طرح جھلکتی تھیں جیسے شفق کے رنگ کی موجیں۔ ان کے ساتھ وہ بیانِ خطابت، خطیبانہ ادبیت، متین ظرافت اور ظریفانہ متانت ایسی رخصت ہو گئیں کہ یہ شعور ہوتا ہے جیسے اب کبھی لوٹ کے نہ آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ادیبوں، انشا پردازوں اور سخن فہموں کی ایک مخصوص جماعت کے سب سے بڑے ترجمان تھے ان کے چلے جانے کے بعد اگرچہ اس جماعت کے گنتی کے کچھ افراد باقی ہیں۔ لیکن اس جماعت کی وہ تابندہ و درخشاں روح رخصت ہو گئی جس کی جرأت سے اس جماعت کے سارے افراد جیسے بڑے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔

شائستگی اور بخاری ایک دوسرے کے لئے اس طرح لازم ہو گئے تھے کہ میں تو جب شائستگی کے متعلق کچھ سوچتا تھا تو بخاری کو اس کا مظہر نسبتی بنا کر سوچتا تھا۔ انہیں فطرت نے گوناگوں صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا کہ سائنس میں بصیرت رکھتے تھے۔ آرٹ کے مزاج پر حاوی تھے۔ ادبیات کے دلدادہ تھے اور حسن انتظام کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ افسوس کہ ان کی یہ تمام صلاحیتیں پاکستان کے کام نہ آئیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مسئلے کے سلسلے میں ایسی گرہ پیدا ہو گئی ہے کہ سلجھائے نہیں سلجھتی اور بخاری سے جو رجوع کیا گیا ہے تو انہوں نے پہلے مسئلے کو چٹکیوں میں سلجھایا ہے اور پھر اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کام لے کر بات کو چٹکیوں میں اڑا دیا ہے۔

اردو ادبیات کے سلسلے میں ان کی تحقیقات گنتی کے چند مضامین اور منظومات پر مشتمل ہیں۔ لیکن ہر تحقیق ایک کارنامہ ہے اور ہر مضمون پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ بخاری اس سے بہتر مضمون نہ لکھ سکیں گے مگر یہ گمان غلط ثابت ہوتا ہے ہر دوسرا مضمون پہلے سے بڑھ کر خوب صورت ہوتا ہے۔

بلی اور وصالت سے قطع نظر ان کے بانکپن کی یہ ادا کون فراموش کر سکتا ہے کہ مرتے ہوئے ہنس رہے ہیں اور ہنستے ہوئے مر رہے ہیں شاید لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کو ان کی موت کے بعد معلوم ہوا ہو گا کہ ان کی بیماری کتنی خوفناک شدید اور طویل تھی اور اپنے فرائض منصبی کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے۔ آج تاثیر مرحوم کی موت کا داغ تازہ ہوا۔

ہم زباں چپ ہو گئے ہم داستاں چپ ہو گئے
کیسے محفل آرا ناگہاں چپ ہو گئے

ہماری کتابیں

(تصانیف شوکت تھانوی)

نیلوفر۔ شوکت صاحب کا تازہ ترین ناول ہے جو مقبول ہو رہا ہے۔ یہ ناول ہے [illegible] ان کے پچھلے ناولوں [illegible] اگر آپ نے اب تک نہیں پڑھا تو آپ [illegible] کے مطالعہ سے محروم ہیں۔

قیمت -/۶

ہماری دوسری کتابیں

مولانا	شوکت تھانوی	۳/۸
[illegible]	"	-/۶
خدانخواستہ	"	۳/
سودیشی ریل	"	-/۳
کُتیا	"	۳/۸
سانچ کو آنچ	"	۴/۰
سسرال	"	۲/۴
کارٹون	"	۳/۸
مابدولت	"	۳/۸
[illegible]	"	۲/۸
جوڑ توڑ	"	-/۴

مضامین شوکت	۲/۸	"	قاضی جی (تین حصے)	۱/۸
غالب کے ڈرامے	۲/۸	"	غیرہ وغیرہ	-/۲

ادارۂ فروغ اردو لاہور

فون ـــــــ ۲۳۸ ـــــــ پوسٹ بکس نمبر

ہفت روزہ — نصرت — لاہور

یکے از مطبوعات مکتبۂ جدید

بہت سے لوگوں اور اداروں نے نصرت کو اپنی رائے کے لائق سمجھا ہے۔ امید ہے آپ بھی اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنا اپنے لیے کچھ فائدے کی بات پسند کریں گے۔

ایک شاعر

نصرت واقعی پیارا ہے۔ نصرت نے جن امور کو پیش نظر رکھا ہے۔ آج کل ہمیشہ ان کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں بہتر زندگی کے لئے آرزو پیدا کرنا اور اپنے ملک و ملت کے مسائل میں تعمیری جذبات کے ساتھ خود حصہ لینا اور دوسروں کو مائل کرنا نصرت کا مطمح نظر ہے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

ایک مصوّر

دماغی نشو و نما اور صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے مکتبۂ جدید نے بے مثل خدمت کی ہے اور اب ہفت روزہ نصرت بھی ان خدمات کی ایک کڑی ہے جسے فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ نصرت نے اتنے تھوڑے عرصے میں جتنی ترقی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ایک پیغام ہے اور اس میں بصیرت کی چمک ہے۔

مصور مشرق، عبد الرحمٰن چغتائی

ایک روزنامہ

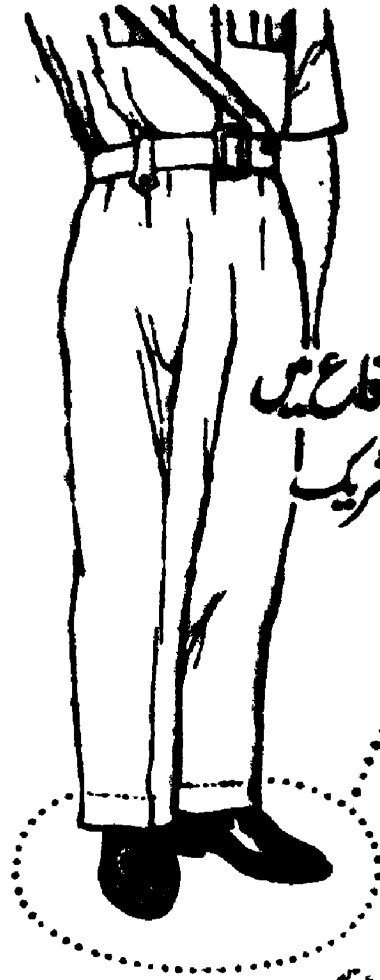
نصرت میں باقاعدہ یہ کوشش نظر آتی ہے کہ ہماری زندگی کے جو مختلف اور متنوع پہلو ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور یوں لوگوں میں اردگرد کی زندگی میں اور خود اپنی زندگی میں دلچسپی لینے کا مذاق پیدا کیا جائے ۔۔ اور یہی ایک ہفتہ وار کا صحیح تصور ہے۔

روزنامہ "آفاق" لاہور

بدل اشتراک

فی شمارہ چھ آنے ـــــــ ایک سال کے لئے پندرہ روپے ـــــــ چھ ماہ کے لئے آٹھ روپے

ناظم: ہفت روزہ نصرت ـــــــ ۶ ـــ نسبت روڈ ـــــــ لاہور


اپنے وطن کے دفاع میں
برابر کے شریک
Bata
باٹا
دنیا بھر کے
جوتے ساز

دوچار باتیں

۱۔ نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا۔ جو دیگر رسائل کے سالناموں سے زیادہ بہتر ہوگا۔ انشاء اللہ!

۲۔ عام نمبر کے بعد نقوش اپنے دس سالہ کارناموں کا انتخاب پیش کریگا جو بلاشبہ ایک کارنامہ ہوگا۔

۳۔ نقوش کا غزل نمبر کئی اہم اضافوں کے ساتھ جلد ہی مارکیٹ میں آجائیگا شاید نومبر تک۔

۴۔ افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر (دوم) منٹو نمبر اور طنز و مزاح نمبر مل سکتے ہیں مگر صرف لائبریریوں کو

۵۔ نقوش کے پرانے نمبروں میں یہ شمارے بھی مل سکتے ہیں مثلاً نمبر ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

۶۔ بعض دیگر نمبروں کے لئے ہماری ایجنسی طاہر نیوز ایجنسی نول روڈ کراچی کو لکھیں شاید چند ایک شمارے مل جائیں۔

۷۔ ادارہ نقوش ڈرامہ نمبر کے لئے بھی پر تول رہا ہے۔ کچھ مشورے دیجئے، کچھ مواد کی فراہمی میں مدد دیجئے۔

۸۔ نقوش کے سابقہ کارناموں پر رائے اور آئندہ کے لئے آپ کے مشورے ہماری رہنمائی کا موجب ہوں گے۔ کچھ لکھئے تو۔

(ادارہ)